واجد علی شاہ

اور

ان کا عہد

رئیس احمد جعفری

سکندر بک ڈپو۔ اردو بازار دہلی

(جملہ حقوق محفوظ)

قیمت دس روپے

(سو دیشقو پریس دہلی)

واجد علی شاہ اور اُن کا عہد

Wajid Ali Shah aur
Un Ka Ahad.

Raees Ahmad Jaffari

کمپنی کے فرزندوں سے

کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانہ یاد ہے؟
یاد تو ہوگی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں!
اب بھی جس کی خاک سے اٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں

تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بار ہا؟
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا

(جوشؔ)

انتساب

اُن شہیدوں کے نام

جو

غدر ۵۷ء میں ملک کی آزادی کے لئے شہید ہوئے

دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی !
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں !
آنکھوں میں گدا کی سُرخی ہے' بے نُور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے سنسان میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا ان کو خبر تھی زیر و زبر رکھتے تھے جو رُوحِ ملت کو
اُبلیں گے زمیں سے مارِ سیہ برسینگی فلک سے شمشیریں
کیا اُن کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اُٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں' دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں

(جوشؔ)

گورے رتھوں پر بیٹھے گولیاں برساتے جاتے تھے۔ عبادت خانہ کو آگ لگادی۔ راستہ میں جو سامنے آیا شکار کیا مسجد فدا حسین میں کھانا کھایا، (پھر) توشہ خانۂ سلطانی میں گئے۔ جتنے شیر جانور وغیرہ تھے سب کو مار ڈالا، نبی بخش داروغہ کو گولی ماردی ۔ پھر آگ لگائی۔ پھر چوپڑ کے اصطبل میں آئے۔ جتنی چھاؤنی تھی سب کو جلادیا۔ بہت سے تلنگے گھبرا کر دریا میں ڈوبے ۔ ایک کشتی پہ اس کثرت سے چڑھے کہ اپنے ساتھ سب کو لے ڈوبے۔

(قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۶۸)

(انگریزوں نے) جب دل کشا محل کو مرمّت طلب دیکھا مسمار کردیا۔ بادشاہ باغ ۵۵ لاکھ میں تیار ہوا تھا، ۳۵ ہزار میں راجہ کپورتھلہ نے مول لے لیا۔ دل آرام کی کوٹھی بھی ایک مہاجن نے خرید لی۔ چوکھی حضرت سلطان عالم (واجد علی شاہ) نے اعظم الدولہ سے چار لاکھ کو لی تھی، جب نیلام ہوا، بارہ ہزار کو ساہو جی نے لے لی۔ جتنے خام مکان تھے سب مسمار کردئے۔ موتی محل کے پاس مرزا کی کوٹھی تھی، اسے مسمار کردیا۔ امام باڑے کے گرد جتنے مکانات عالی شان اور محلّے تھے تا حسین آباد، داخل حصار قلعہ ہوئے، امام باڑہ مرزا حسن جان ومنبر جس میں جمعہ کی جماعت ۷۰ - ۸۰ برس تک ہوئی ہموار زمین ہوگئی۔ امام باڑہ آغا باقر خاں کھد کر برابر ہو گیا!

(قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۵۵ - ۳۵۴)

فہرست مضامین

پیش لفظ

یہ کتاب شاید اب سے بہت پہلے قارئین کے ہاتھوں میں ہوتی۔ اسکا بڑا حصہ لکھا جا چکا تھا، کچھ باقی تھا کہ ۷ مارچ ۱۹۵۷ء کو مجھ پر قلبی حملہ (کارونری تھرامبوسس) ہوا۔ کرنل ضیاءاللہ نے مجھے فوراً گنگارام ہسپتال میں داخل کر لیا۔ ۱۵-۲۰ روز بعد وہاں سے گھر آگیا۔ ابھی چلنے پھرنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ لیکن بظاہر صحت کی طرف عود کر رہا تھا کہ یکایک ۳ مئی ۱۹۵۷ء کو دوبارہ نہایت شدت کے ساتھ یہ حملہ ہوا۔ کرنل ضیاءاللہ اطلاع ملتے ہی تشریف لائے اور جو کچھ ایک ڈاکٹر اور ایک انسان کے بس میں ہے وہ سب کچھ کیا۔ بظاہر بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ لیکن خدا کو شاید میری رفیقۂ حیات کی چشم خوں فشاں اور چھوٹی چھوٹی بچیوں کے گریۂ بے اختیار پر رحم آگیا۔ اس روز مجھے اندازہ ہوا کہ ہوش و حواس کے عالم میں آدمی جب اپنے بیوی بچوں کے سامنے دنیا سے گذرتا ہوگا تو اس پر کیا گذرتی ہوگی؟ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ کرنل ضیاءاللہ کی مسیحا نفسی سے میں بچ گیا لیکن تقریباً چار ماہ تک بستر سے ہل نہ سکا۔ ڈاکٹر اسلم پیرزادہ صاحب

(پروفیسر معالجات، ایڈورڈ میڈیکل کالج) بھی دو مرتبہ تشریف لائے اور برابر ان کی توجہ، عنایت اور طبی مشورے مجھ نیم جان میں ایک نئی زندگی پیدا کرنے کے موجب ہوئے۔ جناب حکیم محمد سعید صاحب (مالک ہمدرد دواخانہ) بھی از راہِ کرم عیادت کے لئے تشریف لائے۔ ان کے قیمتی مشورں اور قیمتی دواؤں کے تحفہ نے بھی مجھے بڑا سہارا دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا، ان حضرات کا شکریہ کیس زبان سے ادا کروں۔

خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست

اس کتاب کا پورا معاوضہ اسے لکھنے سے پہلے میں وصول کر چکا تھا، پھر بیماری کے سبب ایک عرصہ تک کام رکا رہا۔ لیکن شیخ نیاز احمد صاحب (پروپرائٹر میسرز غلام علی اینڈ سنز) نے ایک مرتبہ بھی مجھ سے تقاضا نہیں کیا بلکہ جب ملے آرام کی ہدایت کرتے رہے، ان کی اس کرم فرمائی کا بھی دل سے سپاس گزار ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آج اس بوجھ سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔

بیماری کے یہ سات آٹھ مہینے بڑے صبر آزما گزرے، اس مدت میں یگانوں اور بیگانوں کا، دوستوں اور عزیزوں کا، واقفکاروں اور شناساؤں کا، قدر دانوں اور جاں نثاروں کا، نیاز مندوں اور کرم فرماؤں کا، سب کا تجربہ ہو گیا، اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اب مجھے اس تجربہ سے کبھی دوچار نہ ہونا پڑے ؎

جفائیں دیکھ لیں، کج ادائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب بُرائیاں دیکھیں

۱۲ ستمبر ۱۹۵۷ء

رئیس احمد جعفری

۸۹ - ٹیگور پارک - لاہور

جب آتش جواں تھا!

واجد علی شاہ نے اپنی ایک کتاب "پری خانہ" میں خود اپنا سراپا بیان کیا ہے۔

بیان خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:۔

"........ اور میرے دل کی سرزمین پر محبت کے بادل برس رہے تھے۔ اس میں شک نہیں، اس زمانہ میں خود مجھ میں بھی بتانِ شوخ ڈھنگ کے سے آثار موجود تھے میری طلسم آفریں آنکھوں کے آگے، ساحری کو بھی سبقت لے جانا محال تھا۔ یوسف کو میرے حضور میں بار پانا مشکل تھا۔ میری زلف پر پیچ مشکِ تاتار کو شرمندہ کرتی تھی۔ میری نازک مژہ اغیار کے سینوں میں کانٹے کی طرح

چبھتی تھی۔ حسن و جمال۔ لطافت و ملاحت میرے آگے سر بسجود تھے' ادا و ناز میری ادنیٰ سی کنیزیں تھیں۔ آہوانِ رم خوردہ میری چشم پُر فریب سے رک جاتے تھے سنبل پیچاں میری کاکلوں کی اسیر تھی۔ میرے رخسار مثل آئینہ حلب' میری زنخداں سیب سرخ تھی میری آنکھیں ناتوانوں کے لیئے مایۂ قوت تھیں۔ میرے ہونٹ معشوقوں کے لیئے جاں نواز تھے۔ میری بھنویں کمان کیانی' میری پیشانی چاند کی طرح چمکتی' میرے حلقۂ گیسو گمندِ بلا تھے۔ جس میں بے شمار دل اسیر ہو کر تڑپتے تھے۔ میرے مژگاں کے تیروں سے عاشقوں کے دل زخمی تھے۔ میرے ابرو کی تیغ معشوقوں کی جان کی دشمن تھی۔ زلفیں شب تیرہ و تار کی مانند اور عارض صبح وصال کے مثال تھے۔ قد و قامت سروِ مراد کی طرح جو معشوقوں کے دل کو ہزار فریب سے قابو کر لیتا تھا۔

باب (۱)

تزکِ واجد علی شاہ

واجد علی شاہ قدرت کی طرف سے غیر معمولی دل و دماغ لے کر آئے تھے۔ وہ بیک وقت صاحب تخت و تاج بھی تھے اور اقلیم سخن کے شہریار بھی' وہ آرٹسٹ اور فنکار بھی تھے اور مصنف و مولف بھی وہ شگفتہ طبع اور بذلہ سنج بھی تھے اور جودت فکر و نظر کے سرمایہ دار بھی' وہ نثار بھی تھے اور شاعر بھی' وہ ماہر موسیقی بھی تھے اور رقص کے اقدام الپسپائی حرکت وجنبش اور اعضا کے توڑ موڑ کے فن پر بھی ماہرانہ نگاہ رکھتے تھے۔ وہ عاشق صادق بھی تھے اور رند لاابالی بھی' وہ نکتہ سنج بھی تھے اور ادا آموز بھی' وہ حسن کے قدردان بھی تھے اور پرستار بھی' وہ بلا کے ذہین تھے' ان کی بارگاہ سے جو القاب و خطابات عطا کئے جاتے تھے' وہ انکی ذہانت اور جودت طبع کے آئینہ دار تھے۔ بڑے صاف گو بھی تھے' جو دل میں وہ زبان پر' لگی لپٹی رکھنے کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا کوئی گوشہ نہیں چھپایا' اچھا یا بُرا' سیاہ یا سفید' روشن یا تاریک' جو کچھ کیا' جو کچھ دیکھا۔ جو کچھ کہا۔ جو دل میں خیال آیا۔ اس تک کو' بغیر کسی جھجک اور تامل کے بیان کردیا۔

پہنچا تو ہوگا سمع مبارک میں حالِ میر
اس پر بھی جی میں آئے تو دل کو لگائیے

واجد علی شاہ کے خامۂ بہار آفریں سے بہت سی کتابیں نکلی ہیں۔ لیکن ان میں

"بنی" کو اختصاص اور امتیاز خاص ہے۔ یہ کتاب ایک کشکول کی حیثیت رکھتی ہے۔ کئی سو صفحات پر حاوی ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے آپ کو بے نقاب کر دیا ہے' یہ ایک صاف اور روشن آئینہ ہے جس کے سامنے وہ آکر بیٹھ گئے ہیں' اس میں انہوں نے فن کی باتیں بھی کی ہیں۔ اشخاص و افراد کے بارے میں اظہارِ خیال بھی کیا ہے۔ اپنے تاثرات و واردات بھی بیان کیے ہیں۔ آپ بیتی کے نقوش بھی کہیں کہیں ملتے ہیں۔ جگ بیتی کی جھلک بھی ہے' غیر محسوس طور پر' لیکن وضاحت کے ساتھ' انہوں نے اپنے نفسیات پر سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ جہاں وہ محل کی رہنے والیوں کو آداب حیات بتلاتے ہیں۔ وہ ان کی نفسیات دانی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کتاب میں نقلیں بھی ہیں' حکایتیں بھی' داستانیں بھی' واقعات و حقائق بھی' کئی سو صفحوں میں پھیلی ہوئی اس کتاب کے بعض حصوں کو اختصار کے ساتھ میں ذیل میں درج کرتا ہوں' تاکہ واجد علی شاہ کے کردار و گفتار کا ایک دلچسپ اور دل نشین و دل آویز مرقع نظر کے سامنے آجائے۔

"رہس" کو واجد علی شاہ کے فنکارانہ اولیات میں شمار کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ان کی "ہدایت کاری" دیکھیے:۔

۱۔ رہس کی ہدایت کاری

سکھیاں پیشواز وغیرہ سے آراستہ ہو کر آئیں اور خاموش بیٹھ جائیں سازندے ان کے ہمراہ تصنیف راقم گائیں۔

استائی

چلو چلو سکھی اب رہس کریں
اکھتر¹ پیا کے من کو رجھائیں

جس وقت راقم کا تخلص لب پر آئے فوراً سب سکھیاں کھڑی ہو جائیں۔ اور

---

¹ یعنی اختر۔ دیہاتی نہیں "اکھتر" کہتے ہیں۔ یہ واجد علی شاہ کا تخلص تھا۔ *

جس مقام پر رہس کے واسطے صف باندھ کے کھڑا ہونا مقرر ہو چکا ہو وہاں پر صف بستہ ہموار ہوں اور رہس کے وقت اکل و شرب شور و غل سے محفوظ رہیں۔ ہر رہس کے ماقبل ضرور ہے کہ راقم کی تصنیفات گائیں۔ بعد کنھیا جی کے ٹکڑے کے ہمراہ وہ نغمہ سم پر تمام کیا کریں اور ہر رہس کے ختم کے بعد چرنجی رہو جان عالم کہا کریں (ص ۲۹)

اداکاروں کی پوشاک

(۳۳ واں رہس ہمراز نام ہے اس میں ایک جوگن ہے جس کا نام غربت، شہزادہ کہتا ہے کہ رادھا کنھیا کا ناچ دیکھنے کی ہوس ہے اس رہس میں بہت سے کردار ہیں ان کے مکالمے خاصے دلچسپ ہیں یہ صفحہ ۸۹ سے شروع ہو کر ص ۱۰۹ پر ختم ہوتا ہے اس میں واجد علی شاہ نے بہ حیثیت ہدایت کار کے رہس کے کرداروں کے لئے جو پوشاکیں تجویز کی ہیں صرف ان کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے)

تفصیل پوشاک کنھیا جی

۱۔ گھٹنا معہ جانگیہ

۲۔ گھاگرہ

۳۔ گلوبند کارچوبی

۴۔ مکٹ کارچوبی

تفصیل پوشاک کی اور رادھا جی کے زیور کی

۱۔ نتھ

۲۔ بینہ

۳۔ تمام ہندوانی زیور

۴ - پھریہ
۵ - لہنگا
۶ - پیشواز
۷ - بندے یعنی سراسری نقرہ
۸ - نقرہ بانسری معہ مُرلی

سکھیوں کی پوشاک

۱ - جیغہ
۲ - کلغی
۳ - سلطان بند
۴ - جُملہ
۵ - زیور پشواز
۶ - ڈوپٹہ
۷ - پاجامہ

پریوں کی پوشاک

۱ - کارچوبی دوپٹہ
۲ - جامۂ حسن پُرزر
۳ - پاجامہ پُرزر
۴ - جُملہ زیور مطابق لیاقت

دیو کی پوشاک

۱ - جاکٹ سیاہ

۲ - پتلون سیاہ

۳ - دستانہ سیاہ

۴ - موزہ یعنی جراب سیاہ

۵ - چہرہ مقوہ کریہہ منظر

۶ - گرز چوبی سیاہ پر

۷ - کلاہ کاغذی

جوگن کی پوشاک

۱ - تہمد پارچہ شنجرفی

۲ - کفنی

۳ - جٹا کلاہ مصنوعی

۴ - سانپ کپڑے کا کلاہ

۵ - جھولی پارچہ

۶ - تونبہ

۷ - بیراگی چوبی

۸ - بھبوت

آلات و پوشاک ماکہن والیونکی

۱ - ساڑھی

۲ - ٹکی برنجی گلٹ نقرہ

۳ - سیلنی برنجی نقرہ

۴ - منہنائی چوبی

۵ - کھریہ گلٹ نقرہ

۶ - کلسیہ گلٹ نقرہ

۷ - زیور ہندوانہ حسب لیاقت صاحب قِصّہ

پوشاک اور زیور پنہارنوں کا

۱ - ساڑھی

۲ - گھڑہ مسی

۳ - ڈول

۴ - رسیماں

۵ - چاہ مصنوعی مع گرادی

۶ - زیور حسب لیاقت

پوشاک مسافر کی

۱ - انگرکھا

۲ - پاجامہ

۳ - پگڑی

۴ - گٹھڑی

۵ - لاٹھی

۶ - لوٹا

۷ - توشہ بستہ

۸ - دری خورد

پوشاک غربت

۱ - انگرکھا

۲ - پاجامہ

۳ - چپکن سفید

۴ - کمربند

۵ - دستار سفید

پوشاک راچھیرا

۱ - دھوتی

۲ - مرزائی

۳ - پہنیٹھ

۴ - جنیو

۵ - کڑہ دست نقرہ

۶ - انگوچھا

رہس والیوں کی پوشاک

۱ - پاجامہ پرزر

۲ - پشواز مصالہ دار

۳ - دوپٹہ پر زر

۴ - زیور حسب لیاقت (از صفحہ ۱۰۰ تا صفحہ ۱۰۹)

۲ - بھانڈوں اور نقالوں کا ذکر

بھانڈ اور نقالی، لکھنؤ کے بے فکروں کی محفل عیش و نشاط کا بہت دلچسپ حصہ تھے، رفتہ رفتہ یہ گروہ ایک طبقہ بن گیا۔ جو موروثی طور پر اپنے آبائی فن کا مظاہرہ کرتے اور انعام و اکرام سے، بادشاہوں کے دربار اور رؤسا کی محفل میں شاد کام ہوتے تھے،

اس کتاب میں واجد علی شاہ نے اس طبقہ کا بھی ذکر خیر کیا ہے، نمونتہً :-

اس فرقے کو راقم نے بچشم خود دیکھا کہ ایسے پابندِ صوم صلوٰۃ ہوتے ہیں کہ سبحان اللہ ہزار روپے کی تھیلی سامنے دھر دو اور فرمائش کرو کہ نماز فوت ہونے دو اگر نقل کئے جاؤگے ہزار روپیہ تمہارا ہے کبھی قبول نہ کرینگے پر نماز وقت پر بجا لادینگے پس دل لگی کے واسطے میں نے بھی دو بھنڈ لیتان اور چند نقلیں ان لوگوں کی درج کتاب کیں بموجب اس کے کہ علم شئی بہ از جہل شئی مشہور ہے (صفحہ ۱۲۶ تا صفحہ ۱۲۷)

نقلیں

رئیسوں اور امیروں کی محفلوں میں، یا کھیل تماشے میں فن کار طرح طرح کی نقلیں کر کے خراج تحسین اور مال و دولت حاصل کیا کرتے تھے، رفتہ رفتہ یہ بھی ایک فن بنگیا۔ واجد علی شاہ نے بھی اس موضوع پر طبع آزمائی کر کے خوب خوب گلکاریاں دکھائی ہیں نمونہ حاضر ہے :-

نقل لونڈی بی بی کی

اصل کی نقل بیان کرتا ہوں کان لگا کر سنو - ایک میاں بی بی تھے - ایک لونڈی بھی میاں بی بی کا پیار اخلاص دیکھ کر لونڈی کا بھی جی چاہا کرتا تھا ایک روز میاں بی بی دونوں کسی کی شادی میں مہمان گئے گھر خالی رہا۔ لونڈی کو اور کوئی تو نہ ملا اپنی چادر یہ بیری کے پیڑ پر ڈال کے اور اس کے کانٹوں میں الجھا

کے یہ گاتی اور یوں اپنے دل کا حوصلہ نکالتی تھی'

آستائی

واہ جی واہ یہ ٹھٹھا نہیں، اچھا راہ چلتوں کا دامن پکڑ لیتے ہو۔

انترا

جانے نہیں دیتے ہو مجھ کو باہر ہاتھوں سے ناحق جھگڑتے ہو۔ (ص ۱۴۲)

واجد علی شاہ کی شگفتہ طبعی' اور بدیہہ گوئی ہر قید اور پابندی سے آزاد تھی' یہ نقل جو سبق آموز بھی ہے ملاحظہ ہو :-

نقل نیش عقرب کی

ایک مجتہد نے لاکھ آدمی کی جماعت سے حکم دیا کہ ہم تمہارے پیش امام ہیں تم سب پر واجب ہے کہ جو لفظ اور کلمہ ہماری زبان سے صادر ہو یا جو افعال ہم سے سرزد ہوں خبردار تم سب اس کا تتبع اور تقلید کرنا ایسا نہ ہو کہ مشغول الذمہ رہو اور گنہگار ہو' سبھوں نے عرض کیا ہم سب ماموم اور مقلد ہیں ۔ ہماری کیا مجال معاذاللہ جو سرِ مو حکم عالی میں تفاوت کریں' مجتہد نے کہا اٹھو میرے پیچھے کھڑے ہو سب پیچھے صف باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ مجتہد نے کہا اللہ اکبر سبھوں نے کہا اللہ اکبر امام نے سورہ پڑھا سب نے سورہ پڑھا امام رکوع میں گیا لاکھ آدمی رکوع میں گیا امام نے سجدہ کیا لاکھ آدمی نے سجدہ کیا امام سجدے سے فارغ ہو کر بیٹھے لاکھ آدمی سجدے سے فراغت کر کے بیٹھا قضارا جہاں پر مجتہد بیٹھے وہاں پر ایک بچھو کے رہنے کا سوراخ تھا۔ بیٹھتے ہی مجتہد صاحب کے چوتڑ میں بچھو نے چپ سے ڈنک مارا مجتہد نے کہا اُف ہو لاکھ آدمی نے کہا اُف ہو مجتہد صاحب اوکڑوں ہو بیٹھے لاکھ آدمی اکڑو بیٹھ گئے۔ مجتہد صاحب نے کہا ہم کو بچھو نے کاٹا لاکھ آدمی نے کہا ہم کو بچھو نے کاٹا مجتہد صاحب درد کی شدت سے کولہ ہلانے لگے لاکھ آدمی کولہ ہلانے لگے مجتہد صاحب کہنے لگے بخدا عزّوجل مجھ کو بچھو نے کاٹا لاکھ آدمی نے کہا بخدا عزّوجل مجھ کو بچھو نے کاٹا جب لہو جاری ہوا جب معلوم ہوا کہ یہ نیش خوردہ

ہیں۔ نتیجہ یہ کہ عالم ہو کے جاہلانہ حکم نہ دے (صـ۱۷۶ و صـ۱۷۷)

نقل بانکے کی

ایک بانکے کی زوجہ حاملہ ہوئی ہر صحبت میں ان کے دوست روزمرّہ مبارکباد دیتے تھے خان صاحب خانم صاحبہ کا حمل مبارک ہو حق سبحانہ تعالیٰ اولاد عطا کرے یہ کہتے تھے کہ بھائیو تم کو بھی مبارک ہو ہر روز لوگ پوچھتے تھے خانم صاحبہ کو ماشاءاللہ حمل ہے کہنے لگے حمل تو نہیں آپ کی والدہ کا مقبرہ ہے بس اتنا بندے کو نہ تنگ کیجئے جو پیٹ بھی لپیٹ میں آجائے حاصل کلام یہ ہے کہ اصرار ہر شے میں نہ چاہیئے (صـ۱۸۰ و صـ۱۸۱)

۳۔ اشخاص و افراد پر تبصرہ

جن لوگوں کو واجد علی شاہ نے دیکھا پرکھا اور برتا تھا ان پر نہایت دل چسپ تبصرے بھی انہوں نے کئے ہیں:۔

ہلال

شہ کشور ہند سلطان عالم

سلیمان اختر نگر جان عالم

یہ شخص تادم زندگی راقم کی ملازموں میں رہا فقیر کے عہد شاہی میں چھاپہ خانہ سے متعلق رہا جب فقیر انتزاع سلطنت کے بعد وارد کلکتہ ہوا باغوائی مغویاں کوتہ اندیش دو برس دو مہینے تک قلعہ ولیم فورڈ کلکتہ میں محبوس رہا بعد رہائی یہ شخص تا انتقال میرا ملازم رہا۔ (صـ۲۳۳، صـ۲۳۴)

تدبیر الدولہ منشی مظفر علیخاں بہادر جنگ اسیر کا کردار

واجد علی شاہ نے اسیر کا جو سراپا کھینچا ہے، وہ عبرت انگیز بھی ہے اور سبق آموز بھی اور ایک بالکل نئی چیز، یہ واقعہ ابتک کسی تذکرہ میں نہیں گذرا، اس اعتبار سے واجد علی شاہ کے یہ الفاظ بڑی اہمیت رکھتے ہیں:۔

یہ شخص دس پندرہ برس کے سن میں راقم کا ہم پیالہ اور ہم نوالہ رہا اور صحبت مشاعرہ کوئی ایسی نہ ہوتی تھی جس میں اسکی اور میری ہمراہی نہ ہو بلکہ یہ خطاب فیقر ہی کا عنایت کیا ہوا ہے۔ دم محبت کا بھرتا تھا اور خود کو عاشقوں میں گنتا تھا باعن جدّ اس کے نمک خوار میرے باپ دادا کے رہے میرے عہد ولیعہدی میں عاشق اور میرے زمان سلطنت میں مصاحب اور داروغہ کل زندان خانۂ سرکار اودھ کا اور خلاصہ نویس تمام چہریات سلطانی کا رہا اور یہاں تک میرے مزاج میں دخیل تھا کہ شبانہ روز حاضر خدمت رہتا تھا۔ ۶۵ برس کے سن میں عقد کیا زوجہ سے نہایت مانوس رہا کرتا تھا جب اوضاع فلکی متبدل ہوئے یعنی امر انتزاع سلطنت اودھ واقع ہوا میں مایوس جانب کلکتہ چلا یہ از بسکہ زوجہ کا مبتلا بہت تھا حق نمک مالک یک قلم فراموش کر کے گھر میں جا چھپا میں کلکتہ میں داخل ہوا بیس برس سے مجھ سے اس سے فراق ہے طرفہ یہ ہے کہ اب والی رام پور کو اپنا پادشاہ بنا کر سید بنی فاطمہ کہہ کر ان کا نمک کھاتا ہے فاعتبروا یا اولی الابصار یہ مطلع اس شخص نمک فراموش کا ہے۔

غزل

دل گنہ کرنے میں خیرہ ہو گیا
جو صغیرہ تھا کبیرہ ہو گیا
کھا گیا بے فائدہ مجھ کو فلک
اونٹ کے منھ کا میں زیرہ ہو گیا (صفحہ ۲۳۶ تا ۲۳۸)

کتنا درد ہے ان الفاظ میں!

فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برق

استاد مرحوم راقم ابن مرزا کاظم علی صلح جنھوں نے تا دم مرگ گھر سے قدم باہر نہیں نکالا بخشی مذکور میرے والد کے عہد سلطنت میں تمام فوج کے

بخشی رہے اور میرے عہد میں استاد عاشق رہے اور بعد انتزاع سلطنت ہمراہ آئے اور زندان قلعہ ولیم فورڈ کلکتہ میں بھی میرے ساتھ قید ہوئے اور اسی زنداں میں جان بحق ہوئے اور وقت دم واپسیں یہ بیت اور یہ مطلع پڑھ کر روانہ فردوس ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون

مطلع

برق جو منہ سے کہا تھا وہی کر کے اُٹھے
جان دی آپ کے دروازہ پہ مر کے اٹھے

بیت

سانس لینے میں ہر اک جا سے مسک جاتا ہے تن
برق بدلو جامۂ ہستی پرانا ہو گیا۔ (صفحہ ۲۳۸، ۲۳۹)

اس کے مقابلے میں برق کا کردار کتنا روشن، کتنا تابناک، اور کتنا سبق آموز ہے!

مقبول الدولہ مرزا محمد مہدی قبول

ہم مشورۂ راقم اٹھارہ انیس برس کا میرا سن تھا جو میرا ان کا ساتھ ہوا میرے ملازم رہے میرے والد کے بھی ملازم تھے میرے عہد میں خدمت چوکی پلنگ خاص و مصاحبت اور چھاپہ خانہ اور کتب خانہ اور کرنیل راٹن کا توپ خانہ یہ سب ان کے پائے نام رہا اور بعد انتزاع سلطنت اودھ جب راقم قلعۂ ولیم فورڈ کلکتہ میں مقید تھا یہ حاضر کلکتہ ہوئے اور جب راقم نے رہائی پائی یہ میرے پاس موجود تھے حسرت زیارات عتبات عالیات میں انتقال کیا یہ مطلع ان کا ہے:۔

مطلع

چھلّے کو تری آگ سے جدا نہیں سکتا
اے گلبدن اس واسطے گل کھا نہیں سکتا

(صـ ۲۳۹، صـ ۲۴۰)

خود اپنا تذکرہ

اس کتاب میں واجد علی شاہ نے اپنا تذکرہ بھی کیا ہے ایک حصہ ملاحظہ ہو:-

یہ فقیر حقیر راقم و مصنّف و مؤلف سراپا تقصیر پندرہ برس کے سن میں والد جنت مکان نے ولی عہد اور وزیر کیا۔ بیس برس کے سن میں بلا صدور ظلم و ناانصافی و بے آزار رعیت بے سبب تخت سے محروم کیا گیا بیس برس سے کلکتہ محلہ موچی کھولا ملقب بہ مٹیا برج میں قیام ہے۔ پچاس برس کا سن ہوا چھبیس مہینے قلعہ ولیم فورٹ کلکتہ میں ناحق قید رہا ساٹھ سے اوپر ماشاءاللہ چشم بد دور اولاد ذکور و اناث ہیں ۱۲۸۱ھ سے باعانت گورنمنٹ بیس ہزار روپوں میں دو دختروں کا عقد کر دیا۔ سنا جاتا ہے کہ اسی حساب سے بارہ دختریں سن آئندہ میں باعانت گورنمنٹ متعہد ہوں گی پچاس برس کے سن میں اتنی جلدیں کتابوں کی تصنیف کیں۔

۱- اختر ملک
۲- افسانہ عشق
۳- ارشاد خاقانی
۴- ایمان
۵- بحر الہدایت
۶- بحر الفت
۷- بحر مختلف
۸- کتاب یمنی
۹- تاریخ مذہب
۱۰- تاریخ ممتاز
۱۱- تاریخ خلوص
۱۲- تاریخ فراق

۱۳ ۔ تاریخ مشغلہ

۱۴ ۔ تاریخ غزالہ

۱۵ ۔ تاریخ نور

۱۶ ۔ تاریخ جمشیدی

۱۷ ۔ تاریخ دہر

۱۸ ۔ تجلّی عشق

۱۹ ۔ جوہر عروض

۲۰ ۔ حزن اختری

۲۱ ۔ دریائے تعشق

۲۲ ۔ دستور واجدیہ

۲۳ ۔ دفتر ہمایوں

۲۴ ۔ دیوان مبارک

۲۵ ۔ دفتر پریشاں

۲۶ ۔ دلہن

۲۷ ۔ سخن اشرف

۲۸ ۔ شاہدِ عیش

۲۹ ۔ صحیفۂ سلطانی

۳۰ ۔ صورت المبارک

۳۱ ۔ عشق نامہ

۳۲ ۔ قمر مضمون

۳۳ ۔ کلیات اختری

۳۴ - کلیات سوم

۳۵ - گلدستۂ عاشقان

۳۶ - مسودات حرثیہ

۳۷ - ماہی نامہ

۳۸ - مرقع فرح

۳۹ - مباحثہ بین النفس والعقل

۴۰ - ناجو

۴۱ - نظم امور

۴۲ - نصائح اختری

۴۳ - ہیبت حیدری

۴۴ - لغت ہفت زبان کہ وہ ابھی ناتمام ہے۔

۴۵ - پانچ چار کتابیں مراثی اور مصائب منظوم شہدائے کربلا ہیں کہ ان مرثیوں کا حساب نہیں کیا۔

۴۶ - مجموعہ داجلہ یہ سب فقیر کے کتب خانے میں موجود ہیں اور جو تنزل سلطنت اور غارت بد معاشوں میں تاراج ہوئیں وہ خارج از حساب ہیں۔

لراقمہ

ایک حسرت طور پر بھی بہر موسےؑ رہ گئی
ایسا کچھ دیکھا کہ آنکھوں کو تمنا رہ گئی   صفحہ ۲۴۰، صفحہ ۲۴۱

۵ - خاندان اہل و عیال کا ذکر

واجد علی شاہ نے اس کتاب میں اپنی بیویوں اور اولاد کا ذکر بھی کیا ہے۔

خاکسار ان کا جنہیں شعر و شاعری سے مس تھا، کچھ حصہ نمونتہً ملاحظہ ہو:-

صدر محل صدر

جو شمول محلات ہمراہ راقم ہیں بمشورۂ گلشن الدولہ مرزا علی بہار

بڑھے رتبہ شہ واجد علی کا

بجے ڈنکا شہ واجد علی کا (ص ۲۴۳)

ملکہ مخدرۂ عظمیٰ عالم آرا بیگم عالم منکوحہ کلاں (والدہ ولیعہد مرحوم)

محو نظارۂ نگار ہوا

تیر مژگاں جگر کے پار ہوا

فارسی

اے یار حریم تو نزدیک و دور را

خلعت تو شامل است شکور و غفور را (ص ۲۴۴)

ولی عہد مرحوم کی یاد

کوکب ولی عہد جنت نشین فرزند راقم منکوحۂ مرقومہ بالا کے بطن سے جو سن بارہ سو اکانویں میں فوت ہو کر سبطین آباد امام باڑہ تعمیر کردہ راقم میں دفن ہوا۔

بے مثل و بے مانند و یکتا اسے خدا پایا؟

کیے طے شش جہت لیکن نہ ایسا دوسرا پایا

(ص ۲۴۴، ص ۲۴۵)

ماہتاب الدولہ درخشاں

تیس برس سے تا ایندم میرا ملازم ہے۔

مطلع

اہل حیرت سے نہ بزم عیش خالی ہو سکے

صید کیوں کر طائر تصویر قالی ہو سکے

تعیش الدولہ عیش

سات شخص ایک مرتبہ میرے شاگرد ہوئے ساتوں کا سبع سیارہ لقب ہوا۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ استعداد بہت اچھا عروض لاجواب میرا ملازم بھی ہے۔

مطلع

پہلے صفتِ پاک ہیں کھول اپنے دہن کو
کر صاحبِ نشیں سے طلب تاجِ سخن کو (صہ ۲۴۶)

شاد داخل سبع سیارہ

بہار باغِ جنت ہو نہ کیوں کر پاؤں کے نیچے
کہ رہتی ہے زمینِ کوئے دلبر پاؤں کے نیچے (صہ ۲۴۶، صہ ۲۴۷)

لطیفہ

دو فاضلوں کا مزاج

ایک فاضل کا نام ملّا باقر تھا اور دوسرے کا ملّا طاہر دونوں راہ میں ملے طاہر نے کہا سلام علیکم باقر بقر سے مشتق ہے ملّا باقر نے جواب سلام دے کر کہا فی الواقع وہی بقر کہ فضلہ جس کا طاہر ہے وہ اپنی راہ پر چلے گئے وہ اپنی راہ پر۔ (صہ ۲۶۷، صہ ۲۶۸)

واجد علی شاہ کے مشاغل

"جاننا چاہیئے کہ زیر تعلیم راقم تا تحریر ہذا تینتالیس اسم ہیں اور سب جلسے ملا کر دو سو سولہ اسم گانے ناچنے والے اللھم زد ماشاء اللہ چشم بد دور تا ختیر کتاب ہذا راقم کے پاس ہر وقت وہر ساعت وہر لمحہ موجود ہیں مگر ملاقات اور صحبت اور حکایات ہر روز انھی سے ہوتی ہے جو تینتالیس اسم زیر تعلیم حقیر ہیں۔

جملہ آٹھ ہزار پانچسو اٹھانوے روپیہ مشاہرہ ہوئے پندرہ کلاونت مغنی ایک

گھمی والا اور دو پکھاوجی تیئس طبلہ نواز چھیالیس سارنگی نواز بائیس منجیرہ نواز ایک نے نواز
چھ رقاص ایک شعبدہ باز دو ڈھولک نواز ایک سرنگھار نواز اور انیس نفر نقار خانے میں اور
پچھ محفل ملازم ہیں جن کی ماہوار تنخواہ دار تین ہزار دو سو اکسٹھ روپیہ ماہانہ کی اور رقم کو سرکار میں
جوڈومنیاں عورتیں ہیں ان کو سرور محفل اور جوان کے مرد ہیں ان کو بہار محفل کہتے ہیں -
(ص ۲۳۲، ص ۲۳۳) -

(۶) القاب و خطابات

واجد علی شاہ نے جو القاب و خطابات عطا کئے تھے کہیں کہیں سے انکا ذکر بھی غیر مناسب نہ ہوگا:-

خطابات صاحبان عالم پسند جو لفظ دولائی سے ممتاز ہیں

۱ - وزیر السلطان محمد امیر علی خان بہادر کا روزارت ان کے تعلق ہے

۲ - برادر السلطان منتظم السلطنت ذوالفقار الدولہ شمشیر الملک سید سجاد علیخان بہادر تیغ جنگ تقاریب مکتب نشینی شاہزادگان اس کے تعلق ہے -

۳ - ارسطو خصلت افلاطون طبینت سردار الحکما طبیب الدولہ حکیم سید آقا علیخان بہادر محکم جنگ یہ حکیم حاذق ہیں اور شفاخانہ سرکاری اور افسری کل اطباء ملازمین -

۴ - مونس الدولہ رفیق الملک سید علی حسین خان بہادر رفع جنگ تعمیر و ترمیم کل عمارت شاہی اور جمیع فرقاشات سلطان اور کل تقریبات سالانہ اور پوشاک بیگمات اور امام باڑہ سبطین آباد مبارک اور کوٹھیات شل سلطان مبارک وغیرہ اور باغات شاہی اور خبر گیری ابونات از داج شاہی اور خاکروب متعلق ہیں -

۵ - ریحان الدولہ سید شجاع حسین خان بہادر کوٹھیات سرگانہ کوٹھی تفریح بخش عالی وغیرہ اور رسالہ بادی گارڈ اور ماہی پرداز اور سقہ متعلق ہیں -

۶ - منشی السلطان رمضان علیخان بہادر افسر اہل قلم اور کچہری بیت الاجراء سلطانی اور دانہ خوری جانوران اور رسالہ خسروے اور کوٹھی تہنیت منزل ہمایوں متعلق ہے -

۷ - منصوم الدولہ مختار الملک منشی محمد حسین خان بہادر جلادت جنگ مختار عام شاہی ہیں اور کوتوالی شاہی اور داروغگی کوٹھیات شہنشاہ منزل مبارک اور اسد منزل سعد اور زر میوہ خوری لانا اور چائے خانہ متعلق ہے۔

۸ - بخشی الملک امانت الدولہ سید عبد العلی خاں بہادر کچہری بخشگیری اور تقسیم تنخواہ کل تنخواہ داران متعلق ہیں۔

۹ - رفیق دیرینہ الملک الدولہ کاظم علی خاں بہادر افسری کل پیادگان اور حراست کل ڈھیوڑیات ازواج شاہی اور چادر خانہ متعلق ہے۔

۱۰ - خلاصۃ الدولہ منشی علی نقی خان بہادر لفافہ ملاحظہ کرانا اور مہر خاص ثبت کرنا اور زر میوہ خوری لانا اور داروغگی ارباب نشاط اور دفتر متعلق ہے۔

۱۱ - جلیس الدولہ مصاحب الملک سید علی خان شیرازی لطافت رقم بہادر مصاحب خاص حضرت سلطان عالم خلد اللہ ملکہ پوشاک خانہ شاہی اور کوٹھی سید سلطانی اور رسالہ بادشاہی متعلق ہے۔

۱۲ - رفعت الدولہ رفیع الملک کاتب الملوک سید محمد شفیع الرضوی دفتر معتمد اثر شاہی متعلق ہے۔ کاغذات اصلی دستخطی خاص اس دفتر میں داخل ہوتے ہیں اور خدمت تحریر پرچہ و پیام اور شقہ جات بھی سپرد ہے۔

۱۳ - سفیر الدولہ مولوی دین محمد خان بہادر دفتر انگریزی متعلق ہے۔

۱۴ - ضرغام الدولہ مہدی حسن خان بہادر

۱۵ - ترصیع الدولہ زمرد رقم محمد امیر خاں بہادر ابن علی رضا جواہر رقم خاں بہادر

۱۶ - رئیس الدولہ علی حسن بہادر مطبع سلطانی اور کچہری دساعت اور افسری خوشنویسان متعلق ہے۔

۱۷ - زین المدققین ہاتف الدولہ عابد حسین خان بہادر کوکب الملک انجم جنگ یہ

منجم ہیں۔

۱۸۔ ماہتاب الدولہ کوکب الملک سید علی جان خان بہادر درخشان ستارہ جنگ۔

۱۹۔ تعیش الدولہ بہادر

۲۰۔ گلشن الدولہ مرزا علی خان بہادر یہ شاعر ہیں۔ ان لوگوں کے ذمہ خدمت سرکاری بھی تفویض ہے اور مصاحب بھی ہیں۔

۲۱۔ مہتمم الدولہ مدار الملک محمد جعفر علی خان بہادر اہتمام جنگ۔

۲۲۔ انیس الدولہ مونس الملک خانہ زاد خان بہادر دلاور جنگ مصاحب خاص حضرت سلطان عالم۔

۲۳۔ مصاحب الدولہ بہادر ہم نشیں الدولہ محمد عابد خان بہادر ان کے سپرد کوئی خدمت نہیں مگر مصاحب ہیں۔

۲۴۔ تخلص الدولہ سرفراز حسین خان بہادر کچہری اخبار مع ہرکارگان متعلق ہے۔

۲۵۔ مرحمت الدولہ کلب حسین بہادر کوٹھی قیصر البیضا اور فلک باغ اور رسالۂ ہندوستانی متعلق ہے۔

۲۶۔ تصدیق الدولہ تصدق حسین خان بہادر داروغگی کوٹھی شمس منزل معلی متعلق ہے

۲۷۔ فلک الدولہ محمد بہادر علی خان بہادر حاضری داروغگی پرچہ پیام اور چوبدار اور چپراسی کل کار دیوان خانہ متعلق ہے۔

۲۸۔ خازن الدولہ بہادر تحویل جیب خاص شاہی اور خزانہ شاہی متعلق ہے۔

۲۹۔ الطاف الدولہ حیدر علی خان بہادر داروغگی کوٹھی گوشہ سلطانے متعلق ہے۔

۳۰۔ منظور الدولہ نواب ناظر علی خان بہادر بگھی خانہ شاہی اور کوٹھی حشمت منزل متعلق ہے اور ان کے خدمت سرکاری سپرد ہے اور منتفع المعہ صاحب بھی ہیں

۳۱۔ لائق الدولہ محمد جان عالم خان بہادر یہ شاعر ہیں۔

۳۲- شرافت الدولہ اشرف الدین احمد خان بہادر

۳۳- تفضیل الدولہ افضل الدین احمد خان بہادر

۳۴- حمید الدولہ سید حامد علی خان بہادر

۳۵- حامد الدولہ سید محمود علی خان بہادر

۳۶- مالک الدولہ جعفر حسین خان بہادر

۳۷- شرف الدولہ سید محمد شریف علی خاں بہادر

۳۸- ندرت الدولہ بہادر

۳۹ اخلاص الدولہ احمد علی خان بہادر

۴۰- عزت الدولہ محتشم الملک روشن علی خان بہادر معتبر جنگ۔

۴۱- خالص الدولہ نادر علی خان بہادر

۴۲- لطیف الدولہ بہادر عطاء الدولہ بہادر داعی الدولہ بہادر ان لوگوں کے متعلق کوئی خدمت نہیں اور متوقع المصاحبت ہیں۔ (ص۳۳۹ تا ص۳۴۴)

(۷) جانوروں کے خطابات

واجد علی شاہ نے جو پرندے اور جانور پالے تھے، انھیں بھی دلچسپ خطابات سے نوازا تھا۔ صرف بلبل کو جو خطابات دئے ہیں تینتالیس سے زیادہ ہیں۔ انہی سے دوسروں کا اندازہ کر لیجئے۔

۱- زیورِ گُل

۲- آشنائے چمن

۳- عاشقِ گُل

۴ گلابی رنگ

۵ شب گو

۶ ۔ شب نوا
۷ ۔ شب بیدار
۸ شب دوست
۹ ۔ خوش گو
۱۰ ۔ شب صدا
۱۱ ۔ خوش صدا
۱۲ ۔ خوش نوا
۱۳ ۔ شب صوت
۱۴ ۔ زاہد نما
۱۵ ۔ پارسا
۱۶ ۔ تسبیح گو
۱۷ ۔ شب گلو
۱۸ ۔ شب آواز
۱۹ ۔ لیل بیدار
۲۰ ۔ شاہد چمن
۲۱ ۔ آرام دل
۲۲ پرصد
۲۳ ۔ راحت دل
۲۴ ۔ درد جگر
۲۵ ۔ راحت گوش
۲۶ ۔ خوش داستان

۲۷ - بیخواب

۲۸ - صدائے ملک

۲۹ - چرخ آشیاں

۳۰ - شب زندہ دار

۳۱ - مخزن الاصوات

۳۲ - فلک آشیان

۳۳ - لیل گو

۳۴ - ضوفشان

۳۵ - ساطع

۳۶ - سرُدار

۳۷ - سوزِ جگر

۳۸ - جواہر سیماب

۳۹ - حیفہ آدم

۴۰ - خانم آرام

۴۱ - قلب خوش (صہ ۳۴۵)

(۸)

محلاّت و کوٹھیات کے خطابات

دیگر خطابات کے بعد ترتیب کتاب راقم نے دیئے ہیں

متعلق کوٹھی جواہر منزل خاص کوٹھی

برآمدہ شمالی :- برآمد جنوبی - برآمدہ مغربی - برآمدہ شرقی راست منزل -

چیپ منزل مشرق منزل مغرب منزل۔ رقص منزل۔ روح افزا خطاب سقف کوٹھی چشمہ حیوان واقع۔ کمرہ رقص منزل (ص ۳۶۳)

متعلقہ محلسرائے نواب یادگار محل صاحبہ

خورد منزل بیت الحزن چشمہ مشترک

اطلاع کوٹھی سلطان خانہ مبارک

بادشاہ منزل بالا منزل۔ جہاں نما سڑک سطح

مرصع منزل

چشمہ مرصع مرصع باغ پسند باغ باغ گرد بنگلہ فرحت منزل

خطاب بنگلہ نصرت منزل

مرغزار سلطان رمنہ مرصع منزل موج نام چبوترہ کہ زیر شجرہ بادام است رمنہ راحت افزا در عدالت منزل است چشمہ دشت (ص ۳۶۴)

(۹)

قانون اختری

حفظ عصمت مرد و زن اور ہدایت بیگمات کیواسطے مشتمل اوپر آٹھ دفعہ کے

دفعہ پہلی

کسی غیر مرد نامحرم کے موہنہ پر نظریں نہ چھوئیں خواہ پیش مالک خواہ پیٹھ پیچھے

دفعہ دوسری

غیر مرد نامحرم سے بات کرتے وقت اپنی نظریں نیچی رکھیں خواہ مالک کے آگے خواہ غیبت میں۔

دفعہ تیسری

جو شخص مالک کے روبرو بیٹھتا ہو کسی ضرورت کے وقت اگر ان کے سامنے بھی بیٹھ جائے

مضائقہ نہیں سوائے دیسے شخص لائق کے اور کسی نامحرم مرد کو قریب بٹھانے کی اجازت نہیں۔

دفعہ چوتھی

کسی غیر نامحرم مرد کو گلوری پان کی دینے کی اجازت نہیں۔

دفعہ پانچویں

کسی نامحرم غیر مرد کو حقہ پلوانے کی اجازت نہیں۔

دفعہ چھٹی

کسی غیر مرد نامحرم کا نام نہ لو خواہ پیش مالک خواہ پس مالک بلکہ اس فرقے کے نام سے اسے پکارو یعنی کوئی آدمی ہے یا کوئی کبوتر باز یا جانور باز یا داروغہ یا باغبان یا مکان دار یا ماہی پرور وغیرہ یہ نہ کہو کہ نام تو نواب علی ہے پیار سے کہو نبو یا فلاں یا بیگ یا خان ایدھر آؤ یا میر صاحب یا مرزا صاحب یا شخصیات۔

دفعہ ساتویں

کسی نامحرم غیر مرد کے دست بدست کوئی چیز نہ لو بلکہ لانے والا زمین یا اس جگہ پر با آرام و حفاظت دہر دے بعد اس کے اپنے ہاتھ سے اٹھا کر لینے والے اپنے مصرف میں لائیں۔

دفعہ آٹھویں

غیر مرد نامحرم جو رومال سے فرش کو صاف کریں تو نامحرم عورتیں ان کو صفائی کی جگہ دے دیا کریں ایسا نہ ہو کہ کسی کا ہاتھ ان کے اجسام سے صفائی کے وقت مس ہو تو باعث خوشی مالک اور غضب خدا ہو، چاہیئے کہ ان آٹھوں ہدایات کو ہمہ وقت مد نظر رکھیں تا خاوند اور خداوند دونوں خوشنود ہوں اور دنیا کا کار بھی بند نہ رہے۔ اگر تم کو پردے میں بٹھا دیا جائے تو کسی قدر تمہارے خاوند کو البتہ بے چینی ہوگی اور عجب نہیں کہ اس بے چینی کی جہت سے تم لوگ اپنے خاوند کے ملاقات سے معذور ہو جاؤ۔ اگر اس ہدایت پر چلوگی، اپنے خاوند کے پہلو میں رہوگی بلکہ ہمہ وقت دل میں گھر ہوگا۔ خدا تم عورتوں کا ہادی ہے بس۔

(صہ ۳۶۵ ، صہ ۳۶۶)

(۱۰) احکامات واسطے بیگمات سلطان خانہ مبارک اور جواہر منزل اور خاص منزل شامل ہیں دفعہ پر۔

دفعہ پہلی

ہمیشہ اپنے کو خوشبو رکھیں۔

دفعہ دوسری

دھویا ہوا اور اجلا کپڑا جو کچھ سرکار سے ملتا ہے یا اپنی لیاقت کے موافق جیسا بنایا ہو پہنا کریں، زنہار زنہار میلی اور دھبے دار اور پھٹی پوشاک خواہ پائجامہ خواہ دوپٹہ خواہ چھوٹے کپڑے نہ پہنا کریں ورنہ جن کے سپرد ہیں اور جو ان کے اہتمام والے ہیں ان سے مواخذہ ہوگا اور وہی داروغہ لوگ اس کے جواب دہ ہونگے۔

دفعہ تیسری

پوشاک میں اور ہاتھوں میں اور منہ میں ہرگز ہرگز کسی طرح کی بدبو نہ آنے پائے۔

دفعہ چوتھی

پاؤں اور تلوے ہمیشہ آئینے کی طرح صاف اور چمکتے رہیں اور کسی طرح کا میل اور آخور نہ ہوا کرے۔

دفعہ پانچویں

بالوں میں خوشبو روغن اور آنکھوں میں کاجل یا سرمہ ہاتھوں میں مہدی پہنچوں تک ہمیشہ رہا کرے۔

دفعہ چھٹی

جو کنواریاں ہیں وہ بغیر حکم از خود مسّی نہ ملیں اور جو مل چکی ہیں ان کا مضائقہ نہیں۔

دفعہ ساتویں

کوئی بلاق چھیدنے کا قصد نہ کرے ممانعت قطعی ہے۔

دفعہ آٹھویں

کوئی تمباکو اور حقہ پینے کا قصد نہ کرے ممانعت دائمی ہے۔

دفعہ نویں

کوئی پیروں پر انگلیوں کے یا پاؤں کے ناخنوں پر یا ہتھیلی یا تلوؤں میں کسی طرح مہندی کا نقش و نگار جسے فندق کہتے ہیں نہ بنائے ممانعت قطعی ہے۔

دفعہ دسویں

بلانے کے وقت حتی الوسع جلد حاضر ہوا کریں۔

دفعہ گیارہ

بے باک و بے حجاب حاضر ہوا کریں۔

دفعہ بارہ

مزاج پرسی میں ایک جواب دس کو اور سو کو اور ایک کو کافی ہے البتہ جو لجد جواب دینے کے نئی آئے گی۔ اور مزاج کا حال پوچھے گے اسے دوسرا جواب دیا جائے گا۔

دفعہ تیرہ

میں تمہاری آمد و رفت کے ملاحظہ کو فقط جواہر منزل اور خاص منزل میں آکر بیٹھا کرتا ہوں اور اب تم صاحبوں نے یہ رویہ اور شیوہ اختیار کیا ہے کہ اکثر میرے سامنے کا چلنا پھرنا بچا جاتی ہو بلکہ اکثر بنظر ضرورت کوئی ضرورت کو جاتا بھی ہے تو وہاں سے پھر پلٹ کر میری دہشت سے اپنے مکان پر نہیں آتا ہے بلکہ واللہ اعلم اور کدھر چلا جاتا ہے جیسا کہ ایک دن نواب صبیحہ بیگم صاحبہ اور نواب اللہ جلائی بیگم صاحبہ میرے سامنے سے مزاج پوچھ کر بیت الخلا گئیں شاید ایک بجا ہو دن کا پھر میں چراغ جلے تک راہ دیکھا کیا

اور وہ اپنے مکان پر پلٹ کر نہ آئیں اور مجھے برا معلوم ہو اپس سبھوں کو لازم ہے کہ اپنی آمد و رفت ضروری سی ہے ہماری آنکھوں کو محروم نہ رکھا کریں کہ ہم کو موجب خوشنودی ہے نہ باعث ناراضی البتہ دوسرے کے مکان میں رہ جانے کی ممانعت ہے سیدھے جاؤ اپنے گھر کو پلٹ کر آؤ۔

دفعہ چودہ

جب خلوت میں ہمارے پاس آؤ چپ نہ بیٹھو کسی نہ کسی طرح کی باتیں ضرور ہم سے کئے جاؤ ورنہ باعث ہمارے نہایت ناراضی کا ہوگا اور ہر وقت اپنے دل پر جبر نہ کرو دل چاہے بیٹھو دل چاہے لیٹو۔

دفعہ پندرہ

خاصہ پکانے کے وقت کا غل ہمارے دماغ کو اس مرتبہ بے چین کرتا ہے۔

(ص ۳۶۹ تا ص ۳۷۲)

بڑی مشکل سے یہ کتاب (بنی) مجھے دستیاب ہو سکی۔ اب یہ چیزیں کہاں ملتی ہیں لیکن جو نسخہ ہاتھ لگا وہ نامکمل تھا۔ پھر بھی اس سے کام کی سب چیزیں میں نے اخذ کر لیں۔

باب ۲

واجد علی شاہ کی بزمِ سخن!

واجد علی شاہ خود بھی بہت بڑے اور بہت اچھے شاعر تھے اور انہوں نے اپنے دربار میں چھانٹ چھانٹ کر ایسے نغز گو اور غزل سرا جمع کئے تھے جو اپنی مثال آپ تھے جن کا رنگ سخن اپنے اندر انفرادیت کی خاص شان رکھتا تھا، جن کی شاعرانہ سیرت اور کردار میں بھی ایک خاص رنگ جھلکتا تھا۔

عہدِ واجد علی شاہ کے اساتذہ سخن اور ماہرینِ فن کا ذکر نسبتاً تفصیل سے کسی دوسرے باب میں ملاحظہ کریںگے جس دربار میں اسیرؔ و امیرؔ جیسے یگانۂ فن موجود ہوں، جس عہد میں آتشؔ اور ناسخؔ کا ڈنکا بج رہا ہو، جس دور میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ جیسے یکتائے روزگار موجود ہوں، جس زمانہ میں نواب مرزا شوقؔ کی بےمثل مثنویاں الفاظ کا پیکر پہن رہی ہوں، اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس عہد کا سرسری جائزہ لینے پر مورّخ مجبور ہے۔

لیکن اس باب میں ہم زیادہ واجد علی شاہ کی بزمِ سخن کے ان غزل سراؤں کا ذکر کریںگے جو ذاتی طور پر واجد علی شاہ سے اپنے غیر معمولی ربط و تعلق کی بنا پر والہانہ وابستگی رکھتے تھے۔ یہ لوگ جس طرح واجد علی شاہ کے عروج اور فروغ کے زمانہ میں فدوی خاص اور جاں نثار باختصاص بنے ہوئے تھے اسی طرح اس وقت بھی اپنے آقا کے وفادار رہے، جب اودھ کی سلطنت چھینی جا چکی تھی، قیصر باغ فلک شکوہ محلّات ویران ہو چکے تھے اور واجد علی شاہ "نظر بند" اور "پابند" کر کے کلکتہ کے ایک مضافاتی علاقہ "مٹیا برج" میں بھیج دئے گئے تھے اور ادبار و فلاکت کے عالم میں زندگی کے دن گذار رہے تھے۔

نواب حیدر علی خان نظم طباطبائی، واجد علی شاہ کے معتمد اور مخصوصین میں تھے۔
علوم عقلی و نقلی کے ماہر، منطق و فلسفہ کے امام و دریائے فصاحت و بلاغت کے شناور فن عروض و قوافی کے استاد، سخن ور، سخن داں، نغز گو۔ غزل سرا، شاعر، انشاپرداز، غرض غیر معمولی خصوصیات کے حامل، یہ شہزادوں کے اتالیق تھے۔ جب تک واجد علی شاہ زندہ رہے، مٹیابرج میں حق نمک ادا کرتے رہے، انکی وفات کے بعد اپنے وطن لکھنؤ میں واپس آ گئے۔ لیکن اب لیس پردیس بن چکا تھا جی نہ لگا۔ دکن کے شہریار نے قدر افزائی کی، وہاں چلے گئے اور پھر ساری زندگی وہیں گزار دی۔ تاریخ کا یہ بھی کتنا عبرتناک باب ہے، ایک زمانہ تھا کہ دربار دہلی کے فن کار اور ہنرور حالات سے مجبور ہو کر لکھنؤ کا رخ کرتے تھے اور ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے یا اب لکھنؤ کے باکمال، آشفتہ حال بن کر دکن کا رخ کر رہے تھے۔ اور وہاں سر آنکھوں پر بٹھائے جا رہے تھے۔ طباطبائی عمر بھی بڑی طویل لے کر آئے تھے۔ انہوں نے عہد واجد علی شاہ کی رعنائیاں دیکھیں۔ فرنگی دور کی ہلاکتیں اور بربادیاں دیکھیں۔ پھر دربار دکن کی قدر دانیاں اور حوصلہ افزائیاں دیکھیں اور آخر ایک روز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں۔

یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

طباطبائی نے حیدر آباد کے دوران قیام میں عہد واجد علی شاہ پر کئی تحریریں لکھیں متعدد مضامین سپرد قلم کئے۔ اپنی دیکھی ہوئی اور برتی ہوئی شخصیتوں کا تذکرہ کیا۔ جو نظارے خود کر چکے تھے انہیں اس طرح بیان کیا کہ دوسرے بھی یہ محسوس کرنے لگے۔ گویا وہ طباطبائی کی زبان سے کوئی داستان نہیں سن رہے ہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے واقعات و حالات کا نظارہ کر رہے ہیں۔ طباطبائی نے مٹیابرج کے واجد علی کے شاہی شعرا کا تذکرہ بھی اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں لکھا ہے۔ ذیل میں جن کا شعرا کا ذکر کیا جاتا ہے وہ اسی سے لیا ہے۔

فتح الدولہ برق

اہل علم کے خاندان میں سے تھے ناسخ کے شاگرد بادشاہ کے استاد تھے مقبول و مشہور شعران کے خداداد ہیں۔

کیا شوخیاں ہیں ابلق لیل و نہار کی
جمتی نہیں ہے ران کسی شہسوار کی

اذاں دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

خاص رنگ ان کا جوٹ ہے اور شعر میں نئے طرز کی بندشیں کونسا یہ ناسخ والوں کا ایک ممتاز طریقہ ہے۔ برق کہتے ہیں اور یہی ایک شعر ان کا کچھ ٹوٹا پھوٹا مجھے یاد آگیا ہے۔

اس طرح گردوں نے مجھ کو ٹپکا خاک پر
تن سے اونچا ہو کے سایہ شامیانہ ہو گیا

ان کے استاد بھائی خواجہ وزیر بھی اسی منزل کے راہرو ہیں اور ان سے کچھ آگے بڑھ گئے ہیں۔ برق نے یہ بات دکھائی کہ میرا سایہ اونچا ہو کر شامیانہ بن گیا اس میں جنازہ کی ایک جھلک نظر آگئی۔ وزیر کہتے ہیں دریا سمٹ کر آنسو بن گیا ہے

تو نہا کر جو پھرا۔ غم سے سمٹ کر دریا
آگیا دیدۂ گرداب میں آنسو ہو کر

برق نے مرتے وقت بادشاہ کے پاس یہ شعر لکھ کر بھیجا ہے

برق جو منہ سے کہا تھا وہی کر کے اُٹھے
جان دی آپ کے دروازہ پہ مر کے اُٹھے

حالت اختصار نے اس شعر میں ذرا تعقید پیدا کر دی ہے یعنی جو منہ سے کہا تھا برق وہی کر کے اٹھے۔ دیوان ان کا چھپ گیا ہے۔

مہتاب الدولہ درخشاں

حضرت واجد علی شاہ طاب ثراہ کے منتخب کئے ہوئے شاعروں میں تھے۔ تدبیرالدولہ منشی منظفر علی اسیر سے انہوں نے فن شعر کو حاصل کیا تھا۔ ان کی سخن سنجی و خوش گوئی پر استاد کو بھی ناز تھا۔ یہی سبب ہوا کہ جب فتح الدولہ برقؔ نے اپنے ایک خوش فکر شاگرد مرزا محمد رضا طور کو دربار شاہی میں پیش کیا تو منشی صاحب نے مہتاب الدولہ درخشاں کو پیش کر دیا۔ مہتاب الدولہ خود بیان کرتے تھے کہ میری اور آفتاب الدولہ قلق کی نذر ساتھ ہی ہوئی اور ہم دونوں کو خطاب بھی ساتھ ہی ملے۔ الحاق اودھ کے بعد قلق اور اسیر لکھنؤ میں رہ گئے۔ طور کربلائے معلّٰی چلے گئے۔ برقؔ و درخشاں بادشاہ کے ساتھ مٹیابرج میں رہے اور وہیں مر بھی گئے۔ بادشاہ کے قلعہ سے چھوٹنے اور ۱۸۵۷ء کے فتنہ و فساد فرو ہونے کے بعد لکھنؤ سے اور بھی شعرا پہنچے اور ملازمان شاہی میں منسلک ہوئے۔ سات شاعر ان میں سے سبعہ سیارہ کہلاتے تھے۔ یہ امتیاز حضرت کا دیا ہوا تھا۔ درخشاں بھی ان ساتوں میں داخل تھے۔ یہ سب بڑے نازک خیال تھے اس سبب سے کہ بادشاہ کو وہی رنگ زیادہ تر پسند تھا۔ مرزا داغ مرحوم بارہا ذکر کرتے تھے کہ میں جب رامپور سے چلا تو لکھنؤ و عظیم آباد وغیرہ میں ٹھہرتا ہوا اور مشاعروں میں سب جگہ شریک ہوتا ہوا کلکتہ پہنچا۔ جو مزہ مجھے مٹیابرج کے مشاعروں میں آیا وہ لطف لکھنؤ میں بھی نہ پایا۔ درخشان نہایت پُر گو شخص تھے۔ جمیع اصناف سخن پر ان کا کلام شامل تھا۔ بنگالہ ان لوگوں کے لئے ایسا گور وہ تھا کہ کسی نے یہ بھی نہ جانا کہ لکھنؤ کے کچھ اہلِ کمال یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ کسی کے کلام کا بھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ مجھے ایک عرصہ کے بعد شاہزادہ مرزا محمد مقیم بہادر کے حسب الطلب کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک ایک سے پوچھا کہ عیشؔ و بہارؔ و ہنرؔ و درخشاں وغیرہ کے

دیوان کسی کے پاس ہیں ایک مصرع بھی نہ ملا۔ مستورات میں سے ایک صاحب کے پاس درخشاں کے چند شعر نکلے۔ دیکھا تو سب الف کی ردیف ہیں اور یہ معلوم ہوا کہ کسی نے فقط اپنی پسند کے شعر لکھ لئے ہیں پوری غزل کوئی نہیں ہے۔ میں نے انہیں اشعار کو مغتنم سمجھا اور سب لکھ لئے۔ اگر محسنات کلام کے بیان میں میرے قلم سے کہیں مبالغہ گزارش کرے تو اہل فن اس کو مقتضائے محبت و حق صحبت پر محمول فرمائیں۔

اشعار

ہر مصرع ہر شعر کا حاصل مصرع ہے دوسرا ۔۔۔ مرغ معنی کے لئے پیدا ہو شہپر دوسرا

حالِ ابنائے زماں ہے مثل سنگ آسیا ۔۔۔ ایک ہے آرام میں کھاتا ہے چکر دوسرا

نیک پر ہے فوق بد کو بحر عالم میں تو کیا ۔۔۔ خس نظر آتا ہے تجھ کو ایک گوہر دوسرا

گلشن عالم میں کی اک وضع پر ہم نے بسر ۔۔۔ پیرہن بدلا نہ مانند صنوبر دوسرا

کیوں پئے روزی کسی دنا کسی کرتا ہے رجوع ۔۔۔ بند کر سکتا نہیں رزقِ مقدر دوسرا

دست رس میرا جو پہنچے توڑ دوں آئینہ ۔۔۔ دیکھنے پائے نہ تیرا روئے انور دوسرا

کام وہ کر جس سے راحت گورکی منزل میں ہو ۔۔۔ تا قیامت نور ہے جس میں نہیں گھر دوسرا

ذبح کیا کرتے ہو چھوڑ دو باندھ کر پر بام پر ۔۔۔ ایک کو دیکھے تو آ بیٹھے کبوتر دوسرا

اے درخشاں جس کے مضمون سے ہے روشن اک جہاں
شاہ اختر سا نہیں دیکھا سخن ور دوسرا

اس غزل میں حسن بندش لطف تغزل شان و شوکت دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ غزل میں زبان کا مزہ ردیف کے چمکنے سے پیدا ہوتا ہے اس کے ہر شعر میں ردیف ایسا مزہ دے رہی ہے جیسے ترانہ میں سم ہر شعر کے حاصل معنی کو دیکھئے کیسے پُرمغز مضامین ہیں۔ مطلع میں شہرت کا استعارہ شہپر ہے۔ سنگ آسیا کی تشبیہ خس کا پانی کے اوپر بہنا اور گوہر کا تہ نشین ہونا صنوبر اور مقدر کے قافیہ میں قناعت کا اور آئینہ والے شعر میں غیرت کا مضمون داد طلب ہے گھر کا قافیہ بھی ردیف

سے خوب لپٹا ہے اور مضمون بھی عبرت خیز ہے ۔ ایک کبوتر کو دیکھ کر دوسرے کا آبیٹھنا کیا اچھی تخیل ہی شعر کی جان ہے ۔ ورنہ شاعر کوئی واعظ نہیں ہے کہ سارا کلام اس کا پند ناصح ہو۔ مقطع میں بادشاہ کی مدح ہے ۔ ذوالفقار الدولہ بادشاہ کے مقرب و رفیق خاص تھے ۔ ان کے یہاں مشاعرہ تھا اور سب کو معلوم تھا کہ جہاں پناہ بھی رونق افروز ہوں گے ۔ غزلیں بھی شعرا نے فکر سے کہیں اور ایک آدھ شعر میں انکی مدح بھی کی ہے ۔ بادشاہ کہنے تو بہت تھے مگر مشاعرہ میں آنے کا ذوق نہ تھا ۔ اسی سبب سے یہ مشاعرہ ٹوٹ گیا ۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ ہوادار پر سوار چلے جا رہے ہیں شعرا کو باریابی کا موقع مل گیا باتوں باتوں میں کوئی مصرع حضرت کی زبان سے نکل گیا ۔ سب نے مل کر اُسے طرح قرار دے لیا ۔ پھر جو سواری ہوئی تو اپنی اپنی غزلیں سناتے ہوئے ہوادار یا بوچے کے ساتھ ساتھ چلے ۔ بوچے کے کہار مزاج شناس تھے ۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگے ۔ سیدھی راہ کو چھوڑ کر باغوں کے اندر ہوتے ہوئے گزرے ۔ شعرا جب پڑھ چکے اور واہ واہ سے چکے تو رئیس الدولہ جو خوشنویسوں کے افسر اور مطبع سلطانی کے مہتمم تھے ۔ بوچے کے قریب آئے اور بادشاہ کی غزل صاف کی ہوئی گزران دی ۔ ان سے غزل لے کر حضرت نے پڑھنا شروع کی ۔ کلام الملوک ملوک الکلام کا شور بلند ہوا ۔ لیجئے مشاعرہ ہو گیا ۔ جہاں پناہ اس منزل میں داخل ہو گئے ۔ رئیس الدولہ بھی شعر کہتے تھے ۔ اور مہتاب الدولہ سے مشورہ تھا ۔

ولہ

کیا نام خدا قبلہ نما دل نظر آیا ۔۔۔ محراب سا ابرو کے مقابل نظر آیا
دریائے محبت کا نہ پوچھو حد و پایاں ۔۔۔ جی ڈوب گیا جب مجھے ساحل نظر آیا
مرجانے سے بدتر ہے غم دوری احباب ۔۔۔ دیدار فقط زیست کا حاصل نظر آیا
نالاں ہے جراحت سے نہیں طائر مرہم ۔۔۔ دل صورت منقار عنادل نظر آیا

نازک ہے فن شعر نہایت ہی درخشاں
کہنے سے سمجھنا مجھے مشکل نظر آیا

محراب ابرو کی گنجائش وزن میں نہ تھی ۔ محراب سا ابرو باندھ دیا ۔ نام خدا کا لفظ محض قبلہ و محراب کی رعایت سے رکھا ہے، اور بھرتی کا لفظ معلوم ہوتا ہے ۔ دوسرے شعر میں جی ڈوب جانا بھی دریا کی رعایت سے لائے ہیں ۔ مگر وہ برا نہیں معلوم ہوتا ۔ رعایت لفظی کرنے میں اتنا سلیقہ شاعر کو ضرور ہونا چاہیئے کہ رعایت مبتذل و مبتکر میں تمیز کرے ۔ یورپ کے شاعروں کی تقلید میں جو لوگ رعایت سے مطلقاً نفرت ظاہر کرتے ہیں ان کی رائے یہ ہے کہ کسی محل پر رعایت اچھی نہیں معلوم ہوتی مگر تجربہ اس کے خلاف ہے ۔ میں اس کو ویسی ہی بات سمجھتا ہوں کہ کسی کو اُبلا ہوا گوشت پسند ہے کسی کو بھنا ہوا ۔ حدود پایاں میں ایک لفظ مؤنث، ایک لفظ مذکر ہے مگر دونوں مل کر مذکر ہی بولے جائیں گے ۔ دل دو نیم کی تشبیہ منقار عنادل سے، اور مقطع میں بندش کی صفائی و طرز بیان نہایت پُر لطف ہے ۔

ولہ

کبھی تم نے بھی گُل کھایا تو ہوتا ۔۔۔ جلانے کا مزہ پایا تو ہوتا
کوئی میرے لئے ہے بے خور و خواب ۔۔۔ تمہیں اتنا خیال آیا تو ہوتا
کہیں سکتہ نہ عاشق کو ہوا ہو ۔۔۔ اُسے آئینہ دکھلایا تو ہوتا
پلائی گر نہ ساقی نے مجھے مَے ۔۔۔ دکھا کر جام ڈھکایا تو ہوتا

جلانے کا مزہ دیکھ لیا ہوتا یا چکھا ہوتا تو زیادہ تر اس محل پر بولتے ہیں ۔ پایا تو ہوتا ضرورت قافیہ کے سبب سے کہہ گئے ہیں ۔ خواب و خیال میں مراعات النظیر بھر موجود ہے اور بیشک بری معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے برا معلوم ہونے کی لِم یہ نہیں ہے کہ رعایت لفظی اصل میں بڑی چیز ہے بلکہ متبذل ہونے کی وجہ سے بُری معلوم ہوتی ہے یعنی خواب کے ساتھ خیال کا لفظ دو لاکھ دفعہ کہا گیا ہے ۔ اب سُنتے سُنتے جی اکتا گیا ۔ تیسرے شعر میں عاشق کا لفظ متبذل ہے ۔

ان کا شعر مجھے یاد آیا اسی مضمون کو کیا اچھی طرح کہا ہے ؎

سکتہ میں وہ آئینہ دکھا کر مجھے لوٹے ۔۔۔ پتھر پڑیں اے شخص تری بے خبری پر

ڈھکانے کا شعر بہت صاف ہے مگر ایک پرہیزگار کہہ رہا ہے کہ مجھے مے نہ پلائی تھی تو ڈھکایا ہی ہوتا اس کے معنی کیا۔ معنی اس کے یہ ہیں کہ شراب کا مضمون فارسی واُردو کی شاعری میں معرکہ شعرا ہے، خواہ کوئی شراب پیے یا نہ پیے ان مضامین کا کہنا ضرور ہے۔ ایسے ہی اور بھی اسرار ہیں جو ہر زبان کی شاعری میں پائے جاتے ہیں۔ یورپ کی شاعری بھی اس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ ایسے مضامین کہنا ضروری ہی کیا ہے۔ آغا حجو شرف مرحوم نے شراب ساقی پیرمغاں مے خانہ واعظ زاہد سبحہ زنار مسجد بت خانہ وغیرہ کا ذکر غزل میں ترک کر دیا تھا۔ کہتے تھے آخر اس کے معنی کیا کہ شراب سے نفرت واعظ سے عقیدت اور پھر اس کی تعریف کریں، اور اسکی مذمت اس قسم کے شعر سراسر غیر واقعی ہوا کرتے ہیں۔ مجھے اس سے کچھ لطف نہیں ملتا۔ اسی زمانہ میں مرزا غالب کا دیوان پہلی دفعہ لکھنؤ سے چھپ کر نکلا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ شرف تڑپ رہے ہیں اور بے چین ہوئے جاتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے بھئی مرزا نوشہ نے ایک شعر کہا ہے کہ میں نے کلیجہ پکڑ لیا ہے ؎

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

میں نے کہا اس مضمون غیر واقعی سے ہو تو کیا پوچھنا۔ یہ غزل بھی اسی طرح کے مشاعرہ کی ہے جو سواری کے ساتھ ہوا کرتا تھا بادشاہ کی غزل بھی اسی طرح میں ہے۔ مجھ سے رئیس الدولہ نے ذکر کیا کہ اپنی غزل پڑھ کر حضرت نے خواجہ حیدر علی آتش کا مطلع پڑھا ؎

کبھی وہ سرو قد آیا تو ہوتا کوئی دم گور پر سایہ تو ہوتا

اور مہتاب الدولہ سے فرمایا کہ دیکھو بظاہر یہ مطلع دو لخت معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے عرض کیا بجا ارشاد ہوتا ہے۔ کہنے لگے نہیں۔ سرو کو گور سے اک مناسبت ہے۔ یہ درخت قبرستان میں اکثر لگاتے ہیں۔ یہ ایران کی رسم ہے۔ مہتاب الدولہ نے کہا کہ کوئی دم کا لفظ بھی سرو کے مناسب حال ہے کہ اس کا سایہ دیر تک نہیں رہتا۔ پھر فرمانے لگے کہ فارسی کے اساتذہ سایہ اور آیا کبھی قافیہ نہ کرینگے۔ اُردو میں کوئی اس کا خیال نہیں کرتا۔ میں نے بھی یہی اختیار کر لیا۔

مہتاب الدولہ نے ناسخ کا مطلع پڑھا کہ ؎

گھر غم فرقت میں سُونا ہو گیا ۔۔۔ کنج مرقد کا نمونہ ہو گیا

اور عرض کیا کہ دیکھئے شیخ نے بھی ہائے مختفی کو روی قرار دیا ہے۔ جناب مُفتی میر عباس صاحب کے پاس یہ ذکر پہنچا۔ اُنہوں نے اس مسئلہ میں یہ اجتہاد فرمایا کہ دیکھا اور نمونہ اور اچھا قافیہ نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن سایہ اور آیا اور نمونہ اور سُونا میں کچھ قباحت نہیں۔ ایک بادشاہ کے دم سے مٹیا برج میں عجب دلچسپ مجمع رہا۔ کیسے کیسے دقائق چھن گئے اور کتنے لوگ شاعر و طبیب و علامہ بن گئے۔ رئیس الدولہ نے مجھ سے پُوچھا کہ جناب مفتی صاحب نے یہ تفصیل جو کی میری سمجھ میں اس کی وجہ نہ آئی۔ دیکھا اور سایہ قافیہ غلط اور آیا اور سایہ صحیح۔ میں نے کہا کہ دیکھا اور سایہ میں ہائے مختفی کو سوا روی قرار دینے کے اور کوئی صورت نہیں اور فارسی والے کبھی ہائے مختفی کو روی نہیں قرار دیتے۔ کہنے لگے ہمیں فارسی والوں سے کیا غرض۔ میر انیس اور مرزا دبیر ہمارے زمانہ کے بڑے شاعر ہیں۔ یہ لوگ تو ہائے مختفی اور الف کو ایک چیز سمجھتے ہیں اور بے تکلف دریا کے ساتھ چشمہ باندھا کرتے ہیں۔ اور صحرا کا قافیہ سبزہ کر دیا کرتے ہیں اور کچھ بُرا بھی نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے کہا اگر چشمہ کا قافیہ مجمع یا کون ومکاں کا قافیہ ارض وسما کر دیجئے تو بُرا تو جب بھی نہ معلوم ہوگا۔ کہنے لگے تو پھر سُونا اور نمونہ بھی غلط ہے۔ الف ہو تو سب جگہ الف ہی ہو ہ ہو تو سب جگہ بس ہ ہو۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ حسب قاعدہ کہیں ہ ہونا ہی نہ چاہیئے۔ خصوصاً ترکیب فارسی میں ہو تو نہایت مہمل پن معلوم ہوتا ہے اور جناب مفتی صاحب قبلہ کا مقصود یہی ہے کہ فقط اردو کے واسطے اجازت ہے کہ سُونا اور نمونہ قافیہ کر لیں ورنہ فارسی میں ایسا نہیں ہو سکتا جیسا کہ بادشاہ نے ارشاد فرمایا۔

ولہ

کیا شرف ذرّہ کا گر فیض کا جوہر نہ ہوا ۔۔۔ آب گوہر سے لبِ خشک کبھی تر نہ ہوا

جامۂ سلطنت و فقر برابر نہ ہوا | شکل آئینہ نمد پوش سکندر نہ ہوا
بحر ہستی میں ہے دن رات رواں کشتی عمر | خواب سنگین بھی اس کے لیئے لنگر نہ ہوا
نکتہ در کار نہیں چشم مروت کے لیئے | آشنا باز کی وحشت سے کبوتر نہ ہوا
بشر حال جہاں ہم نے پریشاں دیکھا | گھر ہوا وہ نہوا زور ہوا زر نہ ہوا
دیکھیئے کب نظر آتا ہے ہمیں قامت یار | وقت فردا ئے قیامت کا مقرر نہ ہوا
طالب بوسۂ ابرو کو دیا اس نے جواب | کیا کہوں ہاتھ میں اس دم مرے خنجر نہ ہوا
سادہ رویوں سے نہیں چشم وفا دنیا میں | آئینہ مرگ سکندر سے مکدّر نہ ہوا

آب گوہر دالا مطلع۔ انصاف یہ ہے کہ خوب کہا ہے لیکن اس کی رائے کے موافق یہ صنعت بھی قابل ترک ہے۔ اس سبب سے کہ محض فارسی میں یہ ایک لفظ دو معنوں میں مشترک پایا جاتا ہے کہ آب چمک کو بھی کہتے ہیں اور پانی کو بھی کہتے ہیں۔ اشتراک معنی کے سبب سے یہ صنعت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی خوبی محض دھوکا ہی دھوکا ہے۔ اصل میں کچھ بھی نہیں اس آب میں نمائش سراب ہے۔ اڈیسن کی اس نکتہ سنجی کے آگے صائب کا بھی یہ مشہور شعر

دست طمع چو پیش کسان کردۂ دراز | پل بستۂ کہ بگزری از آب روئے خویش

خاک میں مل گیا یہاں بھی لفظ آب کے مشترک ہونے سے یہ حیرت انگیز صنعت پیدا ہوئی ہے مگر اس کی کیا وجہ کہ ہم اڈیسن کا تتبع کریں اور شیکسپیئر کی تقلید نہ کریں وہ تو ان کی زبان کا فردوسی ہے اور اس صنعت کا دلدادہ ہے اور اڈیسن کا مرتبہ شعر میں اس سے بہت ہی پست ہے۔ اس کی فلسفیانہ نثریں البتہ مقبول ہیں۔

آئینہ نمد پوش کو درویش صاف باطن خیال کرنا اور سکندر پر اسکا تفوق ثابت کرنا نہایت بلند مضمون ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ خواب سنگین یعنی غفلت کا بے سود ہونا بھی اچھی طرح نظم کیا کبوتر کی آنکھ سے مروت کے معنی نکالنا کیا اچھی تخیل ہے۔ ایسی تخیلیں پیدا ہو سکیں تو زبان اردو میں جان پڑ جائے۔ حال جہان کی پریشانی کس تفصیل سے دوسرے مصرع میں بیان کی ہے

یہ صنعت معنوی اور بندش کی برجستگی داد خوش بیانی کی طالب و سزاوار ہے۔ فرمائے
قیامت والا شعر بھی مشتاقانہ ہے لیکن قامت کے ساتھ قیامت کا ذکر اس کثرت سے کیا گیا
ہے کہ اب سننے کو جی نہیں چاہتا۔ گوشۂ ابرو میں نہایت تصنع کو دخل دیا ہے۔ بوسہ لینے کے
مقامات جو ہیں ان میں ابرو نہیں داخل۔ شمشیر و خنجر کے ساتھ دم کا لفظ بہت مبتذل ہو چکا ہے۔ اس
سبب سے برا معلوم ہوتا ہے۔ سادہ رویوں کا ذکر ایک ثقہ شاعر کے قلم سے نکلنا اور ان کی
بیوفائی کا گلہ کرنا البتہ گرفت کے قابل ہے لیکن لکھنؤ میں زیادہ تر اور دہلی میں بھی مہذب شاعروں
کا رنگ سخن صاف دلالت کرتا ہے کہ قصد شاعر کا کیا ہے۔ بقول غالب ایک سخن گسترانہ بات
ہے یہ غزل ان مرحوم کو کئی مرتبہ پڑھتے میں نے سنا ہے ہمیشہ مشاعرہ میں رنگ دیتی تھی۔

ولہ

قلم خط شعاع مہر کا ہو دست مانی میں
بھرے تصویر جاناں میں سپیدہ روز روشن کا

یہ طاقت جوش وحشت نے دکھائی ناتوانی پر
گریباں سے مرے کرتا ہے باتیں چاک دامن کا

طریق عشق میں ہرگز نہیں چلتی ہے طراری
یہ وہ منزل ہے کٹ جائے جہاں اسباب رہزن کا

دل بیرحم سے اعجاز داؤدی بھی عاجز ہو
بہت مشکل ہے کرنا موم ایسے سخت آہن کا

برنگ بوئے گل پہنچے سبک روحی سے اس جا ہم
دکھائے برچھیاں سبزہ جہاں دیوار گلشن کا

ہمیشہ رنج میں رکھتی ہے اپنی ہمت عالی
ہمیں ہے دوست کا احسان گویا ظلم دشمن کا

فرومایہ کو ہو برعکس فیض صحبت عمدہ
عفونت بیشتر لاتا ہے پانی چاہ گلشن کا

نہیں چھپتا ترا چوری سے جانا غیر کے گھر میں
بڑھایا جب قدم دروازہ سے ماتھا مرا ٹھنکا

بسر کرتا ہے تنگی سے کوئی، کوئی فراغت سے
ہوا ہے ساتھ یاراں جہاں میں چولی دامن کا

مسی آلودہ لب سے اس پری کے شرم یہ آئی
اڑا تخت سلیماں کی طرح ہر تختہ سوسن کا

خط شعاعی کا قلم روز روشن کا سپیدہ اس کی تصویر کے لئے چاہیے۔ صدہا رنگ سے
یہ مضمون کہا جا چکا ہے۔ اس کے مبتذل ہونے میں شک نہیں۔ چاک دامن کا گریبان سے

باندھ کرنا ایک بات ہے مگر مصرع بالکل پیش افتادہ اٹھا کر چپکا دیا ہے۔ رہزن والا شعر بے عیب ہے۔ بیرحم کی مذمت لطف سے کی ہے۔ سبزہ کا برچھیاں دکھانا اچھی تخئیل ہے۔ خصوصاً وہ سبزہ جو دیوار پر اگا ہو۔ دیوار و در پر حفاظت کے لیئے سنانوں کی شکل کی آہنی سلاخیں لگا دیا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سبک روحی حاصل ہو تو گلشن عرفان تک رسائی ممکن ہے۔ مجھے یہ شعر پسند ہے۔ خصوصاً اس کی تشبیہ۔ دشمن کا قافیہ بھی خوب کہا۔ اخلاقی مضمون ہے۔ چاہ گلشن کا بیش تر متعفن ہو جانا مسلم امر ہے۔ ایسا معشوق جو غیر کے گھر چوری سے جائے قابل نفرت ہے اس قسم کے مضامین کچھ بازاری لوگوں کو اچھے معلوم ہوتے ہوں گے۔ مگر اس شعر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو محض یہ محاورہ صرف کرنا تھا کہ ماتھا ٹھنکا اور اس کا محل استعمال دکھانا تھا ورنہ لکھنؤ کے شعراء رشک کے مضامین جس میں معشوق کا شاہد بازاری ہونا نکلے بہت کم کہتے ہیں۔ مرزا داغ نے قیامت کی۔ کہتے ہیں ؎

تم کو ہے وصل غیر کا انکار   اور اگر ہم نے آ کے دیکھ لیا

آتش نے بھی ایک جگہ رشک کا مضمون غضب کا کہا ہے مگر اس کے برعکس ہے ؎

مرتے ہیں رشک کے مارے پس دیوار رقیب   شور کرتا ہے جو پازیب کا دامنِ شب وصل

چولی کی تنگی اور دامن کی فراخی اچھی تخئیل ہے۔ چولی دامن کا ساتھ فقیر و تونگر کا خوب کہا۔ کئی شعر اس میں مثالی ہیں آخری شعر میں مطلب مبہم رہ گیا اور اغلاق بھی ہے۔ شرم سے رنگ اڑنا کہنا چاہیئے تھا اور یہ کا لفظ اس قدر کے محل پر عجز طبع پر دلالت کرتا ہے جہاں سامعین کو یہ معلوم ہوا کہ فلاں لفظ میں شاعر عاجز ہو گیا۔ پھر شعر و شاعر دونوں نظر سے گر جاتے ہیں اور اس شعر کے ساتھ اچھے شعروں کا بھی خون ہو جاتا ہے۔

ولہ

عاشق کے دل کو دام ہوس میں پھنسا دیا   کیا باغ سبز سبزۂ خط نے دکھا دیا
آئی قریب گوشۂ ابرو جو زلف یار   اتری ہوئی کمان پہ چلّہ چڑھا دیا۔

سیماب وار پاک ہیں آلودگی سے ہم
گردوں نے گرچہ خاک میں ہم کو ملا دیا

جام تہی ہیں صورت دست سوال تھی
گردن کو اپنی شیشۂ مے نے جھکا دیا

پیدا ہے مرے نالۂ جاں سوز سے صدا
بس اے تپ فراق کہ تو نے جلا دیا

سرمہ نہ بہر غیر ہوتا خاک راہ یار
آنکھوں سے ہم نے نقش قدم کو مٹا دیا

ہم اُس سے نقد بوسہ کے امیدوار تھے
قیمت میں دل کی یار نے خنجر لگا دیا

مرنا بھی اہل ہوش کا ہے غافلوں کو پند
ہم سو رہے تو یاروں کو اپنے جگا دیا

غالب ہوئی جو نکہتِ گُل پر شمیم زلف
غنچوں نے چٹکیوں میں صبا کو اڑا دیا

آثار صبح حشر ہیں شاید کہ اے اجل
میرا چراغ عمر جو تُو نے بجھا دیا

کس طرح سوز دل کا درخشاں گلہ کروں
جب آہ سرد نے بھی کلیجہ پکا دیا

اس غزل کے سب قافیوں میں روی الف تقدیر ہے۔ اہل فن کے نظر میں ساری غزل ایک ہی قافیہ میں ہے مگر دکھا دیا، ورجگا دیا میں، الف جزو غیر منفک ہو گیا ہے اس سبب سے ان دونوں قافیوں میں سے ایک کا مطلع میں آجانا تکرار قافیہ کے عیب کو چھپا دیتا ہے سبز و سبزہ میں تجنیس مبتذل ہے اور جو صنعت مبتذل ہو گئی ہو اس سے احتراز چاہیئے۔ اس سے کلام میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ مشکل یہ ہوتی ہے کہ لوگ یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ کوئی لفظ مناسب اس سے چھوٹ تو نہیں گیا۔ جہاں دیکھا کہ لفظ بدلنے سے تجنیس یا مراعات یا ایہام تناسب پیدا ہوتا ہے فوراً اعتراض کرنے کو موجود ہو گئے۔ صنعت کو کیا چھوڑا گویا بڑی غلطی کی۔ میں نے ایک جگہ "بسان نکہت گل باندھا تھا۔ ایک صاحب نے مجھ سے کہا یہاں برنگ نکہت گل کہنا بہتر تھا۔ میں نے یہ جواب دیا کہ میں نے عمداً ترک کیا ہے جس بات کو ہزار دفعہ لوگ کہہ چکے اس کے باندھنے میں اب لطف کیا رہا۔ بلکہ سراسر بے لطفی و ابتذال ہے۔ تجنیس بھی انہیں صنعتوں میں ہے جن کو یورپ کے شعرا نے ترک کر دیا ہے۔ نواب

عماد الملک بہادر ایک دفعہ فرماتے تھے۔ کہ مجھے بھی یہ صنعت بہت مکروہ معلوم ہوتی ہے میں نے یہ مصرع پڑھا۔ ع نقش سُم سبکتگت سجدہ گہ سبکتگین۔ اسکو انہوں نے بہت پسند کیا اصل بات یہی ہے کہ متبذل ہونا صنعت کو خراب کر دیتا ہے۔ اتری ہوئی کمان کی تشبیہ اور زلف کے ابرو پر آجانے سے کمان پر چلّہ چڑھ جانا یعنی تیر افگنی کا سامان ہو جانا سزاوار ستائش ہے سیماب کا خاک میں مل کر بھی آلودگی سے پاک رہنا مضمون نفیس ہے۔ جام کا ہاتھ پھیلانا اور شیشہ کا گردن جھکانا بھی بہت اچھی تخیل ہے۔ آگ میں صدا پیدا ہونا شدت اشتعال کی علامت ہے اور بہت اچھی بات ہے نقش قدم والا شعر بھی خوب کہا قیمت لگانے اور خنجر لگانے میں اشتراک فعل سے صنعت پیدا ہوئی ہے۔ دہلی و لکھنؤ کے شاعر اس صنعت پر مٹے ہوئے ہیں یہ بات ضرور ہے کہ سامعین سنکر پھڑک جاتے ہیں۔ پند والا شعر بھی برا نہیں ہے۔ صبا جو نکہت گل لئے ہوئے تھی شمیم زلف کے سامنے غنچوں نے اُسے چٹکیوں میں اڑا دیا یہ شعر محض یہ تخیل ظاہر کرنے کے لئے کہا گیا ہے کہ غنچہ کا چٹکنا چٹکی بجانا ہے اور بہت اچھی تخیل ہے جس وقت اپنا چراغ عمر بجھ جائے بس اسی کو صبح حشر سمجھنا چاہیئے۔ لطف سے خالی نہیں۔ ٹھنڈی سانسیں بھی کلیجہ پکا دینے کے لئے سوز دل سے کم نہیں ہیں سچا مضمون ہے اور مضمون کا سچا ہونا بڑی خوبی ہے۔

ولہ

زر بے انتہا ناحق ملایا خاک میں اُس نے
مگر شداد کے ہاتھ آ گیا تھا مال قاروں کا

نہیں رہتے ہیں دانشمند رہ جاتا ہے افسانہ
خم گردوں ہے جبتک نام باقی ہے فلاطوں کا

محل عبرت کا ہے آرائش تعمیر نو منعم
کہ ہر خشت کہن ہے آئینہ قصر فریدوں کا

کہا یہ ساربان سے نجد کے وادی میں لیلیٰ نے
کہ پہچانا نہیں جاتا۔ ہوا کیا حال مجنوں کا

نگاہ ناز سے مارے جلائے جنبش لب سے
جواب آسمان ہے اس کو منکر اعجاز و افسوں کا

نہ ہو گی فکر معنی آشنا محتاج غواصی
گہر افشاں ہے خود دامن مرے دریائے مضموں کا

حریفان سخن کا میں کبھی شکوہ نہیں کرتا
مرے مضمون کا سرقہ ہے تصدق طبع موزوں کا

قارون والے شعر میں ایک مضمون یہ نکلتا ہے کہ بخیل کی جمع کی ہوئی دولت بہت بُری طرح لٹا دی جاتی ہے۔ فلاطون و فریدوں کے قافیے بھی مشاقانہ کہے ہیں لیکن خشتِ کہن اور آئینہ یہ دونوں قصر فریدوں کی طرف مضاف ہیں اور حرف اضافت میں تنازع واقع ہوا ہے۔ شاعر نے آئینہ کو قرب کے سبب سے عمل دیا۔ مجھے متنبّی کا ایک شعر یاد آیا ؎

طلبتہم علی الامواہ حتّیٰ تخوّف ان تفتشہ السّحاب

اس نے اپنی زبان میں پہلے عامل کو عمل دیا ہے اگرچہ وہ بعید ہے۔ غرض تنازع کا واقع ہونا بھی شعر میں گنجلک پیدا کرتا ہے۔ مجنوں والا شعر بہت سیدھا سادہ ہے۔ ایسے شعر کے لئے ضرور ہے کہ بندش برجستہ ہو نہیں تو کہنے سے فائدہ۔ نگاہ سے مارنا اور لب سے جلانا مضمون مبتذل اور پامال ہے مگر دوسرے مصرع نے کچھ بنا لیا۔ شعر سے تبادرِ معنی کی یہ تشبیہ کہ گہر افشاں ہے خود دامن مرے دریائے مضمون کا" نہایت پر لطف ہے۔ مضمون کا سرقہ طبع موزوں کا صدقہ ہے۔ شوخی سے خالی نہیں۔

ولہ

پیرہن ہے تنِ عریاں میرا زخم گردن ہے گریباں میرا
ظلم کرتا ہے کتابی چہرہ خط کوفی میں ہے قرآں میرا
خود پرستی ہے پرستش بُت کی کم نہیں کفر سے ایماں میرا
کیوں نہیں برق کرم کرتی ہے وقفِ غارت ہے گلستاں میرا
کیوں ہوں انگشت نمائے وحشت کیا مہِ نو ہے گریباں میرا
لے کے دل مجھ سے ہو چیں بجبیں فائدہ تیرا ہے نقصاں میرا

زخم گردن کی وجہ ظاہر نہ ہوئی شعر سست ہو گیا۔ اسکو یوں سمجھنا چاہیئے کہ گریباں سے ایسی نفرت ہے کہ زخم گردن اُسے تصور کرتا ہوں۔ کوفی کے لفظ سے معنی ظلم کا تبادر ہوتا ہے۔ جسے اصطلاح میں لزوم ذہنی کہتے ہیں۔ اپنے اوپر خود پرستی کا الزام رکھ کر دوسروں کو نصیحت مقصود

ہے۔ برق والا شعر نہایت پُر درد ہے۔ وحشت کو مخاطب بناکر انگشت نما ہونے کی وجہ ظاہر کر دی اس طرح سے مطلب کو ادا کرو دینا شاعر ہی کو آتا ہے۔ چین بجبیں ہونے سے یہ مطلب نکلا ہے کہ وہ دل کو جنس ناروا سمجھا۔ ناپسند کیا۔

ولہ

حال کم فرصتیِ عمرِ گریزاں جانا	عیسےٰ و خضر کو دو روز کا مہماں جانا
آدمیت کو فقط جوہرِ انساں جانا	جس میں اخلاق نہ پائے اسے حیواں جانا
نہ فراغت کی خوشی ہے نہ مصیبت کا قلق	راحت و رنج کو جب دست و گریباں جانا
ہم کو یہ فیض ہوا عشقِ رُخِ گیسو سے	گبر نے گبر۔ مسلماں نے مسلماں جانا
شر سے نفرت ہے ہمیں خیر سے رغبت ہے مدام	کفر سمجھا اُسے ہم نے اسے ایماں جانا
حُسنِ معنی سے جو واقف ہوا صورت دوست	پڑھ کے قرآن کو نہ کچھ رتبہ قرآں جانا
خشک ٹکڑوں پہ کرے شکر جو ہو اہلِ زبان	ہم نے یہ مطلب آوازِ لبِ ناں جانا
جب تلک ضعف نہ تھا بادیہ پیمائی کی	اب تو دشوار ہے تا کوچۂ جاناں جانا

دونوں مطلع اس غزل کے خوب کہے ہیں۔ کم فرصتی کے لفظ میں یائے مصدری دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اسی قیاس پر لوگ فطرتی اور قدرتی بھی لکھنے لگے ہیں۔ اس میں مصدری تے موجود ہے تو پھر مصدری ی کیونکر آسکتی ہے۔ لامحالہ اس ی کو یائے نسبت کہیئے گا اور یائے نسبت جب لگاتے ہیں تو تے کو گرا دیتے ہیں۔ پس فطرتی کہنا یقیناً غلط ہے۔ صحیح لفظ فطری ہے ہاں بلند ہمتی و پست فطری کہنے میں قباحت نہیں ہے کہ اب ہمت اور فطرت ترکیب فارسی کا جزو ہو گئی ہے۔ اس میں فارسی کی یائے مصدری لگا سکتے ہیں اور خود اہلِ فارس اس طرح استعمال کیا کرتے ہیں لیکن فطرتی و قدرتی وہ بھی نہیں کہتے۔ غرض کہ یہ لفظ نہ عربی میں صحیح ہیں نہ فارسی میں۔ یہاں مجھے خود خلجان ہوتا ہے کہ اُردو زبان کیا اس قدر مشکل ہے کہ جب تک عربی و فارسی کے قواعد پر عبور نہ ہو کوئی شخص صحیح عبارت لکھ نہیں سکتا۔ بلکہ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ

اکثر عربی خواں وفارسی داں بھی ناواقفوں کی طرح غلط الفاظ گھڑھ لیا کرتے ہیں مثلاً وقعت کا لفظ عربی ہے۔ جنگ وجدل وفتنہ وفساد کے معنی پر آتا ہے اُردو زبان کے مضمون نگار اور اہل قلم اس لفظ کو توقیر واعتبار کے معنی پر لکھنے لگے۔ ایک کے قلم سے نکلا اور دوسرے نے فوراً اڑالیا۔ اس پر طرہ یہ کہ اسم صفت بھی اس سے بنالیا یعنی وقیع بھی ایک مہمل لفظ اب اردو میں داخل ہوا چاہتا ہے۔ انداز اور نمونہ خوب جانتے ہیں کہ دونو لفظ فارسی ہیں اس میں عربی کی تنوین لگاکر اندازاً کہا اور اس میں تنوین کے ساتھ تاے مصدری بھی لے آئے نمونتہً کہنے لگے مگر اصل بات یہ ہے کہ اس طرح کے مزخرف الفاظ پہلے وہی لوگ بناتے ہیں جنھیں کچھ شُدبُد عربی فارسی آتی ہے اور مقصود ان کا یہ ہوتا ہے کہ تحریر میں اظہار علم کریں اور الفاظ کے تراشنے پر اپنی قدرت دکھائیں۔ اگر یہ کہیے کہ یہ الفاظ بوضع ثانوی اُردو ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ عام وخاص کی زبان پر چڑھ گئے ہوں، ایسا ہرگز نہیں ہے اور اس سے اُردو کی زبان پوچ ہوتی جاتی ہے۔ جو عربی فارسی نہ جانے اسے اظہار علم کرنا کیا ضرور ہے۔ اردو کے زبان زد الفاظ محاورہ کے نچے ہوئے کلمات استعمال کئے جائیں تو اردو لکھنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس سے تحریر میں زبان کا لطف بھی آئیگا۔ اسی طرح ترکیب الفاظ میں بھی احتیاط چاہیے۔ اُردو میں جس طرح سب بولتے ہیں۔ اسی طرح قلم سے بھی ادا کریں۔ تو کبھی غلطی نہیں ہوسکتی۔ آفت تو یہ ہے کہ مثلاً خطوں کا صندوق کہنا اور لکھنا شان کے خلاف سمجھتے ہیں بس ذراسی فارسی دانی قیامت ہوگئی۔ صندوق خطوط اندازی ایک مہمل ترکیب بنالی اور اسے جزو زبان بنادیا۔ اسی طرح تخت نشینی کے لئے تاجپوشی کا لفظ حال میں وضع کیا گیا ہے۔ دیکھیے تعلیم کا ہونا تعلیم ناقص اور بقول ابوالفضل علمک ناقص سے ہزار درجے بہتر ہے۔ انگریزی کے الفاظ مانوس اگر اُردو میں شریک کرلئے جائیں تو کہیں بہتر ہے اس سے کہ ایسے فارسی وعربی کے الفاظ بڑھائے جائیں۔ کم فرصتی وبے عزتی وخوش قسمتی وغیرہ صحیح ترکیبیں ہیں۔ زیادتی کا لفظ غلط العام کے درجہ میں ہے اور اسی کے مقابلہ میں کمتی بھی صحیح وفصیح اردو کے الفاظ ہیں۔ فوراً وفعتہً شکایتہً رعایتہً وغیرہ صحیح الفاظ ہیں۔ اندازاً

نمونۂ غلط و تمسخر آمیز۔ جیسے نعمت خاں عالی نے دل لگی کی ہے ؎

للہ الحمد کہ حجیّدیم مرقد ختم رسل طوفیدیم

اردو کی شاعری فارسی سے ماخوذ ہے فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبیں اسی وجہ سے اردو کے اشعار میں مزہ دیتی ہیں مگر صحیح ترکیب پیدا کرنے کے لئے بہت کچھ فارسی جاننے کی ضرورت ہے اگر اچھی طرح فارسی نہ آتی ہو تو فارسی ترکیبیں تراشنے سے کنارہ کرنا چاہیے۔ سیدھی سادی اردو لکھنے میں کبھی غلطی نہیں ہو سکتی۔ غلطی تو اس سبب سے ہوتی ہے کہ اردو لکھنے میں عربی یا فارسی بولنے کا قصد کیا جاتا ہے۔

اس غزل میں راحت و رنج والا شعر خلاصۂ تہذیب اخلاق ہے۔ گبر و مسلمان کا مضمون مبتذل ہے۔ خیر و شر کی خوبی دیدی کس لطف سے بیان کی ہے اور کس طرز سے ادا کی ہے کہ وجد کرنے کے قابل ہے۔ صورت دوست کی ترکیب صحیح ہے مگر مانوس نہیں۔ صورت پرست اس سے بہتر ہے لیکن وزن مساعد نہ تھا۔ سوکھے ٹکڑوں کے توڑنے میں جو آواز پیدا ہوتی ہے کیا اچھا مطلب اس سے نکالا ہے اس صنعت کو حسن توجیہ کہتے ہیں۔ یہ بھی تخیّل کی ایک صورت ہے لکھنؤ میں چند لوگوں نے اتفاق کر کے فلک کے لفظ کو غیر فصیح قرار دیا ہے۔ درخشاں مرحوم اس سے ناواقف رہے ورنہ ضرور اتباع کرتے لیکن اس قسم کے متروکات کو کوئی غلط نہیں کہہ سکتا۔
بڑی چیز تو کلام کو غلطی سے پاک کرنا ہے۔ یوسف حسین کوئی شخص شیخ علی حزیں کی ملاقات کو گئے شیخ اس وقت پاؤں پھیلائے ہوئے بے تکلف بیٹھا ہوا تھا۔ ان کو دیکھ کر پاؤں سمیٹ لئے سیدھا ہو بیٹھا۔ پوچھا کہ اسم شریف۔ انہوں نے کہا الیسف حسین۔ یہ سن کر نازک دماغی سے اس سے منہ پھیر لیا اور پھر پاؤں پھیلا دئے۔ اسی کے قریب قریب ایک نقل اصمعی بیان کرتا ہے کہ زمانہ حج میں ایک شخص کو زی علما یمن میں نے دیکھا کہ لوگ اسے گھیرے ہوئے ہیں میں سمجھا کہ کسی ملک کا عالم متبحر ہے۔ ملاقات کا مشتاق ہو کر اس کے خیمہ میں گیا۔ پہلے میں نے نام دریافت کیا تو اس نے کہا ابو عبد الرحمن الرحیم مالک یوم الدین۔ اس جواب سے علم و تبحر کی ساری حقیقت کھل گئی۔

زبان کا پاک ہونا بڑے امتیاز کی بات ہے۔ لفظ تو لفظ ہے کسی حرف کا مخرج اگر صحیح نہ ادا ہو تو زبان کا بڑا سقم سمجھا جاتا ہے۔ شریف و رذیل ذرا سے میں پہچان لیا جاتا ہے۔ آبِ حیات میں آزاد اس نکتہ کو سمجھ کر بہت تہذیب سے لکھنؤ کی زبان پر حملہ کرتے ہیں پہلے ناسخ کے کچھ اشعار نقل کرتے ہیں ؎

شہسواری کا جو اس چاند کے ٹکڑے کو ہے شوق — چاندنی نام ہے شبدیز کی اندھیاری کا
نام سنتا ہوں جو میں گور کی اندھیاری کا — دل دھڑکتا ہے جدائی کی شب تار نہ ہو
آتش اس کے گورے گالوں پر یہ تو نے کیا کیا — چاندنی راتیں یکایک ہوگئیں اندھیاریاں

پھر لکھتے ہیں کس کا منہ ہے کہ لکھنؤ کی زبان پر حرف رکھ سکے۔ دلی کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ اندھیاری گھوڑے کی ہوتی ہے اور رات اندھیری، کہی جاتی ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ لکھنؤ کے اساتذہ بھی لفظ کے محل استعمال سے ناواقف ہیں مگر تعجب ہے کہ ایک تذکرہ نگار زبان اردو کی تاریخ کا مصنف اس بات سے ناواقف رہا کہ یہ خاص دلی کا محاورہ ہے جو ناسخ و آتش کے قلم سے نکلا ہے۔ سودا ؎

ہوگی کب تک بچا خبرداری — چور جانے رہے کہ اندھیاری

درخشاں کے کلام کے جو لوگ مشتاق ہیں انہیں میرا دوسری وادی میں نکل جانا اور اس قدر سامعہ خراشی کرنا ضرور شاق ہوا ہوگا مگر میں دیکھتا ہوں کہ کچھ اردو کے دن بھلے آئے ہیں ساری قوم اس کی طرف دفعتہً متوجہ ہوگئی ہے جب گوش شنوا ہو تو کیونکر درد دل نہ کہوں۔

ولہ

کروں کیا لطف پر تکیہ۔ رہوں کیا قہر سے غافل — امید و بیم میں عالم نظر آیا ترازو کا
دلِ نالاں کی ہم کو مرثیہ خوانی پسند آئی — جوانی کا نہ یہ محتاج رہتا ہے نہ بازو کا

دونوں شعر مشاقانہ ہیں۔ بندش میں ذرا جھول نہیں آنے پایا یہ مشاعرہ کی غزل ہے میں نے سنا کہ بادشاہ نے مائل[1] کے مطلع کو بہت پسند کیا کئی دفعہ پڑھوایا۔ وہ مطلع یہ ہے۔

---

[1] مولوی صادق علی خان مائل مرحوم جو بادشاہ کی حیات تک کلکتہ میں رہے اور انکی وفات پر لکھنؤ میں آ کر داد سخن گستری دیتے رہے۔

ے تصور تھا جو رونے میں گلوے یار مہ رو کا
صراحی دار موتی بن گیا ہر قطرہ آنسو کا

ولہ

کل وہ جو مجھ کو دیکھ کے بیگانہ بن گیا
میں بھی تو ہوشیار ہوں دیوانہ بن گیا
غفلت پہ اپنی کیوں نہ پیوں خونِ دل مدام
جامِ شراب عمر کا پیمانہ بن گیا
دیکھی نہ بختِ بد نے مری شکل انقلاب
گو آشنا بگڑ گئے بیگانہ بن گیا
رونق فزا ہوا جو درخشاں وہ بُت کبھی
آئینہ خانہ رشکِ صنم خانہ بن گیا

اس عاشقانہ مطلع میں بیان کا طرز دیکھنے کے قابل ہے یہ باتیں وہ ہیں جن سے شعر میں جان پڑ جاتی ہے۔ اس کے آگے صنائع و بدائع کی کچھ حقیقت نہیں جو لوگ عاشقانہ اشعار سنکر نہایت خشک سے کام لیتے ہیں اور شعر کی اداانکو لبھانہ لے ممکن نہیں۔ شعر کی ماہیت کو نظر دقیق سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ عشق بازی بُت پرستی بادہ خواری کے مضامین ہوں یا معارف و مکارم کا بیان ہو یا عبرت و حسرت کا مضمون ہو جبتک کہ شاعر کے طرز بیان نے اس میں جان نہ ڈال دی ہو وہ کلام موزوں ہے شعر نہیں ہے اور جہاں شعر میں اس طرح کا سحر پیدا ہوا پھر معانی اس کے کیسے ہی رکیک و سقیم ہوں وہ شعر ضرور دلنشیں ہوتا ہے۔ فن شعر و فن خطابت میں یہی بڑا فرق ہے کہ شاعر کے بیان میں شوخی اور خطیب کے بیان میں سنجیدگی ہوتی ہے۔ شاعر کو معانی سے چنداں غرض نہیں وہ طرز بیان کے کوچوں میں دوڑتا پھرتا ہے اور اسی دُھن میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اسکا کلام بے معنی ہو جاتا ہے۔ خطیب کا موضوع بحث فقط معانی ہوتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بیان میں طرز دلکش نہیں پیدا ہوتا۔ شاعر اس بات کی مشق کرتا ہے کہ تادیۂ معانی بطریق متعددہ ہونا چاہیئے اسکی تصریح کتب بلاغت میں موجود ہے۔ پھر اس کے ضمن میں پند و حکمت آجائے تو آجائے اور خطیب کا مقصود اصلی یہی ہوتا ہے کہ پند و حکمت کا افادہ استفادہ ہو بیان میں لذت ہو یا نہ ہو جیسے کوئی شخص فن موسیقی کا ماہر ہو وہ ایک ہی مصرع کو بار بار نئی نئی ترکیبوں سے

پڑھ رہا ہے اور اپنا کمال دکھا رہا ہے ۔ اہل مجلس میں جن کو ذوق نہیں وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مرثیہ کا لطف جاتا ہے ۔ رقّت سلب ہوئی جاتی ہے بول سمجھائی نہیں دیتے ۔ ان کی خاطر سے چند بند سیدھے سیدھے سروں میں وہ پڑھ دیتا ہے اور لوگ خوش ہو جاتے ہیں اسوقت اُردو کی مجلس ادب میں، ایسے ہی لوگوں کا مجمع نظر آرہا ہے جو چاہتے ہیں کہ شعر کو خطابت اور شاعر کو خطیب بنا دیں ۔ شاعر کی ترانہ سنجی ان کے کانوں کو ناگوار ہوتی ہے ۔ اپنے مطلب سے کام ہے ۔ اب ضرور ہے کہ اردو کی شاعری کا رنگ بدل جائے ۔ سامعین شاعر کو اپنے رنگ پر کھینچ لیتے ہیں مگر پھر شعر بھی حیرت انگیز و طرب خیز نہیں ہوتا ۔ کہتا گیا تھا اور کہنے لگا گیا ۔

حافظ

صبا حکایت زلف تو در میان انداخت
بنفشہ طرہ مفتول خود گرہ می زد

مصحفی

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

طرز بیان ہی میں جدت مقصود ہوتی ہے کہ شاعر تصنع سے کام لیتا ہے ۔ اس مضمون کو کہ ممدوح کی درگاہ کو وہ شرف حاصل ہے کہ کوئی قسم کھاتا ہے اسی کے در کی قسم کھاتا ہے ۔ عرفی اس طرح ادا کرتا ہے ؎

چرخ از شرف خاک درش ساخت طلسمے
کز دود ہش آن سو نبود راہ قسم را

طرز بیان میں شکوہ پیدا کرنے کے لئے شاعر تشبیہ وغیرہ سے کام لیتا ہے ۔ یہ مضمون کہ جب فضل خدا ہوتا ہے تو سب کام بن پڑتے ہیں ۔ حافظ اس طرح ادا کرتا ہے ؎

کار دو انیکہ بود بدر قہ اش لطف خدائے
بتجمل بنشیند بجلالت برود

غرض مختلف کوچے ہیں جن میں شاعر اسی چیز کو ڈھونڈتا ہے ۔ مجھے اس دلکشی کی جھلک کبھی برجستگی ردیف میں دکھائی دیتی ہے کبھی باب الانشا میں ۔ شراب کے ذکر میں مدام کا لفظ ایہام تناسب کے لئے لانا ایسا ہی بیہودہ معلوم ہوتا ہے جیسے زبان کے ساتھ گویا کا لفظ صرف

کرنا۔ ایہام تناسب مزے کی چیز ہے لیکن جب تازگی پائی جائے جہاں اس قدر کہنگی و ابتذال پیدا ہوگیا ہو وہاں احتراز واجب ہے۔ مگر مضمون بہت اچھا ہے جب حاصل عمر غفلت و بے خبری ہو تو پیمانہ عمر و جام شراب میں فرق کیا رہا۔ شکایت بخت کی بندش میں شان مشق پیدا ہے۔ مقطع بھی خوب کہا ہے۔

یہ زمین بھی استاد کی نکالی ہوئی ہے ان کی عادت تھی جہاں دیکھا کہ شعرائے سبعہ سیارہ میں سے کچھ لوگ سلام کو حاضر ہوئے ہیں باتوں باتوں میں کوئی مصرع نظم کر دیا۔ یہ لوگ اکثر کوئی قطعہ یا رباعی جس میں اعادہ سلطنت کی دعا ہوتی تھی پڑھ دیا کرتے تھے۔ جس سے ان کا زخم کہن تازہ ہو جاتا تھا اور اپنا درد دل کسی مصرع میں ظاہر کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ زبان سے نکلا۔ ع رہے گا انجم اختر تا کجا اے چرخ گردش میں

بادشاہ ابھی ہوادار سے اتر کر سلطان خانہ میں داخل نہ ہوئے تھے کہ مہتاب الدولہ نے یہ مصرعے پڑھے ؎

نہ ہے یوں ساغر بادہ سدا اے چرخ گردش میں
نہ ہے اس طرح سنگ آسیا اے چرخ گردش میں
رہے گا انجم اختر تا کجا اے چرخ گردش میں
نہ یوں تسبیح دست پارسا اے چرخ گردش میں

ان مصرعوں کو بہت پسند کیا فرمایا کہ قافیے بدل بدل کر اور مصرع لگاؤ اور میرے مصرع کو مصرع ترجیع قرار دو۔ پھر جو ملاقات و حضوری حاصل ہوئی تو مہتاب الدولہ نے ایک خمسہ پڑھا جس میں بہت سے بند تھے ہر بند میں چوتھا مصرع خمسہ کا گمردہ کا مصرع تھا۔ صلہ بھی ملا اور خمسہ مطبع سلطانی میں چھاپا گیا۔ میں نے بھی دیکھا تھا مطلع کے یہ تین مصرعے مجھے یاد رہ گئے۔

ایک صحبت میں میں بھی موجود تھا اور تمام شعرائے شاہی کا مجمع تھا۔ اعادۂ ملک کی دعائیں لوگ دے رہے تھے کہ حضرت نے دست دعا بلند کئے اور یہ مصرع پڑھا۔ ع

بازآ تقصیر سے بس گوشمالی ہوچکی

شگفتہ ایک شاعر حامد علی مرزا کو کب ولی عہد بہادر کے مصاحبوں میں تھے انہوں نے

عرض کیا۔ کہ خانہ زاد نے مصرع لگایا ہے حکم ہوا کہ پڑھو ؎

شانِ تومِتی الملکُ دکھلا دیکھی شانِ تنزعُ ع
باز آ تقصیر سے بس گوشمالی ہو چکی

اس صحبت میں بادشاہ نے کچھ اپنا کلام بھی سنایا تھا۔ دو شعر مجھے یاد رہ گئے ایک مطلع

ایک حسرت طور پر بھی بہر موسیٰ رہ گئی
ایسا کچھ دیکھا کہ آنکھوں کو تمنا رہ گئی

اور ایک غزل کا یہ شعر

جوانی میں سیہ مو تھے۔ سفیدی ہے یہ دندان کی
ضعیفی ہنس رہی ہے مجھ سے کیوں اندوہگیں ہونا

یہ شعر پڑھ کر مہتاب الدولہ سے مخاطب ہوئے کہ معنی بیان کرو، انہوں نے عرض کیا کہ بالوں کی سفیدی نہیں ہے بلکہ ضعیفی کا خندۂ دنداں نما ہے۔ فرمایا وہ تو خندۂ دنداں نما کر رہی ہے مگر سمجھ رہا ہوں کہ مجھ سے ہنس رہی ہے۔ اب اندوہگیں ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس نکتہ کے ارشاد فرمانے پر مہتاب الدولہ فوراً اٹھے اور آداب بجا لائے گویا حضرت نے ان کی شرح پر اصلاح دی اور انہوں نے اصلاح کا سلام کیا۔

ولہ

مشکی سبز رنگ کی چوٹی ہے گیسو حور کا
یار کی گردِ سواری میں ہے عالم نور کا

خلق میں جس کا ید بیضا ہوا مشہور نام
آ گیا گُل ہاتھ موسیٰ کو چراغِ طور کا

دیکھئے گر چشمِ عبرت سے بڑی تنبیہ ہے
نیند کی شدت جھکا دیتی ہے سر مغرور کا

جب نگاہِ مست اس کی غیر پر پڑنے لگی
ہو گیا ثابت بہکنا نرگسِ مخمور کا

خوانِ نعمت دیکھ کر فاقہ کشوں کی یاد کی
کاسۂ چینی سے دھیان آیا سرِ فغفور کا

چارہ سازی خلق کی کرتا ہوں گو درماندہ ہوں
بے مرمت بیشتر رہتا ہے گھر مزدور کا

مطلع میں "چوٹی" کا لفظ چوٹی کا لفظ ہے لیکن گردِ جولان کو تتق نور کہنا مضمون مبتذل ہے۔ معجزۂ ید بیضا طور پر عنایت ہوا ہے اس سبب سے اُسے شمع طور کا گل کہنا لطف سے خالی نہیں۔ یہاں ہاتھ آجانے کی اصطلاح میں ایہام تناسب ہے اور اچھا معلوم ہوتا ہے

تنبیہ کے معنی جگا دینے کے ہیں ۔ یہاں یہ رعایت کوئی کہہ سکتا ہے کہ لطف نہیں دیتی ۔ جہ کے ثبوت میں تازگی نمایاں ہے ۔ محض اس واسطے غیر پر آنکھ پڑنے کا مضمون ناپسندیدہ گوارا کر لیا سو رنہ مقصود بالذات یہ مضمون نہیں ہے ۔ مزدور و فغفور کے دونوں شعروں میں اخلاقی مضمون ہے اور شاعرانہ لہجے میں ہے ۔ غزل میں اخلاقی مضامین اگر واعظانہ طرز کے ہوں تو وہ غزل غزل نہیں ہے موعظ ہے ۔

ولہ

مطلب کے آشنا ہیں فقط یار آشنا
معدوم ہیں جہاں میں وفادار آشنا

کہنے کے واسطے ہیں بہت یار آشنا
لاکھوں میں یاں نکلتے ہیں دو چار آشنا

ناحق تمہیں سمجھتے ہیں اغیار آشنا
ہوتے نہیں کسی کے طرحدار آشنا

رکھیں نہ بعد مرگ سرو کار آشنا
کب ہو سر بریدہ سے دستار آشنا

غافل سے ہے اشارۂ ابروئے ماہ نو
دو دن تو ہو نیام سے تلوار آشنا

کب ہے برادران حقیقی کا اعتماد
بے فائدہ بدلتے ہیں دستار آشنا

تکیہ نہ اتفاق عناصر پہ آج کر
کل چار سمت جائیں گے یہ چار آشنا

ہے دشمنِ وصال فلک پھینک دیگا دور
کیا چلۂ کمان سے ہو سوفار آشنا

پوچھوں میں لطف بوسہ دُر گوش یار سے
کانوں سے ہو اگر لب گفتار آشنا

مجھے لفظ فقط اُردو میں بہت ثقیل معلوم ہوتا ہے لیکن محاورہ میں داخل ہے ۔ میں خود بھی اسکو ترک نہ کر سکا ۔ طرحدار اور صورت دار اور سمجھ دار اور تابعدار یہ سب ترکیبیں غلط ہیں مگر زبان اُردو کا جزو ہو گئی ہیں ۔ پھر بھی اہل قلم ان لفظوں کے استعمال سے احتراز کرتے ہیں خصوصاً فارسی کی اضافت و عطف کے ساتھ تو ہرگز نہ استعمال کرنا چاہیئے ۔

دستار والا مطلع مثالی شعر ہے اور خوب کہا ہے ۔ تلوار کے قافیہ میں چاند کے دو دن چھپنے کا اشارہ لطف دیتا ہے ۔ دستار والا شعر بھی اخلاقی مضمون سے خالی نہیں عناصر کے

جدا ہونے کی صورت دکھا دی ہے۔ یہ بندش بھی داد طلب ہے۔ سوفار کا قافیہ بھی خوب کہا حاصل زمین ہے۔ شعرِ آخر میں دو گوش سے باتیں کرنے کی تمنا کیا اچھی تخیّل ہے۔

ولہ

ہے جائے گریہ حال جہانِ خراب کا
ہو چشم مہر و ماہ پہ دامن سحاب کا

تکیہ پہ لطف عارضِ رنگیں کو دیکھنا
گویا روش پہ پھول پڑا ہے گلاب کا

کبتک پیوں میں ظلمتِ شب ہو کے گھونٹ
چھلکائے شیر صبح قدح آفتاب کا

مسجد سے سجدہ کو بہک کر چلا ہوں
گویا چراغ غول ہے ساغر شراب کا

کیا آئینہ میں عارضِ رنگیں کی ہے بہار
پانی میں پھول تیر رہا ہے گلاب کا

ہم حلۂ بہشت پہن کر چلے گئے
ڈھونڈا کیا کفن میں فرشتہ عذاب کا

تزئین حسن میں ہے سرو دست نقص عیب
انگلی پہ رنگ آتا ہے پہلے خضاب کا

روز سیہ دکھائے نہ لیل و نہار دہر
اک صفحہ تو سفید رہے اس کتاب کا

رخسار آتشیں نے ترے شب کو اے پری
دکھلا دیا چراغ سے اڑنا شراب کا

تجنیس خط ہے لفظ شباب و شتاب میں
کس طرح جلد جائے نہ موسم شباب کا

مجھے اس غزل کا مطلع عبرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ نہایت خوب کہا ہے۔ ہو کا لفظ ہونا چاہئے کے محل میں لکھ گئے ہیں اس پر بھی مطلع کی خوبی میں فرق نہیں آیا۔ دوسرے شعر میں عارض کو گلاب کا پھول کہنا تشبیہ مبتذل ہے۔ مگر مشبہ میں یہ قید لگانا کہ جب تکیہ پر رخسار رکھا ہو تخیل تازہ ہے۔ قدح آفتاب سے شیر صبح کا چھلکنا نہایت دلکش تخیل ہے۔ ساغر شراب کو چراغ غول بھی خوب کہا رات کا لفظ بغیر کو کے استعمال کرنا اگلے زمانہ کی روش تقریر ہے۔ ناسخ سے تنگیٔ محفل کے باعث بھڑ کے بیٹھا مجھ سے یار — رات اہل بزم کی کثرت کا احسان ہو گیا

مہتاب الدولہ مسن شخص تھے ناسخ و آتش کے مشاعروں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ شاید یہ غزل ان کی انہیں مشاعروں کی ہے اس زمانہ میں رات کوئی اس طرح نہ باندھیگا۔ آئینہ والے

شعر میں عارض کو پھر گلاب کے پھول سے تشبیہ دی۔ لیکن یہاں بھی تشبیہ مرکب ہے اور وجہ شبہ میں حرکت بھی داخل ہے اگر آئینہ ہاتھ میں ہو تو کفن کے اندر ہی حلۂ بہشت پہن بھی لیا اور اندر ہی اندر بہشت میں چلے جانے کی راہ بھی پیدا کر لی۔ گہری تخیل ہے مروجہ کی رعایت مبتذل ہے اور قابل ترک۔ آرزو کی ہے کہ فلک روز سیہ نہ دکھائے تو اس کتاب لیل و نہار کا ایک صفحہ سفید رہے اور ایک سادہ۔ چراغ سے شراب کا اڑنا ان کے حصّے کا مضمون تھا اے پری، اے صنم، اے جان، اے مہرو، اے گلرو، اے گلبدن بھرتی کے الفاظ سمجھے جاتے ہیں اور بھرتی کا لفظ شعر میں ہونا شاعر کے عجز طبع پر دلالت کرتا ہے۔ تجنیس لفظی البتہ اگر بانرہ ہو تو چھوڑنے کی چیز نہیں ہے۔ گو یورپ کی تقلید قطعاً مانع ہے مگر تجنیس خطی کے مہمل ہونے میں شک نہیں۔

ولہ

داغ سودائے محبت سکۂ زر ہو گیا — عشق کی دولت سے مفلس بھی تونگر ہو گیا
شکوۂ پست و بلند دہر تھا دردِ زباں — اشک کے طوفاں میں اک عالم برابر ہو گیا
رتبۂ اعلیٰ نہ پائے لاکھ گردونے بڑھے — قد آدم آئینہ کس دن سکندر ہو گیا
خانہ تحریر نے اگلا شکایت کا یہ زہر — مے کے خط جس دم اڑا نیلا کبوتر ہو گیا
مثل دشمن دوستوں کو ہے مٹانے کا خیال — کیا مرا جوہر بھی آئینے کا جوہر ہو گیا
زخمی تیغ ادا شب بھر تڑپ کر گئے — چاندنی کا کھیت وہ پھولوں کا زیور ہو گیا

برابر اور سکندر اور زیور کے قافیوں میں اچھے شعر نکالے ہیں ؛

مرزا مستیا عیش

ناسخ والوں میں ہیں معیار وحدائق البلاغہ ہمیشہ پڑھتے پڑھاتے رہتے تھے نازک خیالی کے مدعی اور بنوٹ کے اُستاد ہیں۔

طرح تھی "نظر وصل کی رات کر وصل کی رات" اس میں دیکھئے وصل کی رات کیا بنائی ہے ؎

وہ گلے مل کے دکھانے لگے زلفِ مشکیں
آ گئی آئینہ میں تا بہ کمر وصل کی رات

بس یہی رنگ ان کا غزل میں تھا۔

آخر میں غزل کہنا چھوڑ کر نعت و منقبت میں شعر کہا کرتے تھے مطلع ہے

سر کے بل چلنا ہے لازم شاہراہ طوس کا
گو کھرو کو سوں بچھا ہے تاج کیکاؤس کا

گوکھرو کے لفظ میں جو ایہام ہے اس پر وہ ناز کرتے تھے۔

سلام کے اسی مطلع میں جو بنوٹ کی ہے ملاحظہ ہو۔

سلامی حال عابد جس جگہ میں نے لکھا دیکھا
مرے ہاتھے نگہ نے بن کے چشم آبلہ دیکھا

میں نے کہا کہ یہاں "چشم آبلہ" کو قافیہ کرنا غلط ہے۔ انہوں نے میر یہ مصرع پڑھا ع۔ روانہ جادۂ شمشیر پر یہ قافلہ دیکھا۔ یعنی "میں نے آبلہ کی (ہ) کو الف بنالیا تو آپ نے بھی تو قافلہ کی (ہ) کو الف بنالیا"۔ میں نے جواب دیا کہ چشم آبلہ فارسی ترکیب ہے فارسی لہجہ میں آبلہ کو (آبلے) کہیں گے نہ کہ (آبلہ) اسی سبب سے شعرائے فارس کے کلام میں کہیں (ہ) کو الف کر کے قافیہ بنایا ہو تو آپ نہ دیکھیں گے ہاں تنوین کو نون کر کے حافظ نے قافیہ کیا ہے۔

گرم وقت عطا پرور دن آمد
کہ فالم لا تذرنی فرداً آمد

اس سبب سے کہ ان کا لہجہ اس کے موافق ہے۔

آغا حجوؔ شرف

آتش کے شاگرد تھے، عالی خاندان شخص تھے۔ نہ لکھے نہ پڑھے مگر بہت اچھے شاعر تھے ان کا دیوان چھپ گیا ہے۔ اس مطلع کو سنیئے اور اس کی زبان دیکھیئے۔

صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا
جھٹ پٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا

ان کے کلام میں ذرا بھی تصنع اور تکلف نہیں ہوتا۔

دم ذرا لینے دو میں دل کو سنبھالوں تو کہوں
منزل عشق کا حال - آپ میں آلوں تو کہوں

سننے والا کوئی پہلو میں بٹھالوں تو کہوں
کون ہے جس سے فسانہ کہوں اے دل تیرا

ان کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ دیر و بتکدہ و صنم و برہمن و ناقوس و قشقہ و زنار تسبیح مصلیٰ - زاہد و موذن و واعظ و شیخ و خانقاہ میخانہ و شیشہ و ساغر و ساقی و پیر مغاں جام و صراحی و مینا کا ذکر کہیں نہیں آنے پاتا۔ کہتے تھے جس شعر میں ایسے الفاظ ہوتے ہیں مجھے اس شعر سے نفرت ہوتی ہے۔

مرزا داغ جن دنوں کلکتہ آئے ہوئے تھے مجھ سے بیان کیا کہ ایک محفل رقص و نشاط میں میری دعوت تھی وہاں مغنّی نے شرف کی یہ غزل گائی۔

منزل عشق کا حال آپ میں آلوں الخ

مجھے زمین اچھی معلوم ہوئی میں نے بھی غزل کہی۔ پھر غزل نکال کر مجھے سنائی۔ ایک مصرع اس مضمون کا کہ "جو میرا مطلب ہے کہ نہیں" سکتا۔ ع

گد گدا لوں تو کہو پاؤں دبالوں تو کہوں

مجھے یاد رہ گیا انصاف یہ ہے کہ شرف کی غزل کا جواب نہ ہو سکا۔

مرزا امداد علی باور

تھے تو برقؔ کے شاگرد مگر استاد کے رنگ سے الگ، کلام بہت شوخ اور بلا تصنع ہوتا تھا۔ بہت کم کہتے تھے، اور مشاعروں میں کم شریک ہوتے تھے۔

مرزا داغؔ جن دنوں کلکتہ آئے ہیں اور اس تقریب میں مشاعرے ہو رہے ہیں ایک مشاعرہ میں باور بھی آ گئے ان کے سامنے جب کنول آیا تو اپنی مشہور غزل کے شعر پڑھنے لگے۔

دور ساقی کہ مجھے لغزش مستانہ ہے | پاؤں قابو میں نہیں ہاتھ میں پیمانہ ہے
آج تک بانگ انا الحق کے گڑے ہیں جھنڈے | سر اٹھائے ہوئے منصور کا افسانہ ہے

ابھی دو ہی شعر پڑھے تھے کہ سارا مشاعرہ مٹھی میں آ گیا۔ داغؔ نے پکار کر کہا۔ طرح میں کچھ کہا ہو تو پڑھیے۔ طرح تو انہوں نے کہی نہ تھی خاموش ہو گئے۔

ان کے دو شعر مجھے اور یاد آئے۔

وہ گئی بات کٹ گئی شب ہجر | تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی
آنکھوں آنکھوں میں یوں وہ لیگئے دل | کانوں کان ایک کو خبر نہ ہوئی

ان کا خاص رنگ:-

بند قبا کو کھینچ کے اتنا نہ باندھیے
دیکھیے نہ گھونٹ گھونٹ کے حسن شباب کو

مظفر علی ہنر

بڑے بذلہ سنج اور خوش طبع شخص تھے۔ مرزا ولی عہد، امد خاص محل اور محبوب محل کے اُستاد تھے۔

ایک مشاعرہ ہوا "اثر پیدا ہوا ثمر پیدا ہوا" دوسری طرح یہ ہوئی "جفا ہونے کو ہے ادا ہونے کو ہے" کسی نے ہنر سے پُوچھا کہ وہاں کیا طرح اب کی ہوئی۔ کہنے لگے۔ ع ایک پسر پیدا ہوا اب دوسرا ہونے کو ہے۔"

کلام ان کا بہت صاف اور بلا تصنع ہوتا تھا بڑے پر گو تھے اور ضخیم کلام تھے

رائیگاں ہوگا نہ ہرگز خاکساروں کا غبار کچھ زمیں لے جائیگی کچھ آسماں لے جائیگا

مجھ سے الگ مرے دل مردہ کو گاڑنا دہرا جنازہ ایک کفن میں نہ چاہیئے

میری ایک غزل میں یہ مصرع تھا۔ ع بسان نکہت گل ساتھ ہم صبا کے چلے

میں غزل پڑھ چکا تو منشی ہنر صاحب نے آہستہ سے مجھ سے کہا کہ معاف کیجیے گا۔ (بسان نکہت گل) کی جگہ برنگ گل آپ کہتے تو ایہام تناسب کا حسن پیدا ہو جاتا۔ میں نے کہا برنگ گل اس قدر لوگوں نے کہا ہے کہ میں نے تو عمداً اس لفظ کو ترک کر دیا ہے۔ اگر اس میں کچھ حسن تھا بھی تو وہ مبتذل ہو گیا۔ اب حسن کہاں رہا۔ اسکے علاوہ آپ نے یہ نہ خیال فرمایا کہ بسانے کے لفظ میں بھی تو بوئے گل کے ساتھ ایہام تناسب موجود ہے جو کسی نے نہیں کہا۔ ہنر اس جواب کو سن کر پھڑک گئے جیسے ایک پردہ پڑا ہوا تھا وہ اٹھ گیا۔ اس کے دوسرے دن کا ذکر ہے کہ ایک مجلس میں ہنر نے اپنا سلام اور مرثیہ پڑھا۔ سلام میں یہ مصرع تھا

ع سزاوار خلافت اور امامت ایسے ہوتے ہیں

جب وہ پڑھ کے اترے اور مجلس برخاست ہو گئی تو میں نے ان سے پُوچھا کہ سزاوار

خلافت فارسی ترکیب ہے خلافتہ ، یہ امارت کا عطف (اور) کے ساتھ کیا درست ہوگا ۔
فوراً سمجھ گئے کہا کہ اس شعر کو میں سلام میں سے نکال ڈالوں گا ۔

اس سے پہلے ہمارے ان کے درمیان ایک بحث یہ بھی ہو چکی تھی کہ مرزا ولی عہد کے یہاں یہ مصرع "عیاں ہے ابروئے جاناں ہلال کی صورت" طرح ہوا تھا ۔ ہنر کے ایک شاگرد تھے آغا حسن مذہب انہوں نے اپنا مطلع میرے سامنے پڑھا ۔

غزل پڑھوں میں دعائے ہلال کی صورت　　　عیاں ہے ابروئے جاناں ہلال کی صورت

میں نے کہا قافیہ مکروہ ہو گیا اس مطلع میں ، ایطا ہے انہوں نے مرزا مستیا عیش کو یہ مطلع سنایا انہوں نے بھی کہا ایطا ہے منشی ہنر نے کہا تکرار قافیہ ہرگز نہیں ایک مصرع میں دعائے ہلال قافیہ ہے دوسرے میں ہلال ہے ۔ فارسی کا شعر

اے دل اول بگو تو بسم اللہ　　　کن ادا شکر نعمت اللہ

بطور شاہد کے پیش کیا یہ جھگڑا دور تک پہنچا ، لکھنؤ کے شعراء و علماء کے پاس استفتے بھیجے گئے ، کہ اس کی کیا وجہ کہ بسم اللہ اور اللہ ۔ کے قافیہ میں ایطا نہ ہو ۔ دعائے ہلال اور ہلال کے قافیہ میں ایطا ہو جائے ۔

میں نے اس شبہ کو اس طرح دفع کیا کہ بسم اللہ نام ہے ساری آیت کا اور تسمیتہ الکل باسم الجزء سے علمیتہ پیدا ہو جاتی ہے یعنی بسم اللہ علم ہے اور علم کے اجزا میں ہر جزو لایعنک ہو جاتا ہے ۔ اس سبب سے اللہ اور بسم اللہ میں ایطا نہ ہوگا اور دعائے ہلال علم نہیں ہے ۔ عبارت ہے ۔ اس سبب سے ہلال اور دعائے ہلال میں ایطا ہوگا ۔

گلشن الدولہ مرزا علی بہار

ناسخ والوں میں کہنہ مشق شاعر اور خوش فکر و خوش طبع سخن سنج تھے۔ غزل کی طرف توجہ کم تھی۔ ان کا یہ مطلع یاد ہے۔

نہ دل ہے مرا اور نہ وہ نازنین ہے
کئی دن سے پہلو میں کوئی نہیں ہے

مرثیہ کہنے میں مشّاق تھے۔ کہتے بھی خوب تھے۔ پڑھتے بھی اچھا تھے۔ ان کے سلام کا یہ مطلع مجھے پسند ہے۔

باغ میں مدح کی بیتیں جو مزا دیتی ہیں
ڈالیاں جھوم کے پھولوں کو گرا دیتی ہیں

ان کے مرثیوں کا سلاموں کا غزلوں کا سارا ذخیرہ تلف ہو گیا۔ ان کے شاگردوں میں مانوس الدولہ بھی مرثیہ کہتے تھے۔ مٹیا برج سے لکھنؤ جا کر مجلسیں پڑھتے تھے اور حسن سخن کی داد لے کر آتے تھے۔

مالک الدولہ صولت

فتح الدولہ برق کے بھتیجے تھے۔ شعر میں انہماک و استغراق کا یہ حال تھا کہ جانتے تھے شعر سے بہتر کوئی فن دنیا میں نہیں۔ ناسخ کے دیوان کو ایمان سمجھتے تھے بار بار اول سے آخر تک دونوں دیوانوں کا مطالعہ کیا چوٹی کے شعر زبان پر تھے۔ عروض کے زحافات و علل کو ہمیشہ رٹا کرتے تھے۔ جوان مر گئے اور مرتے مرتے مشاعرہ کر کے مرے۔ دق میں مبتلا تھے مگر صحبت احباب و محفل شعر و سخن میں آکر جان آجاتی تھی۔ صاحب فراش ہو گئے تو کئی مہینہ تک گھر سے نہ نکلے۔ ایک دن میرے پاس رقعہ آیا کہ میرے یہاں مشاعرہ ہے احباب کے دیکھنے کو جی ترس گیا۔ ایک طرح بھی کر دی ہے۔

ع ۔ اے آمدنت باعث آبادئ ما۔

میں اس مشاعرہ میں گیا تھا ہم سب لوگ تختوں کے چوکے پر بیٹھے تھے مالک الدولہ اپنے پلنگ پر گاؤ تکیہ کے سہارے سے کچھ بیٹھے تھے کچھ لیٹے تھے۔ لوگ اپنی اپنی غزل طرح میں پڑھ رہے تھے۔ ہر شخص کے آگے نفیس حقہ اور خاص دانوں میں پان رکھے ہوئے تھے۔ چائے تقسیم ہو رہی تھی۔ جب صاحب خانہ کے پڑھنے کی باری آئی یعنی سب لوگ پڑھ چکے تو مالک الدولہ سیدھے ہو کر بیٹھے اور طرح کی غزل نکال کر اس طرز سے پڑھی کہ معلوم ہوتا تھا یہ بیمار ہی نہیں ہے۔ یہ شعر مجھے یاد رہ گیا اور آپ سب صاحبوں کے سننے کے قابل ہے۔

ماتم میں میرے غم سے نہ کرنا تباہ حال   تم شعبدے سمجھنا یہ لیل و نہار کے

اوپر کا مصرع مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں ہے مگر اس مصرع نے ع

تم شعبدے سمجھنا یہ لیل و نہار کے، ایک نشتر کا کام کیا اور پس پردہ کسی کے رونے کی

آواز سنائی دی - لوگ اٹھ کھڑے ہوئے محفل برہم ہو گئی -

مٹیا برج کے شعرا میں ان کا دیوان مجھے ملا تھا میں نے سارے دیوان کا انتخاب کر کے رسالہ ادیب (الہ آباد) میں کئی قسطوں میں اپنے نقد و تبصرہ کے ساتھ شائع کر دیا تھا -

اس کے دانتوں کے مقابل جو گہر جاتا ہے
دل سے گر جاتا ہے آنکھوں سے اتر جاتا ہے

یوں ہے صحرا میں ہوا پر ترے وحشی کا غبار
جیسے دیوانہ کوئی خاک بسر جاتا ہے

آتشِ حسن کو پانی سے بھڑکتے دیکھا
جب نہاتا ہے تو وہ اور نکھر جاتا ہے

جسم سے جان جدا ہو کے بھلا خاک آئے
کہ نکل کر نہیں پتھر میں شرر جاتا ہے

آمدِ فصلِ خزاں بھی ہے قیامت سے فزوں
چہرہ بلبلِ تصویر اتر جاتا ہے

دستِ صیاد سے بلبل کی رہائی کے لئے
غنچہ مٹھی میں دبائے ہوئے زر جاتا ہے

ہر حبابِ لبِ جو کہتا ہے باچشم پر آب
یہ زمانہ فقط آنکھوں میں گزر جاتا ہے

اس زمین میں غبار کے جانے کا انداز اور بلبلِ تصویر کا چہرہ اُتر جانے میں ایہام تناسب مجھے لطف دیتا ہے اور حبابِ لبِ جو والا شعر تو بے مثل ہے - شرر و زر کے قافیہ میں ردلیف اچھی نہ رہی اور یہ دیکھنے کی بات ہے کہ ردلیف کے نہ چپکنے سے شعر کس قدر سست ہو جاتا ہے -

بہ نسبت اسم و حرف کے فعل میں ایہام زیادہ لطف دیتا ہے - صائب

شکار اگرچہ دریں پہن وحشت بسیار است
مرا گرفتن عبرت ز روزگار بس است

عرفی - عدل تو بفر زندی برداشت ستم را - یہاں گرفتن اور برداشتن نے جو لطف دیا ہے اگر ایڈیسن سنتا تو اُسے بھی اپنی رائے سے رجوع کرنا پڑتا -

حرم میں دیر میں صنم ہے، اِدھر کو اب یا اُدھر کو چلیئے
کہاں یہ کم ہو گی دل کی وحشت، یہ ہے تردد کدھر کو چلیئے

کہیں وہ دیکھیں نہ اس طرف کو، بچا کے ان کی نظر کو چلیے
پڑے نہ آکر خدنگِ مژگاں، چھپا کے ان سے جگر کو چلیے

گزر گئی اب شبِ جوانی، ہے آمدِ مرگِ ناگہانی
یہ صبحِ پیری کی ہے زبانی، کمر کو کسیے سفر کو چلیے

میں بھیج کر خط ہوا ہوں مضطر، نہ قاصد آیا نہ وہ ستمگر
تلاش کیجیے نشانِ دلبر، کہ ڈھونڈھنے نامہ بر کو چلیے

یہ دل میں مانی ہے ہم نے منت، وطن میں کس کو دکھائیں صورت
بغیر شاہِ اودھ کے صولت، کبھی نہ اختر نگر کو چلیے

بادشاہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لکھنؤ کا نام اختر نگر بھی ہے اور اسی مناسبت سے میں نے چاہا کہ اپنا تخلص اختر رکھوں مگر معلوم ہوا کہ اختر کسی کا تخلص ہے تو میں نے ان سے تخلص مول لے لیا۔ جن سے بادشاہ نے تخلص مول لیا وہ قاضی محمد صادق خاں اختر ہیں۔ یہ بنگالہ سے آکر لکھنؤ میں ایسا رہے کہ پورے لکھنوی ہو گئے۔ یہیں تحصیل کی یہیں فنِ شعر میں کمال پیدا کیا اور یہیں سے جاگیر و زر و مال حاصل کیا۔ ان کا اہلِ زبان میں شمار ہے۔ لکھنؤ کی زبان ان کی اکتسابی نہ تھی بلکہ ان کے گھر کی زبان ہو گئی تھی۔ تعلق ازدواج بھی انہوں نے اہلِ شہر میں کیا۔ میرے ایک عزیز مرحوم نواب یوسف حسین خاں ان کے نواسے ہیں اور انکی جاگیر کے مالک تھے اور یہ تخلص کا بیچنا کچھ بادشاہ کی خاطر سے تھا ورنہ انہوں نے کبھی اپنا تخلص نہیں بدلا۔

وہ پردہ میں ہیں نور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی — کیا دشتی طور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
ہیں کوہ پہ فرہاد ہوا دشت میں مجنوں — قصہ مرا مشہور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
وہ کہتے ہیں بدنام کیا خلق میں تم نے — سُن لو وہی مذکور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
کس سمت سے قاصد کو ملے جلد گھر اُن کا — دو راستے ہیں۔ دور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

اتنی بڑی ردیفوں میں میں نے بھی دیکھا ہے کہ کوئی شعر ایسا جو نشتر بدل ہو نہیں نکلتا

ایسی زمینوں میں فقط ردیف کا چمک جانا اور محاورہ میں پورا اترنا انتہائی خوبی ہے۔

وہ ملے تدبیر ایسی چاہیئے | بس مجھے تقدیر ایسی چاہیئے
تیرے ابرو دیکھ کر بسمل ہے دل | برق دم شمشیر ایسی چاہیئے
تا قیامت جس میں رہنا ہو تمہیں | غافلو تعمیر ایسی چاہیئے

غزل کے مضامین میں بے ثباتی دنیا کا مضمون بہت ہی پیش پا افتادہ ہے۔ اہل تہذیب ہمیشہ سے اس کوشش میں ہیں کہ غزل میں اس کے علاوہ بھی اخلاقی مضامین کی گنجائش ہو سکے۔ صائب نے اس کی راہیں بہت اچھی نکالیں کہ اخلاقی مضمون ہے اور پھر بھی غزل کا شعر معلوم ہوتا ہے ؎

تا ترا چوں دیگراں دیدن ظاہر کار ست | چشم بر روے تو چوں آئینہ بر دیوار ست
زیر شمشیر حوادث پائے بر جا ایم ما | رو نمی تابیم از سیلاب دریائیم ما
دل بستگیِ خلق بہ عمر گزراں چیست | استادگیِ عکس دریں آب رواں چیست
گل بے خار اگر بود دریں باغستاں | دامنے بود کہ از صحبتِ مردم چیدند
نریخت تا گہرِ عاریت ز دامن خویش | غبار تیرگی از چہرہ سحاب نرفت
چو ماہ نو قدِ خم گشتہ در سپہر وجود | اشارتیست کہ آمادہ باش رفتن را
بزرگ اوست کہ بر خاک ہمچو سایۂ ابر | چناں رود کہ دل مور را نیازارد

چاہا بہت کہ رازِ محبت نہاں رہے | کیا کیجیئے کہ آنکھ سے آنسو رواں رہے
صیاد اب تو ہم کو رہا کر پئے خدا | دل میں نہ مرتے دم ہوسِ بوستاں رہے
یوسف کی جستجو نے ہمیں خاک کر دیا | مثلِ غبار راہ پسِ کارواں رہے
گو ہم چمن سے دور ہیں لیکن یہ ہے دعا | گلشن رہے بہار رہے باغباں رہے
آفت سے دور رہنا قضا کی دلیل ہے | اُڑ جاؤں میں خدنگ سے زاغ کماں رہے

مطلع میں ایک درد ہے۔ صیاد والے شعر میں اب تو سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ طائر

اسیر کو اپنے مرنے کا یقین ہو گیا - کارواں کی رعایت سے یوسف کی جست وجو باندھا ہے ورنہ یوسف کی جگہ منزل کا لفظ بھی کہہ سکتے تھے جہاں کو شعرا ہمیشہ سے طلسم سمجھا کئے، اور آج کل کے علوم جدیدہ نے اس کا طلسم ہونا ثابت کر دیا - اس سے بڑھ کر طلسم میں کیا ہوگا - کہ عالم میں خاموشی محض ہے اور ہمیں آوازیں سنائی دیتی ہیں - نیوٹن ثابت کر چکا ہے کہ عالم میں اندھیرا ہے - آفتاب و کواکب سیاہ ہیں اور ہمیں دنیا روشن دکھائی دیتی ہے - اب ہمیں اس کا انتظار ہے کہ یہ مسئلہ بھی کوئی ثابت کر دے کہ عالم معدوم ہے اور ہم اسے موجود سمجھ رہے ہیں - باغباں والا شعر مجھے بہت پسند ہے - آفت سے دور رہنا بھاگنے کے معنی پر ہے ورنہ مضمون میں سستی پیدا ہو گی ؎

خلاف قاعدہ کیوں ہو خفا کہو تو سہی ۔۔۔ قصور، کوئی گنہ، کچھ خطا، کہو تو سہی

ہمیں سخن کلامی کی تاب لاتے ہیں ۔۔۔ کسی کو اور ہمارے سوا کہو تو سہی

بیان کو دشنِ تیرِ مژہ پہ وہ بولے ۔۔۔ کہاں کہاں ہے نشان زخم کا کہو تو سہی

یہ زمین مخدرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ عالم کی نکالی ہوئی ہے ؎

تمہارا دل تو نہ عالم اسیر گیسو تھا ۔۔۔ یہ کس طرح سے ہوا مبتلا کہو تو سہی

نہ وہ مزاج نہ وہ چہچہے نہ وہ ہنسیاں ۔۔۔ اداس رہنے کا باعث ہے کیا کہو تو سہی

بیگم صاحبہ نے یہ غزل کہی اور خود ان کی دھن رکھی گانیوں کو حکم ہوا کہ یاد کریں - مجھے یاد ہے کہ اس غزل کا ایسا رنگ بندھا کہ اکثر لوگوں نے اس زمین میں طبع آزمائی کی کسی نے ردیف میں تصرف کر کے سنو تو سہی کر دیا - ع سنبھال تیغ ادا کو ذرا سنو تو سہی صولت کے اس شعر میں - ع کسی کو اور ہمارے سوا کہو تو سہی ردیف کا لطف اور زبان کی خوبی دیکھو پڑھتی ہے - نواب مخدرہ عظمیٰ کی اس غزل پر نواب محبوب عالم صاحبہ نے مصرعے لگائے ہیں ان دونوں بیگموں کو منشی ہنر صاحب سے مشورہ تھا دونوں صاحب دیوان ہیں مگر محبوب محل کا دیوان شاید تلف ہو گیا -

یکایک آئی کہاں سے بلا کہو تو سہی ۔۔۔ یہ کیوں اتر گیا منہ چاند سا کہو تو سہی

یہ حال عشق میں کس کے ہوا کہو تو سہی — ہوئی ہے کاہشوں کی وجہ کیا کہو تو سہی
ملال کیوں ہوئے اے مہ لقا کہو تو سہی

ہمیشہ سے یونہیں عادت ہے قسمیں کھانے کی — ہیں یاد تجھ کو دغابازیاں زمانے کی
عبث عبث نہ قسم کھاؤ کل کے آنے کی — نقط یہ گھات ہے پہلو سے اٹھ کے جانے کی
کیا ہے کون سا وعدہ وفا کہو تو سہی

رقیب کو نہیں ایسا ملال دیتے ہو — ہمیں کو رنج و غم قتیل و قلق دیتے ہو
مزا ہے دل کے جلانے میں کیا کہو تو سہی

کہیں کچلیں نہ یہ اونچے دل آکر پاؤں کے نیچے
کہ ہیں گیسو تمہارے سر کے اوپر پاؤں کے نیچے
سوم کو بھی نہ آئے فاتحہ کو قبر عاشق پر
نہ روندی تم نے یہ پھولوں کی چادر پاؤں کے نیچے
تپے گا چرخ سے بالائے سر مہر مبیں آکر
زمیں تانبے کی ہوگی روز محشر پاؤں کے نیچے

یہ زمین بادشاہ کی طرح کی ہوئی ہے۔ شعرائے سبعہ سیارہ اور تمام سخن سنجان دربار نے ٹوٹ ٹوٹ کر فکر کی تھی۔ میں شریک صحبت نہ تھا مگر غزلیں اکثر لوگوں کی سنیں اگر وہ مشاعرہ چھپتا تو انتخاب میں اچھے اچھے شعر آتے ۔

مانگے خالق سے دعائے خیر قاتل کے لئے — گر زباں ہو ہر دہان زخم بسمل کے لئے
بال آجانے کا ڈر ہے شیشۂ دل کے لئے — جان دینا اک نہ اک دن زلف ساقی کا خیال
پہلے میں عاجز نہ تھا دو چار منزل کے لئے — دو قدم چلنے پہ غش آتا ہے اب یہ حال ہے

زلف کی رعایت سے بال آجانے کا لفظ شعر میں لائے ہیں رعایتہً جہاں بھرتی معلوم ہو وہاں بے شک بری معلوم ہوتی ہے جیسے حافظ کے اس شعر میں ۔

یار گنجد ہم کنون ما گر میل کردہ ایم جو / ہر دو عالم پیش چشم ما نمودے یک عدم

اگر رعایتہ بے تکلف آجائے اور مبتذل بھی نہ ہو تو اب بھی لطف دے جاتی ہے۔

لاکھ ہم نیند کا بہانہ کریں / دخل کیا ہے جو چشم تر سوئے
گذری اوقات عین غفلت میں / آکے دنیا میں عمر بھر سوئے
کبھی چونکے نہ ہوشیار ہوئے / اجل آپہنچی اس قدر سوئے
جاکے سوئے عدم نہ لی کروٹ / واہ صولت یہ بے خبر سوئے

پہلے شعر میں اگر چشم تر کی جگہ دیدۂ تر کر دیں تو مصرع جب بھی موزوں رہتا ہے قافیہ جو پہلے تھا وہی اب بھی رہا لیکن ردیف بدل جائے گی یعنی سوئے پہلے فعلن کے وزن پر تھا اب فاع کے وزن پر ہو گیا اس سبب سے یہ مصرع دخل کیا ہے جو دیدۂ تر سوئے باوجود اس کے کہ بحر وہی ہے قافیہ وہی ہے ردیف بھی دیکھنے میں وہی ہے مگر دوسری زمین میں ہے اور زمین کے بدل جانے سے اس زمین میں یہ مصرع ہو تو غلط سمجھا جائے گا طالب فن کو اس کا خیال ضرور چاہیے۔ مثنوی میں ایسی غلطی اکثر میں نے دیکھی ہے۔ مثلاً ؎

جانبِ پشت تو گدھے کا تھا منہ / اس کی دُم کی طرف تھا ان کا منہ

دیکھنے میں تھا کا قافیہ کا صحیح معلوم ہوتا تھا لیکن تھا کا الف گر گیا اور کا میں الف باقی ہے۔ اس سبب سے اس شعر میں قافیہ نہیں رہا یا مثلاً یہ شعر ؎

ابر آیا ہے بادہ خوار آئے / اب بے پئے کس طرح قرار آئے

اس میں بھی پہلے مصرع میں آئے فعلن کے وزن پر ہے اور دوسرے مصرع میں فاع کے وزن پر ہے۔ غرض کہ اس شعر کے غلط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ زمین بدل گئی پہلے مصرع کا وزن مفعول مفاعلن فعلولن ہے اور دوسرے مصرع میں فعلولن کی جگہ مفاعیل ہو گیا۔ آزاد مرحوم اس نکتہ کو نہ سمجھے آب حیات میں جرأت کی اس غزل پر ؎

اجل گر اپنی خیال جمال یار میں آئے / تو پھر بجائے فرشتہ پری مزار میں آئے

خراب کیوں کہ نہ ہو شہر دل کی آبادی   ہمیشہ لوٹنے والے ہی اس دیار میں آئے

اعتراض کرتے ہیں کہ کس وصوم کی غزل تھی مگر آئے کہیں واحد سے کہیں جمع ہو گیا ہے۔ اگر برنت نے یوں کہا ہوتا ع پری بجائے فرشتہ مزار پر آئے تو البتہ زمین بن جاتی واحد جمع کو کیا دخل ہے جو یہاں تکلیف دی گئی۔

خفا ہو چکے آؤ مل جاؤ اب   چلو بس جبیں پر شکن پڑ چکی
نزاکت اگر ایسی ہی ہے تو پھر   یہ تلوار لے تیغ زن پڑ چکی
جو تقدیر ہی میں ہے فرقت لکھی   تو پھر کوئی تدبیر بن پڑ چکی
سبب شور کا گل نے پوچھا تو کب   جب آواز مرغ چمن پڑ چکی
کہی حکم اختر سے صولت غزل   کہ شہ سے بنائے سخن پڑ چکی

ایسی کڈھب زمینیں بادشاہ ہی نکالا کرتے تھے۔ کہ رسن پڑ چکی اور شکن پڑ چکی کے سوا قافیہ ردیف سے نہیں لپٹا مگر مالک الدولہ نے اچھے شعر نکال لیے۔

شکل پیش نظر کسی کی ہے   ایک صورت یہ دل لگی کی ہے
میر اول تو نہ تھا کسی لائق   نظر لطف آپ ہی کی ہے
اور کچھ تم سے واسطہ نہ سہی   جان پہچان تو کبھی کی ہے
دیں ہمیں دل ہمیں ہوں پھر مجرم   واہ کیا خوب منصفی کی ہے
سوزش قلب زاہد سن سن کر   اس منہ کیسی جلی کٹی کی ہے

ان اشعار میں تغزل کا لطف بھرا ہوا ہے اور یہی رنگ اُن کے دیوان میں زیادہ تر ہے مگر بادشاہ کی طبیعت تصنع کو بہت پسند کرتی تھی یعنی برق و بحر و خواجہ وزیر جس رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہی رنگ بادشاہ کو پسند تھا ان لوگوں کا شمار زبان اردو کے اساتذہ میں تھا۔ میر انیس سے شاعر معجز بیان نے بحر کے ایک شعر پر مصرعے لگائے اور سر منبر پڑھے۔ غرض کہ مالک الدولہ میں کچھ خاندانی اثر کچھ بادشاہ کی پسند کا خیال ضرور تھا اس رنگ کے شعر بھی ان کے

دیوان میں موجود ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں ؎

چاہے قیدی جو ترا رزق بلامنت غیر
ہے یقیں دامن زنجیر سے خرمن ہوجائے

کم ماہ کی ہے چاہ میں رشتہ کا مرض
کافی اب ڈوبنے کو چشمۂ سوزن ہوجائے

مگر یہ رنگ غیر طبعی ہونے کے بموجب کبھی عام پسند نہیں ہوا لکھنؤ میں ہمیشہ آتش وانیس ونسیم دہلوی کے جرگہ والے اس کا مضحکہ کیا کرتے تھے۔ رشک کے اکثر اشعار نقل محفل تھے لیکن یہ خیال لوگوں کا کہ یہ رنگ لکھنؤ کے ساتھ مخصوص ہے نفس الامر سے مطابقہ نہیں رکھتا۔ شاہ نصیر کا دیوان اٹھاکر دیکھیں کہ اول سے آخر تک اسی تصنع سے بھرا ہوا ہے ذوق کا کلام بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ مومن کا، اور غالب کا اردو دیوان بھی جادۂ مستقیم سے الگ ہے انہوں نے اس قسم کے تصنع کو چھوڑا دوسری قسم کا تصنع اختیار کیا اس سبب سے کہ جو غزل میں جدت نہ کرے وہ شاعر ہی نہیں لکھنؤ کے امرا میں نواب غضنفر الدولہ بہادر مرحوم شعر تو نہیں کہتے تھے مگر بڑے سخن فہم تھے، اور شوق کا یہ حال تھا کہ شہر کا کوئی مشاعرہ ان سے نہ چھوٹتا تھا مجھ سے کہنے لگے کہ بھئی شعر کا شوق کیا ہے تو ایک بات ہماری یاد رکھنا خدا کے لیے جدت پیدا کرنے کا زیادہ خیال نہ کرنا۔ رباعی

ہے ماہ صیام دل سے کر یاد الٰہ
لا دھیان میں ایام جوانی کے گناہ

آئینہ میں دیکھ صبح پیری کا طلوع
خیط ابیض ہے تیرا ہر موئے سیاہ

پیری کے حال کی یہ رباعی بیاض انتخاب میں لکھنے کے قابل ہے۔ موئے سیاہ کا خیط ابیض ہوجانا لطف سے خالی نہیں۔ رباعی کے اوزان میں ایک مغالطہ عامۃ الورود ہوا کرتا ہے کہ مفعولن مستفعلن مفاعیل فع کے وزن پر بعض مصرع کہہ جایا کرتے ہیں اور یہ کوئی وزن رباعی کا نہیں اس سے احتراز واجب ہے اور طالب فن کو یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ رباعی کا وزن حقیقی مفعول مفاعلن مفاعیل فعل ہے اور وزن الحاقی مفعول مفاعیل مفاعیل فعل ہے یہ دونوں وزن مطبوع ہیں۔ الحاق کا سبب یہ ہے کہ دونوں وزنوں میں نہایت مشابہت ہے ایک میں

مفاعلن ہے - اور ایک میں مفاعیل ہے مفاعلن میں پانچواں حرف متحرک اور چھٹا ساکن ہے اور مفاعیل میں پانچواں ساکن اور چھٹا متحرک ہے اس کے سوا اور کسی طرح کا فرق نہیں ہے وزن حقیقی میں بعمل تخنیق تین صورتیں پیدا ہوتی ہیں مفعولن فاعلن مفاعیل فعل مفعول مفاعلن مفاعیلن فع مفعولن فاعلن مفاعیلن فع - وزن الحاقی میں بعمل تخنیق سات صورتیں پیدا ہوتی ہیں مفعولن مفعول مفاعیل فعل مفعول مفاعیل مفاعیل مفاعیلن فع مفعول مفاعیلن مفعول فعل مفعولن مفعول مفاعیلن فع مفعول مفاعیلن مفعولن فع مفعولن مفعولن مفعول فعل - مفعولن مفعولن مفعولن فع ———

دو وزن وہ اور دس تخنیق سے پیدا ہوئے - یہ سب بارہ وزن ہوئے - اب بموجب اس قاعدہ کلیہ کے کہ چاہیں مصرع کو ایک ہی ساکن پر ختم کردیں چاہیں آخر میں ایک ساکن اور بڑھادیں ان بارہ وزنوں کے آخر میں جہاں جہاں فعل ہے اسے فعول کر سکتے ہیں جہاں جہاں فع ہے اُسے فاع کر سکتے ہیں - یہ چوبیس وزن رباعی کہلاتے ہیں - ان سب اوزان کے پرکھنے کی ایک سہل سی صورت ہے کہ مفاعلن اور فاعلن کے سوا جہاں جہاں نون ہو اسے متحرک کر کے پڑھو وزن مطبوع پیدا ہو جائیگا برخلاف مفعولن مستفعلن مفاعیلن فع کے کہ نون متحرک کر کے پڑھو تو اور بھی ناموزوں ہو جائے بہت عرصہ ہوا کہ وزن رباعی پر میں ایک مفصل مضمون شائع کرچکا ہوں اسے دیکھنا چاہیے - اس وزن میں ہزار برس سے گتھی پڑی ہوئی تھی جسے اس ہیچمدان نے سلجھایا ہے

تاریخ وفات نواب مصلح السلطان بہادر

انجم الدولہ مصلح السلطان — پیش بگرفت راہ از ہستی
گفت صولت پئے سنہ رحلت — بہ عدم رفت آہ از ہستی
۱۲۹۰

نواب انجم الدولہ بہادر مصلح السلطان پشتہا پشت کے امیر تھے دربار اودھ میں انکا مرتبہ وزارت کے قریب قریب تھا صورت پرمادہ پرستی تھی شاعر تو نہ تھے مگر فارسی و اردو کے صدہا شعر چوٹی کے یاد تھے کہ جس صحبت میں شعر پڑھنا شروع کرتے تھے لوگ محو ہو جاتے تھے - پوشاک کی نفاست اور عطر کا شوق ان کے مزاج سے مخصوص تھا - بادشاہ نے بنارس سے دخانی کشتیوں

پر سفر کیا تو یہ بھی ساتھ تھے۔ خلیج بنگال کے طوفان میں کئی کشتیاں ڈوب گئیں ان میں نواب صاحب کا پوشاک خانہ تلف ہو گیا مگر اس پر بھی پشمینہ اور جامدانی کی قبائیں ایسی ایسی باقی رہ گئی تھیں کہ نمائش میں رکھی جاتی تھیں اور ان کا مثل اب کشمیر یا ڈھاکہ میں دستیاب نہ تھا۔ رفعت الدولہ مرحوم ایک دفعہ کہنے لگے کہ میں جب عطر لگاتا تھا بیسن سے ہاتھ دھوتا تھا آج نواب انجم الدولہ کو میں نے دیکھا کہ عطر لگا کر انہوں نے ہاتھ نہیں دھوئے ذراسا کیوڑا یا گلاب ہاتھ پر چھڑکا اور دستی رومال سے رگڑ کر دونوں ہاتھ پونچھ ڈالے عطر کی چکنائی بھی چھوٹ گئی اور خوشبو بھی ہاتھوں میں رہ گئی۔ یہ بات نہایت پسند آئی۔

تاریخ خطاب وزیر السلطان

اے پرور تو شکوہ حشمت نازد — بر خسیر بہ شان و شوکت نازد

حق اینکہ بجاہ تو وزارت نازد — شوکت ناز بمصرعِ سال خطاب

۱۲۹۲

نواب سید امیر علی خاں باڑھ کے رہنے والے ہائیکورٹ کے وکیل تھے۔ مٹیا برج میں بادشاہ کے ملازم ہوتے بتدریج ایسی ترقی کی، ور اس قدر تقرب حاصل کیا کہ وزیر السلطان خطاب ہوا اور تمام اہل دربار ان سے رشک کرنے لگے ہر ایک کو فکر ہوئی کہ انہیں بادشاہ کی نظر سے گرائیں غدر کے زمانہ میں انہوں نے میجر کو نیا قلعہ وارو ٹیم فورٹ کو ایک جھوٹی خبر پہنچائی تھی کہ راجہ بن سنگھ لکھنؤ سے چھپ کر آئے اور بادشاہ سے ملے اور ایک فرمان مزین بمہر شاہی لکھوا کر لے گئے ہیں کہ اہلِ اودھ غدر کر کے انگریزی تسلّط کو اٹھا دیں میجر کونیا نے فوراً یہ واقعہ نواب گورنر جنرل کے حضور میں عرض کیا وہاں سے بادشاہ کو قید کر لینے کا حکم صادر ہو دیا۔

۲۳ شوال ۱۲۷۳ھ صبح کا وقت تھا بادشاہ وظیفہ میں مشغول تھے کہ داہنی طرف مڑ کر دیکھا کہ دریائے بھاگا رتی میں تین جنگی جہازوں نے ایوان شاہی کے محاذی لنگر ڈال دیا گورے وردیاں پہنے مسلح منتظر حکم کھڑے ہیں توپوں کا منہ سلطان خانہ کی طرف ہے۔ بائیں جانب مڑ کر دیکھا تو کئی پلٹنیں گوروں کی کوٹھی کو محاصرہ کئے ہوئے ہیں، اور سب پھاٹکوں پر کئی گھر چڑھی توپیں لگی ہوئی

ہیں اسی اثنا میں مصلح السلطان انجم الدولہ بہادر زریں پر تلا دولا لاتی لگائے حضور میں حاضر ہوئے عرض کی کہ میجر کوبنیا کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں حکم ہوا کہ بلالو میجر کوبنیا نے نواب گورنر جنرل بہادر کا پیغام پہنچایا کہ جبتک ہندوستان میں غدر ہے آپ کا ولیم فورٹ میں رہنا مناسب ہے جہاز اسی واسطے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ سوار ہو کر قلعہ میں رونق افروز ہوں ۔ بادشاہ نے جہاز میں سوار ہونے سے انکار کیا اس پر نواب گورنر جنرل کی سواری کی گاڑی فوراً منگائی گئی بادشاہ ایک لودہا ہاتھ میں لئے ہوئے سوار ہوئے ایک فوجی افسر نے چاہا کہ پہلو میں بادشاہ کے بیٹھ جائے نواب مجاہد الدولہ مسلح کھڑے ہوئے تھے دھکا دیا اور خود حسب قاعدہ پہلو میں بیٹھ گئے ۔ میجر کوبنیا سامنے بیٹھے شاگرد پیشہ والوں میں سے ایک شخص گاڑی کے پیچھے کھڑا ہونے لگا کہ نواب دیانتہ الدولہ بہادر نے اسے ہٹا کر کہا کہ آج یہ مقام ہم غلاموں کا ہے ان کے ساتھ عشرۃ الدولہ رفیق مجاہد الدولہ بھی گاڑی کے پیچھے کھڑے ہو گئے چوکڑی مٹیا برج سے چلی اور ولیم فورٹ میں داخل ہو گئی ۔ میجر کوبنیا نے اپنے روزنامچے میں اس طرح یہ سارا واقعہ لکھا ہے کہ میرے گوئندہ امیر علی نے مجھے خبر دی کہ کل راجہ مان سنگھ چھپ کر آئے اور بادشاہ سے غدر کے لئے فرمان لے گئے لیکن بعدہ معلوم ہو گیا کہ وہ خبر جھوٹی تھی اس روز تو راجہ مان سنگھ لکھنؤ میں موجود تھے ۔ حریفوں نے میجر کوبنیا کا روزنامچہ منگایا اور شاہزادہ مرزا جہاں قدر بہادر کی وساطت سے بادشاہ تک پہنچا دیا ۔ مگر بادشاہ عجب نفس رکھتے تھے فرمایا کہ اس زمانہ میں امیر علی میرے ملازم نہ تھے ۔

رد نساخ در جواب انتخاب نقص کی تاریخ

ع - کامل کو جو ناقص کہے خود ہو گا وہ ناقص ۔ ۱۲۹۶ھ

نساخ نے میر انیس و مرزا دبیر کے کلام پر اعتراضات شائع کئے ہیں منشی مظفر علی ہنر شعرائے سبعہ میں سے تھے اور مرثیہ بھی کہتے تھے مرزا صاحب کے پرانے شاگردوں میں تھے انہوں نے رد نساخ میں ایک کتاب لکھی صولت نے اس کی تاریخ میں یہ مادہ بہت بے تکلف نکالا ہے منشی ہنر صاحب نے وہ ساری کتاب اول سے آخر تک مجھے بھی سنائی تھی ۔

بہت ہی دنداں شکن جواب تھے افسوس ہے کہ چھپی نہیں اس کے تھوڑے دنوں بعد ان کے مکان میں آگ لگ گئی اور ساری محنت انکی تلف ہو گئی دو ایک باتیں مجھے یاد رہ گئی ہیں - ایک تو یہ کہ نشتر کی طرح پیر گئی ہر رگ و پے میں - اس پر یہ اعتراض تھا کہ تلوار کو نشتر کہا اور پھر نشتر ہر رگ و پے میں پیرتا کب ہے یوں کہنا چاہیئے تھا کہ ع سوزن کی طرح پیر گئی ہر رگ و پے ہیں - ہنر نے جواب دیا کہ نشتر کے لفظ میں کاتب اور معترض دونوں نے دھوکا کھایا میرے پاس وہی مرثیہ قلمی موجود ہے اس میں نشتر کی جگہ نشتر کا لفظ ہے ایک اور بات پر مجھے ہنسی آئی تھی وہ یہ ہے کہ ع گل تھا چراغ چشم ثریا مثال کا - اعتراض یہ تھا کہ ثریا میں بہت کم روشنی ہوتی ہے اور اُسے چشم سے تشبیہ دی تو کیا دی - ہنر نے جواب دیا کہ معترض کو یہ نہ سوجھا کہ چشم نابینا کی مدح میں یہ مصرع ہے اور نابینا ہونا اس لفظ سے بخوبی ظاہر ہے کہ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ گل تھا چراغ ہنر کا جواب بہت پر لطف و پر مغز تھا وہ تو آتشزدگی میں رائگاں ہوا مگر راجہ امیر حسن خاں مرحوم نے ان ہفوات کا ایک جواب لکھوا کر چھپوا دیا اس کے نسخے ٹیا برج میں بھی بھیجے تھے وہ بھی جواب بہت خوب لکھا گیا تھا۔ نساخ کی اس حرکت سے مجھے بھی ملال ہوا تھا ٹیا برج میں وہ آئے اور انسخ ان کے شاگرد بھی ساتھ تھے میں نے کہا آپ نے ناسخ سے انسخ و نساخ دو لفظ جو بنائے اس کی کہیں سند بھی ہے کہنے لگے انسخ باب التفضیل ہے - میں نے کہا افعل بمعنی مفعول بھی تو ہوا کرتا ہے جیسے اشہر بمعنی مشہور ہے تو اس قیاس پر انسخ بمعنی منسوخ ہو سکتا ہے اور نساخ کا لفظ آپ نے کہیں دیکھا ہو تو اسکی سند چاہیئے کہنے لگے مبالغہ ہے میں نے کہا ذلیل پیشوں کے لئے بھی یہی وزن آتا ہے جیسے حجام قصاب بقول بزاز حرفت نجار خیاط اس کی سند کا بھی وعدہ کیا پھر مرزا جہاں قدر نے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی غزل انہوں نے شروع کی اس میں بھی کئی غلطیاں تھیں ایک کا جواب نہ دے سکے ہر شعر پر یہی کہتے تھے کہ اس کی سند لکھ کر بھیج دوں گا - تحریر یہ بمرمہ کا لفظ بھی تھا۔ سید صالح خادم کربلا سے حضرت کے لئے عبا لے کر آئے تھے مالک الدولہ نے تاریخ

کہی بادہ کا مصرع یہ ہے ۔ ع پاک حلقہ پُر اختر آیا ۔ ۱۲۹۱؁ ہجری

ان سید صاحب نے خوب ہی دام فریب پھیلایا تھا بادشاہ سے کہا کہ امام حسین نے حکم دیا کہ عبائے خاکر واجد علی شاہ کو ہماری طرف سے دو بادشاہ نے وہ عبائے سیاہ سر پر رکھ لی سب شاہزادوں کے پاس بھیجی کہ سر و چشم پر اُسے رکھیں ۔ سید صاحب کو بہت کچھ اسکا صلہ مل چکا تھا مگر چلتے چلتے انہوں نے اور چونگا گیا عرض کی کہ ناصر الدین شاہ ایران کی طرف سے ایک جھاڑ کربلا میں روشن کرتا ہے میں چاہتا ہوں کہ حضرت کی طرف سے بھی جھاڑ روشن ہوا کرے فوراً یہ استدعا مقبول ہوگئی جھاڑ کی قیمت ، اور بتیوں کے ماہانہ مخارج کے لئے حکم ہوگیا ۔

تاریخ امام باڑہ جلیس الدولہ ۔ ع

مظلوم کی ہے بارگاہ ۔ ۱۲۹۰؁

یہ مصرع بحر رجز میں ہے ۔ جلیس الدولہ میرزایان شیراز میں سے تھے ۔ عہد سلطنۃ میں آکر بادشاہ کے ملازم ہوئے اور مرتے دم تک ان کی رفاقت میں رہے ان کے فرزند اکبر حامد الدولہ برتر ان کی خدمت عنایت ہوئی یہ شخص فارسی وارد دونوں میں اہل زبان بھی تھے ، اور دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے کلکتہ سے مٹیا برج جہاز پر آرہے تھے کنارہ کے قریب پہنچ کر ایک دوسرے جہاز سے ٹکر ہوئی غریق رحمت ہوگئے ۔ مرحوم بڑے پیراک تھے مگر انجن کے پھٹ جانے سے کچھ صدمہ پہنچا کہ ابھر نہ سکے ۔

تاریخ انتقال صاحب عالم مرزا ولیعہد ۔ ع

کوکب شد زیر خاک نا ئم ۔ ۱۲۹۱؁ ہجری

خلیج بنگال کے طوفان کی زحمتیں اٹھا کر بادشاہ جب کلکتہ پہنچے تو فسخ عزم کیا اور انگلینڈ کا جانا موقوف رہا اس وقت مرزا ولیعہد آمادہ ہوئے کہ آپ نہیں جاتے تو مجھے بھیجیے ان کے اس ارادہ سے بادشاہ بہت خوش ہوئے مرزا اسکندر حشمت ، اور جناب عالیہ بھی ساتھ چلنے پر آمادہ ہوئیں گو والدہ ولی عہد نواب مخدرہ عظمیٰ ناراض ہوئیں ، اور انہوں نے فہمائش کی کہ

بادشاہ نہیں جاتے تو تمہارے جانے سے کیا فائدہ ہوگا مگر انہوں نے ایک نہ سنی انگلینڈ میں ان لوگوں کا پہنچنا ایک نیا واقعہ تھا اہل شہر نے ہجوم کیا، اور دیکھنے کے مشتاق ہوئے ان کو سرکاری لوگوں کے سوا اور کسی سے ملنا منظور نہ تھا مگر مسٹر بیڈ اور مسٹر برنٹن کی سفارش سے کہ یہ دونوں انگریز متوسلین دولت اودھ میں سے تھے۔ انگلینڈ میں دونوں شاہزادوں نے دربار عام کیا میں خواجہ سرا صف بستہ پس پشت کھڑے ہوئے تھے اور مسٹر برڈ ہر ایک کے بر وقت تعارف خدمت ترجمانی ادا کرتے تھے اس دربار میں بڑے بڑے رئیس و عہدہ دار انگلینڈ کے آئے ہوئے تھے جناب عالیہ سے ملنے کو بہت سی معزز انگریزنیں آئی تھیں اور مس برنٹن ترجمان تھیں ملکہ معظمہ سے ایک ملاقات ہوئی تھی جس میں زحمت سفر کے سوا کچھ ذکر نہیں آنے پایا تھا کہ ہندوستان کے غدر کی خبریں آنے لگیں اور انگلینڈ کی ساری خلقت اس قدر ان لوگوں سے بیزار ہو گئی کہ وہاں ٹھہرنا مشکل ہوگیا۔ حکیم احسن الزمان نگینہ کے ایک طبیب اس قافلہ کے ساتھ تھے بیان کرتے تھے کہ ہم لوگ مکان کے دروازے بند کئے بیٹھے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ ہندوستان کے غدر کا قصاص ہم سے لیں مایوس ہوکر یہ لوگ پیرس میں چلے آئے دس پندرہ دن کے عرصہ میں جناب عالیہ اور مرزا اسکندر حشمت کا انتقال ہوگیا۔ امپراطور فرانس نے مرزا ولی عہد سے ملنا چاہا کہ تعزیت ادا کریں اور ملکہ معظمہ سے ان کی سفارش کریں مگر ولی عہد نے یہ عذر کیا کہ دونوں سلطنتوں میں صفائی نہیں ہے اور ہم کو انگلینڈ کی سرکار سے توسل ہے آپ سے ملنا مناسب نہیں معلوم ہوتا اور یہ ذکر میں نے سنا کہ جب یہ قافلہ لکھنؤ سے کلکتہ آرہا تھا تو رانی گنج سے ریل پر سوار ہوئے راہ میں فرانس ڈانگہ ملا وہاں جب ریل ٹھہری تو ایک ہندو محرر نے مرزا ولیعہد کو یہ صلاح دی کہ یہیں اتر پڑیئے اور اپنے معاملات کو دولت فرانس کی وساطت سے طے کیجئے اس سے بہتر ذریعہ آپ کو نہیں ملے گا۔ مگر انہوں نے یہی کہا کہ دولت فرانس سے پناہ لے کر انگریزوں کے قدیمی تعلقات کو قطع کرنا مناسب نہیں ہے۔

مرزا ولی عہد کا ایک دیوان ان کی زندگی میں چھپ گیا تھا دوسرا دیوان بھی تیار تھا۔

مگر انتقال ان کا ہوگیا کلام بالکل صاف ہے ذرا تصنع و تکلف کو دخل نہیں ہے وطن کا رونا ہر غزل میں ہے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

تاریخ غسل صحت جہاں پناہ

فلک جاہ واجد علی شاہ اختر
رہیں تا قیامت صحیح وسلامت

سدا ہفت اقلیم ہوں زیر فرماں
ملے تاج و تخت دوائے حکومت

نہ ہو پھر کبھی اختلال عناصر
رہے بد مزہ دشمنوں کی طبیعت

اُسے صحت حال کی فکر جس دم
بطرز جدید ایک ہاتھ آئی صورت

حروف صحیحہ میں تاریخ نکلی
سپر دعد و علت و حرف علت

زحافات کو اس سبب سے نہ لایا
کہ ہو وزن سالم دلیل سلامت

لکھ اے خامۂ فکر صولت یہ مصرع
مبارک ہو سلطاں کو یہ جشن صحت

۱۲۹۲ھ

شیخ صادق علی مائل

بادشاہی مرد ہے کے نواسے خواجہ آتش کے بڑے پیرو وں میں تھے۔ آتش کے دیوان کو اس طرح دیکھا کرتے تھے جیسے کوئی سبق لیتا ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ ایک ایک محاورہ کو وحی آسمانی سمجھتے تھے۔ کوئی مرید ہو تو ایسا تو ہو۔

استعداد کچھ نہ تھی اور چاہتے تھے جناب قائمتہ الدین کے حلقۂ درس میں شریک ہوں وہ شرح مسلم سے نیچی کتابوں کو نہیں پڑھاتے تھے یہ اس درس میں شریک ہو گئے۔ جناب نے فرمایا پہلے شرح تہذیب وقطبی وحاشیہ میں کسی سے پڑھ لو پھر شرح مسلم کے درس میں شریک ہونا جب انہوں نے بہت اصرار والحاح کیا تو جناب چپ ہو رہے۔ کئی برس تک یہ درس میں شریک رہے اور مطالب کے سمجھنے سے قاصر رہے آخر کو پڑھنا چھوڑ دیا۔

بادشاہ کے پاس انہوں نے اپنی غزل اصلاح کے لئے بھیجی بادشاہ نے ایک آدھ لفظ بنا دیا اور کئی شعر ان کی ستائش میں لکھ کر غزل کو واپس کیا۔ مائل نے مجھے بھی یہ بادشاہ کی اصلاحی غزل دکھائی تھی۔ ان کا مصرع تھا۔

ع ۔ جھگڑا چکائے بھی کہیں قاتل لگا کے ہاتھ

بادشاہ کی اصلاح یہ تھی۔ ع جھگڑا چکا چکے کہیں قاتل لگا کے ہاتھ

ان کی مدح میں جو شعر بادشاہ نے لکھ دئے تھے اس میں کا یہ پہلا شعر مجھے یاد ہے

اے شاعر نو سخن خدارا   انداز سخن نے تیرے مارا

بادشاہ کے اس ایک ہی شعر سے خیال کیجئے تو انتہا کی مدح نکلتی ہے اگر یہ کہتے کہ تمہاری غزل دیکھ کر میں پھڑک گیا دل بے چین ہو گیا تو یہ دونوں فقرے جملہ خبریہ ہوتے بادشاہ نے خبر کو انشا کے قالب میں ڈھالا ہے۔ یہ ایک مثال ہے فن بلاغت کے اس نکتہ کی کہ

خبر کو انشا بنا لینے میں کلام کا اثر کس قدر بڑھ جاتا ہے۔

غالب کے کلام کی شرح میں اس ہیچ میرز ہیچ مداں نے اس بات کی جا بجا تصریح کی ہے کہ شاعر و کاتب کا کمال یہ ہے کہ خبر کو انشا بنائے۔ علما نے خبر کے اقسام، انشا کی صورتیں بہت تفصیل و توضیح سے بیان کی ہیں لیکن یہ تصریح کسی نے نہیں کی تھی کہ خبر کو انشا بنا لینے میں کلام کی بلاغت بہت بڑھ جاتی ہے۔

اس نکتہ پر بس ایک ہی نظر پڑی اور اسی نے اس مسئلہ کو ادب الکاتب و الشاعر میں داخل کیا ہے

اے شاعر نو سخن خدارا　　انداز سخن ہے تیرے مارا

بادشاہ کے اس شعر میں فن بلاغت کا ایک نکتہ بھی ہے جسے علامہ جرجانی نے اسرار البلاغۃ میں ذکر فرمایا ہے اور غالباً ان کے سوا کسی کی نظر نہیں پڑی تھی وہ نکتہ یہ ہے کہ حذف سے کلام کی بلاغت بڑھ جاتی ہے۔

بادشاہ نے اس شعر میں "خدارا" کہہ کر کلام کو ختم کر دیا اور مقصود یہ ہے کہ "اے شاعر نو سخن۔ خدارا ایسی شوخیاں نہ کر" مقصود میں سے آخر کا فقرہ حذف کر دیا اور اس حذف کر دینے سے کلام کی بلاغت حدِ اعجاز تک پہنچ گئی۔ اسی قسم کی مثالیں دے کر صاحب اسرار البلاغۃ فرماتے ہیں کہ الفاظ تو کچھ نہیں اور معنی اس کے سننے والوں کے دلوں میں ما تلا دیئے یہ سحر نہیں تو کیا ہے۔

مائل کا یہ اعتقاد تھا کہ دنیا میں شعر سے بڑھ کر کوئی شرف نہیں یہ شعر کی فکر میں فنا ہو گئے تھے۔ شاعر خوش فکر و صاحب دیوان تھے۔

بادشاہ کے مرنے کے بعد ایک مائل تھے جو لکھنؤ میں زندہ پہنچے ایک میں ہوں جو حیدرآباد چلا آیا اور ابھی تک زندہ ہوں۔

ان کے کلام میں تصنع بالکل نہیں ہے

عہد پیری میں عیاں داغ جگر ہونے کو ہے
گرمیٔ ہنگامۂ شمع سحر ہونے کو ہے

یہ مطلع مائل کا ہے لیکن ایک بوڑھے شاگرد ان کے اپنے نام سے پڑھا کرتے تھے بعض لوگوں نے گرفت کی، اور کہا یہ مطلع تو مائل کا ہے۔ انہوں نے کہا اکثر لوگوں کا قاعدہ ہے کہ پیش خوانی میں استاد کا کلام پڑھا کرتے ہیں کوئی پسند کرکے داد دیتا ہے تو استاد کی طرف سے میں سلام بھی کر لیتا ہوں۔

یہ تین شعر مائل کے اور مجھے یاد آ گئے ہیں۔ مرزا ولی عہد کے مشاعرہ میں انہوں نے پڑھے تھے ؎

طریق گریہ تجھے چشم تر نہیں آتا | کہ ساتھ اشک کے خون جگر نہیں آتا
خدا دکھائے نہ تاریکیٔ شب فرقت | کہ آسمان و زمیں کچھ نظر نہیں آتا
نہ جانے کس کا یہ تیر نظر تھا آفت کا | کہ التیام یہ زخم جگر نہیں آتا

لکھنؤ میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا مائل اس میں شریک تھے۔ ایک شعر ان کا حیدرآباد تک پہنچا۔

موسےٰ کی آنکھ اور ہے میری نگاہ اور | اور جلوہ گاہ یار میں بے کار آئے ہیں

ایک دفعہ ان شعرا میں سے جو لوگ مشاق اور استاد تھے انہوں نے آپس میں اتفاق کیا کہ عہدِ رسالت کے واقعات و غزوات کو سب مل کر اردو میں شاہنامہ کے وزن پر نظم کریں۔ درخشاں نے عقد امیر المومنین و جناب سیدہ کو نظم کیا اور جشن کے جلسہ میں پڑھا۔ مائل نے فتح مکہ کے واقعہ کو نظم کرکے ایک محفل میں پڑھا۔ ان دونوں مثنویوں کو میں نے بھی سنا تھا بہت خوبی سے نظم ہوئی تھیں ہنر اور عیش، اور بہار نے بھی اسی قسم کی مثنویاں لکھی تھیں۔ یہ سب مثنویاں جمع ہو کر ترتیب واقعات کے ساتھ چھپ جاتیں تو اردو میں ایک نادر کتاب ہوتی۔

مٹیا برج جب تباہ ہوا تو ایک سال کے اندر اندر یہ سب لوگ مرگئے اور سارا کلام ان کا تلف ہوگیا ان مثنویوں کا بھی پتہ نہیں۔ گمان تھا کہ مائل کا کلام محفوظ ہوگا۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے شرر کو خط لکھا کہ مائل کے فرزند سے مل کر ان کے دیوان وقصائد ومثنویات کے حفاظت سے دیکھنے کی تاکید کریں۔ شرر گڑھ سے امین آباد گئے۔ مائل کے دیوان کو پوچھا تو صاحبزادہ نے کہا خدا جانے کیا ہوگیا ۔

بادشاہ کے داماد اور بھتیجے جنہیں بادشاہ نے خود پرورش کیا انکے والد مرزا سکندر حشمت ان کو بادشاہ کے ظلِ عاطفت میں چھوڑ کر مرزا ولی عہد اپنی والدہ ملکہ کشور کو لے کر انتزاعِ سلطنت کے معاملہ میں ملکہ وکٹوریہ کے حضور میں ایسٹ انڈیا کمپنی پر نالش کرنے گئے تھے۔

مسٹر برڈ اور مسٹر برنڈن یہ دو انگریز ملازمان سلطنت اودھ میں سے تھے ان دونوں انگریزوں کو بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ بے وفائی سخت ناگوار ہوئی انھوں نے یہ مشورہ دیا کہ انگلینڈ کے محکمۂ شاہی میں کمپنی پر نالش کرنا چاہیئے، لیکن ابھی نالش کرنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ ہندوستان میں انگریزی فوج نے غدر کر دیا۔ اور انگریزوں کو بہت ہی بے رحمی سے قتل کرنے لگے یہ خبریں انگلینڈ میں پہنچیں وہاں ایک قیامت برپا ہو گئی کشتیوں کے عزیزو اقربا ان لوگوں پر پل پڑے گالیاں اور غیظ و غضب کی چنگاریاں سب دشتم کی بوچھار ہر طرف سے ہونے لگی، ان کا بس چلتا تو لکھنؤ کے ان مسافروں کو کچا کھا جاتے اپنی جان بچانے کے لئے یہ قافلہ انگلینڈ سے روانہ ہو کر پیرس میں آ بسا غدر کے زمانہ کو طول ہوا بادشاہ کے بھائی اور والدہ دونوں پیرس کی خاک میں مل گئے۔

خلاصہ یہ کہ مرزا جہاں قدر کو خود بادشاہ نے پرورش کیا اور یہ سب شاہزادوں میں بڑے لائق اور ذی علم بھی تھے ویسرائے کے یہاں ان کو یا مرزا ولی عہد کو کب کو پرویٹ انٹری حاصل تھی یہ ٹالی گنج کے تمام میسوری شاہزادوں سے کلکتہ کے تمام حکام و شرفا سے بے انتہا ربط رکھتے تھے اس باب میں ان کو ایسا ملکہ حاصل تھا کہ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ کبھی کبھی مشاعرہ بھی کرتے تھے اپنا کلام مجھی کو دکھاتے تھے۔ غزل بہت کم کہتے تھے یہ مقطع انکی ایک غزل کا مجھے یاد ہے۔

محبت دونوں نے ہم کو نیتر پتہ ملا ہے دل و جگر کا

وہ نکلا پتھر سے آگ بن کر یہ ٹپکا مہندی سے رنگ ہو کر

آغا جو شرف کا یہ شعر ان کو بہت پسند تھا۔

چمن میں جا کے جو دل لی تلاش کی ہیں نے
چھدا ہوا اسے اک نوک خار ہیں دیکھا

طبیعت کا رنگ اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے شرف کے اس شعر کو اس قدر رٹا کہ ایک مدت کے بعد اسی کے پرتو سے یہ مقطع پیدا ہوا جو اصل سے بھی بڑھ گیا۔

انھوں نے مجھ سے سبعہ معلقہ پڑھی امراؤالقیس اور طرفہ کے قصیدوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ ایک شعر کا ترجمہ نمونہ کے طور پر سننے کے قابل ہے۔ طرفہ کا یہ شعر کہ وہ ایک نصیحت گو عورت سے خطاب کر کے کہتا ہے

عرب کے علوی ہمت و حوصلۂ بلند کی بولتی تصویر ہے اور اہل ادب کی زبانوں پر ہے۔ اس کا جو ترجمہ شاہزادہ صاحب نے کیا ہے داد کے قابل ہے۔

ڈرا طولِ شب غم سے نہ ہیں روز مصیبت سے
ترے سر کی قسم۔ مشکل کو مشکل میں نہیں سمجھا

میرے حیدرآباد میں آنے کے بعد لکھنؤ کے ایک فاضل ادیب سید محمد مہدی صاحب مٹیا برج میں وارد ہوئے یہ نواب اختر محل کی جاگیر کے ناظم تھے۔ جاگیر اودھ میں تھی اس سلسلہ سے ان کو اکثر مٹیا برج آنے کا اتفاق ہوتا تھا اور جناب قائمتہ الدین کے درس میں وہ اور میں ہم سبق بھی رہ چکے تھے غرض کہ میری غیبت میں جب وہ مٹیا برج وارد ہوئے تو مرزا جہاں قدر نے ان سے عربی لکھنے کی مشق کی اسی مشق کا نتیجہ تھا کہ ساری نحو میر فارسی سے عربی میں ترجمہ ہو گئی میرے پاس بھیجی تھی کہ میں بھی اس پر ایک نظر ڈالوں میں نے ایک تقریظ لکھ کر کتاب واپس کی۔ شاہزادہ صاحب نے یہ کتاب چھپوا کر جب مشتہر کی ہے تو اس پر

میری تقریظ بھی عربی میں چھپی ہے۔

مرزا جہاں قدر بہادر کو مرثیہ کہنے کا بہت شوق تھا شاہی امام باڑہ میں نہایت اہتمام سے مجلسیں کرتے تھے اور خود منبر پر پڑھتے تھے شاہزادہ علی اکبر[۲] نیزہ لے کر طارق سے آمادۂ قتال ہوئے ہیں۔

بجلی کا چلن پھل کے چمکنے نے دکھایا — گردوں پہ کمند اپنی لگا پھینکنے سایہ

یہاں سے نیزہ کی تعریف میں اتنے بند لکھے کہ رفعت الدولہ بادشاہ کے میر منشی پکار کر کہنے لگے کہ صاحب عالم میں نے اٹھارہ بند گنے کہ نیزہ کی تعریف میں آپ نے پڑھے۔ تعالی اللہ و جزاک اللہ۔

ان کے انتقال کے دس بارہ برس بعد کا ذکر ہے کہ پرنس مرزا مقیم نے مجھے لکھا کہ حضور مرحوم کا کچھ کلام میں نے فراہم کیا ہے آپ اپنی تصحیح سے اسے حیدر آباد میں ہی چھپوا دیجیئے۔ چار مرثیے چند سلام نوحے غزلیں سبعہ معلقہ کے دو قصیدوں کا اردو ترجمہ، میں نے یہاں مطبع شمسی چھپوا کر پان سو نسخے کلکتہ روانہ کر دیئے۔

مرزا آسماں جاہ انجُمؔ

یہ شاہزادہ عہد سلطنت میں پیدا ہوئے تھے۔ بادشاہ کے ساتھ مٹیابرج میں آئے یہیں ہوش سنبھالا۔ طبیعت میں انتہا کی موزونیت زبان و محاورہ گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ کلام اپنا مجھے دکھاتے تھے۔ میرے حیدر آباد آنے کے بعد دفتر حسرت اپنا دیوان چھپوایا۔ اسی زمانہ میں انتقال کیا۔

بڑی بحروں میں اور چھوٹی بحروں میں ان کے اکثر اشعار برجستہ نکلتے ہیں۔

کھیل گئے کیوں جان پہ انجم تم نے ابھی کیا دنیا دیکھی
مرنے لگے خوبانِ جہاں پر تیری میری دیکھا دیکھی

درد جگر کم تھا کہ نہیں تھا یہ تو بتا دم تھا کہ نہیں تھا
کہ تو مریض میں کچھ بھی دیکھا نبض جو تو نے مسیحا دیکھی

ایک ذرا سے حشر پہ واعظ۔ اس کو ڈرانا اللہ اللہ
جس نے بتوں کی گلی میں برسوں روز قیامت برپا دیکھی

واہ ری قسمت اب تک اس کو مرنا مرا باور ہی نہیں
سارے جہاں نے کشتۂ حسرت نام ہمارا رکھا ہے

دیکھو نہ جانا اس طرف انجم وحشت بلا ہے کوچۂ یار
کہنا مان ہمارا ورنہ مفت میں مارا رکھا ہے

زبان آرزو کا یہ محاورہ (مفت میں مارا رکھا ہے) ان کے سوا شاید کسی نے نظم نہ کیا ہوگا۔ ایسے محاوروں سے زبان اردو کی شان بڑھتی ہے۔

یا میری کوئی خطا بتا دے   یا رسم و رہ وفا اٹھا دے

اے اشک تو فرش کو ڈبو دے — اے آہ تو عرش کو ہلا دے

مانے کہ نہ مانے یار انجمؔ

اپنی سی تو کر کے تو دکھا دے

نہیں اچھا دکھانا دل کسی کا — کہا بھی مان او قاتل کسی کا

سرک جاتے ہیں اک جھلکی دکھا کر — کہ وہ جائے پھڑک کر دل کسی کا

لگا کر تیغ اب کیا سوچتا ہے — لگا دے نام اے قاتل کسی کا

منظفر علی اسیر کے شاگرد تھے دو دیوان ان کے ۱۲۹۰ھ کے پیشتر چھپ چکے تھے اور ہم سب لوگوں کو تقسیم ہوئے تھے اب شاید ایک مصرعہ بھی کسی کے پاس نہ ہوگا۔ مرزا ولی عہد افیون بہت پیتے تھے۔ ایک بوڑھا خواجہ سرا جس نے شاید بچپن میں ان کو پرورش کیا تھا اس کے حوالے یہ خدمت تھی۔ ابھی آپ سے باتیں کر رہے ہیں ذرا نشہ ختم ہوا۔ اٹھے اور سیدھے خواجہ سرا کے حجرہ میں پہنچے۔ سب سے چھپ کر چکے سے یہ گھلی ہوئی افیون کا قدح چڑھایا اور پھر آکر بیٹھ گئے ایک دن میں اتنی افیون پی جاتے تھے کہ میں سمجھتا ہوں اگر سو آدمیوں کو دی جائے تو مر جائیں۔ جب تک ہر وقت منہ کڑوا نہ رہے چین نہ آتا تھا۔ ہیضہ کی فصل تھی کہ انہوں نے انتقال کیا دس گیارہ بجے رات کو مٹیا برج کی گلیوں میں (ہائے مرزا ولی عہد) کی آواز سنائی دی مشہور تو یہی ہے کہ ہیضہ میں مر گئے۔ مگر آغا حجو شرف نے ان کے مرنے کی جو تاریخ کہی ہے اس میں یہ داستان نظم ہے کہ دشمنوں نے زہر پلا دیا چند دقیقہ گزرے تھے کہ روح مفارقت کر گئی۔ کلام میں تصنع اور بناوٹ نام کو نہیں سیدھا سیدھا کہتے ہیں اور اکثر غربت بے وطنی کا رونا روتے ہیں۔

مجھے ان کا کوئی شعر یاد نہیں ان کی دو غزلوں پر شرف نے مصرعے لگائے ہیں میں انہیں کے دیوان میں سے کوکب کے کلام کا نمونہ پیش کرتا ہوں۔

کس طرح آہ بھلا خاک فراہم ہوگی — کس طرف اڑ کے غبار اپنا گیا کیا جانے
صورتِ سبزۂ بیگانہ ہوا ہوں پامال — نخلِ امید مرا نشو و نما کیا جانے
کوئی تو ایسی خطا اس سے ہوئی ہوگی ضرور — سر جھکانا یہ گنہگار ترا کیا جانے

چھٹا ہے جس دن سے میرا مسکن
ملول ہیں دوست خوش ہیں دشمن

ملا نہ بعدِ فنا بھی مدفن — گواہِ غربت مری قضا ہے
رکھوں جہاں میں امید کس سے — ہزاروں ہیں میرے دل کو شکوے
خبر بھی اب تک نہ لی کسی نے — چراغِ تربت بجھا پڑا ہے.
نشان بھی اب نہیں چمن کا — نہ ذکر باقی ہے انجمن کا
ہم ایسے آوارۂ وطن کا!! — نہ کچھ نشاں ہے نہ کچھ پتا ہے

واجد علی شاہ اختر کے متنوع خصوصیات کے حامل تھے وہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے جو کہ اکثر اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے تھے، غزل بھی، مثنوی بھی، مخمس بھی، مسدس بھی، رباعی بھی، سلام اور مرثیہ بھی، اور ہر رنگ میں ان کی انفرادیت قائم ہے، زبان پر انھیں غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ خیالات پرے باندھے ہر وقت حاضر رہتے تھے ان کے منھ سے نکلا ہوا ہر بول سند تھا، بدیہہ گوئی ان کی خصوصیت تھی، ان کی شاعری میں وہ رفعت اور سوز و گداز نہیں ہے، جو زمانہ کے ستائے، دکھوں کے مارے، پریشاں حال اور آشفتہ روزگار، ناکام و نامراد شاعروں کی خصوصیت ہے، ان کی زندگی یکسر عیش و نشاط تھی، انکی شاعری بھی زندگی کے اسی رخ کی ترجمان ہے، لیکن زبان کی صفائی اور صحت، بندش کی چستی، خیالات کی روانی، ترکیب کی تراش خراش میں وہ خود اپنی مثال تھے، اس نقطۂ نظر سے بجا طور پر ان کے کلام کو "ملک الکلام" کہا جا سکتا ہے۔

اب ہم واجد علی شاہ کی غزل گوئی اور غزل سرائی پر مختصر سی گفتگو کریں گے۔

مولانا عبدالرزاق مصنف البرامکہ اپنے مشاہدہ مٹیا برج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

میرے ایک خاص عزیز تھے جن کا میں مہمان تھا، مٹیا برج کے اندر چھوٹے پیمانے پر گویا تمام لکھنؤ آباد تھا۔ کون سا محکمہ اور صیغہ تھا جو مٹیا برج کے اندر نہ تھا، جملہ آبادی ۴۰ ہزار تھی اور ایک لاکھ ماہوار پنشن میں ایک ٹکہ باقی نہ رہتا تھا۔ تفریحی سامان کے علاوہ علماء شعراء، اور مستند اور مستعد ادیب بھی موجود تھے۔ مولانا نظم طباطبائی مرحوم (پروفیسر نظام کالج) بھی شاہ کے ترتیب کردہ تھے، واجد علی شاہ خود بھی شاعر

تھے لیکن بقول ہارون الرشید بادشاہوں کے لئے شاعری سرمایہ فخر نہیں ہے بادشاہ خود کو شاعر تھے لیکن اُن کے اشعار، محاورات کی سند میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ زبان سندی تھی ہر دکاندار لکھنؤ کا تھا لہٰذا جس بازار میں گزر ہوتا تھا یہی معلوم ہوتا تھا کہ ہم لکھنؤ کے کسی بازار کی سیر کر رہے ہیں۔ اعلیٰ عہدہ دار اکثر سنی تھے اور بادشاہ کی بے تعصبی کی دلیل تھی۔

۱۸۸۷ء میں شاہ کا انتقال ہو گیا اور چند ہی سال کے بعد مٹیا برج فسانہ بن کر رہ گیا[1]

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

جس کی حالت ویرانی لکھنے سے قلم کا جگر شق ہوتا ہے اب بھی سیاحوں کیلئے مٹیا برج عبرت کدہ ہے

خواجہ عبدالرؤف عشرت عہد واجدی کے مشاعروں کی تصویر یوں کھینچتے ہیں[2] :۔

محل شاہی میں مشاعرہ نہایت شان و شوکت اور دھوم دھام سے ہوتے تھے لال بارہ دری میں سلیم گُل کو چمن بندی گُل و فوار کی ہوتی تھی کمرے میں تمام سامان عیش تیار ہوتا تھا، دریچیاں سبز سُرخ کاشانی مخمل کی مسندیں گز گز بھر کی جھالر نقرئی طلائی ٹنکی ہوئی چاروں طرف گلدستے قرینے سے رکھے ہوئے جھاڑ جھلب کنول، فانوس شام سے روشن ہو گئے پردوں میں نبات گوکھرو لچکا ٹنکا ہوا۔ چاروں طرف قد آدم آئینے آئینہ بندی۔ مشاعرے عام نہ ہوتے تھے۔ مشاعرے میں ہمیشہ اہل دربار شریک ہوتے تھے۔ اور کبھی خاص عزا بادشاہ مدعو ہوتے تھے۔

شام سے مرزا خرم بخت بہادر نواب یحییٰ علی خاں خان مرزا عظیم الشان نواب محمد تقی علی بہادر مرزا فریدون بہادر نواب مجید الدولہ عظمت الدولہ مرزا سلیمان قدر بہادر دارا سطوت مرزا حیدر شاہ پیاری تشریف فرما ہوئے اپنے اپنے مراتب کے موافق داہنے بائیں بیچ بیچ میں پہنچے مسند پر بادشاہ جلوہ افروز تھے۔

خواجہ سرا اگلگا جی کشتیاں جن میں بھاری بھاری لچکے گوٹے کے ہار الائچیاں چکنی ڈلیاں عطر کے کنٹر رکھے ہوئے۔ مخملی کشتی پوش پڑے ہوئے سب کے سامنے ایک ایک کشتی رکھ گئے ملازمین اٹھا لے گئے۔ اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ ہر ایک نے غزل پڑھی اور پر لطف صحبت بارہ بجے شب تک ختم

---

[1] یادِ ایام (عبدالرزاق) صفحہ ۲۲۹ ؎

[2] تذکرہ آب بقا ؎

ہوگئی۔ اہلِ دربار کا مشاعرہ ہر مہینہ میں ہوا کرتا تھا اور یہ صحبت بہت ہی پاکیزہ اور پرلطف ہوتی تھی۔ گرمی کے دن میں شام سے لال بارہ دری کی چھت پر چھڑکاؤ ہو رہا ہے قناتیں لگائی جاتی ہیں۔ پھولوں کے گلدستہ منڈیروں پر رکھے جاتے ہیں۔ مکلف فرش بچھایا جاتا ہے قناتوں میں بیلے کے ہار پھیلے ہیں۔ اہل دربار اپنے قرینے سے مؤدب بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ مدار الدولہ علی نقی خاں بہادر وزیر۔ یہ کون ہیں بہ فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا خاں برق۔ یہ کون ہیں؟ آفتاب الدولہ قلق یہ کون ہیں تدبیر الدولہ دبیر الملک منشی منظفر علی خاں بہادر اسیر۔ یہ کون ہیں؟ مقبول الدولہ احسان الملک کپتان مرزا مہدی علی خاں ثابت جنگ کرنل اس طرح تمام درباری تشریف لائے۔

اور اپنی اپنی جگہ فروکش ہوتے اتنے میں حضور جان عالم برآمد ہوئے تمام ارکین سروقد کھڑے ہوئے اور بسم اللہ کی صدا چاروں طرف سے آنے لگی۔ حضور مسند زرنگار پر باجاہ و جلال جلوہ افروز ہوئے مشاعرہ دہنی طرف سے شروع ہوا اور مختصر غزلیں پڑھی گئیں۔ علی قدر مراتب ہر ایک کی تعریف ہوئی سب کے بعد حضور نے اپنا کلام پڑھا اور مشاعرہ برخاست ہوا۔ تو سہا، اور امرا کے گھر بہت سے مشاعرے ہوتے تھے مگر حضور کبھی کسی مشاعرے میں تشریف نہیں لے گئے فتح الدولہ برق اور منشی اسیر نے بادشاہ کی اکثر غزلوں پر مصرعے لگائے ہیں جو مشہور عام ہیں۔[1]

واجد علی شاہ اختر کی شاعری، اور اس کے مختلف پہلوؤں پر خواجہ عبدالرؤف عشرت نے بڑی خوبی سے تنقید کی ہے:۔

حضرت قدر قدرت ابو منصور سکندر جاہ ناصر الدین حیدر زماں سلطان عالم واجد علی شاہ جان عالم علاوہ اور تمام فنون کے گلشن شاعری کی بھی گلگشت کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اس میں بہت کچھ گلکاری کی ہے۔ نظم کے ہر صیغے میں داد سخن دی ہے۔

تمام ہندوستان کے مشہور شاعروں سے صحبت گرم رہتی تھی۔ خاص مصاحبین اچھے اچھے نامی شاعر تھے خواجہ آفتاب الدولہ ارشد علی خاں قلق عرف خواجہ اسد قلق۔ فتح الدولہ بخشی الملک میرزا محمد رضا برق۔ تدبیر الدولہ

---

[1] تذکرہ آب بقا (خواجہ عشرت)

مدبر الملک مظفر علی خاں بہادر اسیر۔ گلشن الدولہ بہار۔

اس کے علاوہ صحبت مشاعرہ میں منتخب شعرا شریک ہوتے تھے وہ زمانہ اُردو شاعری کے شباب کا تھا زبان کے قواعد۔ محاورات کی پابندی۔ متروکات کا لحاظ۔ ثقیل اور غلط الفاظ کی بندش سے پرہیز کا دور دورہ تھا۔ پھر ہم عصر شعرا میں شیخ امام بخش ناسخ۔ خواجہ حیدر علی آتش۔ خواجہ وزیر۔ شیخ مستیا عیش۔ کپتان معتمد الدولہ قبول۔ آغا حجو شرف۔ الہ یار خاں سحاب۔ میر جان خاں انجم۔ میر محمدی بیتاب۔ میر امداد علی بحر۔ اصغر علی خاں نسیم۔ میر علی اوسط رشک۔ امیر علی خاں ہلال۔ نواب حسین علی خاں اثر۔ مہدی حسن خاں آباد۔ میر وزیر صبا۔ میر دوست علی خلیل۔ میر کلو عرش۔ شیخ محمد جان شاد۔ شیخ امان علی خاں سحر ایسے باکمال استاد فن موجود تھے شاعر۔ امرا میں بھی اس فن کی طرف کمال رغبت پائی جاتی تھی اس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ کوئی امیر اس فن سے کسب اکتساب سے خالی نہ تھا اور تمام شہر لوگان والا تبار اسی رنگ میں ڈوبے ہوتے تھے۔ مرزا ہزبر علی خاں ہزبر۔ کیوان ہمایوں جاہ قیصر حشم ولی عہد مرزا حامد علی خاں بہادر کوکب۔ نواب سید محمد خاں رند۔ راجہ جواہر سنگھ جوہر۔ نواب طالب علی خاں عیشی۔ مہاراجہ جے گوپال سنگھ ثاقب۔ نواب عاشور علی خاں عاشور غرض لکھنؤ میں شاعری کا اچھا خاصا باغ لگا ہوا تھا۔ جس میں طرح طرح کے گل بوٹے کھلے اور عجیب عجیب بلبل چہکتے ہوئے نظر آتے تھے بادشاہ کی قدردانی کے لحاظ سے خاص و عام میں یہ اسپرٹ بھری ہوئی تھی جس کو دیکھئے شاعر جس کو سنیے شاعر۔ دار السلطنت ہونے کی وجہ سے لکھنؤ کی زبان مستند اور مقبول عام تھی اور دہلی کا لوٹا ہوا مجمع بھی اسی دربار میں فروغ حاصل کر رہا تھا۔

محلات میں تمام بیگمات کو اگرچہ فیاض ازل سے سخن فہمی اور سخن گوئی کا حصہ ملا تھا لیکن بعض بیگمیں زبان اور محاورہ کے لحاظ سے نظم کی لڑیوں میں موتی پروتی تھیں۔ ان میں ملکہ مخدرہ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ عرف نواب خاص محل ملکہ عالم کا نمبر سب سے اول تھا ان کی تصنیف سے ایک دیوان بیاض عشاق اور ایک مثنوی بہت پیاری زبان میں مطبوعہ موجود ہے۔

ان کے علاوہ حضور عالیہ ملکہ اودھ اختر محل نواب نقی آرا بیگم بنت نواب علی نقی خاں تاج النسا نواب معشوق محل صاحبہ ملکہ جہاں مہر تن افسر النسا۔ نواب نشاط محل صاحبہ نواب زیب محل صاحبہ وغیرہ وغیرہ

اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

شاہ اختر کا شاعری میں معجز نمائی کرنا ایک لازمی فعل تھا بادشاہ کا مذاق شاعری ایک نفیس اور اچھوتا پہلو لیے ہوتے تھا۔

تحصیل فن کے اعتبار سے عروض میں اردو کی کتاب جواہر العروض خود ان کی تصنیف کی ہوئی اور دوسری کتاب ارشاد خاقانی شاہدین عادلین ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ کم سے کم علمی مذاق کے ہر شعبہ میں ایک نہ ایک تصنیف بادشاہ کی موجود ہے۔ پند و نصائح میں "نصائح اختری" اخلاق میں "مناظرہ مین النفس والعقل" مراثی میں "دختر عم" تجربات خاص میں "مجموعہ واجدیہ" علم موسیقی میں "ناجو" "دلھن" اور "بنی"۔ مثنویات میں "سر در خاقانی" "حزن اختر" "دریائے تعشق" "بحر الفت"۔

نامہ جات و رقعہ جات میں "ملک اختر" "خطبات" میں "مثنوی بحر مختلف" عروض میں "جواہر العروض" "ارشاد خاقانی" غزلیات میں چھ دیوان ضخیم اس کے علاوہ اور بہت سے مختلف فنون کی کتابیں ہیں۔ کلام زیادہ تر میر و مرزا کے طرز شاعری سے ملتا جلتا تھا۔ شاعری میں بڑے بڑے سخن فہم شاعر بیکلا اٹھتے تھے "خداوندا یہ شاعری نہیں سحر ہے۔ اعجاز ہے۔"

فارسی ترکیبوں کے جملے ایک جدید شان سے چھلکتے نظر آتے ہیں۔ اصناف سخن میں صرف قصیدہ ایک ایسی چیز ہیں۔ جن کے لکھنے کی بادشاہ کو احتیاج نہ تھی۔ آخر وہ بھی آئمہ معصومین علیہم السلام کی شان میں لکھے مرثیوں میں اگرچہ نازک خیالی اور شاعرانہ تخیلات نہیں۔ لیکن احادیث کا بامحاورہ ترجمہ اور سادی عبارت کچھ عجیب مزا دیتی ہے۔

زمانہ ولی عہدی سے غزل گوئی کا شوق ہوا عروض و قافیے کے سارے ازبر کیے مشکل سے مشکل بحروں میں بغیر کسی کی اصلاح کے موتی پرو دیے۔ اور مشاعرے میں غزل پڑھی بہت سے سخن فہم شاگرد ہوئے۔ مہتاب الدولہ خاں، تعیش الدولہ عیش، منشی مظفر علی ہنر، مرزا محمد عباس، شاہ لائق الدولہ شاہد اور شبیر وغیرہ وغیرہ کو اصلاح دی۔ غزل میں جو لفظ بنایا پتھر کی لکیر ہو گیا تھا جب نظام سلطنت ہاتھ

میں لی شعر و سخن کا چرچا بہت کم ہو گیا تھا۔ مگر باوجود اس کے دو منشی تصنیفات کی تحریر پر ملازم تھے۔ عہد سلطنت کا ذکر ہے منشی امیر اللہ تسلیم نے جو علاوہ شاعر ہونے کے خوشنویس بے بدل تھے ایک عرضیہ حضرت ابوالمنصور کی خدمت میں نظم میں نہایت خوش خط پیش کیا بالاتفاق وقت سے حضور کی نظر اس عرض داشت پر پڑ گئی دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بلا اصلاح شرح دستخط نظم لکھوائی وہ اشعار یہ ہیں:۔

بشنو اے خوشنویس اے خوشگو
ہر دو فن مے کنی دہر دو نکو
اسم تو مندرج بہ دفتر شد
نسبت دو روپیہ مقرر شد

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح حضور اردو نظم میں قادر الکلام تھے اُسی طرح فارسی بھی برجستہ فی البدیہہ کہتے تھے۔

بادشاہوں کا کلام اس سبب سے لوگ کم دیکھتے ہیں کہ ان کی شاعری تعریف کی بوچھاڑ سے کمال کی حد تک نہیں پہنچ پاتی اور مصاحبین کی بے جا خوشامد سے پختہ کلامی اور کہنہ مشقی نہیں آنے پاتی مگر شاہ اختر کا کلام اس عیب سے بری تھا۔ وہ اپنے کلام کو ہمیشہ نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھتے تھے ان کو ہر شک ہمیشہ دامنگیر رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی نقص شاعری کلام میں رہ جائے اور چونکہ خود سخن فہم تھے اسی سبب سے ایسے ویسے شاعر کی غزل ان کے مشاعرے میں مشکل سے مدح کی مستحق ہوتی تھی دوسرے اہل کمال کا کثیر مجمع آپس کی چشمک سے ہر ایک کا امتحان بنا رہتا تھا کوئی لفظ بے محل صرف کیا اور شاعر نظر سے گر گیا ایسا ویسا شاعر تو سامنے منہ نہیں کھول سکتا تھا آتش و ناسخ کی چوٹیں برق اور رشک کی نوک جھونک اکتساب فن کے واسطے کیا کم تھیں۔

ایک مرتبہ ایک شاعر نے ایک شعر مثالیہ پڑھا۔

اہل جوہر نہیں جھکتے ہیں کسی کے آگے
ڈھلتی ہے دبی تلوار جو فولادی ہے۔

حضرت نے بہت پسند فرمایا اور تمام مشاعرے نے داد دی۔ دوسرے مشاعرے میں ان کے لطیفے اسی کے جواب میں ایک شعر کہا جو عام پسند ہوا

نیک و بد سب سے جھک کے ملتے ہیں
دونوں ناکوں پہ تیغ کہتے ہیں

اسی طرح ہر مشاعرے میں ذوق چونکہ شاعر تھے کوئی نہ کوئی چوٹ فی البدیہہ اشعار ہوا کرتے تھے اور داد سخن ملتی تھی لیکن جانعالم نے زیادہ تر مشاغل امور سلطنت کے حیطہ فرمایا۔ دیدہ گوش خلائق ہوا۔ جو غزل مقبول خاص و عام تھی

مشکل سے مشکل اور سنگلاخ زمین آپ کے دریائے فکر کے آگے پانی تھی ہر پہلو پہ جزئیات بلاغت کا خیال رہتا تھا پھر تشبیہات و استعارات کی ملمع کاری نور علی نور۔

ان سب باتوں سے قطع نظر کر کے تمام کلام پر اجمالی نظر ڈالی جائے تو معنوی خوبیاں اور عمدہ تخیل کے سمندر موجزن نظر آئیں گے۔

جزئیات پر خیال کیجیے تو قلیل الاستعمال قافیے اس شائستہ پہلو سے نظم کئے ہیں جن سے بہتر کہنا غیر ممکن ہے۔

بندے کو اس کے عشق ہے ذات و صفات کا
مبدع حقیقتاً ہے وہ کل کائنات کا

حمد میں صفات و کائنات کے قلیل الاستعمال قافیے کس عمدہ تخیل کے ساتھ ادا کیے ہیں۔

ناقوس برہمن نے صدائے اذاں سُنی
سجدے میں نے قصد کیا سومنات کا

توحید پرستی کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا تھا۔

جانے بچا ہو گئے کس کا رہا سکن بچا
عشق کی منزل سے کب میں دوست اور دشمن بچا

رشکِ پائے یار سے پامال ہیں اہلِ فرنگ
ٹھوکروں سے اس بتِ خودکام کی ارگن بجا
رہروِ ملکِ عدم کا حال کچھ کھلتا نہیں
لے جرس اس قافلے پر ہے ترا شیون بجا

مذکورہ بالا اشعار میں خوبیِ معانی اور شوکت کے علاوہ ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کی ہر ردیف کے جدا جدا معانی پیدا ہوتے ہیں۔ مطلع میں "بجا" کے معنی ٹھکانے کے لئے گئے ہیں یعنی "برجا"۔ تیسرے اور دوسرے شعر میں "بجا" نواخت کے معنی پر نظم ہوا ہے۔ تیسرے شعر میں "بجا" درست اور صحیح کے معنی دیتا ہے۔

ابرو کا کوئی مجھ پر اب وار نہ ٹھہرے گا
وہ ترک بھی عاری ہے زنہار نہ ٹھہریگا
کانٹا ترے تلوؤں کا آنکھوں سے نکالیں گے
کھٹکا ہے نگاہوں میں یہ خار نہ ٹھہریگا

بعض بعض مقام پر رعایتِ لفظی کو آپ نے صرف کیا ہے۔ لیکن اس میں رعایتِ معنوی کا خوبصورت پہلو مضمر ہے۔

ساون کی طرح ہجر میں مینھ آنکھ سے برسا
بجلی کا بڑھا وصل میں کچھ نور نظر کا
کس کی نظرِ صاف کی تاثیر ہوئی ہے
اختر کو نہ دیکھا انشا کبھی ہم نے دو قمر سا
ابلقِ شب کو اگر یار نے موڑا ہوتا
توسنِ عمرِ رواں پہ مرا کوڑا ہوتا

خاص لکھنؤ کی زبان اور روز مرہ اور محاورات جو بادشاہ کے کلام پائے جاتے ہیں وہ بہت معتبر اور

مستند ہیں جس موقع پر جو جملہ استعمال کیا جاتا ہے اسکو پہلو سے نظم کیا ہے مثلاً

ترانہ گل کا جو پیک صبا نے سکھایا
چمن میں نغمۂ بلبل کو میں اڑا لایا

زندگی تخت پہ کی مر کے گئے قبر میں شاہ
فکر آغاز میں ہوتا ہے یہ انجام نصیب

روتا ہوں مرا اشک ہے قلزم کے برابر
خاموش ہوں لیکن ہے تکلم کے برابر

(نوشتۂ تقدیر)

یہ عشق ترے حسن سے قسمت میں لکھا ہے
افسوس نہیں چاہیئے ہم کو شدنی پر

نکالوں کس طرح دل سے تری مژگاں کے تیروں کو
مٹا سکتا نہیں انسان ہاتھوں کی لکیروں کو

غم پیری

دل بھی کملاتے ہیں جوں جوں بال ہوتے ہیں سفید
بلبلیں بھی سرد ہوں موسم ہے پت جھڑ کا اگر

مذمت دنیا

عشرت دنیا بزم غم اندوز ہو
رنج و غم توام مجھے ہر روز ہو

(عشق حقیقی)

کچھ نہیں اختر مجھے عشق مجازی سے حصول
اب تو معشوق حقیقی سے ہے اپنا اختلاط

جو معشوق حقیقی ہے مجھے اس کی غلامی ہے
وہ آتا ہے۔ کہ سرنامہ پہ جس کا نام نامی ہے

(خضوع وخشوع)

ہم نمازوں میں جب آس کھڑے رہتے ہیں
سامنے چشم کے دسواس کھڑے رہتے ہیں

(توحید)

چشم وحدت میں وہ معشوق جو لاثانی ہے
حلقہ چشم بھی اک خانۂ سلطانی ہے
شاہد اصلی مجھے مقصود ہے
کعبۂ دل میں وہی معبود ہے
دونوں صفحے ہیں تری وحدت پر دال
جب دوئی سے ان کو دیکھا فرد ہے
وہ جو معشوق حقیقی حسن میں موصوف ہے
عشق میں عاشق بھی اس کا شہر میں معروف ہے

(تجرد)

دفتر عالم میں بس وہ فرد ہے
جو مجرد اس چمن میں مرد ہے

(مختلف مضامین)

مے رنگین یہ لاکھوں کا نشہ سر چڑھ پہتے ہیں!
رخ ساقی سے یہ مے نوش سب مخمور ہوتے ہیں

پردہ نشین سماسکے دل ناشناس میں
آتی نہیں یہ بات ہمارے قیاس میں!
اگر محراب ابروبت کی ہے۔ تو آنکھ ساحر ہے
مسلمانی بظاہر ہے مگر باطن میں کافر ہے
کھلے گی تختۂ گل کا غنیہ سرخی خونِ شاعر کی!
قلم تیغِ مضامین ہے یہ سر ہوجائے حاضر ہے

زیادہ تر افسوس کی بات یہ ہے کہ اکثر تصانیف کا علمی ذخیرہ جس کو سلطانِ عالم خزینۂ درد جواہر سے زیادہ عزیز دیکھتے تھے۔ زوالِ سلطنت کے ساتھ ساتھ سفر میں گم ہوگیا۔

مثنویوں میں سرورِ خاقانی ایک ایسی مثنوی ہے جس میں بادشاہ نے اپنی عاشقی کی سرگذشت لکھی ہے اور واقعات کے لحاظ سے بہت دل چسپ ہے متنوعہ بیگمات کے ابتدائی تعلقات اور ملنے کے قصہ طلب واقعات کو بالتصریح نظم فرمایا۔

انتخابِ کلام

اختر کے کلام کا نمونہ ذیل میں درج کرتا ہوں۔

لگی ہو چوٹ جس کو عشق کی باتوں میں اچھا ہے
زباں نے خاصہ پیدا کیا ہے مومیائی کا
پابندِ دل ہوا جو تمہارے خیال کا
ہر دم ہے پیشِ چشم تصویر جمال کا
ہر عاشقِ دل سوختہ دیوانہ ہے اس کا
وہ شمع تجلّے ہے یہ پروانہ ہے اس کا

عارض صاف ترا رشک قمر دیکھ لیا
جان سی آگئی جب ایک نظر دیکھ لیا
جو شب کو کوٹھے پر وہ چاند بے نقاب آیا
چھپا ہلالِ فلک اس قدر حجاب آیا
رخ اپنا ہم کو دکھلایا تو ہوتا!
ذرا شورِ رخ کو شرمایا تو ہوتا
گالوں پر جو اس یار کے بالا نہیں رہتا
شب کو کبھی مہتاب پہ ہالا نہیں رہتا
الفت نے تری ہم کو تو رکھا نہ کہیں کا
دریا کا نہ جنگل کا ہوا کا نہ زمیں کا
میری زبان سے پوچھو مزا محبت کا
یہ خوب جانتی ہے ذائقہ محبت کا
نصیب فتح ہو یا مجھے شکست اختر
خدا بچائے ہوا سامنا محبت کا
دلِ گویا کو ترے عشق نے خاموش کیا
یار غیروں کی ہوئی محفل فراموش کیا
محبت کا بندہ بنا لیجیے گا!
مرا دل بھی نام خدا لیجیے گا
ابھی امتحان محبت نہ کیجیے
کبھی تیغ سے آزما لیجیے گا

عجیب کوچہ ہے اپنے جی کا کہ پاؤں ملتا نہیں خوشی کا
پتا نہیں ان کی دل لگی کا یہ دل بھی معشوق ہے کسی کا

(دنیا کی ہوس)

ہوس بڑھتی ہے اتنی جسقدر یہ عمر گھٹتی ہے!
ضعیفی کہہ رہی ہے کوئی کمسن ہو تو میں آؤں

گئی بہار نہ کر الفت زن و فرزند
خزاں چمن میں ہوئی موسم خضاب آیا

اندھیرا بزم میں تھا، تو جو انجمن میں نہ تھا
چمن اداس تھا اے گل جو تو چمن میں نہ تھا

غرور کا جو کیا احتمال اختر پر
کلام کبر زباں پر نہ تھا دہن میں نہ تھا

اختر اس بے مہر سے ناحق وفا کا دھیان ہے
تونے یہ کیسا خیال خام اے ناداں کیا

مجھی کو واعظ! پند و نصیحت
ذرا اس کو بھی سمجھایا تو ہوتا

کچھ لطف خوشی ہے - نہ مجھے خوف الم کا
حسرت ہے نہ راحت کی نہ دھڑکا ہے ستم کا

حیراں ہوں میں ان دونوں میں ترجیح کسے دوں؟
ہستی کی تمنا ہے نہ کچھ خوف عدم کا!

حیف ہے شہر خموشاں کا نہ کچھ حال کھلا
نہ وہ صورت نہ وہ سیرت نہ وہ احوال کھلا

آخری کلام

اودھ کے ایک اور داستان گو واجد علی شاہ کی شاعری کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

واجد علی شاہ کا کلام ہر صنف میں موجود ہے۔ غزل، سلام، مرثیہ، مثنوی، قصیدہ وغیرہ کے علاوہ نثر کی کتابیں بھی ہیں۔ دادرا ٹھمری بھی کہتے تھے اور خوب کہتے تھے شاید ہی کوئی بادشاہ اتنی تصنیفات چھوڑ گیا ہو۔ پورا کلام اب ملتا کہاں ہے جس قدر اب بھی واجد علی شاہ کی تصنیف زمانہ کے ہاتھوں سے محفوظ رہ گئی ہیں، وہ بھی بہت ہے۔ بادشاہ نے ہندی الفاظ و محاورات کے مستند طور پر طریق استعمال میں اور زبان اردو کی وسعت کو ترقی دینے میں بڑا حصہ لیا۔ بادشاہ کا کلام صفائی، اثر اور درد کا مجموعہ ہوتا تھا۔ جب بادشاہ کلکتہ جا رہے تھے تو سفر کے درمیان میں انھیں تکلیفیں پہنچیں۔ اس سفر میں انھوں نے یہ بے مثل شعر کہا تھا ؎

زمانہ تھا پسا کرتے تھے گوہر پاؤں کے نیچے
پر اب ہے دھوپ سر پر اور کنکر پاؤں کے نیچے
یہی تشویش شب و روز ہے بنگالہ میں
لکھنؤ پھر کبھی دکھائے گا مقدر میرا
آہ کرتا ہوں تو سب لوگ خفا ہوتے ہیں
اے نسیم سحری ہم تو ہوا ہوتے ہیں
یوں تو شاہانِ جہاں پر سے ہے پڑا وقت مگر
ختم ہے اختر بے کس پہ جفائے غربت
قید ہونے سے کہیں بوئے ریاست جائے گی
لاکھ گردش آسمان کو ہو زمیں ہوتا نہیں [1]

---

[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۴۷

واجد علی شاہ کا ایک نایاب دیوان

گلدستۂ عاشقاں

واجد علی شاہ کے قلم سے، نثر اور نظم میں بہت سی چیزیں نکلیں، جو زیور طبع سے آراستہ ہوئیں، مقبول ہوئیں، پسند کی گئیں، لیکن جس طرح زمانہ کا ورق الٹنے کے بعد واجد علی شاہ کا صحیفہ حیات بے نشان ہو گیا، اسی طرح مردہ دہر سے، ان کی ذہنی دماغی کاوشوں کے انمول جواہر پارے بھی مٹی میں مل کر خاک ہو گئے۔ غدر میں بہت سی چیزیں فنا ہوئیں اور مٹیں لیکن قلمی اور ذہنی شہ پارے جس طرح برباد ہوئے، وہ ایک ایسا المیہ ہے، جو نہ اب تک فراموش ہوا ہے، نہ آئندہ کبھی فراموش ہو سکے گا۔

"بنی" میں واجد علی شاہ نے اپنے تصنیفات مؤلفات کی جو شہرت دی ہے، وہ ۶ء سے متجاوز ہے، اور ظاہر ہے اس کے بعد بھی ان کا قلم خشک نہیں ہو گیا، وہ لکھتے پڑھتے رہے لیکن اب ان کی تصنیفات میں سے کون چیز، کتب فروشوں کی دوکان پر مل سکتی ہے؟ کوئی بھی نہیں، پرانی لائبریریوں اور کتب خانوں میں کہیں ڈھکی چھپی کوئی ایک آدھ کتاب مل جاتی ہے لیکن وہ بھی ناقص اور نا تمام۔

"گلدستۂ عاشقاں" واجد علی شاہ کے کلام نغز کا مجموعہ ہے، جس کا ذکر انھوں نے کتاب بنی میں بھی پینتیسویں نمبر پر کیا ہے، یہ اتفاق سے، چند روز کے لئے، ایک اہل علم کرم فرما کی عنایت سے میرے ہاتھ آ گیا، ۱۲۵۹ھ میں، یہ زیور طبع سے آراستہ ہوا، مطبع محمدی میں منشی محمد حسین نے اسے چھاپا۔

اس دیوان میں، حروف تہجی کی ترتیب سے واجد علی شاہ اختر کی غزلیات ہیں، ہماری رائے میں اردو شاعری کی روح غزل ہے، مثنوی وغیرہ کا نمبر بعد میں آتا ہے۔ اس دیوان میں جو خاصا ضخیم ہے، اختر کی بہت سی غزلیں ہیں ان میں رطب و یابس سب کچھ ہے، لیکن زبان کی روانی و شستگی، اور فصاحت و بلاغت اپنا جواب نہیں رکھتی، اس گلدستہ سے تو پھول (اشعار) چن کر ہم نے ایک ہار تیار کیا ہے، شاید اہل نظر پسند کریں۔

(۱) بحرِ الفت میں دلا دیدہ تر چھوڑ دیا
ناخدا تو نے جہاز آج کدھر چھوڑ دیا

(۲) رقص پائے یار پر مائل ہیں اہلِ فرنگ
ٹھوکروں سے اس بُت خود کام کی ارگن بجا

(۳) ٹٹ پونجیوں کا اختر میخانہ میں دورہ ہے
دوکان اٹھا ڈالو بازار نہ ٹھہرے گا

(۴) حسن اور عشق تخت و تاج ہوا
ہجر بھی وصل کا خراج ہوا

(۵) حکمرانی ہے حسن کی اے عشق
سکّہ داغ کا خراج ہوا

(۶) برباد نہ کر اس کو ذرا ہاتھ پہ دھر لا
اے باد صبا خاک در یار ادھر لا

(۷) یہ شمع نہیں ہے قدح جانانہ ہے اس کا
دل صورت پروانہ ہے دیوانہ ہے اس کا

(۸) اختر اس میکدۂ شعر میں ہے زیست حرام
ساغرِ عمر کہیں اور ڈبو با ہوتا

(۹) یہ قاتل سخت کیسا تھا دل مظلوم کیسا تھا
بتا اے خنجر مژگاں مرا حلقوم کیسا تھا؟

(۱۰) شب تاریک میں فانوس کا دھوکا ہوتا
بدنِ صاف ترا زیرِ قبا کھل جاتا

(۱۱) وہ وطن یاد ہے غربت میں وہ سارے احباب
ہائے کب مجھ سے ملیں گے مرے پیارے احباب

(۱۲) یاد آتا ہے پھر اس طفل کا سارا آداب
ہائے وہ ناز کا انداز وہ پیارا آداب

(۱۳) بجھ جائے سرد مہری بے مہر سے ابھی
آئے جو میرا نالۂ آتش فشاں قریب

(۱۴) منبرِ دل پہ ہے پہلے میرا پیغمبر خطیب
دوسرے زینہ پہ ہے پھر حیدرِ صفدر خطیب

(۱۵) گلوں کا نشو و نما ہے مجھی سے اے بلبل
سحابِ اشک سے کیوں کر نہ ہو چمن شاداب

(۱۶) مشکل بہت ہے خانۂ دلدار کا خیال
کوچہ میں کب ہے سایۂ دیوارِ باریاب

(۱۷) رُخِ انور سے نظر آئی سحر آخرِ شب
چھپ گیا عارضِ روشن سے قمر آخرِ شب

(۱۸) چودھویں رات میں ہوتی ہے سحر آخرِ شب
ماہرو آج ارادہ ہے کدھر آخرِ شب

(۱۹) شمع عریاں کی طرح دل نہ جلاؤ صاحب
اپنے جامہ سے نہ باہر ہوئے جاؤ صاحب

(۲۰) طور کیا یار کا سیکھا جو گئے پھر نہ پھرے
جسم کو عمر رواں سے ہے یہ تیری چال عذاب

(۲۱) پلکوں سے پھوٹ جائے گی بوتل شراب کی
گردش بھی چشم مست کی دکھلائیے حباب

(۲۲) رہے نہ حشر میں مٹی خراب اختر کی
پلائیں ہاتھ سے بھر بھر کے بوتراب شراب

(۲۳) چمن سے پھینک دیا میرا آشیاں کیا خوب
نہال مجھ کو کیا آ کے باغباں کیا خوب

(۲۴) ہمارا یار تو ہے لامکاں مکاں کیا خوب
خدا کے نام سے افزوں ہے یہ نشاں کیا خوب

(۲۵) شباب میں کسے معلوم یہ ضعیفی تھی
عجب بہار میں آئی ہے یہ خزاں کیا خوب

(۲۶) یہ اشتیاق تھا قاتل کا ہم کے قتل کے وقت
کہ چشم زخم کھلی ہے کہاں کہاں کیا خوب

(۲۷) پسند آگیا اس بادہ خوار کا اسلوب
وہ اس کی نشہ کی آنکھیں خمار کا اسلوب

(۲۸) کہاں بڑ مارتا پھرتا ہے اختر
صدائے شعر ہے آواز مجذوب

(۲۹) زلفیں بنائیں رخ پہ پکڑ کر تمام رات
جلتا ہے چاند آج بھڑک کر تمام رات

(۳۰) رند یاد کوچۂ جاناں میں جنّت کو گئے
زاہدوں کو لے گیا دوزخ میں سودائے بہشت

(۳۱) میرا مالک رکھے دوزخ میں تو جنت ہے وہی
مجھ کو اختر اب نہیں زنہار پروائے بہشت

(۳۲) وصل کی صبح سے ملی شب ہجر
ہجر کی نظر میں یہ گذری رات

(۳۳) سحر وصل ہو گئی کافور
شمع کرتی ہے آہ وزاری رات

(۳۴) شب گیسو کا یہ پھیلا ہے اثر آج کی رات
نظر آتا نہیں جو نور سحر آج کی رات

(۳۵) اے ترک ابروؤں سے رخ مہر و ماہ کاٹ
پڑنے اڑا نگوں کے سر کج کلاہ کاٹ

(۳۶) دم میں ملتے ہیں شفا دیکھ کے برسوں کے مریض
عاشقوں کے لئے اے جان مسیحا ہے یہ رُخ

(۳۷) مثل کندن کے چمکتا ہے ترا چہرہ صاف
ہم فقیروں کے لئے دولت دنیا ہے یہ رُخ

(۳۸) دندان و چشم و لب کا اثر اس قدر ہوا
دل سے اُٹھے شرار سفید و سیاہ و سُرخ

(۳۹) اُڑ جائے ابھی طائرِ جاں ہو جو قفس بند
صیاد سے تن میں نہوا ایک نفس بند

(۴۰) سوتا ہوں مرا اشک ہے قلزم کے برابر
خاموش ہوں لیکن ہے تکلم کے برابر

(۴۱) بلبل بھی اُڑی قافلہ گُلہیں کا ہے خاموش
ہوگا نہ جرس میرے تکلم کے برابر

(۴۲) سب اہلِ جہاں آنکھ میں ہیں پھر بھی ہے خالی
تشبیہ کہاں ہے اسے قلزم کے برابر

(۴۳) کرتا ہے کیوں تو اپنے نمک خوار سے بگاڑ
میں نے تو کچھ کیا نہیں سرکار سے بگاڑ

(۴۴) اچھا بُرے سے لڑکے نہیں ہوتا فتح یاب
گُل کی شکست ہو جو کرے خار سے بگاڑ

(۴۵) اب کوئی لینے والا بھی اس جنسِ دل کا ہے
مدت سے ہو گیا ہے خریدار سے بگاڑ

(۴۶) پوشیدہ ہے نگاہ سے جیسے مرا مسیح
صحت سے اور ہے دلِ بیمار سے بگاڑ

(۴۷) قاصد و ساتھ مرا چھوڑ دو اس منزل میں
راہِ اُلفت میں چلے گا دلِ ناکام فقط

(۴۸) آہوں کی بھی آواز ہے نو طرز مرصّع
نالہ کا بھی اک ساز ہے نو طرز مرصّع

(۴۹) اندھوں کو نہ خلخال کی آواز سناؤ
ہے ناز کا انداز بھی نوطرز مرصع

(۵۰) چشم تر میری اشکباری تک
برق ہے میری بے قراری تک

(۵۱) ذرے جو چمکا کرتے ہیں خورشید کی طرح
صدہا ہوئے ہیں صاحب حسن و جمال خاک

(۵۲) آئینہ سان چلے ہیں مکدر جہان سے
چمکائے گی غریبوں کا حسن و جمال خاک

(۵۳) پختہ ہوں خیال خام میں میں
ناصح نہ کرے گا مجھ سے بک بک

(۵۴) ہم نمازوں میں جو بیباک کھڑے رہتے ہیں
سامنے یہ بت سفاک کھڑے رہتے ہیں

(۵۵) بے قراری کو مری دیکھ کے اے شاہ سوار
با ادب توسن چالاک کھڑے رہتے ہیں

(۵۶) شوق وصل زنداں میں ہجر سے بڑھا اتنا
ہر کڑی کو آہن کی چشم مار ٹھہراؤں

(۵۷) مے کدے میں عالم کے عین بے خودی دیکھو
مے اگر وہ خمیازہ میں خمار ٹھہراؤں

(۵۸) تیغ ابروئے جاناں آنکھ میں لگی کاری
ہوں وہ دوست، دشمن کو اپنا یار ٹھہراؤں

(۵۹) اب اُس گلی میں اپنا گذر ہے بھی اور نہیں
ریگ رواں کی طرح سفر ہے بھی اور نہیں

(۶۰) شاعر ترے دہن کے معمّا میں رہ گئے
یہ طرفہ وصف ہے کہ کمر ہے بھی اور نہیں

(۶۱) تری خوش چشمی بنا دیتی ہے پرکار مژہ
اس قلم پہ ختم ہے جادو نگاری ان دنوں

(۶۲) ہے درِ مضموں کا پایا عرش و کرسی سے بلند
کیوں نہ شاہانِ جہاں ٹانکیں اسے اکلیل میں

(۶۳) نرخِ جنسِ حسن کا اے عشق دکّاں میں نہ کر
ایک بازارِ شکستہ دل بھی ہے اس شہر میں

(۶۴) بلبلو باغ میں نالوں کا اثر ہو کہ نہ ہو
آتشِ گل سے فزوں دردِ جگر ہو کہ نہ ہو

(۶۵) ایسے نالہ میں خدا جانے اثر ہو کہ نہ ہو
زلفِ شبگوں میں ہم اُلجھے ہیں سحر ہو کہ نہ ہو

(۶۶) عیشِ دنیا بزمِ غم اندوز ہو
رنج و غم توام سمجھے ہر روز ہو!

(۶۷) تابِ نظارہ نہ ہو اے شمع رو
شاہدِ اصلی جو بزم افروز ہو

(۶۸) جگرِ عاشق دل سوز جلاتے نہ چلو
شمع کو محفلِ عشرت میں دلاتے نہ چلو

(۶۹) دفتر جہاں سے لو ہم تو اٹھے جاتے ہیں
آؤ اب دکھا جاؤ شکل گر دکھانی ہو

(۷۰) بازی جو کبھی حسن کے دم باز نے کھیلی
باقی نہ رہا نقد تو ہارے مرے دل کو

(۷۱) ڈھیب نہیں سکتا بدن آرزو
تنگ ہوا پیرہن آرزو

(۷۲) مصفّا قصر دل ہو جائے اس کی آمد آمد ہے
شہ کون و مکاں سمجھا ہوں جسکو وہ محمدؐ ہے

(۷۳) رسالت کا بھی ہے اقرار یہ حق ہے نبوت ہے
محمد کا کرے انکار جو دنیا میں مرتد ہے

(۷۴) تری کرسی کا کیوں پایہ نہ برتر ہو دو عالم سے
جسے ہم عرش سمجھے ہیں محمدؐ کی وہ مسند ہے

(۷۵) دم ساز باغ دل میں جناب امیرؑ ہے
پیرو اسی کا ہوں جو میرا ہم صفیر ہے

(۷۶) کب چشم مست ساغر صہبا سے چھٹ سکے
کوثر کی موج موج میں یہ دل اسیر ہے

(۷۷) دار فانی میں عشق حق باقی
اس کے ناموں کا ہے سبق باقی

(۷۸) دار فانی میں کیسے اہل بقا سمجھیں ہم
دل بھی قابو میں نہیں روح بھی پردیس میں ہے

(۷۹) سکّہ داغ جنوں وحشت میں مجنوں کو ملیں
کہہ دیا ہے اس شہ خوباں نے یہ تاکید سے

(۸۰) روشنی رُخ پہ ابرو سیاہی کھل گئی
ربط افزوں ہو گیا پھر ماہ اور خورشید سے

(۸۱) غیر کی آنکھ میں کھٹکتا ہے
آج تنکا جو اس کی ناک میں ہے

(۸۲) ذرّے خورشید سے چمکتے ہیں
مہ رخو سب کا حسن خاک میں ہے

(۸۳) عدم کا کاروان آگے سے پیچھے منہ نہیں کرتا
جرس کے ساتھ مل کر مرا دل بھی پکارا ہے

(۸۴) عروس حسن سے دھبّا پڑا ہے تیرے سینہ پر
اگر تو ماہ پارہ ہے تو یہ اختر بھی تارا ہے

(۸۵) ہستی کی قید سے بہت اب دل بتنگ ہے
فانی ہوں مجھ کو نام سے ہستی کے ننگ ہے

(۸۶) عجب نقشہ ہے اس دنیا میں انسانوں کا اے اختر
نہ پایا بے وفائی سے کوئی ہم نے بشر خالی

(۸۷) میرے دل میں ناوک کھٹکنے لگے تھے
جو پلکوں سے دیدے اٹکنے لگے تھے

(۸۸) پڑا جس گلستاں میں وہ پائے نازک
وہ گلشن سراسر مہکنے لگے تھے

(۸۹) شاہدِ اصلی مجھے مقصود ہے
کعبۂ دل میں وہی معبود ہے

(۹۰) کیا ہوا میں آپ میں آتا نہیں
میں اگر غائب ہوں وہ موجود ہے

(۹۱) کون باقی ہے کہ جس کے حکم سے
اختر و ماہ و فلک نابود ہے

(۹۲) سوزِ دل جب گداز کرتا ہے
برق کو بے قرار کرتا ہے

(۹۳) تازگی گل کی خار میں کب ہے
سختی دل ہزار کرتا ہے

(۹۴) چشم بینا ہوا ہے ہر اک داغ
ہمہ تن انتظار کرتا ہے

(۹۵) بحر خوبی ہوا ہے عکس فگن
موج کو بے قرار کرتا ہے

(۹۶) ذرہ خاک سے بھی کمتر ہوں
کون اختر شمار کرتا ہے

(۹۷) ہوائے سلطنت ہے اس گدا کو
ادھر شاہی ادھر ہے بادشاہی

(۹۸) بتوں کا عشق چھوڑو آئی پیری
کرو اختر بس اب یادِ الٰہی

(۹۹) عارضِ طفلِ حسیں رشکِ گلستاں ہوگئے
آتشیں نالے مرے خورشیدِ تاباں ہوگئے

(۱۰۰) وہ ترک اُلٹ دیتا ہے دم میں صفِ ترکاں
آنکھوں سے مری آج لڑائی ہے کسی کی

گلدستہ عاشقاں - مطبوعہ ۱۲۵۹ھ مطبع محمدی

باب (۵)

دورِ واجدی کے ہنرورانِ اودھ

لکھنؤ اور دلی میں وہی فرق تھا جو واہ اور آہ میں ہوتا ہے۔ دلی ایک عرصے سے کشمکش روزگار تھا۔ آئے دن وہاں طوفان آتے رہتے تھے۔ کشت و خون کا بازار گرم ہوتا رہتا تھا لوٹ مار اور قتل و غارت کا نہ ختم ہونیوالا سلسلہ قائم تھا۔ کبھی جاٹوں کی یورش، کبھی سکھوں کی شورش کبھی روہیلوں کی یلغار، کبھی مرہٹوں کے حملے، کبھی انگریزوں کی ترکتازیاں۔ نہ دلی کے رہنے والوں کو امن و عافیت کی نعمت حاصل تھی۔ نہ شہنشاہ گردوں پناہ کو چین کی ایک گھڑی میسر آتی تھی۔ پھر درباری سازشیں مستزاد۔ یہ سازشیں بھی اتنی ہولناک ہوتی تھیں کہ کبھی بادشاہ اندھا کر دیا گیا کبھی انتہائی شقاوت اور بے دردی کے ساتھ اپنے نمک خواروں اور ملازموں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔ ایک زمانہ تو ایسا بھی گزرا جب خاندان شاہی کے لوگ کسی بادشاہ کے قتل یا ہلاکت کے بعد تخت خلافت پر قدم رکھتے گھبراتے تھے۔

اس کے برعکس لکھنؤ کی زندگی یکسر امن و عافیت۔ آرام و آسائش، اطمینان و فراغ خاطر، عیش و طرب، نشاط و انبساط اور سیر و سکون کی زندگی تھی۔ شجاع الدولہ کے وقت سے لے کر واجد علی شاہ کے دور تک لکھنؤ کے عوام کو کسی طرح کی مصیبت اور ابتلا کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ نہ اندرونی سازشوں نے دربار شاہی کی شان و شوکت آن بان اور

ہیں کہ اس کا کوئی اثر لکھنؤ کی پرسکون زندگی پر نہیں پڑا۔ شجاع الدولہ کو بکسر میں شکست ہوئی لیکن اس شکست سے لکھنؤ کا کاروبار مملکت بالکل غیر متاثر رہا۔ مرہٹوں کی چیرہ دستیوں اور پٹھانوں سے روہیلکھنڈ کے بعض علاقے متاثر ہوئے۔ لیکن نہ اتنے کہ انھوں نے لکھنؤ کے سکون و عافیت پر غارت گری کی ہوتی۔

یہ وجہ تھی کہ لکھنؤ اور اطراف و جوانب میں صنعتیں پروان چڑھتی رہیں۔ اور شاعری کا بازار گرم رہا۔ ہنرور یقینی طور پر اپنے کام میں مشغول رہے۔ دلی اور دوسرے مقامات کے اصحاب فضل و کمال بھاگ کر لکھنؤ پہنچے۔ اور یہاں آرام و عافیت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ لہٰذا یہاں کا فن بڑھتا رہا۔ ترقی کرتا رہا۔ یہاں کی زندگی میں رعنائی۔ اور رنگا رنگی پیدا ہوتی اور ابھرتی رہی۔ یہاں کی سوسائٹیوں اور مجلسوں کی رونق کبھی کم نہیں ہوئی بلکہ برابر بڑھتی رہی لکھنؤ کے عہد فراغ و تنعم کو ہم عہد عباسیہ کے ابتدائی دور سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ سوسائٹی کا کوئی طبقہ بھی فکر مند اور پریشان روزگار اور آشفتہ حال نہیں تھا۔ ہر بس ہا تھا۔ اور ہر شخص اپنا حصہ پا رہا تھا۔ نہ کہیں فاقہ کشی تھی نہ گرسنگی۔ نہ بیکاری نہ بے روزگاری۔ نہ فقر، نہ ہلاکت۔ نہ عسرت و غربت ہر گھر عیش و نشاط کا مرکز تھا۔ ہر مجلس لطف و سرور سے بھرپور تھی۔ بادشاہ کا قصر زرنگار ہو۔ یا مزدور کی جھونپڑی کا۔ رئیس کا کاشانہ ہو یا دہقان کی کٹیا۔ سرمایہ دار کی محلسرا ہو۔ یا فنکاروں اور محنت کاروں کا غریب خانہ کہیں بھی بے اطمینانی نہیں تھی زندگی سے فرار کا جذبہ نہیں تھا۔ زندگی کو برتنے اور اس سے پورے طور پر بہرہ ور ہونے کی ہر شخص میں امنگ تھی۔ سب اپنے اپنے حال میں مگن اور مست تھے۔ نہ فکر امروز نہ غم فردا نے غم دزد۔ نے غم کالا۔

عہد واجد علیشاہ کے مختلف اور رنگارنگ پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہنرمندان اودھ کا بھی ہے۔ اس باب میں ہم اس گراں مایہ عہد کے ہنروروں اور فن کاروں کا اختصار کے ساتھ ذکر کریں گے۔ تاکہ قارئین ایک ہلکا سا اندازہ اس عہد کی

ترقی اور فارغ البالی کما کر سکیں۔

کسی بادشاہ یا فرماں روا کے عہد حکومت کا جب جائزہ لیا جاتا ہے۔ تو اس کے ہنروروں اور فن کاروں کے تجسس احوال پر خاص توجہ کی جاتی ہے۔ کہ بغیر اس کے صحیح نقشہ سامنے نہیں آتا۔

بانکے[1]

اس باب میں بانکوں۔ بنوٹ بازوں۔ اور اسی طرح کے دوسرے فنون کے ماہرین کا تذکرہ ہے۔ جنہوں نے لکھنؤ کی ناموری اور شہرت میں چار چاند لگا دئے تھے۔ خود بھی زندہ جاوید رہے۔ اور وطن کا نام بھی اُچھالا۔

میر جعفر علی بانک کے فن کے آخری اُستاد تھے۔ واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیا برج چلے گئے تھے۔

محمد علی خاں کرہ بزن بیگ نکٹے اہنے والے اور علی مد کے موجد مانے جاتے ہیں۔

محمد مہدی عہد واجدی میں بنوٹ کے اُستاد تھے۔ نواب معشوق محل کے یہاں داروغہ تھے۔

مہاراجہ ڈگبنجے سنگھ عہد شاہی کے تھے۔ بندوق لگانے میں ایسے کامل تھے کہ ایک بار اندھیرے میں شیرنی کی سانس کی آواز پر گولی چلائی۔ اور ٹھیک نشانہ پڑا۔

حکیم محمد رشید فتح پوری بندوق میں ان کا نشانہ حکمی ہوتا تھا۔ اکثر ڈوری کو معلق کر کے پہلی ہی گولی سے کاٹ دیتے تھے۔ شیشہ پر پھول رکھ کر اس خوبی سے گولی لگاتے تھے کہ پھول اڑ جاتا تھا۔ اور گولی کو حرکت نہ ہوتی تھی

نواب جہاں پناہ محل بادشاہ کی ایک ممتوعہ بیگم تھیں جو بادشاہ کے بعد مٹیا برج میں انتقال کر گئیں۔ بندوق بے مثل لگاتی تھیں۔ بندوق میں گولی

---

(۱) حیات ابدی صفحہ ۲۲

بھر کر کسی کوٹھے پر کھڑی ہوئیں۔ اور آدمی کو بوتلیں دے کر ان کے مُنہ کس کے ڈاٹ لگا کر بھاگا رتی میں پھینکدو۔ آدمی نے تعمیل حکم کی جب بوتلیں سامنے آئیں۔ بیگم صاحبہ نے نشانے لگانے شروع کئے۔ سب بوتلیں توڑ دیں۔ جب بوتل غوطہ کھا کے ابھرتی تھی فوراً نشانہ لگاتی تھیں۔ یہ دونوں بیگمیں فن شہسواری سے بھی خوب واقف تھیں۔

میرن صاحب پچ بھٹیے

عہد شاہی کے تھے۔ سعادت گنج میں رہتے تھے اور مرتے دم تک نیابان شیش محل کے ملازم رہے۔

بندوق لگانے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ عورت نتھ پہنے کھڑی ہے اور انھوں نے تاک کر گولی لگائی نتھ کے اندر سے نکل گئی۔ ایک انگریز ان کے کمال کی تعریف سن کر دیرہ سے لکھنؤ آیا اسکنے کہا شمع کی لَو کو جس طرح میں کہوں یہ اُڑا دیں تو میں ان کی اُستادی کا قائل ہو جاؤں میرن صاحب نے کہا میں تیار ہوں۔ اس انگریز نے شیشہ کے کنول میں مومی شمع لگائی۔ شمع کو جلایا۔ اس نے چالاکی یہ کی تھی کہ شمع کی لو کی نوک کو کنول کے کنارے کے سرے سے ملا دیا تھا میرن صاحب نے گولی چلائی۔ شمع بجھ گئی۔ اور کنول کو ضرر نہ پہنچا۔ وہ انگریز ان کی اُستادی کا قائل ہو گیا۔

ایک دفعہ میرن صاحب نے اپنا یہ کمال دکھایا کہ نیم کی پتی کو مٹکے کو لٹا کے اس کے اوپر چپکا دیا۔ اور گولی ماری پتی کو بیچ سے دو کر دیا۔ اور مٹکے کو ضرر نہ پہنچا۔ یہ کمال لاٹ صاحب کے سامنے رکھ دیا تھا۔ میرن صاحب کے شاگرد امراؤ مرزا صاحب ابھی زندہ ہیں۔ (۱)

مرزا احمد بیگ کھٹا کھٹا

عہد دلبری کے بانکوں میں تھے۔ ایک مرتبہ محلہ شیو تیری منصل حسین کی باڑی میں ایک دیگر تلورئے سے اور ان سے تلوار چلی۔ انھوں نے تلوار ماری۔ اسکنے سینہ پر روکی اور تعریف کی کہ سبحان اللہ بے مثل ہاتھ پڑا ہے۔ اب اس نے بھرپور ہاتھ مارا انھوں نے سینہ پر روکا

---

(۱) قدیم خبر دران اودھ صہ ۱۲۸

اور اس کے بھی ہاتھ کی تعریف کی۔ کہ نہایت کاری ہاتھ پڑا ہے۔ اس طرح سے ان کے اور ان کے دیر تک تلوار میں لڑائی رہی۔

میر ولایت علی

یہ عہد شاہی میں گزرے ہیں۔ یہ بیٹے کے اُستاد تھے۔ اور میر ولایت علی ڈنڈا توڑ کے نام سے مشہور تھے۔ حریف کے ہاتھ میں کتنا ہی زبردست ڈنڈا ہو توڑ ڈالتے تھے (۱)

(۱) قدیم ہنر دران اودھ ص ۱۲۱

(۲)

شہ زور

عہدِ واجد علی شاہ کے شہ زوروں پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔

مرتضیٰ خاں لکھنوی

صاحب گنج میں رہتے تھے۔ عہد واجد کے تھے اس قدر قوت تھی کہ بھینسے کی دم کو بھی اور دانتوں میں شکار دبا کر کھینچ لیا۔ ایک برجس کو دو بیل کھینچتے تھے انھوں نے تنہا کنوئیں سے کھینچ لیا۔ (۱)

مرزا امداد حسین لکھنوی

عہد واجدی میں کپتان تھے۔ کمیدان بنے ان کی بنیٹ آج تک مفتی گنج میں مشہور ہے۔ میر امداد کے دادا جان تھے۔ ایک دن ایک مرکھنا بیل چھوٹ گیا۔ اتفاق یہ اودھر آ نکلے تھے لوگوں نے منع کیا کہ حضرت ادھر نہ جائیے۔ مرکھنا بیل چھوٹ گیا ہے۔ انھوں نے دو قدم بڑھے بیل ان کی طرف جھپٹ کر چلا۔ انھوں نے بائیں ہاتھ میں سپر لے کر اس کے سینگوں کو سپر پر روکا لاکھ اس نے زور کیا۔ مگر ان کے ہاتھ کو جنبش نہ ہوئی۔ داہنے ہاتھ سے تلوار ... اور گھٹنے کو زمین پر ٹیک کر ایک ہاتھ بیل کی گردن پر مارا کہ سر الگ ہو گیا۔ اور دھڑ الگ۔ غدر کے کئی برس بعد مرے بنوٹ بھی خوب جانتے تھے

مرزا قدرت اللہ بیگ لکھنوی

عہد واجد کے مشہور شہ زور اور مفتی گنج کے رہنے والے تھے۔ قوت کا یہ حال تھا کہ بانس کے پوروں کو دونوں ہتھیلیوں سے پکڑ کر ادھر زور کر کے اس کے اندر کے ریشے کھینچ لیتے۔ ایک دہلیز کے لوہے کے کنڈے کو اس زور سے مروڑا تھا کہ دہلیز جھک گئی تھی

---

(۱) قدیم ہنروران اودھ ملخصاً

رشیدہ خانم لکھنؤ کی۔ عہد واجدی کی تھیں۔ نواب بادشاہ علی خاں کی منشی گنج کی والدہ تھیں۔ برسات کا زمانہ تھا سب مکان کے صحن میں اپنے اپنے پلنگ پر سو رہے تھے۔ کہ شب کو ایک چور گھر میں آیا۔ کھٹ پٹ سے سب کی آنکھ کھل گئی۔ چور بھاگا۔ اور چاہا کہ جست کر کے دیوار کے اوپر چلا جائے۔ خانم موصوفہ نے ایک ہاتھ سے اس کا موزہ پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا کہ چور کا گٹا اتر گیا۔ لاکھ لاکھ چور نے جھٹکا دیا مگر نہ چھوڑا۔ جب بہت توبہ تلا کی چھوڑ دیا۔ (۱)

ساٹھکا قوم کا مغل تھا۔ دربار شاہی میں اس کے کچھ اعزا ملازم تھے۔ یہ ساٹھ کوس یعنی ایک سو بیس میل ایک دن میں جاتا تھا۔ اور پلٹ آتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جباری بدن اس قدر مضبوط تھا۔ اور اس کی ٹانگیں ایسی قوی تھیں۔ کہ لکھنؤ سے ساٹھ کوس دریاآباد جا کر ایک ہی دن میں پلٹتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نام ساٹھکا پڑا

مرزا احمد حسین عہد واجدی میں بڑے طاقتور اور قوی مشہور تھے یہ دوسرے درجہ کے پہلوان تھے۔ مرزا علی خاں کوتوال کے بھانجے تھے۔ نواب حضور عالم کی کوٹھی کے سب تھمے انہی کے چڑھائے ہوئے ہیں۔ یہ ہاتھی کے پاؤں پر بیٹھتے تھے۔ اس قدر گراں ڈیل تھے کہ گھوڑا بوجھ اٹھا نہ سکتا تھا۔ ہاتھی کی دم پکڑ لیتے تھے اور آگے نہ بڑھنے دیتے تھے جب ہاتھی کی منک پر گھونسا مارتے تو چیخ اٹھتا تھا۔ (۲)

نواب شہنشاہ دولہ مرزا محمد تقی علی خاں بہادر لکھنؤ کے عہد شاہی کے تھے۔ اور اولاد نواب شجاع الدولہ بہادر سے تھے محلہ حسن گنج کے رہنے والے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ ایک ہی جھکاؤ میں ایک ہزار ڈنڈ پیلتے تھے

---

(۱) قدیم ہنرمندان اودھ صـ۱۱۱ (۲) قدیم ہنرمندان اودھ صـ۱۱۳

چھٹانک بھر سنکھیا برفی میں ملا کر ڈنڈ کے بعد ناشتہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ایک بار عیش باغ میں میلہ کی سیر دیکھنے گئے۔ خان بہادر مرزا علی سجا جبین صاحب ڈپٹی کمشنر ساتھ تھے۔ وہ اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ چار پہیہ کی گاڑی تھی۔ اس میں کوچ بکس بھی لگا ہوا تھا۔ کوچ مین گاڑی ہانک رہا تھا۔ اس کے پہلو میں نواب صاحب کا بٹیر باز بیٹھا تھا۔ اور رفقا سامنے کی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ موتی جھیل کے کنارے میلہ کے شور و غل سے گھوڑے نے بدلگامی کی۔ اور گاڑی جھیل کے اندر چلی شہنشاہ دولہ بہادر جلدی سے گاڑی پر سے کودے اور پہیہ کے اندر ہاتھ ڈال کر آرے کو پکڑ لیا۔ لاکھ لاکھ گھوڑا ابھرا گاڑی نہ ہل سکی۔ یہاں تک کہ سب آدمی نیچے اترے۔ اور سائیس نے گاڑی سے گھوڑے کو کھول لیا اسکے بعد بٹیر باز نے کہا کہ حضور میری کابک کوچ بکس پر رہ گئی ہے۔ نواب صاحب نے کہا کہ کابک بھی اتار لیجیے۔ بٹیر باز گاڑی پر چڑھا۔ اور کابک اتاری۔ اسکے بعد نواب صاحب نے ہاتھ نکال لیا۔ اور گاڑی جھیل کے اندر جا رہی۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ امین آباد سے کسی کا تعزیہ گزر رہا تھا۔ اور ایک انگریز ٹمٹم پر سوار آ رہا تھا۔ کہ باجہ کے شور و غل سے اس کا گھوڑا بے قابو ہو گیا۔ اس نے ہزار روکا لیکن نہ رک سکا۔ گھوڑے نے بھاگنا چاہا کہ نواب شہنشاہ دولہ نے جھپٹ کر گھوڑے کا اگلا ہاتھ اپنی بغل میں دبا لیا۔ تین ٹانگیں زمین پر اور ایک ٹانگ گھوڑے کی نواب صاحب کی بغل میں۔ لاکھ لاکھ تڑپا مگر گھوڑا بھاگ نہ سکا۔ جب تعزیہ بہت دور نکل گیا گھوڑے کی ٹانگ چھوڑ دی۔ انگریز نے نواب کا شکریہ ادا کیا کہ اگر وہ اس طرح گھوڑے کو پکڑ نہ لیتے۔ تو بہت آدمی کچل جاتے۔

شہ زوری کا تیسرا واقعہ یہ ہے کہ نواب شہنشاہ دولہ علیل تھے۔ غسل صحت کے لئے ڈاکٹر نے کہا کہ گرم پانی سے نہا ڈالئے۔ بھشتی دیگ کو لبالب بھر کر چلا گیا۔ نواب صاحب نے ملازم سے کہا کہ دیگ کو چولھے پر رکھ دو اور پانی گرم

کر دو- چار آدمیوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا- مگر دیگ جنبش بھی نہ کر سکی- تو نواب صاحب اُٹھے - اور دونوں ہاتھوں سے دیگ کو پکڑ کر چولھے پر رکھ دیا- اتنا زور پڑا کہ دونوں جوتوں کے ٹانکے ٹوٹ گئے مگر نواب صاحب کو پسینہ بھی نہ آیا (۱)

---

(۱) قدم بنر دران اودھ ص۱۱۶

(۳)

شہ سوار

مردانہ فنون اور کرتبوں پر بھی واجد علی شاہ کے دور میں خاص توجہ کیجاتی تھی

بہادر خاں لکھنوی امجدی عہد میں چابک سواری کے فن میں وحید عصر تھا۔ اور پرنس سلیمان قدر کو گھوڑے کی سواری سکھانے پر مامور تھا (۱)

سید صادق حسین لکھنوی واجدی عہد کے تھے۔ شیخ ببر علی کے شاگرد تھے یہ بھی گھوڑے خوب بناتے تھے۔ رسی بٹولہ میں رہتے تھے۔ غدر کے بعد راجہ لال مادھو سنگھ نے اپنا اصطبل ان کے سپرد کر دیا تھا۔

پورن لکھنوی ہندو تھا۔ واجدی عہد کا تھا۔ چابک سواری میں بڑا کمال تھا۔ شیخ ببر علی کا شاگرد تھا۔ انگریزی عہد میں نواب سید مہدی حسن خاں عرف آغا ابو صاحب کی ملازمت کر لی تھی۔ زندگی بھر وہیں رہا۔

شیخ ببر علی لکھنوی واجدی عہد کے تھے۔ شیخ ببر علی کا کمال یہ تھا۔ کہ گھوڑے کاکاوا دے رہے ہیں۔ اور ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا کٹورا لیتے ہیں۔ مگر کیسی مجال ہے کہ پانی چھلک تو جائے۔ ان کا کمال ایک یہ تھا کہ گھوڑے پر سوار ہوتے بائیں ہاتھ میں لگام لی اور داہنے ہاتھ کی ہتھیلی ایک آدمی کے سر پر رکھی اور گھوڑے کو پھیرنا شروع کیا کیا مجال تھی کہ ہتھیلی آدمی کے سر پر سے ہٹ جائے۔ ببر علی چھاؤنی حسین الدین خاں میں رہتے تھے۔ غدر کے کئی برس بعد انتقال کیا۔ شیدی علیخاں پہلوان بڑا طاقتور تھا۔ ایکدن ببر علی نے شیدی صاحب سے کہا کہ بڑے پہلوان ہو تب جانوں کہ میری ران سے زین کھسکا دو۔

---

(۱) صحیفہ زریں ص ۱۰۳

اگر ران زین سے کھسکا دو تو پانچ سیر امرتیاں ابھی کھلاتا ہوں۔ شیدی علی تیار ہو گئے یہ گھوڑے پر بیٹھے۔ شیدی علی نے زور کرنا شروع کیا۔ مگر ران کو جنبش بھی نہ ہوئی۔(۱)

نواب حضور عالم

واجد علیشاہ کے وزیر اعظم تھے۔ گھوڑے پر بے مثل بیٹھتے تھے۔ اور نیزہ بازی کے استاد تھے۔ نواب علی الدولہ کے بعد اودھ میں اگر کوئی گھوڑے کا بہترین شہسوار اعلیٰ طبقہ میں تھا تو وہ نواب حضور عالم تھے۔ ایک دن حضور عالم تحسین گنج والی کوٹھی میں بیٹھے تھے کہ ایک سوداگر گھوڑے پر آ بیٹھا۔ اور نواب کے سامنے اُسے چکر دیا۔ اور اپنا یہ کمال دکھایا کہ دوسرے چکر میں گھوڑے کے سم پہلے چکر کے سموں پر پڑتے تھے۔ نواب اس رمز کو سمجھ گئے سوداگر کا یہ گھوڑا سکھایا ہوا تھا۔ نواب صاحب نے سوداگر سے کہا کہ تم نے کمال خوب دکھایا۔ اور اس کے ایک الھڑ بچھڑے پر سوار ہوئے۔ سوداگر نے کہا حضور یہ گھوڑا ابھی بتایا نہیں گیا۔ نواب صاحب نے کہا کہ کچھ حرج نہیں۔ اور بچھڑے کو چکر دیا دوسرے چکر پر بچھڑے کے سم انہیں نعلوں کے نشان پر پڑے جو پچھلے چکر میں نشان بنے تھے۔ سوداگر نواب صاحب کی شہسواری کا قائل ہو گیا۔

نواب حضور عالم وزیر اعظم شہسواری کے استاد تھے۔ رائے سدرشن لال سے جو دربار نیپال میں تھے مہاراجہ جنگ بہادر سنگھ کی شہسواری کا ذکر سنکر جمعہ کے دن جو نواب صاحب کی سواری کا دن تھا۔ مہاراجہ کو بلایا۔ مہاراجہ گنوگھاٹ آئے۔ حضور عالم برآمد ہو کر تحسین گنج کے اصطبل میں آئے۔ اور مہاراجہ کو ساتھ آنے کا حکم دیا۔ اصطبل کے میدان میں پہنچ کر تین چار شخصوں سے نیزہ بازی میں ان کا مقابلہ کرایا۔ مہاراجہ نے سب کو مغلوب کیا۔ پھر خود حضور عالم گھوڑے پر سوار ہوئے اور مہاراجہ کے مقابلے کو آئے۔ تھوڑی دیر تک مہاراجہ نواب صاحب کی چوٹوں کو روکتے رہے۔ آخر کار کہا کہ میں حضور کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور میرا گھوڑا اب تھک گیا ہے

---

(۱) قدیم ہنر دران اودھ صـ ۱۸۲

حضور عالم نے مہاراجہ کی سواری کی تعریف کی۔ اور فرمایا کہ انگریزی کاٹھی پر کیوں نہیں سوار ہوتے ہو۔ مہاراجہ نے کہا کہ میں اس پر نہیں بیٹھ سکتا۔ حضور عالم نے اسی دن مہاراجہ کو شاگرد کیا۔ اور انگریزی کاٹھی کی سواری سکھائی۔ (۱)

نواب حیدر خاں بنگش

لفظ بنگش کے لغوی معنے ہیں پہاڑی ملک۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کے معنی ہوئے باشندے پہاڑی ملک کے۔ جو لوگ بلند پہاڑیوں پر رہتے تھے بالا بنگش کہلاتے تھے۔ اور جو پہاڑی کے ملک میں سکونت گزیں تھے۔ یعنی کوہاٹ میں پائین بنگش مشہور تھے۔

قائم گنج ضلع فرخ آباد میں پیدا ہوئے اور اپنے والد ولی محمد بنگش کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ نواب یمین الدولہ بہادر نے نواب حیدر خاں کی عزت افزائی اور قدر دانی فرمائی۔ ایک دفعہ یمین الدولہ نے حیدر خاں کی قوت اور شہسواری کا بہت سخت امتحان لیا۔ اور خاں موصوف امتحان میں پورے اترے۔ نواب صاحب نے اسی وقت خاص اپنی سواری کا عربی گھوڑا معہ زین اور چار جامہ عنایت کیا۔ اور ساتھ ہی اسکی خلوت میں سرپیچ اٹک رکھا۔ رومال۔ پیش قبض یستف اور جوڑی بچہ کی عنایت کی۔ اور بہت سی اشرفیاں بھی عنایت کیں۔ اور بعد اس کے خاص اپنے درباری مصوروں سے حیدر خاں کی تصویر کھنچوائی۔ یہ تصویر اب تک موجود ہے مصور نے شمو تصویر بنائی۔ اور خوب اپنا کمال دکھایا۔ (۲)

حیدر خاں بنگش محلہ محمود نگر میں رہتے تھے۔ ایسے شہسوار تھے کہ کیسا ہی گھوڑا کیوں نہ ہو۔ مگر یہ ہر حال میں بغیر رکابوں کے سوار ہوتے تھے۔ ان کی قوت کا یہ عالم تھا کہ وہ زبردست حیوانوں کے سر ٹکرا کر مار ڈالتے تھے۔

---

(۱) تاریخ بلرام پور صـ ۶۷

(۲) تاریخ فرخ آباد نوابان بنگش حصہ اول صـ ۲۱

اسی طرح سے ایک شخص کی گردن ایک ہاتھ سے پکڑی - اور دوسرے کی دوسرے ہاتھ
سے ان دونوں کے سر اس زور سے ٹکرا دیئے کہ سر چور چور ہو جاتا تھا - حیدر خاں
کا معمول تھا کہ روز ورزش کے بعد لوٹا بھر دودھ ایک ہی سانس میں پی لیتے
تھے - وہ تانبے کا لوٹا ابھی موجود ہے - اور اس پر لکھا ہے -
"حیدر خاں سنہ ۱۲۶۱ھ" اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوٹا عہد امجدی کا
ہے - لوٹے کا وزن ڈھائی سیر - اور چھ سیر تین پاؤ آدھ چھٹانک پانی اس
میں آتا ہے - حیدر خاں بنگش غدر ۱۸۵۷ء میں معہ اپنے نوجوان اکلوتے فرزند
غضنفر خاں بنگش کے موضع ماہ بیت مئو (کاکوری روڈ) پر واقع ہے مارے گئے -
لہذا اولاد مذکور میں اب کوئی نہیں ہے - (۱)

بندہ علی خاں

واجد علی شاہ کا کوچ مین تھا - گاڑی بے مثل ہنکاتا
تھا - اس کا کمال یہ تھا - کہ سڑک پر دور تک روپیوں
کی قطار لگائی - بادشاہ چوکڑی میں بیٹھے - اور بندہ علی نے راس لی - ایک پہیہ
روپیوں کی قطار کے اوپر ہے اور ایک زمین پر - جس رفتار سے کہئے گاڑی لے
جائے - کیا مجال جو پہیہ روپئے کی قطار سے اِدھر اُدھر ہو جائے - بندہ علی
گاڑی ہانک رہے ہیں - اور بادشاہ بیٹھے ہیں - قیصر باغ کے پھاٹکوں سے
سواری آئے یا جائے - جب پھاٹکوں سے گاڑی مڑی پرکار سے ناپ لیجئے
دونوں طرف کے پہیہ کے نشان پھاٹک کے دونوں طرف کی چول سے برابر
برابر ہوتے تھے - بادشاہ گاڑی میں بیٹھے ہیں بندہ علی ایک گھوڑے کو سرپٹ
لئے جاتا ہے - اور دوسرے کو پوئی - اور تیسرے کو ڈلکی - اور نہ

---

(۱) قدیم ہنروران اودھ صفحہ ۱۶۷

چوتھے کو قدم قدم۔ اور چاروں گھوڑے ایک ہی گاڑی میں جُتے ہیں۔ مگر کیا مجال کہ سواری کو تکان ہو جائے۔ بندہ علی خاں انتزاعِ سلطنت کے بعد ریاست رامپور چلا گیا تھا۔ اور اس نے نواب کلب علی خاں کو اپنا کمال دکھایا تھا۔ مشہور ہے کہ بتیس گھوڑے گاڑی میں جوت کر نواب صاحب نے ہنکوائے تھے۔ اور بندہ علی نے ہانک دیے۔ پھر مہاراجہ گنیش سنگھ نے بندہ علی کو اپنے ہاں ملازم رکھ لیا تھا۔ اور وہیں مر گیا (۱)

---

(۱) قدیم ہنروران اودھ صـ ۱۷۴

پیراک اور غواص

تند و تیز دریا کی پرشور موجوں میں لکھنؤ کے پیراکوں اور غواصوں کی روانی دیکھئے۔

مولوی مرزا مہدی

عہد شاہی کے تھے۔ پیراکی میں ان کا کمال یہ تھا کہ دریا میں اترے اور ایک تیز دوڑنے والے آدمی کو دریا کے کنارے اپنے برابر کھڑا کیا اور اس سے کہا کہ جہاں تک تیز دوڑ سکتے ہو دوڑو وہ سر پر پیر رکھ کر بھاگا، اور انھوں نے ملاحی کاٹنا شروع کی۔ اتنی تیز ملاحی کاٹتے تھے کہ وہ بانسوں پیچھے رہ جاتا تھا اور یہ آگے نکل جاتے تھے۔ عین غدر ۱۸۵۷ء میں بمقام مفتی گنج گولی سے مارے گئے۔ بانک اور لکڑی سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ان کے بیٹے حسین مرزا صاحب جو شاہی کے پیدا تھے۔ وہ بھی پیراکی اور بانک میں استاد گزرے ہیں۔ پرنس سلیمان قدر اور نواب سیف الدولہ بہادر کو پیرنا سکھا رہا تھا، حسین مرزا کے بیٹے سلطان مرزا جب جو مٹیا برج میں واجد علی شاہ کے ملازم تھے۔ فن شنا وری اور بانک جانتے تھے دریا میں اس طرح غوطہ لگاتے تھے کہ انھیں کوئی چھو نہیں سکتا۔ ستر سال کی عمر ہے۔ ضعف بصارت ہے۔ مفتی گنج میں رہتے ہیں۔

میر صفدر علی

عہد شاہی کے تھے۔ احاطہ مرزا علی خاں میں رہتے تھے۔ مشکل پیراؤں کے استاد تھے۔

کھڑی ایسی لگاتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ پانی میں میخ گڑی ہے کیا مجال کہ ذرا تو جسم کو لغزش ہو جائے۔ ایک وقت چھ سات آدمی ان کو پانی میں دباتے تھے مگر یہ ناف تک کھلے ہی رہتے تھے۔ پانی سے بھرا ہوا گھڑا ہاتھ میں لیا اور اپنے سر پر ڈالنا کیا پورا گھڑا خالی ہو گیا مگر نیچے نہ ڈوبے جتنا کھلے تھے۔ اتنا ہی کھلے رہے جل بانک میں بھی بڑے استاد تھے۔ سات آٹھ آدمی دربار میں ایک طرف اور یہ اکیلے ایک طرف مگر وہ ان کا کچھ نہ کر سکتے تھے۔ واجد علی شاہ کو انھیں نے پیرنا سکھایا تھا۔ میر صفدر علی گلہا گھاٹ پر نہایا کرتے تھے۔ غدر کے کئی برس بعد لکھنؤ میں انتقال کیا۔ ان کے بڑے بیٹے میر فضل حسین تھے۔ جنھوں نے ہز ہائینس نواب حامد علی خاں مرحوم والئ رام پور کو پیرنا سکھایا تھا اور وہاں ملازم تھے۔ یہ بھی لکھنؤ میں مر گئے[1]

شیخ بدلو لکھنوی

قوم کا حجام تھا، عہد واجدی کا تھا ہلکی اور سبک پیرائیوں کا استاد تھا۔ پالتھی کی پیرائی خوب پیرتا تھا۔ صرف پیر کے دونوں انگوٹھوں سے حرکت دیتا تھا۔ ایک ہاتھ میں گڑگڑی ہے اور پیرتا چلا جاتا تھا اور کسی بچہ کو گود میں لئے جاتا ہے۔ ڈبوٹ کی پیرائی بہت اچھی پیرتا تھا یعنی سر سے کمر تک جسم کا حصہ پانی کے اوپر ہے اور باقی حصہ پانی

---

[1] قدیم ہنر دان اودھ صفحہ ۱۳۵

کے اندر ہے اور پیرتا چلا جاتا ہے۔ بدلو پانی میں ریل گاڑی بناتا ہے اس طرح سے کہ پچیس تیس آدمی ایک کے پیچھے دوسرا لگا ہوا ہے۔ اور سب کے آگے خود ہے کبھی ملاحی سے سب کو کھینچ لے جاتا ہے کبھی کھڑی سے کبھی کسی اور پیرائی سے، غدر کے بعد حسین آباد کے تالاب میں ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں یہ کرتب دکھائے جاتے تھے۔ بدلو کھڑی بھی اچھی لگاتا تھا۔ ایسی مشق بہم پہنچائی تھی کہ موضع کانگرآباد سے پکے پل تک کئی کوس، کھڑی لگاتا جاتا تھا۔ جمعہ چھ بجے کانگرآباد سے چلا۔ اور چار بجے پکے پل پر آگیا۔ (۱)

شیخ عابد علی لکھنؤ

عہد شاہی کے تھے اور حاجی احمد علی عرف ننھے مرزا کے شاگرد تھے حاجی صاحب ان کو ایسا باکمال سمجھتے تھے کہ اپنے بیٹوں کی موجودگی میں شیخ کو اپنا جانشین بنایا۔ سچ یہ ہے کہ زمانہ شاہی کے پیراکوں کا خاتمہ شیخ عابد علی پر ہوا۔ شیخ مذکور ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو مر گئے۔ اور موضع برکی براؤں کے باغ دفن کئے گئے۔ سو برس کے قریب عمر پائی۔ عابد علی شر کی پیرائی بے مثل پیرتے تھے۔ اور ڈیٹ کی پیرائی بھی نہایت اچھی پیرتے تھے صفت یہ تھی کہ پانی سے بھرا ہوا کٹورا پیروں کے تلوؤں پر رکھ دیا اور یہ پیرتے چلے جاتے ہیں۔ مجال کیا ہے کہ پانی کٹورے سے چھلک جائے۔ اپنے جسم کو

---

(۱) قدیم ہنروران اودھ صفحہ ۱۳۶

بے حد قائم رکھتے تھے۔ ایک خاص صفت عابد علی میں یہ تھی کہ کنارے پر بیٹھے ہیں اور کسی ڈوبتے دیکھا۔ بس پلک جھپکتے اس کے پاس پہنچ گئے۔ اور پھول کی طرح اٹھا لیا۔ عابد علی دریائی کشتی یعنی جل بانک بھی خوب جانتے تھے۔ بہتا سے پیچ در پیچ جانتے تھے۔ عابد علی گھڑی لگانے کے بھی استاد تھے۔

برسات کے موسم میں جبکہ دریا طغیانی پر ہوتا تھا۔ یہ موضع کانکر آباد سے دریا میں اترے اور اپنے سینہ پر ایک لکیر بنائی اور گھڑی لگاتے چلے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ پانی پر کھڑے ہوئے ہیں۔ مطلق جسم کو حرکت نہ ہوتی تھی۔ اور نہ وہ لکیر بھیگنے پاتی تھی۔ غرض اسی طرح کانکر گھاٹ تک آتے تھے۔

ایک مرتبہ مولوی سجاد حسین صاحب نے شیخ عابد علی سے کہا، کہ آجکل دریا طغیانی پر ہے۔ دل چاہتا کہ سیر کریں، شیخ نے کہا، گنگو گھاٹ چلئے۔ چنانچہ مولوی صاحب گنگو گھاٹ پر آئے۔ عابد علی نے چار گھڑوں کی ایک گھڑی بنائی، اور ایک گھڑے کے پیندے پر مولوی صاحب کو بٹھایا۔ اور دوسرے پر خورشید حسین کو تیسرے پر ابوالحسن کو دندگورہ تینوں حضرات فن شناوری سے ناواقف تھے۔ اور چوتھے پر اپنے بیٹے شیخ محمد اسمٰعیل کو اور خود گھڑنٹی کو گتھے ہوئے چلے۔ کہ ٹوٹ گھاٹ پر دفعتہً گھڑنٹی غڑپ سے بیٹھ گئی اور چاروں آدمی آپس میں غٹ پٹ ہو گئے۔ عابد علی نے ایک ہاتھ سے مولوی صاحب کو اور دوسرے ہاتھ سے خورشید صاحب کو سنبھالا۔ اور ٹانگ سے ابوالحسن کو ابھارا اور ایک ٹانگ سے تیرتے ہوئے کنارے پر آگئے

شیخ محمد اسمٰعیل تیرنا جانتے تھے اس لئے خود باہر نکل آئے (۱)

(۵)

موسیقار

اب موسیقاروں کی محفل جمتی ہے:

خاندان تان سین عہد واجدی میں خاندان تان سین کے باکمالوں میں پیارے خاں۔ جعفر خان۔ حیدر خاں۔ باسط خاں۔ محمد علی خاں تھے۔ (۲)

نعمت اللہ خان باسط خاں کے شاگرد علم موسیقی کے باکمال گیارہ سال تک مٹیا برج میں واجد علی کے ساتھ رہے۔

نظام الدین احمد خاں محمد احمد خاں عہد واجدی میں تھے۔ علم موسیقی میں مقتدائے جہاں گنے گئے۔

نواب بیتی آرا بیگم نواب حضور عالم وزیر اعظم کی صاحبزادی تھیں۔ عہد واجدی میں تھیں، جل ترنگ بے مثل بجاتی تھیں۔

---

(۱) قدیم ہنر دران اودھ ص ۱۳۸

(۲) قدیم ہنر دران اودھ ص ۶۱

محمد حسین خاں لکھنوی عرف محمد

عہد شاہی کی یادگار تھا طبلہ بجانے میں استاد مانا جاتا تھا۔ یہ شعر صاف اس کے طبلہ میں دکھائی دیتا تھا ؎

ترے پر سے جھڑنے لگے شرر نہ تڑپ تو بلبل ازبس
جلے گا قفس جلے گا قفس جلے گا قفس جلے گا

جناب مرزا محمد عسکری صاحب ساکن عبدالعزیز روڈ لکھنؤ نے محمد کا ہنر کمال دیکھا ہے (۱)

پنڈت بھیروں دت دریاآبادی

پنڈت جیونرائن کی نسل سے تھے پنڈت گوری شنکر کے بیٹے تھے۔ فن موسیقی کے بڑے ماہر تھے، مردنگ ڈھول بہت مشہور تھی۔ لکھنؤ میں اچھے اچھے طبلہ نواز ان کی ڈھول سننے آتے تھے۔ پنڈت جی ڈھول سے ہر ساز کی آواز پیدا کر کے سامعین کو وجد میں لاتے تھے۔ عہد واجد کا میں تھے۔ (۲)

مہدی حسن خاں لکھنوی

محلہ تحسین گنج کے رہنے والے تھے اور واجد علی شاہ کے ملازم تھے۔ بین بجانے میں ان کا جواب ہندوستان میں نہ تھا

---

(۱) قدیم ہنر دران اندھ صہ ۷۹

(۲) تاریخ دریاباد

غدر کے بعد ریاست دتیا میں کرتی سنگھ پکھاوجی سے ان کا مقابلہ ہوا اور مہدی حسن نے اس کو شکست دی۔ ایسی بین بجائی کہ پکھاوجی ساتھ نہ دے سکا مہاراجہ صاحب دتیا نے ان کو بہت انعام دیا۔ دولے خاں اور مہدی حسن خاں غلام حسین کے بیٹے تھے مہدی حسن خاں حسن عظیم اللہ خاں کی کربلا میں دفن ہیں۔

غلام محمد خاں عہد واجدی میں ستار بجانے میں کامل تھے ہاتھ میں گلے کا انداز رکھتے تھے۔ بڑے دیندار تھے۔

مسماۃ شرعی دریاآبادی موسیقی دانی کے ساتھ سارنگی بجانے میں استاد تھی۔ حسین بخش لکھنؤ کی شاگرد تھی۔

سورج دین کتھک دریاآبادی ریاست رام پور یا بریلی کے رہنے والے تھے ستار خوب بجاتے تھے اور عہد واجدی کے باکمالوں میں تھے۔

بینی پرشاد کتھک دریاآبادی موسیقی کا استاد تھا۔ خوش گلو مغنی تھا، ناچنے میں کامل تھا۔ عہد واجدی میں پرنس برجیس قدر بہادر کی والدہ

---

(۱) سوانحعمری مہاراجہ ڈگنیج سنگھ۔

(۲) تاریخ دریاباد

کا خاص مجدئی اور شاہی کلاونتوں میں تھا۔ (۱)

چھوٹے خاں دہلوی

یہ امجدی عہد میں لکھنؤ آیا۔ اور ولی عہد سلطنت واجد علی شاہ نے اسے رئیس الدولہ کا خطاب دیا تھا۔ مٹیا برج میں مر گیا۔ اور وہیں دفن ہو۔ ان کے استاد پیار خاں تھے۔ جو تان سین کے خاندان سے تھے (۲)

دولے خاں

لکھنؤ محلہ تحسین گنج کے رہنے والے تھے، عہد واجدی میں ہوزی اور دھرپد گانے کے استاد تھے تال کٹورہ کی کربلا میں دفن ہیں۔

دولے خاں کا مکان محلہ تحسین گنج میں وہاں تھا جہاں حامد علی خاں صاحب بیرسٹر کی کوٹھی ہے۔

حیدر علی خاں و چھجو خاں

ان دونوں نے دھرپد اور خیال ایسا گایا۔ کہ مدعی تک وجد میں آ گیا۔ عہد واجدی میں تھے۔

رقّاص

نغمۂ موسیقی کی بساط الٹی۔ اب رقص بے حجاب کا ایک جلوہ ملاحظہ فرمائیے۔

درگا پرشاد و ٹھاکر پرشاد

عہد محمد علی شاہ سے واجدی عہد

(۱) تاریخ دریا آباد (۲) قدیم ہنر داران۔ دہ ص۷۵

تک یہ دونوں فن رقاصی کے کامل استاد گزرے ہیں۔ (۱)

نیو مان پرشاد کتھک دریاآبادی

فنِ موسیقی میں کامل تھا

مشیر الدولہ مہاراج بالکرشن بہادر (دیوان سلطنت اودھ) کی سرکار میں نوکر تھا۔ ناچنے اور گانے میں کامل تھا۔ (۲)

مغل جان

راجی مٹو مضافات دریاآباد ضلع بارہ بنکی کی رہنے والی تھی عہدِ واجدی تک زندہ تھی اور گنگے کے ہاتھ دکھاتی تھی۔ ناچنے میں دور دور تک مشہور تھی۔ فن موسیقی میں بھی کمال تھا

خدا بخش کسبی

اس کی ایک بیٹی مانی جان بے حد خوب صورت تھی خدا بخش مانی جان کو لیکر لکھنؤ سے ریاست بلرام پور آئی۔ الغرض مانی جان مہاراجہ ڈگبیج سنگھ کی خدمت میں آئی۔ اور بڑی آفت اٹھوائی، آخر زبردستی لکھنؤ بھیجی گئی، مانی جان نے راجہ مذکور سے جدا ہوتے ہی اپنی ماں کو چھوڑ دیا۔ اور بیت اللہ کی راہ لی۔ صبح سے شام تک عبادت کرتی تھی۔ وہیں دنیا سے چل بسی (۳)

بندہ دین و کالکا

یہ دونوں کتھک درگا پرشاد کے لڑکے تھے۔ اور آخر عہد نہر ایسے باکمال گزرے کہ روئے زمین پر ان ہمسر نہ تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے (خصوصاً بندہ دین نے) ناچ کے تمام فنون میں کمال دکھا کے اپنے

---

(۱) قدیم ہنرمندانِ اودھ ص۷ (۲) تاریخ دریاآباد۔

(۳) قدیم ہنرمندان اودھ ص۷۲

آپ کو بہ حیثیت استاد بے بدل ثابت کر دیا۔ بندہ دین کا گت ناچنا رقص کے استادانہ توڑے اور ٹکڑے اصلی صورت میں دکھانا گھونگھرو بجانے میں یہ اختیار اور قدرت ظاہر کرنا کہ جتنے گھونگھرو چاہے بجائے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کو پیر کی رگوں پر کس قدر قدرت اور قبضہ تھا۔ یہ بات مشہور و معروف ہے۔ کہ بندہ دین ایک سو چوراسی گھونگھرو پاؤں میں باندھ کر رقص کرتا تھا۔ اور اس کا ہر ہر لفظ اور ہر ہر چیز کو بتانا ایسی چیزیں تھیں۔ جس کا بندہ دین ہی پر خاتمہ ہوا۔ وہ ایک ایک چیز کو سو سو اداؤں وضعوں نزاکتوں اور دل قریب اشاروں سے بتاتا تھا اور اس میں ایسی نازک خیالی اور جدت طرازی ہوتی تھی کہ دیکھنے والا جانتا نہ ہو تو خاک سمجھ نہیں سکتا۔ ایسا رقص کرتا تھا۔ کہ لوگ ششدر رہ جاتے تھے۔ ایک سناٹے کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ دیکھنے والوں کے دل میں گداز پیدا ہوتا تھا۔ ایسے ایسے ناز غمزے عشوے اشارے رقص میں کرتا تھا کہ طبیعت بے چین ہو جاتی تھی۔ یہ معمول تھا کہ بندہ دین بتاتا۔ اور کالکا پاس کھڑا ہو کے اس کی تشریح کرتا جاتا تھا۔ ناچ میں اس کے پاؤں اس نزاکت سے زمین میں پڑتے تھے۔ کہ مشہور ہے۔ یہ بعض اوقات تلوار کی باڑھ پر ناچا اور مجال کیا جو تلوے میں ذرا چر کا آیا ہو۔ (۱)

---

(۱) قدیم ہنر وران اودھ ص ۲۷

(۷)

مصوّر

کانوں نے نغمہ و موسیقی کے ترانے سُن لئے، آنکھوں نے رقص بے محابا کا جلوہ دیکھ لیا۔ اب، مصوروں کے موقلم کا کمال ملاحظہ ہو

کاشی رام

عہد واجدی کا یکتائے روز کا مصوّر تھا۔ (۱)

میر محمد علی لکھنوی

عہد واجدی کے کاملین سے تھا۔ میر انیس کی مجلس پڑھنے کا ایک مرقع اسی محمد علی جیسے باکمال مصور سے داروغہ محمد خان نے تیار کرایا تھا یہ مرقع میر محمد علی نے بڑی جانکاہی سے کھینچا تھا۔ منبر کے داہنی جانب جناب احسن لکھنوی کے والد کھڑے ہیں۔ اور میر صاحب کے ہاتھ میں جو مرثیہ ہے اس پر یہ مصرعہ لکھا ہے۔ ع

برہم ہے مرقع چمنستان جہاں کا (۲)

مصوّر الدولہ

لکھنوی مٹیا برج میں واجد علی شاہ کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ بادشاہ نے مصوّرالدولہ بہادر خطاب دیا تھا۔ ہر قسم کی تصویر کشی میں ایسی اعلیٰ درجے کی مہارت

---

(۱) تذکرہ ہنروران اودھ ص ۲۳ (۲) واقعات انیس ص ۲۹

سکتے تھے کہ آج کل کے دستکاروں میں بھی وہ کمال نہیں پایا جاتا۔ اس وقت بھی حسین آباد کی تصویر والی بارہ دری اور دیگر مقامات پر شاہی مصوروں کی اعلیٰ صناعی کے نمونے موجود ہیں۔

نواب کاظم حسین خاں

لکھنوی اولاد نواب شجاع الدولہ سے تھے عہد واجدی کے مصور تھے۔ شوقیہ تصاویر کھینچا کرتے تھے۔ جانوروں کی تصویریں نہایت عمدہ بناتے تھے۔ اور کبوتر کی تصویر اب بھی لوگوں کے پاس موجود ہیں۔ اور نخاس میں بکنے آجاتی ہیں۔ نواب صاحب موصوف سرائے معالی خاں میں رہتے تھے۔ اب سے دس سال پہلے مرگئے۔ خوبصورت آدمی تھے۔[1]

(۸)

خوشنویس اور خطاط

خوشنویسی اور خطاطی بھی درحقیقت مصوری ہی کی ایک قسم ہے، نمونہ بھی پیش نظر ہے۔

میر احمد حسین

حسن الحسینی ولد سید علی لکھنوی نیشاپوری ایسے کامل خوشنویس تھے کہ میر عماد کے کتبوں میں خط ملا دیا۔ لارڈ منٹو بہادر وائسرائے نے ان کے ہاتھ کی جلی تحریر

(۱) قدیم ہنروران اودھ صفحہ ۳۲

رام پور میں دیکھکر کہا کہ یہ قلم کی تحریر نہیں ہے۔ انھوں نے موصوف کے سامنے لکھ کر مطمئن کر دیا۔ (۱)

رونق علی خاں ہنی پور عہد نواب علین الدولہ میں میر دفتر تھے حاجی حیات علی دہلوی کے شاگرد تھے۔ جو خط شکست کے کامل تھے۔ گلستاں خط شکست میں ان کی لکھی ہوئی قابل دید تھی۔ غدر میں تلف ہو گئی تھی (۲)

شیخ رحیم الدین خط نستعلیق کے کامل تھے۔ گلستاں ایک رات دن میں لکھی وہ کتاب محررہ ۱۲۱۷ھ موجود ہے۔ (۳)

حاجی حافظ ہادی علی بنارسی نے تحصیل علم لکھنؤ میں کیا قصبہ کاکوری میں مدفون ہیں۔ ہفت قلم تھے۔ ۱۲۳۴ھ سے مستقل قیام لکھنؤ میں تھا۔ آخر میں نابینا ہو گئے تھے۔ انھوں نے مولانا تراب علی قلندر کی مسہری کے لئے ایک چھت کپڑے کی بنوائی۔ اور اس پر نجات مداخل کے سورۃ آیتہ الکرسی بخط نسخ لکھی، اور اس کے درمیان سورۃ اخلاص کا طغرا لکھا۔ نابینائی کے عالم میں یہ کمال تھا کہ اسی چادر کے لکھتے وقت حافظ عزیز حسن صاحب موجود تھے۔ جن کا یہ قول ہے۔ کہ حاجی صاحب نے ان سے کہدیا تھا کہ جہاں سے حرف

---

(۱) تذکرہ کاملان رام پور ص ۱۲ (۲) سوانح اسلاف ص ۱۹

(۳) شمس التواریخ جلد دوم ص ۴۴ ۔

لکھوانا ہو وہاں میرا ہاتھ رکھ دو۔ چنانچہ حافظ موصوف ہاتھ رکھ دیتے تھے اور یہ لکھتے جاتے تھے، وہ چھت ابتک کاکوری میں موجود ہے۔ (۱)

حسام الدولہ فقیر محمد خان

عہد شاہی میں گذرے۔ دستخطی صاد ایسے بناتے تھے کہ دس ہزار روپے کے انعام پر بھی انکے طرح کوئی نہ بنا سکا۔ (۲)

منشی عبدالحئی

سندیلوی یہ یکتائے روزگار خوش نویس عہد واجدی میں گذرے ہیں۔ یہ منشی عبدالستار سندیلوی خوشنویس کے بیٹے تھے یہ واجدی دربار میں ملازم تھے۔ بعد انتزاع سلطنت مٹیا برج میں جاکر رہے۔ اور وہیں عمر ختم کی ان کے بیٹے منشی عبدالعلی اپنے والد کی جگہ مقرر ہوئے۔ جنکے صاحبزادے منشی عبدالحئی صاحب جج اور منشی عبدالسمیع صاحب کلکٹر پنشنر ابھی زندہ ہیں۔ (۳)

میر بندہ علی مرتعش

شاہی زمانہ کے خوشنویس تھے۔ ان کے ہاتھ میں رعشہ تھا خط نسخ کے بڑے کامل استاد تھے۔ جب قلم ہاتھ میں لیتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ لوہے کی طرح ہاتھ سختی سے جم گیا ہے ان کی قدر خط کے پہچاننے میں ایسا کمال رکھتی تھی کہ بڑے بڑے ان کا لوہا مانتے تھے۔ (۴)

سید احمد طباطبائی

خط نسخ کے نہایت لاجواب خوشنویس تھے۔ قرآن شریف لکھا کرتے تھے۔ سید صاحب نے لکھنؤ میں انتقال کیا اور مقبرہ ان کا راج گھاٹ میں دریائے گومتی پر تعمیر ہوا۔ چنانچہ

---

(۱) مشاہیر کاکوری صفحہ ۲۴۹ (۲) نامہ مظفری صفحہ ۳ (۳) تاریخ سندیلہ صفحہ ۲۰۳

(۴) قدیم ہنر دران اودھ صفحہ ۳۰۔

وہ مزار پاک ان کا مرجع ارباب حاجت کا تھا۔ پھول اور چراغ اہلِ غرض لاکر روشن کرتے تھے (۱)

انگریزی نواب ضیغم الدولہ سید زین العابدین خان

فارسی اردو اس قدر تیز لکھتے تھے کہ پندرہ منٹ میں سولہ صفحے لکھ سکتے تھے۔ کسی قدر فرانسیسی، جرمنی، ترکی، اور روسی زبان بھی جانتے تھے، اور علم جفر نوازش علی خان اور امام علی خاں سے سیکھا تھا۔ نواب صاحب اردو زبان کے شاعر بھی تھے۔ اور بہت سے نوحے تصنیف کئے تھے۔ فن شہ سواری اور نیزہ بازی سے خوب واقف تھے، اور بنوٹ میں تو فرد تھے۔ علم موسیقی میں تو نواب صاحب سمندر تھے۔ نور کا گلا پایا تھا۔ اگر تان پلٹا مارتے تھے۔ تو ایک ہزار قدم پر آواز پہنچتی تھی۔ ایسی ترکیب اور تقطیع مندی سے نوحے پڑھتے تھے۔ کہ باکمال ڈھاڑی بھی نہ پڑھ سکتے تھے، یہ راگ اور راگنی سے واقف تھے۔ جس چیز کی فرمائش ہوتی، فوراً سنا دیتے۔ دھرپد۔ آستائیاں خیال اور دیگر چیزیں کثیر تعداد میں جانتے تھے۔ بلکہ خود تصنیف کرتے تھے۔ پکی بات یہ ہے کہ بارہ سو دھرپد، اور دھمال کی تال اٹھارہ سو ہولیاں معلوم تھیں۔ فارسی، پنجابی، بنگلہ زبان کے گیت اچھی طرح جانتے تھے۔ انگریزی راگ راگنیوں اور دھنوں میں ایسی نفاست سے گاتے تھے کہ سننے والے پھڑک جاتے تھے، علاوہ اس کے ستار۔ سرنگھار۔ سارنگی۔ طبلہ۔ پکھاوج۔ بانسری۔ ڈھول۔ پیانو۔ ہارمونیم وغیرہ خوب بجاتے تھے۔ اور بین ایسی بجاتے تھے کہ انسان سن کر غش غش کر جاتے۔ (۲)

---

(۱) طلسم ہند ص ۲۸ (۲) تاریخ قیصری ص ۱۳۲

(۹)

فن کار

مختلف قسم کے فنکاروں کا ایک گلدستہ:-

اکلیل العلماء مولوی سید محمد محسن

کشمیری مشہور قاری تھے ٹیا برج میں سرکار واجد علی شاہ سے وابستہ تھے۔ (۱)

ایک باکمال قاری

یہ باکمال قاری شاہد سرائے معالیخاں کے رہنے والے تھے۔ ایک بار دو عرب لکھنؤ آئے اور ان کو تمام قاریوں کا امتحان منظور ہوا۔ چنانچہ ہر ایک سے قرأت سنی۔ لیکن کسی کے کمال کے قائل نہ ہوئے۔ ان قاری کے کمال کی بڑی شہرت تھی۔ یہ بہت معمر ہو چکے تھے۔ دانت گر گئے تھے۔ قوت باقی نہ تھی۔ لیکن انھوں نے قرآت سنائی۔ ایک جگہ پر جہاں ض کو ع سے کسی لفظ میں ملایا گیا تھا۔ انھوں نے اس خوبی اور کمال سے قرأت میں ظاہر کیا کہ عرب وجد میں آگئے۔ اور کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے ستر۷۰ طریقہ پر اس ض اور ع کے ملانے کو قرأت میں ظاہر کر کے اپنے کمال سے مبہوت کر دیا۔ (۲)

قرأت و تجوید کے فن کاروں کا تذکرہ بہت مختصر تھا۔ اب اس کے بعد، دیگر قسم کے فن کاروں کا کمال دیکھئے اور حیرت کیجئے کہ لکھنؤ کے باکمال کہاں سے کہاں تک پہنچ گئے تھے۔

منشی لطف علی لکھنوی

داروغہ امام بخش غازی الدین حیدر کے باورچی خانہ کے داروغہ تھے۔ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا منشی لطف علی

---

(۱) قدیم ہنرمندان اودھ ص ۹۰ (۲) قدیم ہنرمندان اودھ ص ۹۱

لکھنؤ میں موم کے کام کا پہلا شخص گزرا ہے محمد علی شاہ کے عہد میں مومی فریچ اسی نے پہلے پہل
بنا کر پیش کی۔ عہد حکومت واجد علی شاہ میں لطف علی فلیتوں میں نوکر تھے۔ بعد انتزاع سلطنت
پھر کسی کی نوکری نہیں کی ۱۹۵۶ء میں منشی لطف علی مر گئے۔ (۱)

کلن خاں لکھنوی

واجدی عہد کے تھے۔ غدر کے بعد مرے۔ نخود نگر میں رہتے تھے۔
معمولی پتھر کے دانے کو صاف کر کے سودانہ کا نگینہ بنایا تھا۔ اسے
نے ہاتھ میں رکھا کرتے تھے جس نے دیکھا اس نے یہی سمجھا کہ سلیمانی پتھر ہے۔ بڑے
بڑے جوہری نہ پہچان سکے۔ کلن خاں دو پلکا ایسا بناتے تھے کہ بڑے بڑے مبصر دھوکا کھا گئے۔۔۔
اور بمبئی والوں کا تو منہ پھروا دیا۔ سینکڑوں دو پلکے نیچے کہہ کے بیچ دیتے۔ بے مثل
کاریگر تھے۔ دو رتی کے نگینہ کو کئی رتی کا بنا کر بیچ لیتے تھے (۲)

دُلّی لکھنوی

واجدی عہد کا تھا۔ مشہور ہے کہ ایک انگریزی بیرسٹر قیمتی جوتا لندن سے
لے کر لکھنؤ تشریف لائے معلوم نہیں کیا اتفاق ہوا کہ صاحب کے ایک
پیر کا جوتا کھو گیا۔ لکھنؤ بھر میں ایسا جوتا نہ بن سکا۔ آخر کو دُلّی کو بلایا اور کہا کہ ایسا ہی جوتا
ایک پیر کا بنوا دو۔ جو مانگو گے دیا جائے گا۔ دلّی نے کہا اسّی روپے لوں گا اور اسی میں ملا دوں گا۔ اور
آج سے آٹھویں دن جوتا دے دوں گا۔ بیرسٹر صاحب نے اسے منظور کر لیا۔
اس نے آٹھویں دن جوتا سامنے جا کر رکھ دیا۔ بیرسٹر پہچان نہ سکے کہ کون سا جوتا بنا کر
لایا ہے۔ صاحب نے اسّی روپے کے علاوہ اور زیادہ انعام دیا۔ ایک دن بیرسٹر نے کور
اسی جوتے کو کمیشن پہن کر تشریف لے گئے۔ جب گھر آئے تو خدمت گار نے جوتا پیر سے
اتارا۔ تو تلی الگ ہو گئی، اوپر کا حصہ الگ ہو گیا۔ صاحب بہت جھنجھلائے اور دوسرے

---

(۱) قدیم ہنروان اودھ ص۱۹۲

(۲) قدیم ہنروان اودھ ص۱۹۱

دن وُتی کو بلایا اور کہا کہ کیا جوتہ تم بنا کر لاتے کہ ایک ہی دن میں نکل گیا۔ دُتی نے کہا، کہ حضور کو کمال دکھایا ہے۔ جوتا تو سب کاغذ کی ذتی کا بنا ہے۔ بیرسٹر صاحب بہت خوش ہوئے اور دوسرا جوتا ویسا ہی بنوا کر اپنے یہاں رکھ لیا۔ (۱)

جنرل سکندر حشمت

پرنس جواد علی خاں واجد علی شاہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے پاس سبز مخمل کا ایک تاج تھا جس پر سنہری ستاروں کا کام بنا تھا۔ وہ ذرا میلا ہو گیا۔ جب یہ لندن میں تھے، تو انھوں نے لندن کے ایک بڑے کاریگر کو بلا کر کہا کہ ایسا تاج ہم کو بنا دو۔ اس نے کہا: ایسا کام لندن میں نہ بن سکیگا' یہ کام لکھنؤ کا تھا اور تاج میں ستارے اس خوبی سے ٹانکے گئے تھے کہ تھوڑی دور سے ایک سفیدے کا ڈھلا نظر آتا تھا۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ستاروں کا کام ہے۔ (۲)

لکھنوی کاریگر کا کمال

نواب ملکہ جہاں زوجۂ ثانی محمد علی شاہ کے پاس ایک پازیب نہایت عمدہ طرحدار موتیوں کی تھی' اور اس میں نگینے جڑے تھے۔ اس کو خاص لکھنؤ کے کاریگر نے نہایت صناعی سے بنایا تھا' صفت یہ تھی کہ جب پازیب کے پھول کو کھول دیجئے اور لچھے کو اوپر کھینچئے تو گٹے سے گھٹنے تک جالی دار جراب کی طرح پنڈلی کے چاروں طرف لپٹ جاتی تھی' معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس میں کوئی لچکدار سے لگی ہے' بعد جب پیچ کی کیل نکال لیجئے تو خود بخود سمٹ کر گٹے پر آ کر لچھے کی طرح بن جاتی تھی'

پازیب شہزادی نواب بیگم کو ملکہ جہاں کے بعد ترکہ میں ملی تھی۔ جب شہزادی صاحبہ کابل کی لڑائی دیکھنے تشریف لے گئیں تو مکان میں چوری ہو گئی اور منجملہ پازیب چوری ہو گئی۔

نواب ملکہ جہاں کے پاس ایک نہایت نفیس اور خوشنما حقہ لکھنؤ کے دستکار کا بنا ہوا

---

(۱) قدیم ہنروران اودھ صفحہ ۱۹

(۲) چمنستان اردو صفحہ ۹۶

تھا۔ اس کا وزن سترہ سو روپیہ بھر تھا۔ یہ کل حقہ چاندی کا بنا ہوا تھا۔ جب حقہ پیا جاتا تھا تو پتلی یکے بعد دیگرے اپنے پیر اٹھاتی اور چڑیا اپنی گردن ادھر ادھر پھرا کر چوں چوں بولتی تھی اور اپنے بازوؤں کو کھول کر پھیلاتی تھی۔ یہ آم کے درخت پر بیٹھی تھی جو چاندی کا بنا ہوا تھا۔ درخت میں کرڑیاں بنائی تھیں جن پر پینا کیا ہوا تھا۔ یہ کی چاندی کی تھی، اس سے پیچوان نکالا تھا، چوکی کے چاروں کونوں پر چاندی کی ایک تپلی تھی اور بیچ میں چاندی کی ایک بڑی پتلی تھی۔ جس کے ہاتھ میں حقہ تھا۔ اس پتلی سے کاریگر نے آم کا درخت نکالا تھا۔ پتلی کے ہاتھ میں جب نے دی جاتی تھی اور اس میں منہال لگائی جاتی تھی۔ تو معلوم ہوتا تھا کہ پتلی حقہ پلا رہی ہے ملکہ جہاں نے اس حقہ کو حضرت مسٹر فلنڈل کیری M.A. FUNDALCAARKY اے ڈپٹی کمشنر لکھنؤ نے لندن کی نمائش میں بھیجا تھا۔ لندن سے ایک سارٹیفکیٹ آیا تھا کہ ہندوستان سے اس سے بہتر نادر چیز نمائش میں نہیں آئی۔ یہ حقہ پرنس حیدر مرزا بہادر نے سترہ سو یا سترہ ہزار روپیہ کو جوالا پرشاد کے ہاتھ فروخت کیا۔ عدالتی کاغذات میں حقہ کا ذکر موجود ہے اور داروغہ میر سید محمد مرحوم ساکن گھڑیالی نے اسے دیکھا تھا۔ جو ملکہ جہاں کی حقیقی بہن کے نواسے تھے (۱)

رام دیال گھڑی ساز ولد ہیرم سنگھ لکھنوی سخن تخلص تھا۔ آتش کا شاگرد تھا سہ

نگارِ یار سے بچنا ہے اے سخن دشوار
پڑا ہے دشمنِ جاں سے مقابلہ دل کا (۱)

مرزا عبد العزیز لکھنوی چوب دار محلہ یا محمود نگر میں رہتا تھا۔ واجدی عہد کا تھا۔ کوئی بیس سال ہوئے مرگیا۔ نظر آباد میں اس کی دکان

---

(۱) قدیم ہنروران اودھ ص۱۶

(۲) سراپا سخن ص۸۳

بندوق بنانے کی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے دونالی بنوائی، کل پرزے کندہ اور نال اپنے ہاتھ سے تیار کی اور نواب مرزا جعفر علی خاں صاحب رئیس شیش محل کے روبرو پیش کی۔ نواب مرحوم خود بڑے شوقین اور مبصر تھے۔ یہ بندوق بالکل ولایتی اور مشین میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی، نواب مرحوم نے مرزا نذر کو کافی انعام دیا تھا۔ اس کارہ کا بھی آبائی کام سے واقف ہے، عہد واجد علی شاہ میں ایسی توپیں بنتی تھیں، جن کا گولہ بارہ کوس جاتا تھا۔ (۱)

ملّی لکھنوی

واجدی عہد کا متھا، سعادت گنج میں رہتا تھا، غدر کے بعد مرا ہے، مشہور ہے کہ یہ اپنا کمال انھوں کے میلے میں دکھاتا تھا۔ اس کا کمال یہ تھا کہ جو تا پیر میں پہنے کوئی رئیس جا رہا ہے، ادھر اس نے زمین سے پیر اٹھایا، اس نے ایک پیر کا جوتا لے لیا، جب بغیر جوتے والا پیر زمین پر ٹکا اور دوسرا پیر اٹھا، اور دوسرا جوتا بھی نکال لیا، اس سہولت سے جوتا نکال لیتا تھا کہ مطلق خبر نہ ہوتی تھی، تھوڑی دیر کے بعد جوتا لاکر پیش کر دیتا اور لوگ خوشی سے انعام دیتے تھے۔ (۲)

داروغہ غلام عباس

واجدی عہد میں داستان گوئی کے ماہر تھے۔ داستان گوئی میں فن حسن عیاری کو ایسا بیان کرتے کہ شاید باید حسن کا نقشہ کھینچتے تو معلوم ہوتا کہ انھیں کا چہرہ حسن کی تصویر ہے اور بہت خوبصورت نظر آنے لگتے (۳)

رمضان علی

واجدی عہد میں تھا، فراز گنج میں رہتا تھا، سانپ پکڑنے میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا، ہزاروں سانپ پکڑ ڈالے۔ ہمیشہ بائیں ہاتھ سے سانپ پکڑتا تھا اور کہتا تھا جو لوگ داہنے ہاتھ سے سانپ پکڑیں گے نہ کہ اٹھائیں گے کیونکہ سانپ

---

(۱) قدیم ہنر دان اودھ ص۱۹۹

(۲) قدیم ہنر دان اودھ ص۲۱۲

(۳) قدیم ہنر دان اودھ ص۲۲۲

داہنے طرف سے منھ مارتا ہے، اس کے بہت سے شاگرد لکھنؤ میں موجود ہیں، بہت سے سانپ کے کاٹے ہوئے لوگوں کو اس نے اچھا کیا، جھاڑنے کا طریقہ یہ تھا کہ جس کو سانپ نے کاٹا اس کا کوئی عزیز پکارا ہوا چلا کہ اٹھو ڈنک جاگو جب رمضان سنتا اس آدمی کو اپنے پاس بلاتا اور کچھ پڑھ کر ایک طمانچہ یا چپت اس کو مارتا، وہ غش کھا کر گر پڑتا، اور جس کو سانپ نے کاٹا تھا وہ جہاں [لیٹا] تھا سے اٹھ بیٹھتا تھا۔ بعد کو جسے غش آ گیا تھا، وہ اپنی اصلی حالت پر آ جاتا تھا، میرے سامنے کتنی بار ایسا اتفاق ہوا۔ ایک بار اخبار ہمدم میں سید جالب صاحب مرحوم ایڈیٹر کے زمانے میں یہ تماشا اس کے کمال کو چھپوا دیا تھا۔

ایک بار رمضان علی ایک سیاہ اور پتلا سانپ الماری میں بند کر کے دکھانے لایا، ابھر کا [رنگت] سانپ تھا، جو نہایت زہریلا تھا، اس سانپ کو بعض قسم کو چھوڑ کر باقی سلا حقہ عباسی لگا کر رنگ دیا، اور افریقہ سے ایک انگریز سانپ خریدنے لکھنؤ آیا تھا، اس سانپ کو سو روپے میں مول لیا، وہ انگریز یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ رنگا ہوا سانپ ہے، پانچ سال کے قریب عرصہ ہوا کہ رمضان علی نوابؔ گنج میں بخار سے مر گیا۔ (۱)

آغائی مرزا لکھنوی

عہد شاہی کے تھے۔ محلہ نیا گاؤں میں رہتے تھے، چھپر اٹھانے میں تمام ہندوستان میں ان کی شہرت تھی، جسم کے عضو عضو پر چھپر رکھ کر کرتب دکھاتے تھے کہ ناخنوں اور گھاٹیوں پر بہت لمبی چھپر کو اٹھاتے اور سنبھالتے تھے، علاوہ تلوار دانتوں میں پکڑ کر اس کی دھار پر چھپر کو اٹھاتے ہوئے اور سنبھالتے تھے۔ ۸ اور ۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء کی درمیانی شب میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

محمد و گل باز

واجدی عہد کے تھے، ان کے دونوں رخساروں پر شاہی میں چوری کرنے کی سزا میں گل دیے گئے تھے اسی وجہ سے مشہور ہو گئے تھے، ایک دن

(۱) قدیم ہنرمندان اودھ ص ۳۱

(۲) روزنامہ لکھنؤ جمعہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۳ء جلد ۱۳ نمبر ۲۴۶ صفحہ ۵ کالم ۳

محمد واپنے لڑکے کو گود میں لے گزار رہے تھے، ایک مہاجن کی دوکان پر جڑاؤ پنکھیا رکھی تھی۔ ان کا بیٹا پنکھیا کو دیکھ کر رونے لگا، کہ میں لونگا، محمد و نے مہاجن سے کہا کہ بھائی پنکھیا دے دو میں لڑکے کو بہلا کر ابھی دے دوں گا، مہاجن نے کہا ہم نہیں دیں گے، محمد نے کہا۔ بہت اچھا اس کو ہوشیاری سے رکھیے گا، یہ کہہ کر چلے آئے اور رات کو جا کر پنکھیا چرا لائے اور تیسرے پہر کو جا کر پنکھیا مہاجن کے سامنے رکھ دی۔ (۱)

میر محمد علی لکھنوی

محمد علی شاہ کے عہد میں تھے انھوں نے طوطوں سے کبوتروں کا کام لیا اور بڑا کمال حاصل کیا، طوطا فطرتاً بیوفا جانور ہوتا ہے وہ پنجرے سے نکلتے ہی اڑ جاتا ہے لیکن خدا جانے میر صاحب نے کونسا افسوں دم کر دیا تھا کہ طوطے کی فطرت بدل دی تھی، یہ دس بارہ طوطوں کی ٹکڑی اڑاتے تھے، اور کیا مجال کہ وہ اڑ کر پنجرے میں نہ جائیں، میر صاحب روز حسین آباد میں آکر طوطوں کی ٹکڑی اڑاتے تھے (۲)

مرزا قیتن

واجدی عہد کے تھے مفتی گنج میں رہتے تھے۔ اور مرزا قیتن کے نام سے مشہور تھے، یہ زیادہ تر کبوتر پالا کرتے تھے، ایک دن گنگی شوکل کے تالاب سے ایک کبوتر باز ان کے پاس آئے اور کہا جب جانوں کہ آپ کے کبوتر میرے کبوتروں سے گنگی شوکل کے تالاب پر لڑیں انھوں نے کہا آج کے تیسرے دن لڑاؤں گا اور اپنے ٹھاٹھر سے دو کبوتر نکال کے آنجناب کو دیے۔ کہ ان کو لے جا کر تھوڑی دیر کے لئے ٹھاٹھر میں چھوڑ دیجئے، اور اس کے بعد اڑا دیجئے گا، وہ کبوتروں کو لے گئے اور حسب ہدایت عمل کیا، دونوں کبوتر اڑ کے مفتی گنج چلے آئے۔ مرزا قیتن نے تیسرے دن ان کبوتروں کو اپنے دیگر کبوتروں کے ساتھ اڑا دیا، اور گنگی شوکل کے تالاب کی طرف ہانکا پہلے دونوں کبوتر

---

(۱) قدیم ہنرمندان اودھ ص۲۱

(۲) گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۱۵۰

آگے آگے باقی کبوتر پیچھے پیچھے اڑتے ہوئے گنگی شوکل کے تالاب پر پہنچے اور ان کبوتروں سے لڑے اور ان کے دو کبوتر لیے ہوئے مفتی گنج آ گئے۔ مرزا قین نے ان دونوں کبوتروں کو مار دیا۔ دوسرے دن وہ آکر اپنے دونوں کبوتروں کو لے گئے اور ان کی استادی کے قائل ہو گئے (۱)

مرزا علی عباس

نواز گنج میں رہتے تھے اور واجد علی عہد کے تھے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ اپنے گھر کے پالو کبوتروں میں سے کوئی ایک لے لیا اور گھر میں کسی سے کہہ دیا کہ جب یہ کبوتر کوٹھے پر آکر بیٹھے تو اور کبوتر جو ٹھاٹھر میں بند ہیں انھیں کھول (دینا) یہ کہہ کر کبوتر ہاتھ میں لے کر چلے اور کسی رئیس کے یہاں آئے اور ان کے کوٹھے پر گئے اور اس کبوتر ان کے ٹھاٹھر میں بند کر دیا پھر ٹھاٹھر آکر کھولا، کبوتر نکل کے ٹھاٹھر پر بیٹھا، انھوں نے اسے اڑا دیا وہ اڑ کر گھر پر آ کے ٹھاٹھر پر بیٹھ گیا پھر حسب عادت گھر میں کسی نے ان کے ٹھاٹھر کی کھڑکی کھول دی سب کبوتر نکل کر بیٹھے وہ بیٹے والا کبوتر اڑا آگے آگے وہ اور پیچھے بقیہ سب کبوتر اڑتے ہوئے وہاں پہنچے، جہاں سے مرزا صاحب نے اس کو اڑایا تھا انھوں نے دانہ ڈال دیا۔ سب کبوتروں نے کھایا۔ مرزا صاحب کوٹھے سے اتر کر نیچے آئے۔ کبوتر سب کے سب اپنے گھر چلے گئے، دوسرا کمال ان کا یہ تھا کہ اپنے سب کبوتر شہر بھر میں جہاں جاہتے لے جاتے اور کسی نواب یا رئیس کے کوٹھے پر جا کر لڑاتے یا اڑاتے، جب نواب صاحب تماشا دیکھ چکتے، تو وہی دانہ جو یہ اپنے کبوتروں کو دیا کرتے تھے، نواب صاحب کے کوٹھے پر ڈال دیتے، اور اپنے گھر چلے آتے جب کبوتر دانا کھا چکتے، پھر کسی کے اڑائے نہ اڑتے اور سیدھے گھر لیٹ آتے۔

تیسرا کمال ان کا یہ تھا کہ لکھنؤ سے بمبئی گئے اور وہاں کبوتر خریدے اور پنجرے میں سب کو بند کیا اور جہاز پر کربلائے معلیٰ روانہ ہوئے، جہاز چھوٹا انھوں نے پنجرہ کبوتروں کا کھول

---

(۱) قدیم ہنروان اودھ ص۲۱۰۔

دیا۔ کبوتر اڑ رہے ہیں۔ جا رہا چلا جاتا ہے۔ جب سیٹی دی اور لا کیا کبوتر اپنے پنجرے میں آکر بیٹھ گئے۔ پورے سفر میں یہی تماشہ کرتے گئے۔ معلوم نہیں کونسی گولی کبوتر کو کھلا دیتے تھے اور دانے میں کون سی دوا ملا دیتے تھے۔ کسی کو بتایا نہیں اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔ (۱)

مختلف قسم کی بازیاں

شاہان اودھ کے زمانہ میں مختلف درندوں اور پرندوں کو خاص عنوان سے تعلیم دے کر لڑانے میں صد ہا کاملین گزرے یہ امر مسلمہ ہے کہ اس فن میں جیسے کرشمے اور تماشے سواد لکھنؤ میں دیکھے گئے ——— ہندوستان کیا ساری دنیا میں نہ دیکھے گئے ہوں گے یہ شوق تین طرح پیدا کیا گیا۔

(الف)

(قسم اول جانوروں کو لڑانا)

(۱) شیر

(۲) چیتے

(۳) تیندوے

(۴) ہاتھی

(۵) اونٹ

(۶) گینڈے

(۷) بارہ سنگھے

(۸)

(ب)

(۱) قدیم ہندوستان اور دوسرے ۲۰

طیور کو لڑانا اور اڑانا یا اُن سے تماشے کا ظہور میں آنا ــــ لڑنے والے طیور ہیں

(۱) مرغ

(۲) تیتر

(۳) بٹیر

(۴) لودوں کی لڑائی

(۵) گلدم لڑانا

(۶) لال لڑانا۔

(اڑنے والے طیور ہیں)

(۱) کبوتر

(۲) طوطے

(تماشا کرنے والے طیور ہیں)

نیا:

(ج)

(۱) پتنگ اڑانا۔

(۲) کنکوے اڑانا۔

چاند گنج کے رستے میں ایک عظیم الشان مویشی خانہ جسے آج کل کے زمانے کی اصطلاح میں زندہ جانوروں کا عجائب خانہ کہنا چاہیے۔ نصیر الدین حیدر نے آراستہ کرایا تھا، اس میں اس قدر کثیر اور عجیب اور مختلف اقسام کے جانور تھے جس کا اندازہ کرنا غیر ممکن تھا، بادشاہ کے پاس ایک شیر تھا۔ جس کا نام "بھوریا" تھا، یہ شیر کوہ ہمالیہ کے دامن میں واقع ایک موضع بھوریا سے پکڑ کر آیا تھا، اور اس وجہ سے اس کا یہ نام ہوا۔ بادشاہ کے پاس ایک چیتا گرانا می بڑا گراں ڈیل تھا۔ بہت سی لڑائیاں جیتے ہوئے تھا اس کی کھال پر دھاریاں

نہایت خوش نما تھیں۔ ایک ہاتھی صرف ایک دانت کا اسپانڈر آور کوہ پیکر تھا کہ تنہا اس نے سو مرتبہ لڑائی میں فتح حاصل کی جس کا نام ملیر تھا۔ ایک گھوڑا "مردم خور" کے نام سے مشہور تھا کیونکہ وہ بہت سے لوگوں کو ہلاک کر چکا تھا۔ ایک کمیت رنگ کا نڈر گھوڑا تھا، جس کو شیر اور نے بھیڑیے تک نہ مار سکے بلکہ خود زخمی ہو گئے، ہاتھی کی لڑائی، مینڈھے کی لڑائی، مرغ کی لڑائی، اور دیگر جانوروں کی بازی کا رواج تھا۔ بٹیر بازی کی ابتدا لکھنؤ میں نواب یمین الدولہ کے وقت سے ہوئی۔ پہلے یہاں پنجابی بٹیر لڑانے آئے تھے پھر جب لکھنؤ والوں نے دلچسپی لی تو اس کو ایک مستقل فن بنا کے چھوٹے جانوروں کے سکھلانے کے علاج کے ہزار ہا نسخے، لڑانے کے طریقے اور جانوروں کو طرح طرح سکھا کر بازیوں میں شامل کر کے ایک شیوہ ہو گیا۔ ہزاروں آدمیوں کے لئے یہ روزی کا ذریعہ نکل آیا۔ آصفی عہد میں مینڈھے لڑانے کا فن بھی عروج پر تھا۔ ہندوستان میں اس کا آغاز حبشیوں سے ہوا۔ اور رفتہ رفتہ یہ لکھنؤ میں بھی پھیل گیا۔ مرغ کی لڑائی کی ایجاد نواب شجاع الدولہ کے عہد میں ہوئی۔ نواب آصف الدولہ کو بھی مرغوں کی لڑائی کا شوق تھا۔ آصفی عہد میں ہاتھیوں کی لڑائی اکثر بہت چرچا تھا۔ دولت کی فراوانی تھی۔ امرا کے لئے یہ تفریح کا ذریعہ تھا اور بہت سے غریب اس میں پلتے تھے اور جانوروں کے سکھانے اور ان کو بنانے میں طرح طرح کی حکمتوں اور ریاضتوں کی نمائش ہوتی تھی۔ (۱)

قائم علی نقال

عہد واجدی کا بہت باکمال نقال تھا۔ جو محلہ محمود نگر میں رہتا تھا۔ نواب حضور عالم معہ اپنی زوجہ نواب محل گوہر آرا بیگم کے قائم کا کھیل دیکھنے آئے۔ ان مقررین کو دیکھتے ہی قائم سامنے آیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔ کہ خدا نواب صاحب کو سلامت رکھے اور بیگم صاحبہ کو قائم رکھے

---

(۱) قدیم ہنروران اودھ ص ۲۵

اتنا سخت فقرہ تھا اگر انعام دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ قائم کا کمال یہ تھا " کہ ایک مرتبہ ساڑھے تین گھنٹے تک طرح طرح کے منہ بناتا رہا۔ (۱)

(۱) گذشتہ لکھنؤ ص ۱۸۱

(۱۰)

حکیم اور جراح

بڑے بڑے حکیم اور جراح بھی اس عہدِ گرامی میں اپنا کمال دکھا کر زندۂ جاوید ہو گئے۔

حکیم سید ہاشم علی

موہانی حکیم سید کاظم علی کے بیٹے تھے۔ عہد شاہی کے تھے۔ مولوی سید آصف علی صاحب رئیس جلالی ضلع علی گڑھ نے امتحاناً اپنی نبض حکیم صاحب کو دکھائی۔ حکیم صاحب نے گزشتہ آٹھ سال کے کل حالات محض نبض دیکھ کر بتا دیے۔ انھوں نے سب کی تصدیق کی۔ حکیم صاحب شرط کر کے دن اور ساعت مقرر کر کے مریض کا علاج کرتے تھے۔ (۱)

حکیم پناہ علی

عہد امجدی کے تھے۔ نواب حضور عالم کے باغ کی پشت پر ان کا مکان تھا۔ نبض دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ کیا مرض ہے۔ قیافہ شناسی میں ایسا کمال تھا کہ ایک دن اپنے مکان کے آگے کھڑے تھے کہ ایک نوجوان لڑکا ادھر سے جا رہا تھا۔ اس کو بلایا اور کہا کہ تم کبوتر اڑاتے ہو۔ اس نے کہا جی ہاں۔ حکیم صاحب نے کہا خبردار اب ق زور سے نہ کرنا ورنہ مر جاؤ گے۔ لڑکے نے نہ مانا۔ حسبِ معمول کوٹھے پر چڑھ کر کبوتر اڑاتے اور زور سے تو کی، فوراً دم نکل گیا۔ (۲)

حکیم غلام محمد خان

یہ محمد علی خاں کے بیٹے تھے۔ ایک شخص وجع المفاصل میں مبتلا تھا۔ انھوں نے اس کے پیر کے انگشت کی فصد دے کر صرف دو قطرے خون کے نکالے۔ ورم اور درد جاتا رہا اور پھر تمام عمر یہ مرض نہیں ہوا۔ یہ ضرور رہا

---

(۱) سوانح عمری کشوری جلد اول و یادگار حسن

(۲) قدیم ہنرمندان اودھ صفحہ ۹۵

اس طرف کا حصہ ادھڑ گیا، لیکن اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ حکیم صاحب نے کہا کہ اگر دو قطرے خون کے اور نکل جاتے تو سارا خصیہ غائب ہو جاتا۔ مگر رجولیت کو کوئی صدمہ نہ پہنچا۔ (۱)

شاہ محمد حسن صابری

فن جراحی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ رام پور میں ان کا مقابلہ کئی بار ڈاکٹروں سے اس طرح ہوا کہ پھوڑے میں ریم (پیپ) کا ہونا ڈاکٹروں نے تسلیم نہیں کیا۔ صابری نے آنکھوں پر پٹی باندھ کر ریم کی جگہ انگلی رکھ دی، اور شگاف دینے کے بعد سے ریم نکلی۔ (۲)

مولوی

اس نام کا جراح تھا۔ جو عہدِ واجدی کا تھا۔ مفتی گنج میں رہتا تھا۔ امراؤ مرزا صاحب کی داہنی آنکھ میں ناسور ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کا علاج کر کے ان کے والد تھک گئے۔ ایک دن مولوی نے ان کے والد سے کہا کہ اپنے باغیچہ میں میری قبر کا وعدہ کیجئے۔ تو چند دن میں آپ کے لڑکے کو اچھا کر دوں گا۔ انھوں نے وعدہ کیا، تیرہ دن میں بالکل اچھا کر دیا۔ (۳)

کالے بھگت شاہجہانپوری

قوم کے بنئے تھے۔ جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے تھے۔ تمام عمر مجرد رہے۔ مہاراجہ گوالیار کی طوائف کو فربہی کی بیماری تھی۔ کسی سے فائدہ نہ ہوا۔ کالے بھگت کے علاج سے دو دن میں موٹا پا دور ہو گیا۔ کسی نے دس ہزار روپے اور تحائف پیش کئے۔ مگر آپ نے انکار کر دیا۔ (۴)

میر بخش دریاآبادی

رمضانی کے خاندان سے تھا۔ حجامت ایسی بناتا تھا کہ تین چار دن تک کھونٹی نظر نہیں آتی تھی۔ علاوہ اس کے ہاتھ کی

---

(۱) تاریخ شاہجہانپور ص۲۰۰

(۲) تذکرہ کاملانِ رامپور

(۳) قدیم ہنرمندانِ اودھ ص۹۵

(۴) تاریخ شاہجہانپور ص۲۲۵

باریک سے کپڑے پر چکن کا کام ایسا بناتا تھا کہ بیل بوٹے اُبھر آتے تھے جو ایک ہفتہ سے زیادہ رہتے تھے لیکن اگر کپڑا دھوئیں نہ دھویا جائے تو نشان برابر رہتا تھا شروع انگریزی عہد تک زندہ رہا ۔۔۔ (۱)

شیخ عابد حسین عرف عمدو لکھنوی

واجدی عہد کا تھا، اور مفتی گنج میں رہتا تھا اس کا کمال یہ تھا کہ ناخن گیری ہاتھ میں لی، اور دریا میں اتر گیا، اور غوطہ لگایا، اور دونوں ہاتھ پانی کی سطح کے اوپر نکالے اور کسی دوسرے شخص کی انگلیوں کے ناخن کاٹ دیے، اور مجال کیا کہ چرکا لگ جائے۔ یا کوئی ناخن ٹیڑھا کٹ جائے۔ (۲)

شیخ عابد حسین

عرف عمدہ لکھنوی عہد واجدی کا تھا۔ مفتی گنج میں رہتا تھا۔ اس نے جراحی اور حجامی دونوں میں کمال حاصل کیا تھا۔ جراحی کا کمال تھا کہ ایک مرتبہ باہر سے ایک ہندو زمیندار لکھنؤ آئے۔ اُن کی ران میں زخم پڑ گیا تھا۔ جو کسی طرح اچھا نہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ ٹانگ کاٹ دی جائے گی زخم کے اندر کیڑے پڑ گئے ہیں اور اگر ٹانگ نہ کاٹی گئی تو یہ مر جائے گا۔ زمیندار ٹانگ کٹوانے پر راضی نہ ہوا اور عمدو کو بلوایا عمدو نے کہا کہ ٹانگ کاٹنے کی ضرورت نہیں ڈاکٹر سے عمدو سے بحث ہو گئی، ڈاکٹر نے کہا تم نہیں اچھا کر سکتے عمدو نے شریفہ کی سوکھی پتیاں جلائیں اور اس کا دھواں زمیندار کے زخم کے اندر پہنچایا اور دھواں اندر پہنچ کر کیڑے بچ بچا کر باہر نکلنا شروع ہوئے۔ ڈھیروں کیڑے نکلے، اس کے بعد ہری شریفہ کی پتیاں ہتھیلی پر ملیں اور ان کا عرق زخم پر ٹپکایا۔ باقی سب کیڑے نکل گئے چند دن میں مرہم لگا کر زخم بھر دیا۔ زمیندار کی ٹانگ اچھی ہو گئی، زمیندار نے عمدو کو بہت انعام دیا اور ڈاکٹر صاحب جراح کے کمال کے قائل ہوئے (۳)

---

(۱) تاریخ دریاباد

(۲) قدیم ہندوستان اودھ صفحہ ۱۸۲

(۳) قدیم ہندوستان اودھ صفحہ ۹۹

خیاط درزی اور رنگریز (۱)

جامہ زیبی اگر ایک فن ہے تو جامہ تراشی اس سے بڑا فن ہے :-

عہد واجدی کا رنگریز

فتح گنج میں رہتا تھا، ایک دفعہ اس نے نفیس کپڑوں کا ایک گرڈل (ربیٹی) اور ایک طرف اُسے سرخ رنگا اور دوسری طرف سے سبز رنگ کر سیولاگٹ صاحب ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ پر بھیجا اور گرڈل پیش کی، ڈپٹی کمشنر گرڈل دیکھ کر نہایت خوش ہوئے۔ اور کہا کہ ہم نے ایسا کاریگر کہیں نہیں دیکھا ایک ہی کپڑے کو ایکطرف سے سُرخ رنگے اور دوسری طرف سے سبز۔ زبانی خان بہادر مرزا علی سجاد حسین صاحب لکھنوی کلکٹر علی گڑھ (۱)

شیخ الٰہی بخش و شیخ محمد علی

یہ دو سگے بھائی سعادت گنج میں رہا کرتے تھے الٰہی بخش عہد نصیری کا باکمال خیاط تھا۔ اگلے زمانہ کا انگریزی وضع کا کلی دار کوٹ بے مثل سیتا تھا۔ عہد نصیر الدین حیدر میں لارڈ کامبرمیر کمانڈر انچیف لکھنؤ تشریف لائے تھے اور ان کی پیشوائی بادشاہ نے بطریق شاہی کی تھی، جب کمانڈر انچیف بادشاہ سے ملنے تشریف لائے تو اس وقت بادشاہ شیخ الٰہی بخش کے ہاتھ کا سبز مخمل کا سیا ہوا کوٹ پہنے تھے الٰہی بخش نے کوٹ کی کلیاں اس طرح سے ٹانکی تھیں کہ جب بادشاہ کوٹ پہن کر کمانڈر انچیف کے سامنے ہوکے رُخ پر کرسی پر بیٹھے بطمسے ملعد کوٹ میں لگی، تو معلوم ہوا کہ انار چھوٹ کے رہ گیا، کمانڈر انچیف نے پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے جس بار اپنی چمک دکھاتی ہے۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ میرے درزی نے کوٹ کی کلیاں اور سیون کچھ اس ترتیب سے رکھی ہے کہ جب

---

(۱) قدیم ہندوستان اودھ صلا

لطفی

مسلمان تیلی تھا۔ عہد واجدی کا تھا مفتی گنج میں رہتا تھا کولھا کہ ہاتھ کسی کا اتر گیا۔ اس نے فوراً بٹھا دیا۔ عہد انگریزی میں ایک انگریز کے کتے کا کولھا اکھڑ۔ وہ انگریز کتے کو لطفی کے یہاں لایا۔ کہا اس کا کولھا بٹھا دو۔ لطفی کتے کو اپنے گھر کے اندر لے گیا اور اس کے پیٹ کے نیچے ایک لکڑی ڈالی اور اس طرح کتے کو اچھالا۔ کولھا بیٹھ گیا۔ انگریز نے کہا کہ کتے کو بلاتے ہے۔ صاحب نے آواز دی کتا اچھا خاصہ چلا آیا۔

جب ہوا لگتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ گلدستہ ایسا کھل گیا۔ کمانڈر انچیف نے درزی کے کمال کی تعریف کی۔ یہی الٰہی بخش واجد علی شاہ کی دو پلڑی ٹوپی سیا کرتا تھا اور فی ٹوپی بادشاہ ایک اشرفی دیتے تھے۔ اس ٹوپی میں صفت یہ تھی کہ جہاں پر سیون کے دونوں پلّے ایک دوسرے سے ملا کے سیئے جاتے ہیں سیون کے بیچ میں ایک مہین سا تار دیدیا تھا جو کمان کی طرح دونوں کونوں تک جب بانکی ٹوپی بادشاہ سر پر لگاتے تو ایک طرف کی بھوں خفیف سی چڑھی رہتی تھی، اس ٹوپی کی کاریگری لکھنؤ کی تصویر والی بارہ دری میں واجد علی شاہ کی تصویر میں دیکھ لیجیے، اس تار کا نتیجہ تھا کہ دونوں نکے کھسکتے نہ تھے۔ بلکہ جمع رہتے تھے محمد علی نے بھی اس ٹوپی کو سیا تھا۔

شیخ محمد علی کا کمال یہ تھا کہ پورے ایک تھان کا انگرکھا ایک ہی تاگے سے سیتا تھا۔ اگر تاگے کو پکڑ کر کھینچ لیجیے، تو پورا انگرکھا کھل جاتا تھا۔ محمد علی ایسا بھی انگرکھا سیتا تھا کہ کاندھوں یا چوبغلوں میں جوڑ نہیں ہوتا تھا۔ آغا سید مجتبیٰ حسین خاں صاحب مرحوم نے اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے انگرکھے پہنے تھے، محمد علی کے مقابلہ کے لئے ایک درزی فیض آباد سے آیا اور چار طرح سے بر کا پائجامہ سی کر دکھایا۔ محمد علی نے سات طرح سے سی کر دکھایا وہ ان کی استادی کا قائل ہوگیا، محمد علی زنانی میں ایسی گوٹ لگاتا تھا کہ کسی کونے پر جھبہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ کی سی ہوئی رزائی ابھی تک نواب سجّاد علی خان صاحب عرف نواب صاحب ساکن تحسین گنج کے پاس موجود ہے۔ محمد علی مرصدری بھی بے مثل سیتا تھا، اس کے ہاتھ کی سی ہوئی مرصدریاں مجتبیٰ حسین خاں صاحب رئیس لکھنؤ پہنا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب سجاد علی خاں صاحب نے امداد علی خیاط سے زنانہ پائجامہ کی گوٹ کٹوائی، مگر گوٹ کہیں سے کم کہیں سے زیادہ کٹی۔ محمد علی نے اپنی آنکھوں پر پٹی بندھوائی اور قینچی ہاتھ میں لے کر گوٹ برابر سے کاٹ کے رکھدی۔ امداد علی ان کی استادی کا قائل ہوگیا۔ محمد علی کا مذاق اور کمال بھی ملاحظہ ہو، ایک مسماۃ نے محمد علی سے گرنٹ کا پائچوں دار پائجامہ سلوایا انھوں نے سی کر دیدیا۔ اب جو وہ پہنتی ہیں تو کولھوں کے اوپر پائجامہ نہیں چڑھتا۔ عاجز ہو کر ان

کو واپس کر دیا کہ یہ تنگ ہوگیا ہے اسے ڈھیلا کردو۔ محمد علی نے چور کلی میں خوب کلپ (کلف) لگا دیا تھا، اور بعض کلیوں میں چند ٹانکے اس طرح سے دیئے تھے کہ پائجامہ تنگ ہوگیا تھا۔ انھوں نے اسی وقت رہالی کو ہاتھوں سے خوب مل دیا اور بعض کلیوں کے ٹانکے کھینچ لیئے، اور توڑ دیئے اب جو پائجامہ پہنا گیا تو بالکل ٹھیک۔ خوب ہنسی ہوئی اور کمال کی تعریف کی گئی۔ حقیقت امر یہ ہے کہ محمد علی کپڑا سینے میں اپنا جواب ہندوستان میں نہ رکھتا تھا۔ یہ زمانہ شاہی کا آخری باکمال خیاط تھا تین سال کا عرصہ ہوا کہ محمد علی کچھ کم سو برس کی عمر میں لاولد فوت ہوا، آخر میں سماعت اور بینائی میں فرق آگیا تھا۔ عہد واجدی میں محمد علی کا رسم شاہی سعاروں میں تھا۔ (۱)

---

(۱) قو[illegible] ان اودھ ص ۱۶۳

(۱۲)

باورچی اور رکابدار

بادشاہ کا محل ہو یا رئیس کی محلسرا، یا سرمایہ دار کی حویلی، یا متوسط طبقہ کے کسی آدمی کا گھر، سب کے ہاں، دستر خوان پر جو کھانے چنے جاتے تھے یا جو مٹھائیاں رکھی جاتی تھیں، ان میں جدّت، لذّت، اور تنوع کا پہلو ہمیشہ غالب رہتا تھا۔

کلّو عہد واجدی میں روٹیاں بنانے میں مشہور تھے۔ (۱)

مسماۃ امیرن عہد واجدی میں بے مثل حلوہ بنانے والی گذری ہے۔ (۲)

نوابُ سیّد محمود حسین خان بہادر طباطبائیؒ عہد امجد علی شاہ میں امری پلٹن کے کپتان تھے۔ آم کی گری ایسی چھیلتے تھے کہ اگر مرغی کے انڈوں میں ملا کر رکھدی جاتی تھی تو کوئی پہچان نہ سکتا تھا۔ انھوں نے اپنے چھوٹے بیٹے نواب سیّد سجّاد حسین خاں کو گری کا چھیلنا سکھا دیا تھا، ان میں بھی یہی کمال تھا۔ نواب محمود خان صاحب خوش خط تھے۔ اور تربوز کی قندیل بناتے تھے۔ اس طرح سے کہ تربوز کو کھوکھلا کر کے اس کے چھلکے کے اوپر چاقو کے مہین پھل کی نوک سے طغرے بناتے اور جانور مثل گھوڑا ہاتھی وغیرہ بناتے۔ دیوالی میں تیل بھر کر بیچ میں رکھتے۔ اور جلا دیتے، روشنی میں جانور اور لکھائی صاف نظر آتی تھی۔ (۳)

---

(۱) قدیم ہنروران اودھ صـ ۱۵۶

(۲) ظفر نامہ صـ ۱۲

(۳) قدیم ہنروران اودھ صـ ۱۶۰

شیخ فدا علی لکھنوی

عہدِ واجدی کا رکاب دار تھا۔ سرائے معالی خاں میں اس کا مکان تھا۔ عہدِ انگریزی میں اس نے اپنا کمال دکھایا تھا۔ مشہور ہے کہ فدا علی نے شیشہ کا ایک کنول بنا کر میز پر رکھا، اور لاٹ صاحب کو دکھایا لاٹ صاحب نے فرمایا کہ تم نے شیشہ کو نہایت صفائی سے ڈھال کر بنایا ہے۔ اور کوئی بات اس میں قابلِ تعریف نہیں۔ فدا علی نے مومی شمع کنول میں لگا کر دیا سلائی سے جلائی۔ روشنی نہایت صاف تھی۔ پندرہ منٹ کے بعد بجھا دیا۔ اس کے بعد کنول کا کسکاٹ چٹکی سے توڑا۔ اور لاٹ صاحب سے کہا، کہ حضور اسے نوش فرمائیے۔ لاٹ صاحب نے فرمایا کہ ہم شیشہ نہیں کھاتے۔ خود فدا علی نے لاٹ صاحب کے سامنے چبا کر کھایا، اور دیگر حضرات کو کھلایا۔ اور لاٹ صاحب سے کہا کہ کنول حضور کی نذر ہے۔ یہ پورا کنول مصری کا بنایا تھا۔ لاٹ صاحب نے فرمایا کہ کمال کی حد کر دی، اور انعام مرحمت فرمایا۔ (۱)

واجد علی شاہ کے آخری عہد کا رکاب دار

جب بادشاہ مٹیا برج میں رونق افروز تھے، تو ایک باورچی نے باغ میں نارنگی کے درخت میں چند نارنگیوں میں اس کمال کے ساتھ شیرہ اُتار دیا تھا کہ معلوم نہ ہوتا تھا۔ جب بادشاہ نے نارنگی توڑی، اور رکاب دار نے چھیل کر قاش پیش کی اور بادشاہ نے نوش کی۔ تو لب بند ہونے لگے۔ سونگھنے میں اس نارنگی سے بھینی بھینی تازگی کی خوشبو آتی تھی، نارنگیاں ذائقہ میں اصلی نارنگیوں کی طرح تھیں، اور رنگ روپ میں اور اس کی بات میں مطلق فرق نہ تھا۔ (۲)

شیخ حیدر بخش

عہدِ واجدی کا باورچی تھا۔ جو تین سال ہوئے لکھنؤ میں مر گیا پچانوے سال کے قریب اس کی عمر تھی۔ نواب مرزا احمد باقر علیخاں

---

(۱) قدیم ہنر دران اودھ ص ۱۵۵

(۲) قدیم ہنر دران اودھ ص ۱۵۲

بہادر مرحوم رئیس شیش محل کا ملازم تھا۔ ایک بار نواب مرحوم نے نواب سید بنیاد حسین خاں صاحب جاہ مرحوم کو کھانے کے خوان بھیجے تھے جس میں کل کھانا مونگ کی دال کا تھا، روٹیاں سالن پراٹھے کباب پلاؤ وغیرہ یہ سب حیدر بخش نے مونگ کا بنایا تھا، حیدر بخش انار پلاؤ اور شریفہ پلاؤ پکاتا تھا۔ اگر اصلی اناروں اور شریفوں میں ملا کر اس کے ہاتھ کا بنا ہوا شریفہ اور انار رکھ دیجیے تو کوئی پہچان نہ سکتا تھا کئی بار اس کا امتحان ہو چکا ہے حیدر بخش تین سو ساٹھ قسم کی روٹی پکانا جانتا تھا ہاتھی کان روٹی ایسی پکاتا تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھی کا کان کاٹ کر رکھا ہے۔ اور کھائیے تو کسی قسم کی گرانی نہیں۔ حیدر بخش تنکی بے مثل لگاتا تھا کہ ذرا سی ٹھیس میں ٹوٹ جاتی تھی۔ (۱)

شیخ حسین علی دہلوی

پرنس مرزا آسمان قدر بہادر تیموری کا باورچی تھا۔ شہزادہ موصوف عہد واجدی میں بنارس سے لکھنؤ آئے واجد علی شاہ نے ان کی دعوت کی، تو دسترخوان پر ایک مربا کے رکھا گیا جو صورت میں نہایت نفیس اور مرغوب معلوم ہوتا تھا۔ یہ مربہ واجد علی شاہ کے باورچی کا تیار کیا ہوا تھا۔ جب مرزا آسمان قدر نے اس کا لقمہ کھایا تو چکرائے اس لئے کہ وہ مربہ نہ تھا۔ بلکہ گوشت کا نمکین قورمہ تھا۔ آسمان قدر کو ندامت ہوئی اور بادشاہ خوش ہوئے۔ چند دن کے بعد شہزادہ صاحب نے واجد علی شاہ کی دعوت کی۔ بادشاہ یہ خیال کر کے آئے تھے کہ مجھے بھی ضرور دھوکہ دیا جائے گا۔ مگر ہوشیاری پر بھی دھوکا کھا گئے۔ اس لئے کہ شیخ حسین علی نے یہ کمال کیا تھا کہ دسترخوان پر صدہا ایوان نعمت اور قسم قسم کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ پلاؤ، بریانی، قورمہ، زردہ، کباب، ترکاریاں چٹنی، اچار، روٹیاں، پراٹھے، شیرمالیں وغیرہ مگر واجد علی نے جس چیز کو چکھا شکر کی بنی ہوئی تھی، سالن تھا تو شکر کا۔ چاول تھے تو شکر کے، اچار تھا تو شکر کا

---

(۱) قدیم ہنرمندان اودھ ص ۱۴۵

اور روٹیاں تھیں تو شکر کی۔ یہاں تک کہ برتن دسترخوان سلفچی آفتابہ تک شکر کے تھے۔ بادشاہ گھبرا گھبرا کر ایک ایک چیز پر ہاتھ ڈالتے تھے، اور دھوکے پر دھوکا کھاتے تھے حسین علی لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ (۱)

شیخ فرحت علی

عہد امجدی کا باورچی تھا۔ حسین آباد میں رہتا تھا، کوئی تیرہ سال کا عرصہ ہوا کہ مرگیا۔ لقیمان بے مثل بناتا تھا۔ روے کی لقمی اس طرح کی بناتا تھا کہ جیسے چوسر کی گوٹ ہوتی ہے۔ لقمی کے اندر باریک کٹا ہوا بکری کے گوشت کا قیمہ تلا ہوا بھرتا تھا۔ اور لقمی کے اوپر زعفران لگاتا تھا۔ ایک روپیہ کی ڈھیر بھر دیتا تھا ادھر لقمی منہ میں رکھی، اور ادھر حلق سے اندر گئی۔ فرحت اللہ آم کے پراٹھے دودھ کی روٹی خوب پکاتا تھا۔ عم معظم نواب سیّد احمد حسین خان کے لئے اکثر پکا کر لایا کرتا تھا، ایک بار لکھنؤ کے کسی معزز شخص سے لاٹ صاحب نے فرمائش کی۔ کہ ہم نے لکھنؤ کے باورچیوں کی بہت تعریف سنی ہے۔ مگر ان کے ہاتھ کی تیار کی ہوئی کوئی چیز نہیں کھائی۔ آنحضرت نے فرحت اللہ سے کہا کہ کوئی چیز لاٹ صاحب بہادر کے لئے تیار کرو۔ فرحت اللہ نے کہا۔ کہ ایک پوری پکادوں گا۔ کہ لاٹ صاحب بہادر بہت محظوظ ہوں گے۔ فرحت اللہ بندر کا ایک بچہ لایا، اور اس کو افیون پلانا شروع کی، اور گھنٹہ دو گھنٹہ اس کو بالکل خاموش بیٹھنے کی عادت ڈالی۔ جب وہ اس کا عادی ہوگیا تو فرحت اللہ نے ایک بڑی سی پوری پکائی جو ایک بڑی قاب میں رکھی تھی اور پوری کا چھلکا خوب پھولا ہوا تھا۔ پوری کے ضلع میں بندر کے بچے کو افیون پلاکر بٹھادیا۔ قاب لاٹ صاحب کے سامنے میز پر رکھی گئی۔ لاٹ صاحب نے چھری اٹھاکر جیوں ہی چھری کی لاگ کر بچہ کے سر پر لگی۔ قیں قیں کرتا ہوا بھاگا لاٹ صاحب بہت محظوظ ہوئے۔ فرحت اللہ نے دوسری قاب میم صاحبہ کے سامنے پیش کی، میم صاحبہ نے چھری سے

---

(۱) قدیم ہنر دران اودھ ص۱۷۵

پوری کو تراشا۔ تو اس میں لال نکل کر چوں چوں کرتے اڑ گئے۔ لاٹ صاحب نے سو روپیہ اور ایک شالی رومال فرحت اللہ کو انعام دیا۔ (۱)

شیخ اکرام علی

یہ شیخ محمد داصل سہارنپوری کے بیٹے تھے، اکرام علی اشرفی اور روپوں کا مرتبہ بناتا تھا۔ تیار ہونے پر نقش و حروف مٹتے نہ تھے، بلکہ جب عہد اور سن کا جو سکہ ہوتا تھا، وہ پڑھ لیا جاتا تھا۔ کھانے میں کسی قسم کی گرانی معلوم نہ ہوتی تھی، وہ کشتہ کا کام دیتا تھا، کلکتہ کی نمائش جو ۱۸۸۱ء میں ہوئی تھی، اور نمائش لکھنؤ میں تمغے اور سارٹیفیکیٹ ملے، جو اکرام علی کے پوتے شیخ اعظم علی رکاب دار کے پاس اب تک موجود ہیں۔ شیخ اکرام علی ایک ایسی روٹی پکاتا تھا کہ جس میں کئی مزے ہوتے تھے یعنی ایک طرف سے روٹی کو کھائیے میٹھی دوسری طرف سے کھائیے تو نمکین۔ تیسری طرف سے روکھی روٹی کا ذائقہ، چوتھی طرف سے سلونی یہ بالائی کی گلوری ایسی بناتا تھا کہ اصل اور نقل میں مطلق فرق نہ ہوتا تھا۔ اس کے اندر میوہ بھرتا تھا۔ اور بالائی کے اوپر کی پرت کی گلوری بناتا تھا۔ اور پتے کے کیل لگاتا تھا، سبز رنگ ایسا رہتا تھا کہ پان معلوم ہوتا تھا۔ (۲)

---

(۱) قدیم ہنر دران اودھ صہ ۱۵۰

(۲) قدیم ہنر دران اودھ صہ ۱۵۲

لکھنؤ کی صنعتیں

شاہان اودھ کی سرپرستی میں بالعموم، اور واجد علی شاہ کی سرپرستی میں بالخصوص، لکھنؤ کی مخصوص اور منفرد صنعتیں خوب پھلیں پھولیں۔

لکھنؤ گائڈ کے مورخ کا بیان ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے تک لکھنؤ تجارت کا سب سے بڑا مرکز تھا، خصوصاً شمالی ہندوستان میں تجارتی منڈی اتنی بڑی کہیں نہ تھی، لکھنؤ کے دستکار ہر قسم کی اشیاء نہایت صفائی اور نفاست سے تیار کرتے تھے۔ یہاں علم و ہنر کے صیغہ کو کمال کی حد تک پہونچا دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ صنعت عامہ کی حالت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ چکن کا مدانی کارچوب نہایت عمدگی سے بنایا جاتا تھا، اور اس کام کے لیے لکڑی کے چھاپے لوگ بناتے تھے، اور باہر کے لوگ خریدتے تھے۔ مٹی کے کھلونے ترکاریاں پھل وغیرہ، تیلتے تھے۔ اونی اور ریشمی کپڑے کا گہنا اور گوٹا کی گڑیاں خاص لکھنؤ کی عورتیں ایسی نفیس بناتی تھیں، کہ منہ سے بولنے کی کسر رہتی تھی۔ جن کو لوگ بڑی خوشی سے مول لیتے تھے، یہاں شال میں رفوگری کا پتہ اور رنگ سازی ہوتی تھی۔ ہار سنگھار کی ڈنڈیوں سے رنگ تیار کیا جاتا تھا۔ سونے چاندی پیتل اور رانگے وغیرہ کا گہنا بنایا جاتا تھا، لکھنؤ کے تلے ہوئے تعزیئے کثیر تعداد میں باہر جاتے تھے۔ دستی کپڑے کپڑے کے گہنے، حجابے، ٹلبلے، ٹوکریاں۔ ارہر کی لکڑیوں کے نرکل۔ اور بیت کے پٹارے۔ بیلن پڑے، لکڑی کی کھڑاویں۔ کمچیاں، باندھ، ستلی، مونڈھے۔ مٹی کے برتن وغیرہ اودھ میں بنتے تھے۔ فیض آبادی صندوقچے تمام ہندوستان میں مشہور تھے۔ لکھنؤ کے کاریگر مخملی چوگوشیہ ٹوپی جوتے جوتیاں، مغرق گرگابیاں۔ کمخاب کے جوتے۔ ادگھی۔ چمڑے کے ڈول۔ مشک۔ گنج

مشکیں۔ پیر۔ توئی۔ لچکا۔ کڑوا تیل۔ سرسوں کا تیل۔ گوڈر کی مشعلیں۔ گوڈر کے گیند۔ آتشبازی
تارکشی کا کام۔ روشنائی ساری، جھتوائی ٹولہ کے جانورے۔ مہر کنی۔ کپڑے پر چھاپے کا کام موم
کا کام۔ چربی کی شمعیں۔ طوغین لال سبز بتیاں۔ کاٹھ کی ڈبیاں۔ کلھیاں۔ دونے۔ سونٹھے
نواب یمین الدولہ کے عہد میں کپڑے کے گیندے۔ لکڑی کی تختیاں۔ کٹھرے کونڈے، لاکھ کی
چوڑیاں۔ گڑگڑے، اچار، چٹنی، مربّے، مختلف پھلوں کے شربت۔ مدار یہ حقّہ جو خاص لکھنؤ
کی ایجاد ہے۔ مشک عطر تیل۔ پھولوں کے گہنے۔ ٹاٹ کے بورے۔ کھجور کی چٹائیاں سچے
چاندی کے کٹے ہوئے ورق۔ جھاڑو کی سینکوں کی خوشنما اور مضبوط کابکیں۔ بانس کی تیلیوں
کے پنجرے۔ دھومی خاں کے بنائے ہوئے نیچے غلیل، کمان۔ دیسی بارود۔ ہاتھی دانت کا
کام۔ نواڑ، بیچ۔ بند وغیرہ خاص لکھنؤ کی دستکاریاں تھیں۔ اور ان میں سے ہر ایک دستکاری میں
اہل فن نے ہنرمندی کے دریا بہادیئے۔ جس کا اب نشان صرف تاریخ کے صفحوں پر ڈھونڈھنے
سے ملتا ہے۔ اس طرح گھر کی بیٹھنے والی شریف مستورات لچکا، ٹھپا، چکی، بنت، ریشم، بیلن
وغیرہ بناتی تھیں۔ اور خاطر خواہ پیسے پیدا کرتی تھیں۔ چرخہ سے سوت کاتتی تھیں۔ کھادو کے
پلنگ پوش۔ سوسی کے تھان۔ بیجک کا تاگا سینے پرونے کے لئے۔ چھپائی ہر سال بے چھاپے
جلتے تھے۔ کندلہ یعنی تارکشی یہاں کی صنعت عام تھی۔ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں رنگریز
ایسے صناع تھے کہ جو پھول کہیئے۔ کپڑے پر ہر رنگ کے تیار کر دیں۔ لکھنؤ میں خصوصیت سے
کلابتوں کا کام نہایت نفیس بنایا جاتا تھا۔۔۔ نواب غازی الدین حیدر کی اختراع
کی ہوئی کئی چیزیں ہیں۔ مثلاً کشتیاں کوئی مچھلی کی صورت کی اور کسی میں گھوڑے وغیرہ کی
صورت بنی ہوئی تھی۔ شکار کھیلنے کے ہاتھیوں کے حوضے اس طرح کے بنوائے کہ شکاری جس
طرف متوجہ ہو، اسی طرف حوضے کا منہ پھر جائے۔ بغیر طنابوں اور میخوں کے خیمے جو نصب
کر دیئے جاتے اور ہوا سے بھی نہ گرتے۔ عہد شاہی لکھنؤ میں ایک نئی قطع کا جوتا ایجاد ہوا جسکو یہاں
کے وضع داروں نے بہت پسند کیا۔ اس جوتے کو خوردنو کہتے تھے یہ جوتے لال نری کے نہایت سبک اور

صاف بنائے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض موچیوں کے ہاتھ کا جوڑا چار پانچ پیسوں سے زیادہ نہ ہوتا۔ گرمیوں کے خشک موسم کے لئے کاشانی مخمل کے برسات کے لئے کم بجیت کے بننا شروع ہوئے۔ کمیت بنانے کے بہت سے کارخانے جاری ہوگئے۔ چند دن کے بعد جوتوں کی آرائش میں اور ترقی ہوگئی۔ اور سلمہ ستارے کے کارچوبی کام کے جوتے بننے شروع ہوئے۔ جن میں مقیش کے پھندے لگا کے عجب چمک دمک اور آب وتاب پیدا کر دی جاتی اس کے بعد جب چھوٹا سلمہ اور کلابتوں آیا تو چھوٹے کام کے چڑھویں جوتے بننے لگے۔ جو بہت سستے داموں کے آتے تھے۔ گھیتلا جوتی اور اوگھان یہاں کی ایسی کہیں نہ بن سکیں۔ ان کی مانگ اس قدر بڑھی کہ آبادی کا ایک معتدبہ حصہ انہی کی تیاری پر زندگی بسر کر رہا تھا۔ قبا، شال، دوشالے، رومال پہننے کا یہاں اتنا رواج ہوا کہ ہزاروں شال بننے والے رفوگر اور شال کے دھونے والے کشمیر چھوڑ کر یہاں آباد ہوگئے۔ لکھنؤ کے تمدن کے بدل جانے کا یہ اثر ہوا کہ صنعت عامہ کی اکثر چیزیں جو معاشرتی زندگی کے لئے ضروری تھیں۔ ان کا بننا اور بازار میں آنا اور فروخت ہونا بند ہوگیا۔ مثلاً دسترخوان پر ایک طرف تانبے کا اسپار کھا جاتا تھا۔ جو آج کل جگ سے مشابہ ہوتا تھا۔ اور اس میں دسترخوان کے کھانے والے ہڈیاں رکھتے تھے۔ اس کو سلفدان کہتے تھے۔ اسی طرح پشت کھجلانے کے لئے ایک چیز پنجہ انسان کی شکل کی بنی ہوئی تھی اور پیٹھ کھجانے کی ضرورت ہوتی تھی تو اسی سے کام لیا جاتا تھا۔ اس کو پشت خار کہتے تھے۔ اب یہ چیزیں معدوم ہوگئیں۔ کہیں کہیں باوضع رئیسوں کے ہاں نظر آجاتی ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ محمد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ میں چکی بنائی گئی تھی۔ (۱)

---

(۱) قدیم ہنر دران اودھ ص ۱۹

(۱۳)

مطابع

پریس اور مطبع کی طرف بھی، لکھنؤ نے، بہت پہلے اور بہت زیادہ توجہ کی۔ نصیر الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں لیتھوگراف کا ایک چھاپہ خانہ اشاعت کتب کے لئے قائم ہوا۔ شیخ احمد عرب یمنی مقرب بادشاہ تھے۔ اُنھوں نے مطبع سلطانی کھولا۔ اکثر کتابیں طبع ہوئیں۔ خاص کر بادشاہ نے اسے شاہ نامہ فردوسی کو چھاپنے کے لئے پچاس ہزار روپیہ عطا کیا۔ جس کو کپتان مکان نے بعد از اخراج اشعار اسدی وغیرہ انتخاب کیا تھا۔ واجد علی شاہ کے عہد تک آگے آگے فن طباعت کو اودھ میں بہت ترقی ہوئی۔ سلطانی مطبع میں ہزارہا کتابیں چھپ کر شائع ہوئیں۔ شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری سے معلوم ہوا کہ انھوں نے نستعلیق ٹائپ کی چھپی ہوئی کتاب عہد واجدی کی اردو نمائش واقع لکھنؤ میں دیکھی تھی۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عہد شاہی میں اس فن میں اتنی ترقی ہو چکی تھی، جس کا اب پتہ نہیں۔ عہد امجد علی شاہ میں ہزاروں روپیہ خزانہ شاہی سے کتابوں کے چھاپنے کے لئے ملتے تھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانہ میں ارسل نامی ایک یورپین نے پہلا مطبع لکھنؤ میں کھولا، اور پریس تیار کر کے چھاپنا شروع کیا چنانچہ کتاب ہفت قلزم جو خود غازی الدین حیدر کی تصنیف ہے۔ شرح منازل۔ محامد حیدری وغیرہ اسی زمانہ میں تصنیف ہو کر طبع ہوئیں۔ ۱۸۴۹ء میں خاص لکھنؤ میں بارہ[۱۲] چھاپے خانے لیتھوگرافی کے موجود تھے۔ جس میں مطبع میر حسن اور مطبع مصطفائی بہت مشہور ہیں۔

مطبع علوی:- یہ مطبع علی بخش خان نے عہد شاہی میں کھولا تھا۔

مطبع حاجی حزیں :۔ یہ مطبع عہدِ شاہی میں ایک حاجی حزیں شیرازی نے کھولا تھا اور اس میں دینی اور مذہبی کتابیں ایسی چھپیں کہ اہل بصیرت کے نزدیک کہیں اور نہ چھپ سکیں۔

مطبع مصطفائی :۔ عہدِ شاہی کے آخری دور میں شیشہ آلات کے ایک دولت مند تاجر مصطفیٰ خان نے اس مطبع کو کھولا تھا۔ مصطفیٰ خان کچھ چھاپنے کے لئے حاجی حزیں کے پاس لے گئے۔ اور حاجی صاحب کی زبان سے کوئی ایسا سخت کلمہ نکل گیا کہ مصطفیٰ خان نے اپنا مطبع جاری کر دیا، جسے غیر معمولی فروغ ہوا۔ (۱)

---

(۱) ہنر دران اودھ ص ۲۰

باب (۶)

عہدِ واجد علی شاہ کی شاعری

اور

شعراء

دلی کا زوال اور لکھنؤ کا عروج، ساتھ ساتھ ہوا، قانون قدرت بھی کچھ یہی ہے، ایک مٹتا ہے دوسرا بنتا ہے، ایک کی موت دوسرے کی زندگی کا سبب بن جاتی ہے۔

دریں حدیقہ بہار و خزاں ہم آغوش است

زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است!

دلی کے زوال سے بہت زیادہ جو لوگ متاثر ہوئے وہ فنکار تھے۔ ویسے ہی وہ کون سے فارغ البال اور خوشحال تھے، اس ادبار و انحطاط نے اور زیادہ انھیں تہی مایہ کردیا۔ میر جیسا خود دار، بلکہ متکبر شاعر، در در کی خاک چھانتا، لکھنؤ پہنچا۔ انشا جیسا نابغۂ وقت (جینیس) دلی چھوڑنے کے بعد لکھنؤ بسانے پر مجبور ہوا۔ سودا جیسا شاعر باکمال دبے مثل اپنے وطن میں نہ ٹک سکا، لکھنؤ آیا اور یہیں کا ہو رہا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے ہنرور اور فنکار دلی سے، اپنی بساط اٹھا کر چلے اور لکھنؤ میں آکر سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے۔

اس صورت حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ بہت جلد شعر و شاعری کا مرکز بن گیا۔ چنانچہ قدرتی طور پر اس کی کارگاہ ادب نے ٹکسال کی صورت اختیار کرلی۔ اس ٹکسال میں الفاظ اور محاورے ڈھلنے لگے۔ اور سکۂ رائج الوقت کی طرح بازار سخن میں رائج ہو گئے۔

واجد علی شاہ کا زمانہ اس اعتبار سے خاص طور پر یگانہ اور ممتاز ہے، اسی دور میں آتش اور

ناسخ نے اصلاح زبان پر توجہ کی۔ نئی وضع قطع اور تراش خراش نے زمین سخن کو آسمان بنا دیا، اس دور میں نہ صرف غزل گو اور غزل سرا استادان فن نظر آتے ہیں، بلکہ شعر و شاعری میں رنگا رنگی، تنوع اور ترقی پسندی کے جلوے بھی نظر آتے ہیں۔ نواب مرزا شوق نے اپنی یگانۂ روزگار نفسیاتی اور جذباتی مثنویاں اسی دور میں لکھیں۔ امانت نے اپنی اندر سبھا، اسی عہد میں سجائی اور رواسوخت کی دکان جائی، انیس اور دبیر نے مرثیہ کو شاعری کا سب سے اہم، اثر انگیز اور روح پرور شعبہ بنا دیا۔ ورنہ اس سے پہلے مشہور ہو گیا تھا "بگڑا شاعر مرثیہ گو!" حضور جان عالم واجد علی شاہ اختر نے اپنی بے تکلف، بے ساختہ اور رواں شاعری سے، دنیائے سخن میں کئی خوشنما اور دل آویز اضافے کئے۔ انھوں نے ہر صنف شاعری میں قدم رکھا، اور اپنی انفرادیت کبھی بھی ہاتھ سے نہیں جانے دی غرض اس دور میں شعر و شاعری کا اگر جائزہ لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس سے پہلے دلی و لکھنؤ کے کسی دور کے بھی شعر و ادب کی رنگا رنگی اور تنوع میں وہ بانکپن، وہ طرفگی، وہ رعنائی وہ ہمہ گیری نہیں نظر آتی رجو عہد واجدی کی بزم سخن میں دکھائی دیتی ہے، مرثیہ ہے وہ نصف النہار پر، غزل سرائی ہے وہ عروج پر، مثنوی ہے، وہ کمال پر، غرض جس صنف پر نظر ڈالئے، یکتائی اور انفرادیت نمایاں سے نمایاں تر نظر آئے گی۔

قبل اس کے کہ میں عہد واجد علی شاہ کے شعراء پر گفتگو کروں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر دلی اور لکھنؤ کے فرق پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے۔

یہ سچ ہے، دلی کی شاعری زیادہ تر سوز ہے۔ اور لکھنؤ کی شاعری بڑی حد تک ساز۔ وہاں درد و الم ہے، آہ و فغاں ہے، فریاد و شیون ہے۔ یہاں لطف و نشاط ہے، عیش و سرور ہے، تبسم ہے، قہقہے ہیں، وہاں زندگی مری ہوئی، گھٹی ہوئی، سسکتی ہوئی نظر آئے گی۔ یہاں زندگی میں ہلچل ہے، طوفان ہے، جوش ہے۔ وہاں ناکام حسرتیں ہیں، اور ان کا ماتم۔ یہاں لذت معصیت ہے، اور اس کی سرور آفریں یاد۔

لیکن یہ فرق فن اور شاعری کا نہیں ہے۔ زندگی اور طرز زندگی کا ہے۔ فن تو ہر حالت

میں یکساں رہتا ہے خواہ اس کا تعلق موت کی ٹریجڈی سے ہو یا زندگی کی کامیڈی ہے، شاعری بہر حال جذبات کی ترجمان ہے۔ خواہ وہ جذبات درد و الم کے ہوں یا نشاط و طرب کے۔ فن کار کا کوئی مذہب و مسلک نہیں ہوتا، وہ تو ایک آئینہ ہوتا ہے جو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، فاش و برملا بیان کر دیتا ہے، خواہ کسی بیوہ کا سوگوار چہرہ ہو یا کسی نئی نویلی دُلہن کا مسرور و مخمور رُخِ روشن۔ بقول آسکر وائلڈ کے یہ دیکھنا بیکار ہے کہ چیز کیسی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے، پیش کس طرح کی گئی ہے؟ شاعری خواہ الم کی ہو یا مسرت کی، فن ہے، اور فن ہر حالت میں نکھرتا اور اُبھرتا ہے۔ پھول اچھا ہے یا کانٹا اس سے بحث نہیں، پھول کیسا ہوتا ہے اور کانٹا کیسا وہ صرف یہ دکھاتا ہے اور اس طرح دکھاتا ہے کہ اصل اور نقل میں فرق نہیں رہ جاتا۔ لہٰذا فن کا جہاں تک تعلق ہے وہ دلیؔ اور لکھنؤ کی شاعری میں یکساں ہے۔ مختلف اس لئے ہے کہ دلی کی زندگی اور ہے لکھنؤ کی اور۔

فریادِ جنوں اور ہے بُلبل کی فغاں اور
صحرا کی زباں اور ہے گلشن کی زباں اور

میں نے ابھی عرض کیا تھا، دلیؔ اور لکھنؤ میں فرق فن اور شاعری کا نہیں، زندگی اور طرزِ زندگی کا ہے۔ دلیؔ ایک عرصہ دراز تک، یورشوں، یلغاروں تباہیوں، آفتوں، مصیبتوں، خون ریزیوں اور سفاکیوں کا آماجگاہ رہا۔ لہٰذا وہاں کی زندگی سوز سے زیادہ قریب ہو گئی لکھنؤ ایک عرصہ دراز تک، ہر طرح کی تاخت و تاراج، یورش و یلغار، خوں ریزی اور غارتگری سے محفوظ رہا۔ لہٰذا یہاں کی زندگی میں ساز ہے، نشاط ہے، لطف ہے۔ دلی اور لکھنؤ کی یہی مختلف کیفیتیں، حدِ فاصل بن گئیں، لکھنؤ کی شاعری اپنے آب و رنگ کے اعتبار سے الگ ہو گئی، اور دلیؔ کی جدا۔ لیکن اپنے اپنے حدود میں، یکسر آزاد اور مستقل!

دلی کی شاعری اور شعراء پر، میں اپنی کتاب "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" میں گفتگو کر چکا ہوں، لہٰذا اس امر کی ضرورت نہیں۔ البتہ لکھنؤ کی شاعری اور شعراء کا ایک جائزہ لینا ضروری ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے یہ کتاب نامکمل رہ جائے گی۔

قبل اس کے عہدِ واجدی کے شعرا کا تذکرہ شروع ہو، دو باتیں یاد رکھ لیجیے۔

(۱) شعرا کا ذکر ان میں حروف تہجی کی ترتیب سے کیا ہے۔

(۲) جن شعرا کا ذکر کیا ہے۔ وہ عہدِ واجد علی شاہ کے ہیں اور یہ عہد تخت نشینی سے پہلے اور انتزاعِ سلطنت کے بعد تک پر اپنے اثرات و مؤثرات کے لحاظ سے حاوی ہے۔

---

(۱)

آتش

پورا نام خواجہ حیدر علی، خاندان مشائخ سے تعلق رکھتے تھے ابھی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ شعر و شاعری کا چسکا پڑ گیا۔ اور ذہن و دماغ کی ساری صلاحیتیں اس پر صرف ہونے لگیں۔ ذہانت و جودت کی نعمت، قدرت نے فیاضی سے عطا فرمائی تھی، استاذ مصحفی کے فیض صحبت اور دامن تربیت نے اس جوہر کو اور زیادہ نکھارا، دیکھتے ہی دیکھتے آتش، شاعر یگانہ بن گئے حریف سنبھل بیٹھے کہ عرصۂ سخن میں جو شہسوار آیا ہے، وہ کسی سے ہار ماننے والا نہیں، طبیعت وارفتہ، مزاج بے پروا، غیور و خود دار، اپنے گوشۂ عزلت میں بیٹھے فکر سخن کیا کرتے تھے، ناسخ کے ہمعصر تھے، دونوں میں خوب خوب معرکے رہے، لیکن ان کی سپاہیانہ وضع اور قلندرانہ سج دھج نے ہمیشہ انھیں معاصرین میں ممتاز و یگانہ رکھا۔ خود ہی تو اپنے بارے میں کہہ گئے ہیں۔

طبل و علم ہے پاس ہمارے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟

زمانہ کئی مرتبہ خلاف ہوا، لیکن واقعی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

واجد علی شاہ اختر، آتش ہی سے مشورۂ سخن لیا کرتے تھے، اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ سُنئے۔

"ولی عہدی کے زمانہ میں حضرت محمد واجد علی شاہ آخری شاہ اودھ، آتش کے شاگرد

ہوئے۔ سو روپے ماہوار دیتے رہے غزل اصلاح کو بھیج دیا کرتے تھے۔ آتش نابینا تھے غزل سُن کر شاگرد سے اصلاح لکھوا لیا کرتے تھے۔ ایک شعر پر بادشاہ کو کچھ شک ہوا۔ رفقا نے بیان کیا خداوند آپ کا شعر بے مثل ہے۔ آتش نابینا ہیں۔ شاگرد جو چاہتا ہے شعر کاٹ دیتا ہے۔ یہ خبر آتش کو معلوم ہوئی۔ دوبارہ غزل آئی۔ اس پر لکھ دیا: ماشاءاللہ خوب غزل کہی ہے اس سہ ماہی میں جتنی غزلیں آئیں۔ سب پر یہی لکھ دیا۔

جب سہ ماہی تنخواہ آئی تو واپس کردی اور کہا کہ میں حرام کی تنخواہ نہیں لیتا۔ جب غزل بناتا تھا تنخواہ لیتا تھا۔ اب اصلاح ہوتی نہیں۔ تنخواہ کس بات کی لوں۔ بادشاہ نے علی نقی خاں وزیر اعظم کو بھیجا۔ آتش نے یہی جواب دیا۔ علی نقی خاں نے شاگردوں سے ناراضی کا سبب دریافت کر کے بادشاہ سے بیان کیا۔ بادشاہ خود معذرت کے لیے آتش کے مکان پر آئے۔ [1]

آتش کا ذریعہ معاش

دوسرے فن کاروں کی طرح آتش کی زندگی بھی عسرت و افلاک میں گذری لیکن کبھی وہ حرف شکایت زبان پر نہ لائے۔ سو سوا سو روپیہ مہینہ کی آمدنی تھی۔ محمد حسین آزاد کے بقول اسی، اور خواجہ عشرت کے بقول سو روپے ماہوار واجد علی شاہ کی سرکار سے ملتے تھے۔ قابل ترجیح قول خواجہ عشرت کا ہے۔ کچھ شاگرد خدمت کر دیتے تھے۔ اس رقم میں وہ نہایت ٹھاٹھ سے فاقہ دانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

خودداری

خواجہ آتش بلا کے خوددار تھے، وہ اگر قصیدہ گوئی، اور درباردا ری کو اپنا شعار بناتے تو مالا مال ہو جاتے۔ لیکن اپنے کنج عزلت سے نکلنا وہ اپنی توہین سمجھتے تھے۔ نہ کسی کی شان میں قصیدہ کہا، نہ کسی بادشاہ وامیر کے دربار میں حاضری دی۔ مل گیا تو کھالیا، نہ ملا تو فاقہ ہی۔

وفات

خواجہ آتش کی وفات اچانک ہوئی۔ بھلے چنگے بیٹھے تھے یکا یک، ایسا موت کا جھونکا آیا کہ شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے۔

---

[1] تذکرہ آب بقا، خواجہ عبدالرؤف عشرت)

یوں تو خواجہ کی تاریخ وفات بہت سے دوستوں اور شاگردوں نے کہی، لیکن منشی اشرف علی شرف کی جو تاریخ خواجہ عشرت نے تذکرہ آب بقا میں درج کی ہے خوب ہے۔

"بمرد شاہِ سخن!"

۱۲۶۳ھ

آتش کا دیوان ان کی زندگی میں مرتب ہو کر شائع ہو چکا ہے بقیہ حصہ وفات کے بعد شائع ہوا۔

رنگِ سخن

آتش اپنے رنگ کے موجد اور خاتم تھے۔ زبان کی صفائی اور روزمرّہ کا استعمال ان کی خصوصیت تھی۔ جب وہ حلقۂ گیسو سے نکل کر جذبات کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں، تو ان کی شاعری عشق و محبت کے رموز و اسرار کا آئینہ بن جاتی ہے (۲) تصنع اور تکلف مطلق نہیں، تراشے ہوئے الفاظ آبدار موتیوں کی طرح لڑی میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ محاورے ایسے برمحل استعمال کئے ہیں کہ شاعری مرصع سازی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے بعض اشعار پوری اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میر و غالب کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے تو وہ آتش ہیں۔ (۳) ان کی عاشقانہ غزلیں موسیقی کی تاثیر کو چمکا کر محفلوں کو گرماتی ہیں (۴) آتش جب داخلی رنگ اختیار کرتے ہیں تو غضب کی طبیعت داری دکھا جاتے ہیں۔ لطف زبان ایسا ہے کہ کس منہ سے کوئی اس کی تعریف کرے، محاورہ بندی ایسی ہے کہ جواب نہیں رکھتے۔ ؎۵

نمونہ کلام

ذیل میں آتش کے چند اشعار، درج کئے جاتے ہیں:۔

ظہورِ آدم کی خاکی سے یہ مجھ کو یقیں آیا
تماشا انجمن کا دیکھنے خلوت نشیں آیا

۱؎ آب حیات (محمد حسین آزاد) ص ۳۸۱

۲؎ شعر الہند (عبد السلام ندوی)

۳؎ تاریخ ادب اردو (رام بابو سکسینا) ص ۲۴۴

۴؎ آب حیات ص ۳۸۱

۵؎ کاشف الحقائق، امداد امام اثر، حصہ دوم ص ۱۶۶

محبت مئے و معشوق ترک کر آتش
سفید بال ہوئے موسمِ خضاب آیا

امانت کی طرح رکھا تھا میں نے روزِ محشر تک
نہ اک مُو کم ہُوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا
لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجیے دہن بگڑا!

پیامبر نہ میسّر ہُوا تو خوب ہُوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے ؟

باغِ جہاں میں گُل کی قناعت ہے جائے رشک
عمرِ دو روزہ ایک قبا میں تمام کی !

خدا جانے یہ آرائش کرے گی قتل کس کس کو
طلب ہوتا ہے شانہ، آئینہ کو یاد کرتے ہیں
شیشے شراب کے رہیں آٹھوں پہر کھلے
ایسا گھرے کہ پھر نہ کبھی ابرِ تر کھلے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

اس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیونکر نبھے
دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

پر کترتا ہے مرے صیاد تو کر اس طرح
حسرت پرواز بھی اڑ جائے بال و پر کے ساتھ

---

(۲)

انیس

مرثیہ کی تاریخ، اور اس کے عہد بہ عہد کے ارتقاء پر بحث و گفتگو ہمارے موضوع سے خارج ہے، البتہ یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ نہ صرف اردو میں، بلکہ فارسی اور عربی میں بھی مرثیہ کو ایک مستقل فن کی حیثیت دینے والا، اس فن کی عظمت لوگوں کے دلوں میں بٹھانے والا اور اس فن کو، بلندی میں ہمرتبہ عرش پہنچانے والا انیس کا خاندان ہے اور اس خاندان کی سربلندی اور عظمت تمام تر انیس کی فنکاری کی رہین منت ہے، انیس صحیح معنوں میں اقلیم سخن کا شہریار ہے، وہ جس صنف شاعری کو بھی اپناتا، یگانہ ہو رہتا۔ اس نے اپنے لئے اور راہ منتخب کی، جسے لوگ حقیر نظروں سے دیکھتے تھے اور جس پر رہروی کرتے شرماتے تھے۔ لیکن انیس کے یمن قدم نے اس زمین کو بلندی میں آسمان کا ہمسر بنا دیا۔

ابتدائی حالات

انیس فیض آباد میں پیدا ہوئے سن ولادت ۱۲۱۷ھ ہے[۱] لیکن انیس کے سوانح نگار کو اس سے اختلاف ہے وہ ۱۲۱۹ھ بتاتے ہیں[۲] علوم متداولہ کی تعلیم حاصل کی، مطالعہ کا بہت شوق تھا، ہر علم و فن کی کتابیں پیش نظر رکھتے تھے، علم کے ساتھ ساتھ ورزش کا بھی شوق تھا اور فنون سپہ گری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے[۳]

---

[۱] تاریخ ادب اردو (سکسینہ) ص ۲۷۰ ؛ [۲] حیات انیس (امجد علی شہری)؛ [۳] تاریخ ادب اردو (سکسینہ)

انیس کی شاعری

انیس نے کم سنی ہی سے شاعری شروع کردی تھی۔ فصاحت و بلاغت اس گھر کی باندی تھی۔ حسن بیان اور زور کلام اس خاندان کا حصہ ہے۔

میر انیس کا کلام اپنی فصاحت اور تازگی کے لیے مشہور عالم ہے وہ صحت محاورہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ لغات کی معلومات ان کی بہت وسیع تھی۔ الفاظ کی بناوٹ میں انیس کمال حاصل تھا۔ بہت سے نئے نئے محاورے ان کی وجہ سے داخل زبان ہوئے اور قدیم محاورات کا صحیح استعمال بھی انھوں نے بتایا۔ میر صاحب کی زبان دلی اور لکھنؤ دونوں جگہ مستند ملی جاتی ہے۔ انیس کو مناظر قدرت کی ہو بہو تصویر کھینچنے میں کمال حاصل تھا۔ جذبات کے اظہار پر بھی میر صاحب کو بڑی قدرت حاصل ہے اور کمال یہ ہے کہ کہنے والے کی عمر، جنس، حالت وغیرہ کا پوری طرح خیال رکھا جاتا ہے، مثلاً اگر کسی بچہ کی زبان سے کچھ الفاظ کہے گئے ہیں تو خیالات اور زبان دونوں بچوں ہی کے ادا کیے جاتے ہیں[۱] المیہ شاعری جن زبانوں میں ہے، تمام دنیا میں انھیں بلند پائگی حاصل ہے۔ ہومر اہل یونان سے تھا، اس کی شاعری کی زبان یونانی ہے، ورجل اہل اٹلی سے تھا، اس کی شاعری کی زبان لاطینی ہے، ملٹن اہل انگلستان سے تھا اس کی شاعری کی زبان انگریزی ہے۔ فردوسی اہل عجم سے تھا، اس کی شاعری کی زبان فارسی ہے۔ والمیکی اہل ہند سے تھا اسکی شاعری کی زبان سنسکرت ہے ظاہر ہے کہ یہ سب زبانیں پایۂ امتیاز رکھتی ہیں۔ اور ان کے بولنے والے بھی قومی اعتبار سے بھی اہل ثروت میں سے شمار کیے جاتے ہیں۔ مگر میر انیس نے اپنی شاعری کا جلوہ ایک ایسی زبان میں دکھلایا ہے کہ نہ وہ زبان ابھی تک اعلیٰ درجہ کی سمجھی جاتی ہے نہ اس کے بولنے والے کسی طرح کا دنیاوی امتیاز رکھتے ہیں[۲] میر انیس نے ہر مقام پر جزئیات بلاغت کا خیال رکھا ہے۔ بچے۔ جوان۔ بوڑھے۔ بی بی۔ باندی۔ امام۔ اعزاء۔ انصار اور فرقۂ مخالف کے مبارز اور پہلوان کے متعلق ہر درجہ اور ہر شخص کے مناسب حال داد دی ہے

---

[۱] تاریخ ادب اُردو (سکسینا) صفحہ ۷۵-۲۷۴

[۲] کاشف الحقائق (امداد امام اثر) صفحہ ۴۸۶

پھر تشبیہات و استعارات کی خوبیاں بجائے خود قابل دید ہیں جذبات فطرت اور مناظر قدرت کی بے مثل تصویریں کھینچی ہیں، واقعہ نگاری کی ترتیب اور سلسلہ بندی میں وہ قابل قدر کمال صرف کیا ہے کہ اس سے بہتر اور کہیں نہیں ملتی۔ فردوسی کا یہ بڑا کمال خیال کیا جاتا ہے کہ وہ لڑائی کے تمام جزئیات اور فنون جنگ کا نقشہ کھینچتا ہے لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ وہ سرسری اور معمولی باتوں کے سوا لڑائی کے ہر قسم کے کرتب نہیں دکھاتا۔ لیکن میر انیس لڑائی کے ہر قسم کے کرتب اور ہنر اس تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ عربی اور فارسی میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ؎۱

حقیقت یہ ہے کہ انیس کا جواب اب تک پیدا نہیں ہوا۔ اس سو برس کے عرصہ میں زبان بہت منجھ گئی ہے، برابر اس کی صفائی اور سادگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مگر مستقبل قریب میں بھی امید نہیں کہ انیسؔ کا جواب پیدا ہو سکے۔

میر انیس مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی دونوں کمالوں میں فرد تھے۔ ایک بار واجد علی شاہ نے ایک مجلس میں میر صاحب کی زبان سے یہ شعر سُنا کہ ؎

زلف اکبر کو جو دیکھا سر نیزہ پہ خون

موئے سر کھول دیئے ماں نے پریشاں ہو کر

اور اپنے استاد فتح الدولہ برقؔ سے فرمایا کہ میں نہ کہتا تھا کہ انیس لکھنؤ میں ایک ہی شاعر ہیں۔ یہ زبان انھیں کے لئے ہے ؎۲

میر انیس دربار شاہی میں

انیسؔ کو دربار شاہی سے، بادشاہ و امیر کی توصیف و تعریف سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ اپنے کنج عافیت میں مگن تھے اور اہل بیت اطہار کی مدح و توصیف کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے تھے، لیکن ایک مرتبہ وہ واجد علی شاہ کے دربار میں پہنچے، وہاں کیا گذری، یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔

؎۱ موازنہ انیسؔ و دبیر (شبلی)

؎۲ تذکرہ آب بقا

• تمام شہر لکھنؤ میں میر انیس اور مرزا دبیر کی دھوم مچی ہوئی تھی نقادان سخن کے جتھے دونوں کی طرفداری میں علیحدہ علیحدہ بٹے ہوئے تھے ہر گروہ اپنے نقطہ کی طرفداری پر معدہ تیار تھا کسی ایک مجلس میں دونوں صاحبوں کا جمع ہونا مشکل تھا لیکن لکھنؤ کے حضرات دونوں کو جمع کئے بغیر کب ماننے والے تھے چنانچہ نواب مفتاح الدولہ بہادر نے حضرت جان عالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے سامنے دونوں صاحبوں کی تعریف کرکے ایسی تقریر کی کہ جس سے بادشاہ دونوں کو ایک مجلس میں پڑھنے کا ارشاد فرمائیں اور بادشاہ نے ویسا ہی کیا۔ اس پر مفتاح الدولہ خود دونوں صاحبوں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شاہی پیغام پہنچایا۔ دونوں نے قبول کر لیا۔ وقت معینہ سے پہلے میرزا دبیر پہنچے اور باریاب حضوری ہوکر ایک جانب بیٹھ گئے۔ میر انیس نے ہر بات کی جنبش پہنچنے کا انتظام کر رکھا تھا جب یہ حال معلوم ہوا کہ میرزا دبیر پہنچ گئے تو آپ نے جانے میں دیر لگانا شروع کی۔ یہانتک کہ تمام مجلس حاضرین سے بھر گئی اور وقت معینہ سے کچھ وقت زیادہ آگیا۔ تب شاہی چوبدار حاضر ہوا۔ اور عرض کی کہ مجلس تیار ہے۔ صرف آپ کا انتظار ہے میر صاحب تیار تو تھے ہی اور تام جھام سامنے حاضر تھی اس پر بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ مجلس میں فرش پر پاؤں رکھتے ہی تمام ارباب مجلس تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ میر صاحب نہایت تمکنت اور وقار سے سیدھے ممبر کی طرف گئے اور اپنے قاعدہ مقررہ کے موافق ممبر کے پاس بیٹھ گئے۔ نواب مفتاح الدولہ سامنے آئے تو ان سے کہا کہ آپ حضرت جان عالم سے عرض کر دیں کہ انیس حاضر ہے اور آپ کو دعا عرض کرتا ہے مفتاح الدولہ نے بادشاہ سے اطلاع کی بادشاہ نے اپنی خوشنودی مزاج کا اظہار کیا۔ دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ میر انیس نے اس موقعہ پر بھی اپنی خودداری کا کیسا خیال رکھا ہے۔ آخر کار مجلس شروع ہوئی۔ پہلے میرزا دبیر کو پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ انھوں نے پڑھا بادشاہ کی تعریف میں بھی ایک رباعی پڑھی۔ سامعین نے بڑی دلچسپی سے سنا اور سبحان اللہ کی آوازوں سے عالی شان ہال گونجنے لگا۔ ان کے بعد میر انیس کو پڑھنے کا ارشاد ہوا۔ میر صاحب کھڑے کرتے گئے تھے فی البدیہہ ایک مطلع تصنیف کیا اور ممبر پر تشریف لے گئے۔

ممبر پر جاکر اپنی عادت کے موافق تھوڑی دیر چپ بیٹھے رہے جب تمام مجلس انکی طرف متوجہ ہوگئی تو جناب امیر کی مدح میں ایک رباعی پڑھی چاروں طرف سے آفرین و مرحبا کا شور بلند ہوا۔ ازاں بعد سلام شروع کیا جس کا فی البدیہہ مطلع یہ ہے۔

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر؟
مجرئی اپنی ہوا کھو دُوں سلیماں ہو کر؟

اس مطلع کا سننا تھا کہ معنی فہم طبیعتیں ادائے کلام کے مزے لینے لگیں اور میرانیس کے انداز بیان نے تمام درباری لوگوں کو سمجھا دیا کہ ہم اس موقع پر بھی اپنے درجۂ کمال سے نیچے اترنے والے نہیں۔ سلام ختم کرکے میر صاحب نے مرثیہ کے چند بند پڑھے جس سے اہل مجلس پر وجد کی کیفیت طاری ہوئی اور رزم و بزم دونوں کا حق ادا کرکے ممبر سے اتر آئے۔

میر صاحب کے اشارات کو بادشاہ بھی سمجھ گئے جو ممبر کے عقب میں شہ نشیں پر تشریف رکھتے تھے۔ میر انیس کو سامنے یاد فرما کر تعریف کی۔ میر صاحب آداب بجا لاکر رخصت ہوئے تمام شہر میں اس مجلس کا شہرہ ہوگیا۔ اور مہینوں اس کا ذکر ہوتا رہا۔ میں نے یہ حال نواب بڈھن صاحب کی زبان سے سُن کر قلمبند کیا [1]

وفات میر صاحب مرض دق کے مرض میں مبتلا ہوئے۔ کم و بیش ایک مہینہ تک صاحب فراش رہے۔ ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء کو دو شنبہ کے دن اپنے مکان واقع چوبداری محلہ میں وفات پائی [2]

میرزا دبیر، میر صاحب کے حریف تھے۔ لیکن کتنی شاندار تاریخ وفات کہی ہے۔

طور سینا بے کلیم اور ممبر بے انیس
۱۲۹۱ھ

---

[1] حیاتِ انیس (امجد علی اشہری)

[2] حیاتِ انیس (امجد علی اشہری)

انتخاب کلام انیس کے کلام کا انتخاب، کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن بعد انتخاب ان کے کلام کا کچھ حصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

رباعیات

(۱) معرفت الٰہی

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو
آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
نزدیک رگِ جاں سے ہے اس پر یہ بُعد
اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو!

(۲) قبر

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے
رُخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیوں کر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر
میں نے بھی تو جان کھو کے پایا ہے تجھے

(۳) قبر کی تنہائی

خاموشی میں یاں لذت گویائی ہے
آنکھیں جو ہیں بند عین بینائی ہے
نہ دوست کا جھگڑا ہے نہ دشمن کا فساد
مرقد بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

(۴) بڑھاپا

ہشیار کہ وقت ساز و برگ آیا ہے
ہنگام بیخ و برف و تگرگ آیا ہے
محتاج عصا ہوئے تو پیری نے کہا
چلیے اب چوب دار مرگ آیا ہے

(۵) خودداری

عزت رہے یار و آشنا کے آگے
محجوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے
یہ پاؤں چلیں تو راہ مولا میں انیسؔ
یہ ہاتھ جب اٹھیں تو خدا کے آگے

(۶) معرفت

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے

ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بُو تیری ہے

(۷) روداد قبر

راحت میں بسر ہوئی کہ ایذا گزری
کیوں کر تاریک گھر میں تنہا گزری
اے کنج لحد کے سونے والو افسوس
کس سے پوچھیں کہ تم پہ کیا کیا گزری

(۸) اعمال حسنہ

کیا کیا دنیا سے صاحب مال گئے
دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہنچا کے لحد تلک پھر آئے سب لوگ
ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

(۹) جوانی و پیری

یہ عمر یوں ہی تمام ہو جائے گی
مرنے کی خبر بھی عام ہو جائے گی
روتے ہو انیسؔ کیا جوانی کے لئے
پیری کی سحر بھی شام ہو جائے گی

(۱) امام حسین کا رجز

ہم وہ ہیں کہ اللہ نے کوثر ہمیں بخشا
سرداریٔ فردوس کا افسر ہمیں بخشا
اقبال علیؑ خلق پیمبرؐ ہمیں بخشا
قدرت ہمیں دی زور ہمیں زر ہمیں بخشا

ہم نور ہیں گھر طور تجلا ہے ہمارا
تخت بن داودؑ مصلا ہے ہمارا

کس جنگ میں سینہ کو سپر کر کے نہ آئے؟
کس مرحلۂ صعب کو سر کر کے نہ آئے؟
کس فوج کی صف زیر و زبر کر کے نہ آئے؟
تھی کون سی شب جس کو سحر کر کے نہ آئے؟

تھا کون جو ایماں تہ صمصام نہ لایا
اس شخص کا سر لائے جو اسلام نہ لایا

گر فیض ظہور شہ لولاک[۳] نہ ہوتا
بالائے زمیں گنبد افلاک نہ ہوتا

کچھ خاک کے طبقے میں بجز خاک نہ ہوتا ہم پاک نہ کرتے تو جہاں پاک نہ ہوتا
یہ شور اذاں کا سحر و شام کہاں تھا
ہم عرش پہ جب تھے تو یہ اسلام کہاں تھا

(۲) عباس کا رجز

روکے ہمیں نکل کے جو طاقت کسی میں ہو لے تیغ میان سے جو شجاعت کسی میں ہو
گرمائے رخش کو جو حرارت کسی میں ہو آئے جو حرب و ضرب کی قدرت کسی میں ہو
دو ہاتھ میں علیؑ کے پسر دھار بار ہیں
دریا نہیں کہ رک گیا ہم ذوالفقار ہیں
سرکش ہیں سب ہماری زبردستیوں سے زیر دادا شجاع باپ جوانمرد ہم دلیر
جب دن پڑے ہیں کر دیے ہیں زخمیوں کے ڈھیر لائے ہیں جا کے آگ سے پانی خدا کے شیر
عفریت بھاگتے ہیں وہ چوٹیں جھیلی ہیں
بیر العلم میں کود کے تلواریں ماری ہیں
جرأت جلو میں رہتی ہے نصرت رکاب میں سر کٹتے ہیں پرے کے تیغوں کے آب میں
لکھے ہوئے ہیں شیروں کے حملے کتاب میں فصلیں ہیں اپنے زور کی خیبر کے باب میں
ناصر ہیں بارگاہ فلک بارگاہ کے
دفتر الٹ دیے ہیں عرب کی سپاہ کے

(۳) علی اکبرؑ کا رجز

اللہ نے سب طرح کی دولت ہمیں دی ہے عزت ہمیں بخشی ہے شرافت ہمیں دی ہے
کونین کو بخشی وہ شرافت ہمیں دی ہے قائل ہیں عرب جس کے وہ جرأت ہمیں دی ہے
روباہوں کے حیلوں سے تردد ہمیں کیا ہے
ہم شیر ہیں اس خیبر کے جو شیر خدا ہے

Ghulam Hassan Lone P.U.E. 17/11/76

(۴) عون و محمد کا رجز

تلوار جنہیں حق نے عطا کی ہے وہ ہم ہیں — جن غازیوں نے دیں کی بنا کی ہے وہ ہم ہیں
خوں جن میں شہ عقدہ کشا کی ہے وہ ہم ہیں — دولت جو رسولؐ دوسرا کی ہے وہ ہم ہیں
گیا عرش الٰہی پہ جبکہ آج ملی ہے
کاندھے پہ نبیؐ کے ہمیں معراج ملی ہے

بت توڑ کے کعبہ کو صفا کر دیا کس نے؟ — دم میں حق و باطل کو جدا کر دیا کس نے؟
عالم کو طلب گار خدا کر دیا کس نے؟ — اسلام کی قوت کو سوا کر دیا کس نے؟
در کفر کا خالق کی عنایات سے توڑا
عزیٰ کا سر کش وہ بجنس لات سے توڑا

تقسیم ہوئی دولتِ دیں گھر سے ہمارے — شاہوں کو ملے تاج و نگیں گھر سے ہمارے
ہے پیش نظر خلد بریں گھر سے ہمارے — تعلیم ہوا روح امیں گھر سے ہمارے
دیر آئے کہ مسکن تھا بہت دور ہمارا
آدم سے جو پہلے تھا وہ ہے نور ہمارا

(۵) علی اکبرؓ کی جنگ

تھم تھم کے یوں گیا صف اعدا پہ وہ دلیر — جاتا ہے داؤں کر کے غزالوں پہ جیسے شیر
غازی جو بھوک و پیاس میں تھا زندگی سے سیر — کشتوں کے پشتے ہو گئے دم میں سروں کے ڈھیر
اک سیل زور و شور سے آئی گذر گئی
ثابت نہ یہ ہوا صف اول کدھر گئی

بڑھ کر کسی نے وار جو رد کا سپر کٹی — چار آئینہ کٹا زرہِ خیرہ سر کٹی
نیزے کی ہر گرہ صفتِ نیشکر کٹی — سینہ کٹا جگر ہوا زخمی کمر کٹی
رہوار بھی دو نیم میان مصاف تھا
ان سب کے بعد منہ کو جو دیکھا تو صاف تھا

مٹتا تھا نہ صفوں میں علم کا نشاں کہیں	چلے کہیں تھے شست کہیں اور کماں کہیں
نیزے کہیں تھے ڈانڈ کہیں اور سناں کہیں	خنجر کہیں کمند کہیں برچھیاں کہیں
اک اک سیاہ رو کا جگر داغ داغ تھا
جنگل تمام ڈھالوں کے پھولوں سے باغ تھا

چمکی گری اٹھی اِدھر آئی اُدھر گئی	خالی کیے پرے تو صفیں خوں میں بھر گئی
کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی	ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اُتر گئی
اک شور تھا یہ کیا ہے جو قہرِ صمد نہیں
ایسا تو رودِ نیل میں بھی جزر و مد نہیں

آئی جدھر پلٹ کے صفوں کو بچھا گئی	تن سے اڑا دیا وہیں سر جس کو پا گئی
ہر اک کڑی کو نرم سمجھ کر چبا گئی	فولاد کی زرہ کو اشارہ میں کھا گئی
چار آئینہ کا کاٹ اسی پر حوالہ تھا
ذکر اس کا کیا ہے خود تو منہ کا نوالہ تھا

(۶) گھوڑے کی تعریف

صرصر سے تیز تر تھا وہ اسپِ خجستہ فر	یکساں تھا اس کو صورتِ خورشید دشت و در
پانی پہ تھا جو موج تو آتش میں تھا شرر	گیتی نورد برق تگ و آسماں سفر
ٹاپوں سے سرکشوں کی صفیں پائمال تھیں
زینِ آفتاب تھا تو رکابیں ہلال تھیں

طے کی جو راہ بحر تو بر سے نکل گیا	مانندِ خیر لشکرِ شر سے نکل گیا
آیا اِدھر سے گر تو اُدھر سے نکل گیا	پتلی کے گرد پھر کے نظر سے نکل گیا
سرعت میں تھا ہرن تو وغا میں یزید تھا
پستی میں سیل تھا تو بلندی میں ابر تھا

(۷) دشتِ کربلا کی صبح

گرمی کی سحر اور وہ پھولوں کا مہکنا — مرغانِ چمن کا وہ درختوں پہ چہکنا
انجم کا وہ چھپنا کبھی اور گاہ چمکنا — وہ سرد ہوا اور وہ سبزے کا لہکنا
اس دشت میں رونق تھی جو شبنم شہ دیں پر
تھا موتیوں کا فرش زمرّد کی زمیں پر

جلوہ وہ دم صبح کا وہ نور کا عالم — دلچسپ صدا نوبت و شہنا کی وہ باہم
سرخی وہ شفق کی افق چرخ پہ کم کم — وہ گل کے کٹوروں پہ دُر افشانیِ شبنم
خشکی میں بھی سردی سے ترائی کا سماں تھا
پر مالک گلزار جناں تشنہ دہاں تھا

(۸) بے لفظ بند

وہ طاہر و اطہر ہو اگر معرکہ آرا — معلوم ہو حملہ اسداللہ کا سارا
آگاہ ہو کس طرح کہو عمرو کو مارا — صمصام کا اک وار تھا کس کو گوارا
واللہ گر اک دم کو وہ صمصام علم ہو
ہر روح کو اس دم ہوس ملک عدم ہو

سردار امم محرم اسرار محمدؐ — مہر و اسداللہ کا دلدار محمدؐ
دلدار و دل آرام و مددگار محمدؐ — ممدوح ملک مالکِ سرکار محمدؐ
مسرور کہو اسلام کا اس مالک کل کو
آرام دو اک دم دل سردار رسلؐ کو

(۳)

اسیر

اسیر اپنے علم، ہمہ دانی اور وسعتِ نظر کے اعتبار سے ایک مرتبہ شناس، پُرمایہ شاعر تھے، اور انہوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، اور ہر رنگ میں اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔ مرثیہ اور سلام تک میں بند نہیں ہیں۔ کلام میں غضب کی روانی اور شگفتگی ہے۔ اس رنگِ شاعری دبی ہے۔ جو ان کے عہد میں عام طور پر پھل پھول رہا تھا، یعنی الفاظ سے کھلنا، جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے، خیال و زبان میں مبالغہ کی انتہا۔

اسیر اور واجد علی شاہ

اسیر واجد علی شاہ کے عہدِ ولی عہدی میں مصاحب شناسی اور ندیم با اختصاص تھے۔ پھر جب واجد علی شاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے تو ان کی بن آئی۔ خطابات سے نوازے گئے، مال و دولت کی ریل پیل ہو گئی۔ مگر جب انتزاعِ سلطنت ہوا اور واجد علی شاہ کلکتہ سدھارے تو یہ روپوش ہو گئے۔ صرف یہ کہ ساتھ نہیں گئے بلکہ ملنے تک نہیں۔ واجد علی شاہ نے ان کی بے وفائی پر بڑے سخت اور درشت الفاظ میں طنز کیا ہے* اور دل کے جلے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ انتزاع   یہ دربار رام پور سے وابستہ ہو گئے۔ واجد علی شاہ کو یہ بات بھی بہت بری لگی کہ کل تک جو شخص دربار اودھ سے وابستہ، شاہِ اودھ کا دعاگو اور ثنا خوان تھا۔ آج وہ ایک معمولی سی ریاست کے تاجدار کو رستم دار قرار دیتا ہے اور ہمارے خاندان سے منہ موڑ رہا ہے۔

---

* حزنِ اختر واجد علی شاہ کی کتاب ہے۔

عام رنگِ سخن

یوں تو امیر کا رنگِ سخن خالص لکھنوی ہے لیکن بعض شعر بڑے غضب کے کہہ جاتے ہیں۔ مثلاً:-

شباب تھا کہ الٰہی نسیم کا جھونکا
کہ دفعتاً آدھر آیا، ادھر روانہ ہوا

کسے کہوں جہاں میں ہزاروں ہیں یار دوست
مشکل کے وقت ایک ہے پروردگار دوست

ضد سے جتنا ہے یہاں کافر و دیندار میں فرق
زاہد اتنا تو نہیں سبحہ و زنار میں فرق

امیر پر ایک طائرانہ نظر

امیر کا نام سیّد مظفر علی، والد کا نام سیّد مدد علی، وطن قصبہ امیٹھی تھا۔

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگردوں میں بعد آتش کے انھیں کا مرتبہ تھا۔ ہزارہا مستفید ہوئے ایک دیوان فارسی گلشن نقش اور چھ دیوان اردو میں ہیں: ریاض سخن، گلستان سخن۔ دیوان امیر عاشقانہ دیوان ہیں۔ ایک دیوان غیر مطبوعہ ہے۔ ایک دیوان نعتیہ موسوم بہ گلدستۂ امانت ہے ایک کلیات قصائد اردو۔ ایک مثنوی درۃ التاج ہے جو بادشاہ کی فرمائش سے نظم کی تھی۔ ایک مثنوی میں نواب امین الدولہ وزیر لکھنؤ کے زخمی ہونے کی کیفیت لکھی ہے ایک مثنوی معارج الفضائل معجزات آئمہ میں ہے۔ ایک کتاب زر کامل عیار شرح معیار الاشعار اور بہت سے رسائل علم عروض و قوافی کے فارسی اور اردو میں ہیں۔ رسالہ بیان اضافت، رسالہ تشریح الحروف فارسی میں ہے فوائد مظفریہ علم نحو عربی میں ہے۔ ان میں سے بعض کتب طبع ہو چکی ہیں۔

مدت دراز تک مرثیہ اور سلام کہا کئے۔ مگر وہ دفتر غدر میں تلف ہو گیا۔ ۱۲۲۹ھ میں غازی الدین حیدر بادشاہ تخت نشین اودھ ہوئے۔ اسی سال امیر پیدا ہوئے۔ واجد علی شاہ کے عہد میں علی نقی خاں وزیر کے ہاتھوں امین الدولہ کی دوستی میں امیر بھی کچھ دن اسیر رہے۔

امیر نے قدرتاً شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ بہت پُر گو تھے۔ ساٹھ ساٹھ، ستر ستر شعر کی غزل کہا کرتے تھے۔ مصحفی اکثر کہا کرتے تھے "ایک روز یہ میرا شاگرد اساتذہ کی صفِ اول میں جگہ لے گا۔"

امیر جب واجد علی شاہ کے عہد میں معزز عہدے پر ممتاز ہوئے۔ خطاب حاصل کیا۔ تنخواہ مقرر ہوئی تو ہم چشموں میں امتیاز بڑھ گیا۔ شاعری چمک اٹھی۔ بہت سے شاگرد ہوئے۔ امیر کی غزل گوئی کا رنگ سب سے الگ تھا۔ بہت پرگو تھے۔ مضامین عالی نظم کرتے تھے۔ اصلاح بہت جلد دیتے تھے۔ جب انتزاعِ سلطنت ہوا۔ اور بادشاہ کلکتہ تشریف لے گئے تو امیر لکھنؤ نہ چھوڑ سکے۔ یہاں ان کے قدردان بہت تھے۔ اکثر رؤسا امراء شاگرد تھے۔ انہوں نے ایک محلہ منشی گنج کے نام سے آباد کیا تھا۔ اس میں رہتے تھے۔ کشیدہ قامت۔ گورے چٹے۔ کتابی چہرہ۔ متوسط الجثہ تھے۔ اکثر ٹخنوں تک کا کرتا پہنتے تھے۔ رشک اور امیر میں معاصرانہ چوٹیں چلا کرتی تھیں۔ باوجود کمال کے امیر میں خود نمائی نہ تھی۔

وفات

امیر نے خاصی طویل عمر پائی۔ ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۱ء میں وفات پائی۔ وفات کے وقت عمر ۸۰ سال کی تھی۔ زندگی کی آخری سانس تک دربارِ رام پور سے وابستہ رہے۔

نمونۂ کلام

نمونۂ کلام کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

تیرے دیوانے کو کیوں آرام محفل میں نہیں
جیسے دریا کو قرار آغوشِ ساحل میں نہیں

ابھی تلک نہیں ٹوٹا کسی کا دل مجھ سے
نہ خلق کا نہ خدا کا گنہگار ہوں میں

اپنا قصور ہے کہ چڑھایا ہے تجھ کو سر
تقصیر تیری چرخِ ستمگار کچھ نہیں

کچھ نہ ہو تجھ سے سلوک اے آسماں اتنا تو ہو
پاؤں پھیلیں جس میں تربت کا مکاں ایسا تو ہو

آج ساقی میں نہیں گو کہ مروت باقی
خیر زندہ ہے اگر یار تو صحبت باقی

امیر کا عہد رامپور

جس زمانہ میں نواب محمد سعید خاں والیِ رامپور لکھنؤ میں رونق افروز تھے۔ امیر صاحبزادگانِ عالی شان کی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے۔ پھر نواب یوسف علی خاں بہادر فردوس مکان کے عہد میں گھر بیٹھے وظیفہ خوار رہے۔ پھر زمانہ سلیمان سریر آسمان حشمت حاجی حرمین شریفین بلال رکاب نواب کلب علی خاں بہادر میں دربار سخن نغموں سے سجایا گیا اور قدردانی کا بازار گرم ہوا۔ امیر بھی بیش بہا تنخواہ پر بلائے گئے

امیر کا علمی پایہ

شیخ غلام ہمدانی۔ آتش کے شاگرد ہیں۔ بعد آتش کے انیس کا مرتبہ تھا ہزارہا مستفید ہوئے۔ ایک دیوان فارسی گلشن نقش اور تین دیوان اردو کے ہیں۔ ریاض مصنف۔ گلستان سخن، دیوان امیر عاشقانہ دیوان ہیں۔ ایک دیوان نعت مطہرہ سے ایک دیوان منقبت موسوم بہ گلدستہ امامت ہے ایک کلیات قصائد اردو۔ ایک مثنوی مرآۃ الغیب ہے جو بادشاہ کی فرمائش سے نظم کی تھی۔ ایک مثنوی میں نواب امین الدولہ وزیر لکھنؤ کے زخمی ہونے کی کیفیت لکھی ہے۔ ایک مثنوی معارج الفضائل معجزات آئمہ میں ہے۔ ایک کتاب زر کامل عیار شرح معیار الاشعار اور بہت سے رسائل علم عروض و قوافی کے فارسی و اردو میں ہیں۔ رسالہ بیان اضافت رسالہ تعریف الحروف فارسی زبان میں ہے۔ خزانۂ مظفریہ علم نحو عربی میں ہے۔ ان میں سے بعض کتب طبع ہو چکی ہیں۔

امیر کی خودنوشت

امیر نے خود بھی اپنی زندگی کے حالات پر اپنے قلم سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ گراں بہا خودنوشت رسالہ ادیب الہ آباد جولائی ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی جو ذیل میں درج ہے

"خطۂ امیٹھی جو بہت آباد ہے وہی میرا وطن وہی میرا مولد ہے لیکن خزاں دیدہ ہے رفیقانِ صاحب حشم رئیسانِ عالی ہمم سب اٹھ گئے جب نو دس برس کا سن ہوا بخت لکھنؤ میں لایا میرے جنت مقام باپ دہی تھے۔ محب نبی و علی شیعہ پاک صاف اعتقاد والی وقار بڑے ہی ... وہاں حضرت عباس علمبردار کی ادا دیکھیں ایسی کبھی شعر کہنے

تھے ہائی تخلص تھا۔ میں جب قبلہ گاہی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شفقت سے پڑھانے لگے۔ فارسی میں روشن سواد ہو گیا۔ استاد بن گیا۔ بہت سے طالب علم آنے لگے۔ آخر فکر روزی سے بکدر ہوا تو پہلے کتب خانے میں نوکر ہوا۔ وہاں خوش نویسوں کا مجمع تھا۔ مجھ کو بھی یہ شوق پیدا ہوا۔ رفتہ رفتہ جب شاعروں سے ملاقات ہوئی شعر کہنے کا ڈھب ہو گیا رنگین شاعری کی ہوس ہوئی۔ مضامین کی تلاش کرنے لگا۔ دیوان جمع کر کے دیکھے۔ بہتیروں کے رنگین کلام یاد کیے۔ بعض بعض موقعوں پر عربی زبان کی ضرورت پڑی۔ فکر ہوئی اس کا بھی کچھ علاج کیجیے۔ چچا میر سید علی جو علم عقلی و نقلی میں بہت دقاق تھے۔ صرف و نحو میں منتخب روزگار تھے۔ حکمت منطق میں بے مثل۔ احادیث و قرآن پر شیفتہ۔ آپ نے جلاء العیون نظم کر کے داد سخن دی تھی۔ میرے پڑھانے میں کمال محنت کی۔ چار برس تک ان کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ زمانے نے کچھ ایسا انقلاب کیا۔ فکر قوت میں اضطراب ہوا۔ پڑھنے پڑھانے کی صحبت جاتی رہی۔ روزی کی فکر نے پریشان کیا۔ القصہ کچہری میں نوکری کی۔ کچھ انشا گری جانتا تھا۔ عرصے کے آٹھ برس اسی شغل میں بسر ہوئے۔

خدا کی شان نرالی۔ وہاں ایک عالم مرزا کاظم علی تھے۔ ان کی خدمت میں شرف رہا۔ حدیقۂ حکیم سنائی پڑھا۔ علم حاصل کیا۔ وہ کامل تھے مجھ کو بھی کامل کر دیا۔ کبھی کبھی میر قائم علی سے پڑھ لیتا تھا۔ وہ ایک متقی عالم ہیں۔ ترک عادت تو بہت مشکل ہے شاعری کا بھی کچھ کچھ خیال رہا۔ جا بجا مشاعروں میں گیا۔ شاعروں سے صحبتیں رہیں۔ میں نے کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں کیا کہ مجھ کو شاعری میں کمال ہے۔ مگر لوگ تو تعریف کرتے ہیں۔ یہ سمجھ ہم کو بھی گزرتے ہیں۔ تواریخ کی صبح و شام سیر کی۔ لغت کی کتابیں پیش نظر رہیں۔ جب حضرت ثریا جاہ خاقان زماں محمد امجد علی شاہ زیب تخت و کلاہ ہوئے۔ بڑے نیک طینت متبع شریعت فرشتہ خصال تھے تو مدار المہام وزیر الممالک امین الدولہ عمدۃ الملک امداد حسین خاں بہادر ذو الفقار جنگ وزیر ہوئے۔ خدا نے ایسا بلند رتبہ بنایا کسی ایک چیونٹی کو بھی نہ ستایا۔ صبح سے شام تک وزارت کے کام کرتے

اور شام سے صبح تک عبادت میں مصروف رہتے۔

ہر گھڑی خاص و عام کی خبر تھی۔ رونق اسلام کی بڑھایا کئے۔ روز افزوں تائید خدا رہی۔ لیکن خاکساری بدستور قائم رہی۔ ان کے بزرگ بھی بہت صاحب ثروت قوم بنگش سے فرخ آباد کے رئیس تھے۔ جب یہ پہلے پہل لکھنؤ میں آئے تو محلہ تحسین گنج میں قیام کیا۔ مکانات خرید کئے جب وزارت ملی تو ماہ نو سے ماہ کامل ہو گئے۔ خاندان کا خاندان ساتھ تھا۔ مرزا سکندر شکوہ کے مکانات ان کے بیٹے عباس شکوہ سے مول لئے۔ بسبب نواب صاحب کی ترقی مکانوں کی تقدیر چمک گئی۔ "امین آباد" نام رکھا۔ اس جگہ ایک باغ تھا۔ وہ بھی بادشاہ نے مرحمت فرمایا۔ اس کو خوب تیار کیا۔ ارشاد باغ نام رکھا۔ عجب عشرت آباد بن گیا۔ دوکانوں سے بازار رشک القصرین گیا۔ لوگ نواب کو دعا دیتے ہیں وہاں رہنے والوں کو آرام ہے۔ طبیعت میں حق پرستی کا مذاق ہے۔ بجز رونق دین اور کچھ حرص نہیں ایک مجتہد ملازم ہیں۔ صبح و شام نمازیں ہوتی ہیں۔ ہمیشہ للہ تقسیم نذر ہوتی ہے۔ مرزا حاجی کا باغ مول لیا ہے۔ اس کے قریب درگاہ حضرت عباس علم بردار بنائی ہے۔ وہاں صبح و شام مجلسیں ہوتی ہیں، زیارت کو خاص و عام آتے ہیں۔

میں بھی ان کے بندوں میں ایک صاحب نیاز بندہ تھا۔ کچھ ایسا حق نہ تھا جس پر ناز کرتا مجھ کو محض عنایت سے میر منشی کا حکم دیا۔ بہت مسرت سے تین برس بسر کئے۔ حسب حال مقدرت حاصل ہوئی۔ جو عزیز قریب میرے ساتھ تھے ان کے بخت و نصیب موافق رہے۔ خدا کا شاکر و سپاس ہے۔ یہ بھی قیاس و وہم سے باہر تھا۔ یہاں نہ تو حسن صورت ہے نہ حسن خط ہے۔ املا بھی غلط انشا بھی غلط۔ شکر کا دم دل کیوں نہ بھرے۔ خدا ہمارے محسن پر احسان کرے۔ بعد ازاں گردش روزگار ہوئی۔ زمانے کا تو کچھ اعتبار نہیں ہے۔ آسمان و زمین دوسرے ہو گئے۔ فلک نے ہمیں خانہ نشین کردیا۔ کیا کہوں جو در زمانہ ہوئے تمام آثار عدم کو روانہ ہوئے۔ میری زوجہ نے بھی انتقال کیا۔ دل کو نہایت ملال ہوا۔ میرے سر پر اس قدر بلا پر بلا پڑی کہ دنیا سے دل اٹھ گیا۔ زمانے کی سیر بہت کی۔ الٰہی اب انجام بخیر ہو۔

میں یہاں نیک نام رہا۔ اب علیؑ کی محبت میں تمام ہوں، سخن مختصر دنیا سے بہت برخاستہ تھا۔ کسی بزم آراستہ سے کچھ کام نہ تھا۔ ناگاہ ایک شاہی خواص آیا۔ اور مجھے دیوان خاص میں لے گیا، وہاں حضرت سلطان عالم محمد واحد علی شاہ اختر صاحب سریر رونق افروز تھے۔ یہ بادشاہ رعایا کا بہت محبوب ہے۔ خدا کو اس کی خوشی منظور ہے اور ایام میں ایسے بادشاہ کہاں، پایہ تخت بلند رہے چشم بد سے گزند نہ پہونچے۔

مجھ جیسے ناچیز شخص سے خلق کیا۔ امتیازی درجہ سے پاس بٹھایا۔ ایک ایسی کتاب عنایت فرمائی جو در حقیقت گلِ انتخاب تھی میں نے حسب حکم اسے نظم کیا سن کے بہت خوش ہوئے۔ مجھے بھی ان کی خوشی سے مطلب تھا۔ [1]

---

[1] ادیب الہ آباد (جولائی ۱۹۱۲ء)

(۴۴)

امیر مینائی

منشی امیر احمد امیر مینائی ایک خانوادۂ تصوف سے تعلق رکھتے ہیں۔ علوم معقول و منقول سے بہرہ ور تھے۔ ولادت ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء) میں بمقام لکھنؤ ہوئی۔ درسی علوم فرنگی محل سے حاصل کیا۔ عربی اور فارسی پر عبور کامل رکھتے تھے۔ زندگی کا بڑا حصہ لکھنؤ اور رامپور میں گزرا۔ حیدر آباد میں نظام کی دعوت پر گئے۔ وہیں بیمار پڑے اور سفر آخرت اختیار کیا۔ ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء)

امیر کا واجد علی شاہ سے تعلق

امیر، اسیر کے شاگرد رشید تھے۔ اسی توسل سے واجد علی شاہ کی بارگاہ میں باریاب ہوئے۔ اسی زمانہ میں بادشاہ والا جاہ کی فرمائش سے دو کتابیں لکھیں۔

(۱) ارشاد السلطان

(۲) ہدایت السلطان

لیکن اب یہ کتابیں کہیں نہیں ملتیں۔ کلیات امیر کا درجہ رکھتی ہیں۔ واجد علی شاہ کے بارے میں بہت عزت اور محبت رکھتے ہیں۔

ہے اگر گردوں مخالف غم نہیں مجھ کو امیر
ہم ہیں حامل دامن میں شاہ ابو المنصور کے

مذکورہ کتابوں کے صلہ میں خلعت فاخرہ اور انعام سے سرفراز ہوئے ؎۱

غدر کے بعد تنہائی

غدر کے بعد کی تباہیوں اور بربادیوں سے امیر کو بھی دوچار ہونا پڑا ۱۸۵۷ء میں امیر لکھنؤ ہی میں موجود تھے۔ چنانچہ اس زمانہ کے مصائب کا ذکر ایک رباعی میں کیا ہے۔ جس کے دو مصرعے یہ ہیں۔

گھر لٹنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے
روتی ہے لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے ؎۲

امیر کا بہت بڑا کارنامہ

امیر کا بہت بڑا، لیکن نامکمل کارنامہ، امیر اللغات کی تدوین و تالیف ہے، یوں تو انھوں نے بہت سی کتابیں علوم و فنون اور اصناف شاعری پر تصنیف و تالیف کیں لیکن جس وقتِ نظر، محنت اور کمال استقلال کے ساتھ ترتیب لغت کا کارنامہ انجام دیا، یہ انہی کا حصہ تھا اور کوئی شبہ نہیں، اس میں کوئی ان کا حریف نہیں۔

۱۸۹۱ء میں امیر اللغات کا پہلا حصہ (جس میں الف ممدودہ تھا) اور ۱۸۹۲ء میں دوسرا حصہ (جس میں الف مقصورہ تھا) شائع ہوا۔ ڈاکٹر سر سید احمد خاں مرحوم ریویو فرماتے ہیں کہ "جو ڈھونگ اُنھوں نے اس نمونہ میں اختیار کیا ہے اگر اس طرح یہ کتاب انجام کو پہونچی تو کوئی لغت کسی زبان میں باقی نہ رہے گا۔ اگر شرط لگائی جائے جب بھی کوئی ایسا لغت نہیں ملنے کا جو اس کتاب میں نہ ہو۔ بہت سی زبانیں ایسی ہیں جو لغت کی کتابوں کی بدولت مہذب اور مستند اور علمی زبانوں میں داخل ہوگئی ہیں اور اب ہمارے مخدوم امیر احمد صاحب کی امیر اللغات کی بدولت اُردو بھی اسی درجہ کی زبانوں میں داخل ہو جائے گی۔ بعض نکتہ چینیوں نے اعتراضات بھی کئے لیکن منشی صاحب نے کسی کا جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ خود خاموشی اختیار کی اور اپنے شاگردوں کو بھی

؎۱ تاریخ ادب اردو (سکسینہ) صفحہ ۳۵۸
؎۲ لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۵۹۳

جواب دینے سے منع فرمایا۔ ان کا ہمیشہ یہ مسلک رہا کہ اخباروں میں جو کچھ میری نسبت کبھی کسی مہربان کی مہربانی سے چھپتا ہے میں نہ خود کبھی اس کا جواب دیتا ہوں، نہ کسی دوست اور نہ کسی شاگرد کو اجازت دیتا ہوں مشرب یہ ہے کہ اگر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سچ اور صحیح ہے تو منفعل ہونا چاہیئے اور آئندہ احتراز کرنا چاہیئے اور اگر تعصب سے غلط بات لکھی ہو تو صبر کرنا چاہیئے۔ رد و قدح میں طول عمل ہوگا۔ [۱]

سیرت و شخصیت

منشی صاحب ایک پیکر متانت اور مجسم تہذیب تھے۔ شرم و حیا دیانت و امانت ان کے اخلاق کا خاص جوہر تھی، طبیعت نہایت محبت والی پائی تھی۔ راستبازی اور ہمدردی سے بھرے ہوتے، نہایت متقی و پرہیزگار اور سادہ مزاج واقع ہوئے تھے۔ کبھی کسی لفظ فحش سے زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ نہ کسی کی ہجو لکھی، سچے پاکباز صوفی مشرب، احکام قرآنی کے پورے عامل تھے [۲]

رنگِ سخن

امیر کا رنگ سخن خالص لکھنوی تھا، لیکن کلام کا اگر بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو ماننا پڑے گا، درد و الم، اور سوز و حسرت کی بجلیاں بھی بھری ہوئی ہیں، امیر کے بہت سے اشعار، زبان زد خاص و عام ہو چکے ہیں جنہیں اب تک مزے لیکر لوگ پڑھتے ہیں، اور جب تک اردو زبان زندہ ہے پڑھتے رہیں گے اور ان کا یہ شعر

قریب ہے یار روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہیگی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین کا

ہماری زبان اور لٹریچر کا حصہ بن گیا ہے۔ اس کے بارہ میں ایک مورخ ادب کہتا ہے: "اس شعر کو مسٹر جسٹس محمود نے اپنے ایک فیصلہ میں بطور سند کے لکھا تھا [۳]

انتخاب کلام

ذیل میں چند اشعار کلام امیر سے منتخب کرکے پیش کئے جاتے ہیں۔

---

[۱] طرۂ امیر (امیر احمد علوی بی اے) صفحہ ۶۶
[۲] تاریخ ادب اردو (سکسینہ) صفحہ ۳۶۳
[۳] تاریخ ادب اردو (سکسینہ) صفحہ ۳۶۴

برباد قصرِ تن جو ہوا بن گئی لحد — وہ گھر جو گر پڑا تو یہ تعمیر ہو گیا

تیرے مریضِ غم کی نہیں آج کچھ خبر — سنتے ہیں حال کل تو نہایت سقیم تھا

سامانِ عفو کیا میں کہوں مختصر یہ ہے — بندہ گناہ گار تھا خالق کریم تھا

ملا ہے جن کو دلِ مصفا برے کو بھی دیکھتے ہیں اچھا
پڑے گا عکس آئینہ میں سیدھا ہزار اُلٹا ہو خط نگیں کا

کہاں کا کعبہ ہے دیر کیسا بتاؤ کوچے کا اس کے رستہ
میں پوچھتا ہوں پتہ کہیں کا نشان دیتے ہو تم کہیں کا

اگرچہ پیری میں ناتواں ہیں شباب کے کچھ اثر عیاں ہیں
نہیں یہ بازو میں جھریاں ہیں نشان ہے چینِ آستیں کا

رات دن کعبۂ دل میں ہے بتوں کا مجمع — کیا سے کیا ہو گئی اللہ کے گھر کی صورت

اس نزاکت پہ میں سو جان سے صدقے قاتل — ہاتھ میں تیغ لچکتی ہے کمر کی صورت

اک جلوے میں غش کر گئے اے حضرت موسیٰ — ہوتے ہیں یہی طالب دیدار کے انداز؟

ہر موج سے اک لغزشِ مستانہ ہے پیدا — ہیں آبِ رواں میں تری رفتار کے انداز

ہجوِ مے کر رہا تھا منبر پر — ہم جو پہنچے تو پی گیا واعظ

ہے باغ باغ بلبل جس طرح تو چمن میں — پھرتے تھے ہم بھی یوں ہی خوش خوش کبھی وطن میں

ظالم تجھے دل دیا خطا کی — بس بس میں پہنچ گیا سزا کو

اے حضرتِ دل بتوں کو سجدہ — اتنا تو نہ بھولیے خدا کو

رہے وہ جان جہاں یہ جہاں رہے نہ رہے — مکیں کی خیر ہو یارب مکاں رہے نہ رہے

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں — پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے

ہمارے دل سے مٹے گا نہ داغِ شوقِ سجود — جبیں بنے نہ رہے آستاں رہے نہ رہے

چلا تو ہوں پئے اظہارِ دردِ دل دیکھوں — حضورِ یار مجالِ بیاں رہے نہ رہے

امیر جمع میں احباب دردِ دل کہہ لے پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

مقامِ وجد ہے اے دل کہ بزمِ یار میں آئے بڑے دربار میں پہنچے بڑی سرکار میں آئے

تیر پیہم تم چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے سینہ کس کا ہے مری جان جگر کس کا ہے

دیر میں کون ہے کعبے میں گزر کس کا ہے یار کا گھر ہے اگر یہ تو وہ گھر کس کا ہے؟

وہ مست ہوں کہ ساغرِ مے جب بھر آ گیا اک بار یا غفور کہا اور چڑھا گیا!!

ہاتھ رکھ کر مرے سینہ پہ جگر تھام لیا تم نے اس وقت تو گرتا ہوا گھر تھام لیا

غم نہیں جی تم سے نکلا دل گیا مل گئے تم مجھ کو سب کچھ مل گیا

بولے وہ سینہ پہ میرے رکھ کے ہاتھ کہیئے اب تو اضطرابِ دل گیا؟

سلے نگاہِ یاس تیرا ہو بُرا گھر تلک روتا ہوا قاتل گیا

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر

اپنی گردش پہ تجھے بہت ہے اے چرخ گھمنڈ جب میں جانوں کہ شبِ غم کی سحر پیدا کر

کون مانع ہے کہ در پر ترے آ بھی نہ سکوں کیا مرے نقشِ قدم ہیں کہ اٹھا بھی نہ سکوں

وصل میں چھیڑ نہ اتنا اسے اے شوقِ وصال کہ وہ روٹھے تو کسی طرح منا بھی نہ سکوں

شوخی تھی قیامت تری مستانہ ادا میں فتنوں نے قدم چوم لیے لغزشِ پا میں

آج تو دعوت ہے آپ کو کرنی ہو گی رندیوں حضرت واعظ نہیں ٹلنے والے

کی نظر بھی تو نگاہ غلط انداز سے کی تیر بھی تم نے لگائے تو اچٹنے والے

تمنا بھی وصل کا اقرار ابھی ہے انکار بارک اللہ زبان دے کے پلٹنے والے

(۵)

امانت

غدر ... ت کرے بہت خوش گوئی تھے اپنے رنگ میں یکتا اور بے مثل شاعر بھی
... ہی، بلا کے ذہین تھے، بات میں بات پیدا کرتے اور بڑی دور کی کوڑی لاتے تھے ہر
رنگ میں ہر بات میں اپنی انفرادیت قائم رکھتے تھے۔ لکھنؤ کے بہت سے شاعر دل بے دام
غلام ہو گئے۔ لیکن امانت اس کے باوجود اب تک زندہ ہیں کہ تذکروں میں بھی حضرت رنگی کا نمونہ
آج تک ... کی محفل میں ان کا نام لینا بدتمیزی اور گستاخی ہے۔

زندگی کے مختلف ادوار

سید آغا حسن نام تھا، میر آغا مرزا کے صاحبزادے تھے
پہلے مرثیہ کہتے رہے، پھر غزل کی طرف توجہ کی
واسوخت کے انداز میں رنگ اٹھایا وہاں سے آگے بڑھے تو ناٹک کی سبھا میں اندر سبھا
کے جو ٹھاٹ لگے تو گویا سینے سے نکل کر بجا۔ پیچ کے زور سے زبردست لگائی۔ لو وار کی تھی پر
کام کر دم لیا۔ زندگی اگر غزل میں بھی گزارتے تو بد عملی میں بھی نہیں کاٹی دوارڈ کے یادگار
چھوڑے، لطافت اور فصاحت میں بے عیب ہیں۔ فصاحت کو دیکھا ہے، لکھنؤ میں سے

ریاض خیرآبادی سے ملنے آئے تھے، وضع ولباس سے معلوم ہوتا تھا بہت عسرت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

امانت نے انتزاع سلطنت اودھ کے کچھ عرصہ بعد ۱۸۵۸ء میں انتقال کیا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

واسوخت امانت کی شہرت زیادہ تر، واسوخت اور اندر سبھا کی رہین منت ہے۔ ۱۸۴۷ء میں ایک محفل سنعقد کی اور تمام امراء و رؤساء اور عمائدین شہر کو جمع کر کے برسر محفل واسوخت پڑھا اور دادِ کمال حاصل کی، "اب واسوخت کو پڑھیے تو مذاق سلیم مجروح ہوگا!" [۱]

لیکن اُردو کے ایک اور مؤرخ، واسوخت کا ذکر کرتے ہوئے دوسری رائے ظاہر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"(امانت نے) ایک واسوخت بھی لکھا ہے، جو نہایت اعلیٰ درجہ رکھتا ہے، ان کی تصانیف میں واسوخت اور اندر سبھا کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔" [۲]

اندر سبھا امانت کی اندر سبھا واقعی ایک خاص چیز ہے، جس نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے، اردو زبان میں یہ سب سے پہلا ڈرامہ ہے۔

"اندر سبھا اُردو ڈرامہ کی سب سے بڑی تصنیف ہے۔" [۳]

اُردو زبان کا ایک اور مؤرخ اور نقاد، اندر سبھا کے ذکر میں لکھتا ہے:۔

"(امانت نے) ۱۸۴۲ء میں اندر سبھا کا ایک قصہ نظم کیا، اندر سبھا

---

[۱] لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۷۷

[۲] تاریخ ادب اُردو (سکینہ) صفحہ ۲۶۲

[۳] تاریخ ادب اُردو (سکینہ) صفحہ ۲۶۲

کے لئے لکھنؤ میں فضا پہلے سے تیار تھی، اختر نگر کے عیش خانے اندر کی سبھا کا مکمل نمونے تھے، امانت نے اندر سبھا لکھی تو گویا ماحول سے متاثر ہو کر اس کی ترجمانی کی [1]

اندر سبھا کی غیر معمولی مقبولیت

مولانا عبدالحلیم شرر نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ خاص طور پر دلچسپ ہے۔

جب قیصر باغ کے میلوں کا دروازہ عوام الناس کے لئے بھی کھل گیا تو سارے شہر کے شوقینوں میں ڈرامہ کا فن خود بخود ترقی کرنے لگا۔ اور چند ہی روز میں اس شوق کو اس قدر ترقی ہوئی کہ بعض مشہور شعراء بھی ڈرامہ لکھنے لگے، چنانچہ میاں امانت نے جو ایک مشاق شاعر تھے اندر سبھا لکھی اور شہر میں مختلف جماعتیں اندر سبھا کو اسٹیج پر کھیلنے لگیں، جن میں کہیں عورتیں اور کہیں لڑکے ایکٹ کرتے، اندر سبھا میں اصول موسیقی کے مطابق دل کش دھنیں قائم کی گئیں۔ سارا شہر اندر سبھا کے جلسے دیکھنے کا مشتاق تھا، میاں امانت کی اندر سبھا کی کامیابیاں دیکھ کر اور لوگوں کو بھی شوق ہوا۔ اور اس قسم کے بہت سے ڈرامے ایجاد ہو گئے اور سب کا نام "سبھا" قرار پایا، چنانچہ شہر میں مداری لال وغیرہ کی بہت سی سبھائیں قائم ہو گئیں جن کے پلاٹ بدلے ہوئے تھے۔"

اندر سبھا اردو کا پہلا ڈرامہ ہے

مولانا شرر فرماتے ہیں۔

سبھا کے رنگ نے شہر میں ایسی زندہ دلی پیدا کر دی کہ سوا اندر سبھا کے لوگ اور کسی قسم کا ناچ گانا پسند ہی نہ کرتے تھے، ہر طرف سبھاؤں کی دھوم تھی

---

[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۷۱۴

پارسیوں کا پہلا عام کمپنی امانت کی اندر سبھا تھا۔ اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ڈرامہ کی بنیاد خاص لکھنؤ ہی میں پڑی اور یہیں سے سارے ہندوستان میں اس کا رواج ہوا۔[1]

اندر سبھا پر تنقید ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے، اندر سبھا پر جچا تلا تبصرہ کیا ہے، وہ کہتے ہیں۔

"فنی نقطۂ نظر سے، اندر سبھا مشکل سے ڈرامہ کہی جا سکتی ہے۔ اس میں ساری کہانی عمل اور کرداروں سے ادا ہوتی ہے، اور یہ کردار بھی کاٹھ کی پتلیاں معلوم ہوتے ہیں، یہ حرکت کرتے ہیں، ان کا لباس الگ الگ ہے، لیکن اس لباس میں کسی کردار کی انفرادیت نظر نہیں آتی، اس کا کوئی واضح اور مرتب پلاٹ نہیں، نہ اس میں آغاز، انجام اور نقطۂ عروج کی منزلیں آتی ہیں، نہ اس میں SUSPENCE پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود بھی اردو ڈرامے کا نقش اوّل ہے اور اس کا ماخذ فارسی، یا عربی، یا مغربی زبانوں سے نہیں ہے بلکہ اس کا سلسلہ ناٹک، ـــ اور لیلا سے ملتا ہے، اس لئے ملکی عناصر اس میں غالب ہیں۔ ان میں فنی پہلو کا اتنا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے جتنا عوام کی دلچسپی اور تفریح کا، یہی وجہ ہے کہ مطبوعہ اندر سبھا کے ۴۰ صفحات میں ۱۷ غزلیں، اور ۱۲ دوہرے گیت تھے، جتنا وقت پوری سبھا پر صرف ہوتا ہے اس کا بڑا حصہ ان گانوں اور رقص کے لئے مخصوص ہو گیا ہے۔"[2]

اندر سبھا کا نمونہ داسوخت کا کچھ حصہ تو بطور نمونہ پیش کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا لیکن

---

[1] گزشتہ لکھنؤ (شرر) صفحہ ۸۰

[2] لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۴۹۷

اندر سبھا کا کچھ نمونہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں، اس سے امانت کی ذہانت، طباعی، زبان اور محاورہ پر دسترس، بیان و اسلوب پر ماہرانہ قدرت کا اندازہ ہو جائے گا۔ ہمارے پیش نظر ابو العلائی پریس آگرہ کی چھپی ہوئی با تصویر اندر سبھا ہے۔

راجہ اندر کی آمد:۔ زورِ کلام اور حسن بیان دیکھئے۔

سبھا میں دوستو اندر کی آمد آمد ہے
پری جمالوں کے افسر کی آمد آمد ہے
خوشی سے چہچے لازم ہیں صورت بلبل
کہ اس چمن میں گل تر کی آمد آمد ہے
غضب کا گانا ہے اور ناچ ہے قیامت کا
بہار فتنۂ محشر کی آمد آمد ہے

شعر خوانی پکھراج پری کی پکھراج پری، سبھا میں اپنا "فخریہ" گاتی ہے، زبان کی حلاوت اور کلام کی برجستگی دیکھیے۔

پھندے سے مرے کوئی نکلنے نہیں پاتا
اس گلشن عالم میں بچھا دام ہے میرا
میں لاکھ کی دو لاکھ کی پروا نہیں کرتی
قاروں کا خزانہ ابھی انعام ہے میرا
کہتے ہیں جہاں میں جسے انسان گل و بلبل
یہ رخ ہے وہ گیسوئے سیہ فام ہے میرا
بدمست مجھے دیکھ کے ہوتی ہے خدائی
معمورۂ حسن سے کیا جام ہے میرا
کرتی ہوں دل و جاں سے میں راجہ کی پرستش
کہتے ہیں جسے کفر وہ اسلام ہے میرا

غزل

یہ غزل دیکھیے محاکات معاملہ بندی، رعایت لفظی اور اس عہد کی معاشرتی تاریخ کے کیسے بے باک جلوے نظر آتے ہیں، پھر اج پری گاتی ہے، پہلے چاہِ یوسف کا منظر دیکھیے:۔

بے اد مجھے یاد ہے واللہ تمہاری
یوسف کی قسم اب نہ کروں چاہ تمہاری
عاشق کی مراد آئے رقیبوں کو الم ہو
جلئے جو سواری کبھی درگاہ تمہاری
بت بن گئے محفل میں رقیبوں سے نہ بولے
کیا بات ہے خالق کی قسم واہ تمہاری
بوسہ جو طلب میں نے کیا ہنس کے وہ بولے
سرکار سے موقوف ہے تنخواہ تمہاری

سبز پری کی شعر خوانی

اب ذرا سبز پری کی غزل سرائی بھی سن لیجیے، کہتی ہے۔

معمور ہوں شوخی سے شرارت سے بھری ہوں
دھانی مری پوشاک ہے میں سبز پری ہوں
کیا اصل ہے سبزہ کی مرے حسن کے آگے
فیروزہ سے خوش رنگ، زمرّد سے کھری ہوں
شعلہ ہوں، بھبوکا ہوں غضب ہے مرا غصّہ
جل جائیں پری زاد جو میں گرم ذری ہوں
وہ شمع میں پروانہ، وہ ہے سرو، میں قمری
وہ گل ہے جہاں میں، میں نسیم سحری ہوں

باب (۷)

عہدِ واجد علی شاہ کی صحافت

عہد واجد علی شاہ کی صحافت بھی ایک مخصوص رنگ کی حامل تھی اور شاید سارے ہندوستان میں اپنے تنوع رنگا رنگی اور شعلہ بیانی کے اعتبار سے ممتاز تھی آج سے سو برس پہلے کی صحافت کا آج کی صحافت سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا لیکن جو نمونے ہم نے پیش کئے ہیں ان سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس عہد کی صحافت کا رجحان کتنا شاندار اور امید افزا تھا۔

اب ہم عہد واجدی و انتزاع سلطنت سے قبل و بعد کی صحافت کی مختصر تاریخ مع مختصر نمونوں کے پیش کرتے ہیں۔

اردو اخبار کا دور اب سے پچانوے برس پہلے شروع ہوتا ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس ایک صدی کے تمام سنہ وار نمونے مل سکتے ہیں لیکن اسوقت کی سعی و کوشش پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکی مجبوراً جس قدر نمونے دستیاب ہوئے انھیں کو زبان کی ارتقائی رفتار کے لحاظ سے ۳ ادوار میں منقسم کر دیا گیا قبل اسکے کہ ادوار مذکورہ کی تفصیل لکھی جائے دور اول کے متعلق مشہور مستشرق گارساں دتاسی کے ایک لیکچر کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوسکے گا کہ ۱۸۳۹ء کے بعد ۱۸۵۲ء تک کتنے اردو اخبار اشاعت پذیر ہو چکے تھے۔

۱۸۵۰ء سے نئے سنگی مطبع قائم ہوئے ہیں جہاں سے دلچسپ کتابیں شائع ہوتی ہیں نئے رسالے اور اخبار بھی جاری ہوئے اور پرانے تقریباً سب کے سب زندہ ہیں ان مطبعوں سے مفصلہ ذیل ہندوستانی اخبار شائع ہوتے ہیں۔

آگرے سے مطبع الاخبار جو شہر آگرہ میں خوب بکتا ہے ایک اور اخبار اسی شہر سے نکلتا ہے جس کا نام قطب الاخبار ہے جس میں مذہب اسلام کے متعلق بحث ہوتی ہے۔ اخبار النواح (۵) پہلے ایک علمی

پرچہ تھا مگر اب معمولی خبروں کا اخبار ہے۔ آگرہ گورنمنٹ گزٹ سرکاری اخبار ہے اور ہندوستانی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اب اگر ہم دہلی کی طرف رجوع کریں تو وہاں "سراج الاخبار" ہے جو اس شہر کا سب سے پرانا اخبار ہے۔ "دہلی اردو اخبار" اردو میں چھپتا ہے۔ "مظہر الحق" کے ایڈیٹر ایک صاحب محمد علی ہیں جن کی اسی نام کی ایک تالیف ہے "قران السعدین" ایک باتصویر اخبار ہے جس میں سائنس، ادب اور سیاست سے بحث ہوتی ہے ہفتے میں ایک بار بڑے سفر شائع ہوتا ہے۔ "دقیق الاخبار" ہندوؤں کا ہے۔ میرٹھ میں دو ہندوستانی اخبار ہیں۔ ایک "مفتاح الاخبار" جس کے ایڈیٹر محبوب علی ہیں۔ انھوں نے "ہندوستانی لغت اللغات" کا بھی خلاصہ لکھا ہے جو لکھنؤ میں ۱۸۶۷ء میں طبع ہوا۔ دوسرا اخبار "جام جہاں نما" ہے اس اخبار میں علاوہ معمولی خبروں کے سرکاری گزٹ اور ممالک مغربی و شمالی کی عدالت العالیہ (سپریم کورٹ) کے فیصلوں کے اقتباسات بھی درج ہوتے ہیں۔ بنارس میں چھ ہندوستانی اخبار ہیں۔ ان میں سے دو اخباروں کا ایک ہی ایڈیٹر ہے ایک ہندی یعنی دیوناگری حروف میں، دوسرا یعنی فارسی حروف میں شائع ہوتا ہے۔ پہلے کا نام "بنارس اخبار" ہے۔ بنارس کا تیسرا ہندوستانی اخبار "سدھاکر" ہے پہلے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں نکلتا تھا مگر اب صرف ہندی میں شائع ہوتا ہے۔ چوتھا اخبار "باغ و بہار" ہے جس کا نام اسی نام کی مشہور کتاب پر رکھا گیا ہے۔ پانچواں اخبار "ساٹرس ہند" (؟) ہے یہ دو ہفتے میں ایک بار چھوٹی تقطیع کے آٹھ صفحوں پر چھپتا ہے۔ اور ہر صفحے میں دو کالم ہیں علاوہ معمولی خبروں کے جو کسی قدر تفصیل سے لکھی جاتی ہیں اس میں مختلف قسم کے مضامین ہوتے ہیں چھٹا اخبار "بنارس ہرکارا" ہے جو ۱۸۵۱ء سے اب تک نکل رہا ہے۔ بریلی سے "عمدۃ الاخبار" شائع ہوتا ہے اس کے ایڈیٹر لکشمی پرشاد ہیں۔ مرزاپور سے "خیر خواہ ہند" نکلتا ہے یہ امریکی پروٹسٹنٹ مشن کا اخبار ہے "شملہ اخبار" شملے سے شائع ہوتا ہے جسے آجکل شیخ عبداللہ مرتب کرتے ہیں اور اندور کا اخبار جو مالوے کا دارالحکومت ہے "مالوہ اخبار" ہے۔ یہ آٹھ صفحہ کا ہفتہ واری ہے اس کے ایک کالم میں اردو اور دوسرے میں ہندی ہوتی ہے۔ اس کے ایڈیٹر دھرم نرائن ہیں۔ بھرت پور صوبہ آگرہ میں ہے وہاں کا اخبار "مظہر السرور" ہے۔ مالوہ اخبار کی طرح اس کے ایک کالم میں اردو اور دوسرے میں ہندی ہوتی ہے اب ہم پنجاب کے اخباروں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ ان کے ناموں کے دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ وہ روشنی علم کی اشاعت میں زیادہ کوشاں

ہیں کیونکہ وہاں کے اخبارات کے ناموں کے ساتھ اکثر نور کا لفظ لگا رہتا ہے مثلاً دیا ہے نور جو لاہور کا اخبار ہے۔ ایک دوسرا جو ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا ہے کوہ نور ہے۔ لدھیانہ کا اخبار نور علی نور ہے جسے محمد حسین نے ۱۸۷۳ء میں جاری کیا تھا۔ امرتسر سے "باغ نور" اور ملتان سے جو اسی نام کے صوبے کا دارالحکومت ہے "ریاض نور" نکلتا ہے۔

(ماخوذ از رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۳ء)

گارسن دی تاسی نے اپنی تفصیل میں (۲۸۰) اخباروں کے نام لکھے ہیں جن کی ابتدا ۱۸۵۷ء کے بعد ہوئی ہے۔ اردو اخباروں کا انحصار اس تعداد پر نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ اس عہد میں اور اخبار بھی شائع ہوئے جو کچھ دنوں رہ کر بند ہو گئے مثلاً سید الاخبار و اخبار دہلی۔ پہلا اخبار سر سید احمد خاں کے بھائی نے نکالا تھا اور دوسرے کے ایڈیٹر حسین الدین تھے۔ یہ دونوں ہفتہ وار اخبار تھے۔ اخبار دہلی جس کا ایک ورق حالاتِ حضور والا کے عنوان سے بادشاہ کے مخصوص حالات کیلئے وقف ہوتا تھا۔ اس کا ایک پرچہ عنبری (۵۰) جلد ۳ بابت ۵ جنوری ۱۸۴۷ء یوم یکشنبہ معہ دیگر نمبروں کے بھوپال کی حمیدیہ لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس اخبار کی حیثیت سرکاری یا نیم سرکاری تھی۔ اس میں شاہی کیمپ کے سفراء کی باریابی کے حالات کمپنی کی درخواستیں حضور بادشاہ درج ہوتی تھیں۔ دنیا بھر کی ضروری خبریں خصوصاً افغانستان اور ٹرکی کے انگلستان اور روس سے آویزش کے واقعات بھی چھپتے تھے۔ اخبار کے نمونوں میں جو دور قائم کئے گئے ہیں اگرچہ ان کے اشارات ہر صفحے کے عنوان پر موجود ہیں لیکن یہاں مزید تشریح کر کے ہر دور کی زبان اور اسالیب بیان کی خصوصیات لکھی جاتی ہیں

پہلا دور بہ ترتیب اندراج ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء سے شروع ہو کر ۱۲۷۲ھ ۱۸۵۶ء تک ختم ہوتا ہے لیکن اس کی ابتدا ۱۸۳۵ء ۱۲۵۰ھ سے سمجھنی چاہیئے۔ اگرچہ سنوات گذشتہ (۱۰ سال) کے نمونے بوجہ عدم دستیابی درج نہیں ہوئے ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو زبان ۱۸۴۷ء میں بولی جاتی تھی وہی اندازاً دس بارہ برس پہلے تھی جس کا ثبوت دوسری تصنیفوں سے بآسانی مل رہا ہے۔ بہرحال اس دور کے اخباروں کی حالت بلحاظ نوعیت مضامین عموماً مسمیٰ اخبار کے مذاق کی تابع پائی جاتی ہے جس ایڈیٹر کو جس فن میں توغل ہوتا

لہ ماخوذ از رسالہ زمانہ کانپور

تھا اس مذاق کا عنصر اخبار میں زیادہ پایا جاتا تھا اب رہی خبریں، انکی حالت ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں وسائل و ذرائع کی جو محدود حالت تھی اس کا اثر خبروں کی صحت و عدم صحت پر پڑتا تھا۔ اکثر خبروں کا اندراج کہانی اور افسانوں کے رنگ میں ہوتا تھا نیز ان کی تصدیق کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا مثلاً پاٹن جلال کی خبر مطبوعہ سعد الاخبار نمبر (۴) ۱۸۴۸ء اسی طرح لکھنؤ کے اخبار طلسم اور رسالہ سلفری کی منقولہ ذیل عبارتوں کو دیکھا جائے اور ان خبروں سے اس عہد کے ارتقاء ذہنی پر نظر ڈالی جائے کہ غدر کا پر آشوب زمانہ ہے سلطنت تباہ ہو رہی ہے بادشاہ کو نظر بند کر کے کلکتہ بھیجا جاتا ہے۔ بادشاہ کی والدہ اسی پریشانی میں ولی عہد کے ساتھ ولایت جاتی ہے۔ یہ واقعات جس انداز سے مشتہر کئے جاتے ہیں ان کا اسلوب بیان فسانہ عجائب یا طلسم ہوشربا سے کم نہیں۔ خصوصاً یہ بیان کہ کوئین وکٹوریہ نے شکار گاہ سے جناب عالیہ (والدہ شاہ اودھ) کو لکھا کہ بادشاہی کوٹھی میں اتریئے ہر طرح کا سامان آرام سرکار سے بے خطر ہے ...... اضطراب کا مقام نہیں، گھبرانے کا ہنگام نہیں ڈیڑھ مہینہ میں ہم آتے ہی تمہیں اولاد کو بھیجتے ہیں" یہ عجیب مضحکہ آمیز اور تعجب خیز ہے یہ رنگ تحریر زیادہ دیر پا نہ تھا اور عموماً لکھنؤ یا اس کے قریب و جوار پر چھایا ہوا تھا۔ پنجاب کے اخبار اس زمانہ میں بھی سیاسی مذاق اور رجحان کے تابع نظر آتے ہیں، ان میں ایسی باتیں ضرور ملتی ہیں جو اجرائے اخبار کے مقاصد کو کم و بیش پورا کرتی رہتی تھیں۔

دوسرا دور سنہ ۱۸۵۷ء بمطابق ۱۲۷۳ھ سے ۱۸۸۵ء بمطابق سنہ ۱۳۰۳ھ تک قائم کیا گیا ہے۔ اس عہد میں اخباروں کی زبان بھی بدلی ہوئی ہے اور نوعیت مضامین کی فضا بھی معمولی خبروں سے گزر کر علمی اجتماعی معلومات کے میدانوں میں چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس خصوص میں اودھ اخبار لکھنؤ اور سب سے زیادہ سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کی کوششیں اپنے عہد کے تمام اخباروں کی تبدیلی مذاق کا باعث ہیں۔

تیسرا دور ۱۸۸۵ء بمطابق سنہ ۱۳۰۲ھ سے سنہ ۱۹۰۱ء بمطابق ۱۳۱۹ھ تک اور اس کے بعد سے اس وقت تک (یعنی سنہ ۱۹۳۰ء بمطابق ۱۳۴۹ھ) جو تھا دور شروع ہو گیا ہے۔ اس نصف صدی میں دونوں عہدوں کی زبانوں میں کوئی خاص امتیاز و فرق نہیں البتہ خیالات کا تغیر و تبدل اور جذبات کا جزر و مد ہر دور کی طرز نگارش کو جدا جدا دکھاتا ہے۔ تیسرے دور تک زیادہ تر تعلیمی، تاریخی، مذہبی وغیرہ مضامین کا عنصر اخباروں میں

نظر آتا ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کے شروع ہوتے ہی ساری قوت، تمام توجہ سیاسی ملکی اور قومی ریفارم کی طرف مبذول کردی گئی۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک جو اخبار حکومت کے ہم آواز تھے وہ سودیشی اور بدیشی یا کوآپریشن اور نان کوآپریشن (COOPERATION AND NON COOPERATION) کے میدانوں میں ایسی ایسی بلند پروازیاں دکھانے لگے جن کی مثال کم سے کم ہندوستان میں اب سے پہلے نظر نہیں آتی تھی۔ اس ہنگامہ و انقلاب نے اردو زبان کو نقصان بھی پہنچایا اور فائدہ بھی نقصان تو یہ کہ اب تک اردو جس حیثیت سے فطرت کے مطابق فصاحت و سلاست کی دوش بدوش ترقی کر رہی تھی اس میں بہت سی الجھنیں پیدا کر دی گئیں اور فائدہ یہ کہ اس طوفان و جوش کی بدولت سینکڑوں الفاظ ایسے فراہم ہو گئے جس سے توسیع زبان کی فہرست میں معتدبہ اضافہ ہو گیا۔ چونکہ یہ سب واقعات زمانہ حال کے ہیں اور عصر حاضر میں اخبار بیں نگاہیں عام طور سے کھلی ہوئی ہیں۔ اس لئے ان باتوں کی مزید توضیح تحصیل حاصل ہے۔

اخباروں کے چاروں ادوار میں جتنے نمونے لکھے گئے ہیں وہ بلحاظ تعداد بہت کم ہیں۔ یہ کمی اس لئے روا رکھی گئی کہ فی زمانہ اخبار پڑھنے کا مذاق عام ہو رہا ہے اور اکثر علم دوست افراد اخباروں کے حالات سے کم و بیش واقفیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا مناسب سمجھا کہ ہر دور کے دو چار اخبار پیش کر کے باقی کا اندازہ ان کے قیاس پر چھوڑ دیا جائے۔ مزید معلومات کے لئے ذیل میں ہر دور کے چند اخباروں کے نام مع مقام اشاعت درج کئے جاتے ہیں تاکہ ان کے اندراج یکجائی سے تلاش و جستجو کی زحمت کم ہو جائے۔

عام فہرست

نمبر شمار	نام اخبار	مقام اشاعت	زمانہ اشاعت	نمبر شمار	نام اخبار	مقام اشاعت	زمانہ اشاعت
۱	مطبع الاخبار	آگرہ	دور اول ۱۸۳۵ء تا ۱۸۵۷ء	۵	مفتاح الاخبار	میرٹھ	دور اول ۱۸۳۵ء
۲	قطب الاخبار	"	"	۶	جام جہاں نما	"	تا ۱۸۵۷ء
۳	اخبار النوع	"	"	۷	بنارس اخبار	بنارس	"
۴	آگرہ گورنمنٹ گزٹ	"	"	۸	سدھاکر اخبار	"	"

نمبر شمار	نام اخبار	مقام اشاعت	زمانہ اشاعت	نمبر شمار	نام اخبار	مقام اشاعت	زمانہ اشاعت
۹	باغ وبہار	بنارس	دور اول ۱۸۳۵ء تا ۱۸۵۷ء	۱۸	سائنٹیفک سوسائٹی	علی گڈھ	دور دوم ۱۸۵۷ء تا ۱۸۸۲ء
۱۰	سائرین ہند	"	"	۱۹	نجم الاخبار	اٹاوہ	"
۱۱	بنارس ہرکارا	"	"	۲۰	آگرہ اخبار	آگرہ	"
۱۲	عمدۃ الاخبار	بریلی	"	۲۱	نور الآفاق	کانپور	"
۱۳	خیر خواہ ہند	مرزاپور	"	۲۲	نور الانوار	"	"
۱۴	سعد اخبار	اندور	"	۲۳	تہذیب الاخلاق	علیگڈھ	"
۱۵	طلسم	لکھنؤ	"	۲۴	امداد الاخلاق	کانپور	"
۱۶	سحر سامری	"	"	۲۵	اختر شاہنشاہی	لکھنؤ	"
۱۷	اودھ اخبار	"	دور دوم ۱۸۵۷ء تا ۱۸۸۲ء	۲۶	اودھ پنچ	"	"

نمونہ نمبر ۳

اخبار

پہلا دور

۱۲۶۳ھ سے ۱۲۷۲ھ تک

۱۸۴۷ء ۱۸۵۶ء

شمار	اخبار معہ مقام	زمانہ اجرا	تاریخ تحریر نمونہ	نمونہ عبارت
نمبر ۱	سعد الاخبار اکبر آباد آگرہ	۱۲۶۳ھ ۱۸۴۶ء	نمبر ۲۰ - ۲۱ جون ۱۸۴۷ء روز دوشنبہ جلد (۱)	عبارت سرورق یہ اخبار ہفتے میں ایک بار دوشنبہ کے دن چھپتا ہے۔ قیمت اس کی ۸ر مہینہ اور محصول ڈاک ذمہ خریدار اس اخبار میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے

زمانہ ستبر کا حال تھوڑا تھوڑا ہر اخبار میں چھپا پاجاتا ہے جب بفضلہ یہ حال تمام ہوجاییگا تو اہل بیت اور خلفاء اربعہ اور معرکۂ جگر سوز کربلا اور دوازدہ امام علیہم الصلاۃ والسلام کے حالات بلا کم و کاست بتدریج و تفرقی لکھے جائیں گے تاکہ عوام الناس کو ان حالاتِ فیض سمادات سے بخوبی آگاہی حاصل ہو

پاٹن جھالا کی خبر

صاحب زینۃ الاخبار (لاہور) اپنے ایک دوست کے خط کی رو سے تحریر فرماتے ہیں کہ پاٹن جھالا میں ایک روز عجب ماجرا ہوا کہ جنگل سے ایک صحرائی سور شہر میں وارد ہوا اور مہاراجہ بدن سنگھ بہادر کے محل میں داخل ہوگیا ہر چند لوگوں نے روکا مگر نہ رکا حتی کہ اندر جاکے مہاراجہ کی مسند پر بیٹھ گیا سپاہیوں نے خوب تلواریں چلائیں اور اسے مجروح کرکے مسند سے دور ڈالدیا۔ خوک مجروح پھر دوڑ کر مسند پر جا بیٹھا تین بار ایسا ہی اتفاق ہوا آخر الامر اس سور کو مار ڈالا۔ اس ملک کے نجومی اس امر کو ریاست کے حق میں منحوس بتاتے ہیں۔

صدر الاخبار (بمبئی) سے معلوم ہوا کہ وہاں کے نجومیوں نے اقرار کیا ہے کہ ۱۵ تاریخ کو بہاں بڑی آندھی آوے گی۔ لوگ ان کے کہنے سے خوفزدہ ہو رہے ہیں۔ (۳۹۵،۳۹۴)

شمار	اخبار و مقام	زمانہ اجرا	زمانہ نمونہ	نمونہ عبارت
نمبر ۵	[illegible]	×	[illegible]	اب ملازمت سے بصاحب موصوف (اللہ نس صاحب چیف کمشنر) نے چودھویں تک اس امر کی میعاد ٹھہرائی ہے مگر محلات نے جو حضرت کی طرف سے جواب کے منتظر تھے مکانات خالی کردینے

میں جلدی نہ فرمائی جب میعاد سے کئی دن زیادہ گذرے تو صاحب چیف کمشنر بہادر نے پھر تاکید کی جب سررشتہ صاحب منتظم کے نام چٹھی لکھی منتظم نے اس پر بھی محلات کو حکومت نہ جتائی سوا افہام تفہیم کے کچھ زبردستی نہ دکھائی۔ یہاں تک کہ تاکید شدید سے مامور ہوئے شدت کرنے میں ناچار ہوئے مجبور ہوئے آخر عند الحرم وغیرہ محلات شاہی کا مجموعہ کیا خیاشب مع اسباب سب کو اٹھایا۔ راستے کے سبب سے جو کھاٹ کیا تھا

باقی ہر دن کو چینی بازار کے تقاضے دار کی تاکید سے آتھا۔ غرض بیٹھے بٹھائے گیا پریشانی اٹھائی زمانہ کی گردش نے عجب ویرانی دکھائی۔ تمام خلق کو رقت تھی یہ حیرانی دیکھ کر حیرت تھی دیکھنے والوں کا دل کڑھتا تھا مگر کیا ہو سکتا تھا۔ ایک دوسرے کا منہ تکتا تھا۔ روتا تھا بلکتا تھا۔

۳ - اکتوبر

منگل بین والی کوٹھی میں پرسوں نیلام ہوتا رہا۔ ہر روز صبح سے دس بجے تک وہی سودا رہا ۲۹ ستمبر کے نیلام میں ایک سیف گجراتی نکلی جس کا لوہا ایسا اچھا تھا کہ اس پر سرکار ابوالمنصور خان بہادر صفدر جنگ آب زر سے لکھا تھا ۳۰ تاریخ چھ روپے کو ایک توڑے دار بندوق کا نیلام دیکھا۔ ابوالمنصور خاں بہادر اور محمد یونس کاریگر کا نام منقوش تھا۔ ایک بندوق پر نواب شجاع الدولہ بہادر تحریر تھا۔ دوسری پر وزیرالملک آصف الدولہ بہادر رقم پذیر تھا۔ پانچ پانچ سو سو دو توں چھوٹیں۔ دیکھنے والوں کی کمریں ٹوٹیں ایک بندوق ساڑھے آٹھ روپے کو بکی تھی جس پر سونے سے یہ عبارت لکھی تھی حسب فرمائش دائم خاقان بہادر دائم الدولہ تیار شدہ دس بارہ روپے سے اصفہانی تلواروں کا نیلام ہوا کمان پر ابوالمنصور خاں سونے کے پانی سے لکھا تھا یکم اکتوبر کے نیلام میں ادھر دنوں سے بھی سستا سودا کیا سو روپے کا لالی ایک روپے کو بکا۔

(۴۰۵، ۴۰۷)

شمار	اخبار و مقام	زمانہ اجرا	زمانہ تحریر	نمونہ عبارت
نمبر ۴	[illegible]	نومبر ۱۸۵۶ء / ۱۲۷۳ھ	نمبر ۲۲ جلد اوّل یکم نومبر ۱۸۵۶ء مطابق ربیع الاول ۱۲۷۳ھ	**خبر فرحت اثر** جناب عالیہ (والدہ واجد علی شاہ) و مرزا ولی عہد بہادر مرزا اسکندر حشمت بہادر مرزا حامد صاحب مرزا ولی عہد کے مصاحب سفر ولایت میں ولی نعمت کے ہمراہ تھے اقبال کی طرح مقبول بارگاہ تھے۔ وہاں پہنچ کر ولی نعمت نے نادری کا منصب عنایت کیا۔ حضرت سلطان عالم کے پاس رخصت کیا۔ انگریزی ڈاک کے جہاز پر سوار

ہوئے۔ ۱۰/اپریل ۱۲۷۳ھ کو دریا سے پار ہوئے۔ حضرت کے نام اپنے حضور کی تحریر لائے گھڑی وغیرہ اور بہت تحائف دل پذیر لائے ان کی زبانی ہے دلچسپ کہانی سنی ہے کہ ابھی تک ملکہ فرنگ مصروف سیرو شکار ہیں، مسافران لندن محو انتظار ہیں مگر تیر مدعا نشانے سے قریب تر ہے ملکہ فرنگ کی شکار سے پلٹنے کی جلد خبر ہے۔ بڑے بڑے انگریز ان جلیل الشان اونچی اونچی کچہری پارلیمنٹ کے ارکان ممنون ہیں۔ کہ دادگستر کے آنے تک تیغ انصاف کے جوہر نہاں ہیں ادھر ملکہ شکارگاہ سے پھریں ادھر برگشتہ مقدر کے دن پھر جائیں گے جتنے ستارے گردش کے ہیں اشک ندامت کی طرح چشم فلک سے گر جائیں گے پھر وہی شاہ اودھ کا دور دورہ ہوگا وہی حشمت کا انداز وہی سلطنت کا طور ہوگا۔ شکستہ خاطروں کو تسلی دیتے ہیں۔ اراکین دولت تشفی دیتے ہیں کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے دنیا کی کسی بات کا ثبات نہیں ہے انھیں حکام پارلیمنٹ نے اپنے اپنے مکان خالی کردیئے ایک ایک کو آنکھوں میں جگہ دل میں گھر دیئے ملکہ فرنگ نے پرچہ پیام بھیجا جناب عالیہ کے نام بھیجا جواب لکھا کہ ملکہ عالم رونق افروز ہو لیں، داد طلب دادگستر کے جمال باکمال سے بہرہ اندوز ہو لیں، پھر جہاں ارشاد ہوگا رہیں گے اور جب تک دامن دولت سے دور رہیں عیش کیسے آرام کہاں کا ہر طرح کے جور سہیں گے۔ ملکہ عالم نے پھر تحریر فرمایا تشفی کا مضمون سنایا کہ اضطراب کا مقام نہیں گھبرانے کا ہنگام نہیں ڈیڑھ مہینے میں ہم آتے ہیں، تمہیں مراد کو پہنچاتے ہیں۔ مرزا صاحب اس تحریر کے آنے سے دس روز بعد گرم سفر ہوئے، ۲۲ دن راہ میں بسر ہوئے۔ اس حساب سے اب ملکہ عالم ولایت میں آگئی ہوں گی۔ جناب عالیہ منہ مانگی مراد پا گئی ہوں گی۔ (صفحہ ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۱۰)

دوسرا دور

۱۲۷۳ھ سے ۱۳۰۰ھ تک

۱۸۵۷ء ۱۸۸۲ء

شمار	نام اخبار مع مقام	زمانۂ اجرا	ایڈیٹر	زمانۂ تحریر	مضمون نگار	نمونۂ عبارت
نمبر (۱)	اودھ اخبار لکھنؤ	۲۴ ذی الحجہ ۱۲۷۴ھ ۱۸۵۸ء	منشی نول کشور مالک و ایڈیٹر اعظم منشی پراگ نرائن بھارگو وغیرہ	۱۲۹۰ھ ۱۸۷۳ء	ایڈیٹر خود [illegible]	شاہ فارس کی آمد اے بسر لمحہ امیدواری دیدار فرحت آثار شہر یار کا منگاری تھی کبھی خبر اڑتی تھی کہ اب شاہی ریل گاڑی قریب آگئی پہنچی ہر کہ بدامی شود از دور پندارم توی

باوجود گرمی اور انتظاری کے ایک طرح کی چہل اور زندہ دلی سبھوں کے دلوں پر چھا رہی تھی کہ یکایک شکل سلامی قلعہ لندن سے بجر دچھوٹے ناف لندن کے دمادن دغنے لگیں اب کوئی دقیقے کی بات باقی نہ رہی لیڈیاں معزز مہوش رشک حور کملا گئی جیسے گل کھنچتا ہوا اٹھ کھڑی ہوئیں کہ ٹرین شاہی بھی جب کہ مہر از مطلع انوار برآید ہمطالع ہوئی روز انتظار آخر اور شام انتظار کو سحر

دوبارہ لب نہ کشاید صدف بہ ابر بہار
کریم سائل خود را غنی کند یک بار

ایک ہلچل سی ہوئی (اتنا اتنا) کہ گاڑیوں کے گھوڑے بھی ٹاپیں مارنے لگے اور سبھوں کی آنکھیں نرگس وار ایک طرف ترتیب وار جم گئیں۔

اٹالین اوپرا کے تماشے میں شاہ کا جانا

تو کیا دیکھتے ہیں کہ سات سو پری زاد گل اندام مہر چہرہ زہرہ جبیں ماہ تابان و خورشید درخشاں بہ شید ہیں ہر ایک پر لباس زمرد اور مروارید اور الماس ٹکے لگائے ہوئے تھی چھائے گئیں ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہزاروں ماہتاب نکلے ہیں اور جو جو راگ اور سوانگ اور کرتب اور تماشے دکھلائے کہ بادشاہ اور ہمراہی حیران

ہو گئے۔ ماہی یہ خواب ہے یا سچ مچ کے آدم زاد ہیں یا پریوں کا اکھاڑا اتر آیا ہے خصوصاً جب یہ پریاں تماشے کے دور سے شش طائروں کے اڑتی تھیں یکایک سب ہمراہی کی زبان سے واہ واہ کی صدا بلند ہوئی اگر شمہ اس کا بیاں لکھوں تو قلم بشکن سیاہی ریز کاغذ سوز دم درکش کا عالم ہو۔ ایک دن شاہ خفیہ طور سے شیش محل دیکھنے گئے اور سادی پوشاک میں تھے دربانوں نے ان کو شاہ کا نوکر سمجھا اس واقعے کو یا مرنے یوں قلمبند کیا ہے۔ بادشاہ سے بذریعہ مترجم جو فرانسیسی زبان جانتا تھا پوچھا کہ تم کو بادشاہ کی سرکار میں کون عہدہ ہے۔ بادشاہ نے فرمایا خدمتگار خاص اور معتمد علیہ اور چند ہمراہیوں نے کہا کہ بادشاہ ان پر بہت اعتقاد رکھتے ہیں صدہا مد تقاضہ ان فرنگ نے اشتیاق گرمجوشی اور مس انامل فیض (لمتہ چھونا یا چھونا) ظاہر کیا۔ اکثروں کو اعلیٰ حضرت نے سرفراز فرمایا۔ (۴۰۹، ۴۱۱)

شمار	اخبار و مقام	زمانہ اجراء	زمانہ تحریر	نمونہ عبارت
نمبر ۳	[illegible] (اردو) ہفتہ وار [illegible] حافظ عبد الغنی خاں [illegible] ایڈیٹر	۱۲۶۹ھ / ۱۸۶۲ء	۷ جون ۱۲۹۶ھ و ۲ نومبر ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۰ء ۱۸۸۳ء	لب لباب افسران انگریزیہ کابل سے عبد الرحمٰن کو ایسے مضمون کے خطوط بھیج رہے ہیں جس سے اس کی بدگمانی دور ہو اور یہ بھی ارادہ کیا گیا ہے کہ کوہستانی۔ ہندوؤں نے ایک لاکھ روپیہ جو عبد الرحمٰن کو قرض دیا ہے وہ سرکار ادا کر کے رسید عبد الرحمٰن خاں کے پاس بھیجکر ان کو خوش کرے اور اخبار دہلی گزٹ کا ریاضی ٹمنٹ لکھتا ہے کہ عبد الرحمٰن خاں صرف یہ اصرار کر رہا ہے کہ سرکار انگریزی قندھار کو بھی چھوڑ دے عبد الرحمٰن خاں کی عمر چالیس برس کی ہے۔

(نمونۂ مضمون) اسباب ترقی

لفظ ترقی کے معنی لغت میں بلند ہونا اور چڑھنا ہے اور عرف میں ایک حال پست سے حال بلند کو پہنچنا ہر چند کہ یہ لفظ عام ہے مگر ترقی ظاہری میں بھی بولا ہو گیا ہے اور اس جگہ مقصد بیان سے بھی یہی معنی ہیں اور بعد تو ہیں ہم

جن کے بڑھنے کا نام ترقی ہے اصل اصول ہیں باقی توابع اور فروغ اول مال دوم تزاید جاہ و مرتبہ سوم حکومت و تزاید حکومت۔ (صفحہ ۲۱۶، ۲۱۷)

شمار	اخبار و مقام	زمانہ اجراء	زمانہ تحریر	نمونہ عبارت
نمبر ۳	آگرہ اخبار حیات جاوداں آگرہ ہفتہ وار مجموعہ صفحہ باہتمام بابو چھجو لال	۱۲۸۲ھ ۱۸۶۳ء	۱۳۰۰ھ ۱۸۸۲ء	کالے اور گورے میں فرق ہم مدت سے جانتے تھے کہ قیصر ہند کے عہد آسائش و زیبائش میں گوروں اور کالوں میں کچھ تمیز نہیں ہے دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ہے مگر افسوس مفصلہ ذیل خبر نے ہمارے

اس اولڈ خیال کو یک لخت منتقل کر دیا۔ صرف منتقل کیا بلکہ آہ سو بٹر کر پٹ ڈالے ناظرین وہ خبر کیا ہے؟
سن لیجیے! ایک اخبار معزز سے معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ تجویز کر رہی ہے کہ گورے مجرموں پر گورے سپاہیوں کا پہرا ہو کسی نے مشن دیا تھا ہائے ہے قومی تعصب جس نے ہماری دانا بینا گورنمنٹ کے خیالات کو پلٹ دیا۔ گورنمنٹ کو گوروں کی خاطر داری کس قدر منظور ہے گورنمنٹ گوروں کے مزاج سے جل بل گئی لیکن افسوس بہت سے دیسی گوروں کے ہاتھ سے تباہ ہو گئے۔ اکثروں نے دیسیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا مگر کوئی نہیں اکثر عدالت سے بری کیے گئے ہائے ہائے افسوس ہندوستان کم بخت تو کب اپنی تاریکی جہالت سے سر اٹھائے گا۔ (۲۱۷، ۲۱۸)

شمار	اخبار و مقام	زمانہ اجراء	زمانہ تحریر	نمونہ عبارت
نمبر ۳	اودھ پنچ لکھنؤ ایڈیٹر سید سجاد حسین ہفتہ وار	۱۲۹۳ھ ۱۸۷۷ء	نمبر (۳۰) جلد (۲۲) ۲۸ جمادی الثانی ۱۳۱۴ھ ۱۸۹۶ء	مشکلے نیست کہ آساں نمی شود ہاں صحیح ہے مگر ہندوستان ایسے ملک میں تعلیم کی مشکل ام المشکلات ہے جو کوئی اس کو حل کرے بس سمجھ لو اس

نے سب کچھ کر لیا۔ مرحوم سر سید نے محمڈن کالج کو سخت مشکلات میں جیتا چھوڑا تھا طرح طرح کے اندیشے

ہوتے تھے مگر یارانِ ایمان کی تو یہ ہے کہ علی گڑھ والوں نے واجبی توجہ کوشش کی تدبیر وضع بھی ڈنکے کی چوٹ نباہی اور مخالفتوں کی بھی خس برابر پروا نہ کی صوبہ پنجاب کے سفیر اور لفٹنٹ گورنر بہادر کی دعوت میں آنا جمع کر لیا اور اس قدر وعدے لے لئے کہ سب دقتیں رفع دفع ہو گئیں بلکہ اور بھی سرسبزی کے سامان ہو گئے سنتے ہیں صرف ایک مسلمان رئیس محمد سعید خاں صاحب بہادر نے علاوہ پانچ ہزار کے بہت کچھ وعدہ کیا ہے ادھر او کالج کے منتظمین نواب محسن الملک حاجی اسمٰعیل خاں صاحب مسٹر بک مسٹر ماریسن وغیرہ مسٹر پنچ تمہارے دز تو مل دیں سند خوشنودی مزاج بوقت مناسب عطا کردہ خواہد شد

تبصرہ اور کیفیت

اردو میں پنچ کے نام سے جتنے اخبار شائع ہوئے اور ہوتے ہیں ان میں عموماً مذاحیہ اور مذاقیہ مضامین ہوا کرتے ہیں۔ اودھ پنچ خوبی مضامین لطافت بیان اور صحت زبان کے لحاظ سے تمام پنچوں کا سرپنچ کہا جا سکتا ہے۔ اس کے ابتدائی دور میں بڑے بڑے نامی اور مستند اہل قلم مضامین نگار رہے ہیں جن کی یاد بھینے والوں کو اب تک نہیں بھولی مذاق مذاق میں سیاسی مباحث اکثر ایسے دلکش اور لطیف پیرائے میں لکھے جاتے ہیں جن کی مثال دوسرے معاصرین اخبار میں نہیں ملتی تھی۔ اس کے نامور ایڈیٹر سید سجاد حسین مرحوم ایک پختہ کار اور باہوش اہل قلم میں سے تھے اودھ پنچ ان کے بعد بھی جاری ہے اور موجودہ حالت میں بھی قابل قدر ہے۔ مگر اب وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔

چوتھا دور

شمار	مقام و اخبار	زمانہ اجرا	زمانہ تحریر	نمونہ عبارت
۲۰	[illegible]	۱۲۸۸ھ ۱۸۷۰ء	۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء	پہلے یہ اخبار ۲۰ برس سے مہینہ میں صرف تین بار شائع ہوتا تھا حجم صرف آٹھ صفحوں کا تھا اور عام سے دس روپیہ سالانہ قیمت مقرر تھی۔ اب ہم نے ساتویں مئی ۱۹۰۵ء سے مہینے میں

چار مرتبہ اشاعت کردی ہے حجم بارہ صفحوں کا کردیا ہے اور عام سے سالانہ قیمت صرف چار روپے مع محصولڈاک تھا۔ مفید عام میں جنگ کے تازہ تازہ تار درج ہوتے ہیں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی خبریں اور صحیح صحیح واقعات درج کیے جاتے ہیں۔ ایڈیٹوریل مضامین کے علاوہ مراسلات میں ہندوستان کے قابل قدر نامہ نگاروں کے مضامین ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی شاعری ہوتی ہے غرض ہمارے اخبار میں علمی اخلاقی تاریخی مذہبی اور سوشل رفارم کے متعلق عمدہ مضامین ہوتے ہیں۔

۲۱ جولائی کو نماز جمعہ سے فارغ ہوکر امیر المومنین سلطان عبد الحمید خان ثانی الغازی جامع حمیدیہ سے باہر نکلنے کو تھے کہ کسی نابکار نے بم کا گولہ صحن مسجد میں پھینک دیا جو بڑے زور سے جاکر پھٹا مگر خدا کے فضل و کرم سے جلالتمآب کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ البتہ سلطان اردلی کے سوار اور ہمراہی افسروں وغیرہ میں سے ۲۲ شہید ہوئے اپنے آقائے نعمت پر تصدق ہو گئے اور ۵۷ اشخاص اور ۵۵ گھوڑے زخمی ہوئے۔ جلالت مآب نے اس موقع پر حسب معمول شاہانہ عزم و استقلال ظاہر فرمایا کسی قسم کا خوف یا اضطراب آپ کے چہرہ مبارک پر ہویدا نہ ہوا۔ اور اسی تمکنت اور جلال کے ساتھ گاڑی پر ہو کر اپنے جمال کے شائقین کو جو ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں شفقت پدرانہ سے سلام کرتے ہوئے محل سرا کو تشریف لے گئے۔ (۴۳۶، ۴۳۷)

شمار	اخبار و مقام	زمانۂ اجراء	زمانۂ تحریر	نمونہ عبارت
نمبر ۵	دبدبہ سکندری ریاست رامپور روہیل کھنڈ ہفتہ وار ایڈیٹر حال مولوی فضل حسن صابری	۱۲۸۳ھ ۱۸۶۷ء	میلاد رسول نمبر ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء نمبر (۱۰) جلد (۵۹)	مسلمانوں میں ایک دھوم مچی ہے کہ سلطان کونین رسول ثقلین حضرت سیدنا احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ و اصحابہ وسلم کی رونق افروزی دنیا کا یہ مبارک مہینہ ربیع اول شریف ہے گھر گھر جشن میلاد منایا جارہا ہے اور اس کے انوار و برکات سے حاضرین مستفید ہوتے ہیں لیکن اب یہ بہت

چرچا ہونے لگ گیا ہے کہ فلاں جگہ کیا تقسیم ہوگا ایا لڈو یا بالوشاہیاں یہ ہے ہم لوگوں کے صفت ایماں

کی دلیل ہے اگر سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم سے خلوص ہے تو حضور پُرنور کے جشن میلاد میں بصد خلوص حاضر ہو کر مودب بیٹھیں اور آہستہ آہستہ درود شریف پڑھتے رہیں اور یہ خیال رکھیں کہ ہمارے شہنشاہ ذی جاہ احمد مختار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ الاصحاب اس مجلس نورانی میں بنفس نفیس تشریف فرما ہیں ادب کا بہت اہتمام رکھیں کہ ادب نے سب کو کامیاب کیا ہے ممکن نہیں کہ تمہارا درود بہ تہدیہ سعادت سے باریاب نہ ہو اور اصل یہ ہے کہ یہی ہر یہ سعادت تمہاری دین و دنیا کی مشکلات حل کر سکتا ہے حضرت سفیان ثوری اپنے دروازے پر کھڑے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ ایک نوعمر شخص ہے جو سراہ چلا جاتا ہے مگر قدم جب زمین پر رکھتا ہے اور جب اٹھاتا ہے تو اول بصدق دل کہتا ہے اللہم صل علی سیدنا محمد وعلی آل سیدنا محمد۔ آپ کو حیرت ہوئی دریافت فرمایا بجواب ملاکہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میری ماں کو حج کا شوق ہوا میں ان کے ہمراہ چلا آخر کار منزل مقصود تک پہونچا وہاں جاکر ایک جگہ قیام کیا۔ یہیں ماں کو ایک مرض لاحق ہو گیا پیٹ پھول گیا منہ سیاہ پڑ گیا مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شامت اعمال کا نتیجہ اور مصیبت کا نمونہ ہے میرے بدن پر لرزہ آگیا۔ کانپ رہا تھا اور رو رو کر زاری میں عرض کر رہا تھا کہ الٰہی تیری رحمت بہت وسیع ہے تو غفور و شکور ہے تیرا نام رحمٰن و رحیم ہے اپنے فضل و کرم سے میری ماں کو اچھا کر دے اور اس کے گناہ عفو فرما۔ سجدے میں سر تھا تضرع و زاری کر رہا تھا کہ ابر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس میں ایک شخص نہایت سفید لباس زیب تن فرمائے ظاہر ہوئے انھوں نے میری ماں کے چہرہ پر ہاتھ پھیرا جس سے میری ماں کا جسم مثل چودھویں رات کے چاند کے چمکنے لگا۔ میں نے اس تعجب خیز واقعہ کو دیکھ کر عرض کیا کہ آپ کون ہیں آپ کا کیا نام ہے آہستہ سے فرمایا کہ میں تیرا نبی ہوں میرا نام محمدؐ ہے یہ سُن کر میں نے بصد شوق عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ کچھ ہدایت فرمائیے۔ [1]

---

[1] تاریخ نثر اردو (احسن مارہروی)

عہد واجدی کے مطبوعات وکتب

اب ہم ایک مختصر اور سرسری جائزہ عہدِ واجدی کے مطبوعات کا لیں گے۔ اس دور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی، سرکاری اور قانونی کتابوں کا نیز دوسری فنی اور علمی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کراتی ہے، وہاں دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وقت کے اہلِ علم وادب، عام اس سے کہ مسلمان ہوں یا ہندو یا انگریز، اُردو میں کتابیں لکھتے ہیں، یہ کتابیں مذہبی بھی ہیں اور ادبی بھی، افسانے وقصص بھی ان میں شامل ہیں اور حکایت وخطوط بھی، عدالتوں کے فیصلے بھی، استغاثہ کی درخواستیں بھی

اس عنوان کے ماتحت جن مطبوعات وکتب کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ زیادہ تر عہدِ واجدی سے یا ان کی معزولی کے بعد، ان کے عہد کے لوگوں کے قلم سے نکلی ہیں، اس مواد سے اچھا خاصا اندازہ اس دور کے کلچر کا ہو جاتا ہے۔

(۱)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۱	مجمع القوانین	عمال سلطنت ایسٹ انڈیا کمپنی	۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۳ء مطبوعہ ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۶ء	فہرست بابوں اور فصلوں کی باب اوّل بیچ ذکر تقرر دیوانی عدالتوں کے اور ان کے حدود، علاقہ اور اختیاروں کے باب دوم درباب مفتی وپنڈت واہلِ عملہ ووکلا عدالت ومقدمات مفلسی واسٹامپ کے تیسرا باب درباب تجاویز اور فیصلہ مقدموں کے

دیباچہ

مخفی نہ رہے کہ یہ کتاب موسوم بہ مجمع القوانین دیوانی ترجمہ کی گئی ہے، زبان انگریزی سے اُردو میں حسب الحکم گورنمنٹ کے اور باب دیوانی کے جتنے قانون اور قانون گورنمنٹ اور صاحبان صدر دیوانی عدالت ملک غربی اور شرقی کے جتنے احکام سرکیولر (سرکلر) اور کنسٹرکشن یعنی تفاسیر قوانین کہ شروع ۱۷۹۳ء سے آخر ۱۸۴۳ء تک صادر نافذ ہوئے ہیں اور بعرص نسخ میں آئے ہیں، وہ سب ان میں مندرج ہیں، اور یہ تمام قانون اور احکام منقسم ہیں، سات باب پر اور ہر باب مشتمل ہے او پر چند فصلوں کے اور علاوہ ان کے کچھ اور احکام دباب پٹہ اور پٹنی تعلقوں اور باقیات زربھیج (ادخال یا ارسال مال گزاری) کے اور درباب قرقی اور نیلام کے بعلت باقیات زربھیج ہوا کرتے ہیں، آخر کتاب میں بطریق ضمیمہ لکھ دیئے گئے ہیں۔ اس واسطے کہ اکثر مقدمات دیوانی میں ان کا کام پڑتا ہے اور جاننا ان کا ضروریات سے ہے اور احکام کے متعلق اشامپ اور رجسٹری دستاویزات ہیں وہ بھی انھیں حکموں کے ساتھ ضمیمے میں داخل ہیں اور تمام تفاسیر قوانین اور احکام سرکیولر کہ بالاشترک دونوں صدروں سے تاریخوں مختلف پر صادر ہوئے ہیں ان کے آخر میں دونوں تاریخیں جدی جدی بہ ثبت الفاظ صدر غربی و صدر شرقی لکھ دیئے ہیں لیکن جو حکم دونوں صدر کے کہ تاریخ واحد رکھتے ہیں ان کے آخر میں یہ الفاظ نہیں لکھے ہیں اس لئے کہ ان میں کچھ خصوصیت اس طرح کی نہیں اور حکم کہ خاص ایک ہی صدر سے نافذ ہوئے ہیں ان میں حوالہ خاص اس صدر کا مرقوم ہے۔ اور ایک فہرست تمام قانون کی بقید دفعہ و ضمن اور تمام سرکیولروں اور تفسیروں کے بقید تاریخ دلبر شروع کتاب میں لکھ دیئے گئے ہیں کہ ہر حکم عندالضرورت بآسانی اور جلدی سے نکل آوے اور تلاش کرنے والے کو دقت نہ پڑے اور آخر میں کچھ اصطلاحات انگریزی باب دیوانی کی مع ترجمہ اُردو ملحق ہیں، فقط

تبصرہ وکیفیت:۔ انگریزی عملداری میں قانون کی یہ پہلی کتاب ہے جو سرکاری حکم سے

اُردو میں ترجمہ کی گئی ۔ اگرچہ اس کے الفاظ کی ترکیب بھی ماقبل تالیفات کی طرح مربوط و پختہ نہیں تاہم بیان کی صفائی اور عبارت کی سلاست پچھلے نمونوں سے بہتر حالت میں ہے ۔

اس دیباچہ کے اندر یہاں سے یہ امر بھی واضح ہوتا ہے کہ اس عہد میں اجہاں (بیچ ذکر تقریر) داخل کتابت تھا وہاں اس کا مترادف (در باب تجاویز) بھی استعمال میں آتا تھا ۔ اسی طرح (اوپر) اور (پر) بھی بیک وقت شامل روزمرہ تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترک و اصلاح کا سلسلہ اسی وقت سے جاری ہو گیا تھا ۔ اب سے پہلے عموماً اس زبان کو ہندی اور ریختہ کہتے ہیں ۔ مگر اس تالیف میں اُردو کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے [۱]

(۲)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۱۳	داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی	سید انشاء اللہ خان انشا	۱۸۰۳ء ۱۲۱۸ھ	ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات آپ کے دھیان میں چڑھ آئی کوئی کہانی ایسی کہیے جس میں ہندوی (اردو) چھٹ اور کسی بول کی پٹ [۲] (آمیزش) نہ ملے تب جاکے میرا جی پھول کی کلی کے روپ سے کھلے باہر کی بولی اور گنواری کچھ اُس کے بیچ میں نہ ہو آپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی بڑے پڑھے لکھے پرانے دھرانے بوڑھے گھاک یہ کھڑاگ لائے سر ہلا کر منہ تھتھا کر ناک بھوں چڑھا کر بگلا بھگلا کے لال لال آنکھیں پھرا کر لگے کہنے یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی ہندوی

---

[۱] تاریخ نثر اُردو احسن مارہروی ، صفحہ ۸۳ - ۸۵

[۲] رسالہ اردو میں پٹ کی جگہ بیٹ ہے اور آب حیات میں پٹ ہے ۔ ہمارے خیال میں پٹ زیادہ موزوں ہے ۔

پن بھی نہ نکلے اور بھاکا پن بھی نہ ٹھس جائے جیسے بھلے لوگ اچھوں سے اچھے آپس میں بولتے چالتے ہیں۔ جوں کا توں وہی ڈول رہے اور چھاؤں کسی کی نہ پڑے یہ نہیں ہونے کا میں نے ان کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹہوکا کھا کر جھنجھلا کر کہا میں کچھ ایسا انوکھا بڑبولا نہیں جو رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کر انگلیاں نچاؤں اور بے سری بے ٹھکانے کی الجھی سلجھی باتیں کیے جاؤں مجھ سے نہ ہو سکتا تو بھلا منہ سے کیوں نکالتا جس ڈھب سے ہوتا اس بکھیڑے کو ٹالتا اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے۔ اور جیسا کچھ لوگ اسے پکارتے ہیں (انشاء اللہ) کہہ سناتا ہے۔ دہنا ہاتھ منہ پر پھیر کر مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوں اور آپ کو جتاتا ہوں جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور راؤ چاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں جو دیکھتے ہی آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل اور اچپلاہٹ میں ہرنوں کے روپ میں ہے اپنی چوکڑی بھول جائے۔

چوتکا (رباعی)

گھوڑے اپنے پہ چڑھ کے آتا ہوں میں — کرتب جو ہیں سو سب دکھاتا ہوں میں
اس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی — کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں

تبصرہ و کیفیت اس داستان کا مختصر نمونہ تذکرہ آبِ حیات میں شائع ہو چکا ہے انجمن ترقی اردو کے فاضل آنریری سکریٹری نے اس کی مکمل نقل حاصل کی۔ جس کو انھوں نے اپریل ۱۹۲۶ء کے رسالے اُردو میں چھاپ دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ سید انشاء اللہ خاں کی وہ داستان جس میں ایک لفظ بھی عربی فارسی کا نہیں آنے دیا مشہور تو بہت ہے مگر ملتی کہیں نہ تھی۔ آخر ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی پرانی جلدوں میں اس کا پتہ لگا۔ مسٹر کلنٹ پرنسپل لا مارٹین کالج لکھنؤ کو اس کا ایک نسخہ موتی محل لائبریری میں دستیاب ہوا تھا جسے انھوں نے سوسائٹی کے رسالہ میں طبع کرا دیا۔ ۱۸۵۲ء میں ایک حصہ طبع ہوا اور دوسرا حصہ ۱۸۵۵ء میں۔

اس میں شک نہیں کہ اس میں عربی فارسی کا کوئی لفظ نہیں آتا۔ لیکن اس زمانے کے لحاظ سے زبان ایسی صاف نہیں جیسا کہ دعویٰ کیا گیا ہے بہرحال سید انشاء اللہ مرحوم کی جو اپنی

جس خوبیوں کے لحاظ سے یکتا تھے ایک عجیب یادگار ہے جس کا محفوظ رکھنا ہمارا فرض ہے [1]

(۳)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تالیف	نمونہ عبارت
نمبر ۱۹	فسانۂ عجائب	مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی	۱۲۴۰ھ ۱۸۲۴ء	ناگاہ ایک روز موکبِ وکیمپ حشمت وجلال بافر وشان وشوکت کمال ایک صحرائے بلاغ وبہار دشت لالہ زار میں ہوا فضائے صحرا قابل تحریر کیفیت وسعت گلشن آسا لائق تحریر بو باس ہر برگ وگل کی رشک مشک اذفر صفحہ بیابان معنبر ومعطر چشموں کا پانی صفا میں آب گہر سے

آبدار تر بذائقہ میں بہ از شیر وشکر چلنے کے جاڑے کڑاکے کی سردی تھی گویا زمین سے آسمان تک سیخ بھر دی تھی، پرند اور چرند اپنے اپنے آشیانوں اور کاشانوں میں چھپے ہوئے بیٹھے بھوک اور پیاس کے صدمے اٹھاتے تھے دھوپ کھاتے باہر نہ آتے تھے قصے سے تھرتھراتے تھے۔ سردی سے سب کا جی جلتا تھا دم تقریر ہر شخص کے منہ سے دھواں دھار دھواں نکلتا تھا آواز کسی کی کسی کے کان تک کم جاتی تھی، منہ سے بات باہر آئی اور جم جاتی تھی مارے سیاہ اوس چاٹنے باہر نہ آتا تھا سردی کے باعث دم دبا کے پانی ہی میں بھاگ جاتا تھا، زمانے کے کاروبار میں خلل تھا، ہر ایک دست در بغل تھا شمع انجمن لگن تک گرتے گرتے اولا تھا، پروانوں نے گرد پھرتے پھرتے ٹٹولا تھا۔ ہر سنگ کے سینے میں آگ لگی تھی گو وہ شرری شرر تھا لیکن سردی کو بھی یہ لاگ تھی اور جاڑے کا یہ اثر تھا کہ سلیں کی سلیں جمی پڑی تھیں، فولاد سے زیادہ کڑی تھیں، تنور فلک چارم (سورج) کی چھاتی سرد تھی لگ جن میں بر ودت تھی کہ کشمیر گرد تھی، اُنھوں نے بیڑ کڑی، لوٹے لولوں کے ہاتھ آئے۔ لنگڑے ہرن باندھ لائے، ہر زمین نہ میں مرغے نہ چلتے تھے۔ زندوں کے ہاتھ پاؤں گلتے تھے، آتش رخسار گل شبنم نے بجھائی تھی، باغ میں بھی جاڑے کی دہائی تھی۔ اوس برگ و

[1] تاریخ نثر اردو، صفحہ ۹۵ - ۹۷

بارکی صنعت پروردگار کی دکھاتی تھی، مرصع کاری یک لخت نظر آتی تھی، دانہ ہائے اشک شبنم خواہ بڑے یا ریزے تھے ہر شجر کے پتے اور شاخ میں الماس اور موتیوں کے روینے تھے اس سردی کا کہیں ٹھکانہ تھا حمام تہہ خانہ کا خس خانہ تھا آگ پر لوگ جی نثار کرتے تھے زردشت کا طریق اختیار کرتے تھے، اس زمانہ میں جاڑے کی یہ ترقی تھی کہ آج تک بتوں کی سرد مہری نہ گئی جاڑے میں ہر ایک المست تھا عالم اللہ کا آتش پرست تھا یہاں تک جاڑے کا زور شور عالم گیر ہوا تھا کرہ نار میر یر ہوا تھا جان عالم نے فرمایا آج خیمہ ہمارا یہیں ہو لہ

(۴)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۲۰	مجموعہ قوانین مطبوعہ مطبع نور الابصار آگرہ ۱۸۶۴ء	مرتبہ سدا سکھ لال	۱۲۴۹ھ ، ۱۸۳۴ء	مجموعہ قوانین ایکٹ ہائے سوپریم گورنمنٹ ۱۸۳۴ء سے لغایت ۱۸۵۶ء جو آخر ۱۸۶۳ء میں نافذ تھے۔ دیباچہ مجموعہ قوانین کی جلد اول ۱۷۹۳ء سے ۱۸۳۴ء تک مرتب ہو کر ۱۸۶۴ء میں طبع ہوئی اب یہ جلد ثانی متضمن ایکٹ ہائے غیر منسوخہ کی سن ابتدائے ۱۸۳۴ء لغایت ۱۸۵۶ء مع جلد ثالث من ابتدائے ۱۸۵۶ء

لغایت ۱۸۶۰ء و جلد رابع من ابتدائے ۱۸۶۱ء لغایت ۱۸۶۳ء تضمین جملہ ایکٹ ہائے غیر منسوخہ مروجہ ممالک مغربی و شمالی چھاپ کر شائع کی جاتی ہے ان جلدوں میں بعض ایکٹ متعلقہ بنگالہ اور سوپریم کورٹ گو کہ وہ متعلق ممالک مذکور نہیں ہیں مگر بایں نظر کہ ترجمہ ان کا کسی خاص وجہ سے اردو گورنمنٹ گزٹ ممالک مغربی و شمالی میں چھپا تھا داخل کئے گئے۔

لہ تاریخ نثر اردو (صفحہ ۷۰، ۷۱) (صفحہ ۱۰۳، 105)

ہیں۔ فائدے اس تالیف کے ایسے نہیں ہیں کہ احتیاج ان کے بیان کی ہو فی الواقع یہ حسب بدیں آئینہ نمائے انتظام جملہ سررشتہ ہائے سلطنت عظیم الشان سرکار دولت مدار انگلشیہ کی ہیں ان کے دیکھنے سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ہر باب میں کتنے قوانین مجاریہ وقت ہیں اور کتنے منسوخ ہو گئے۔ واضح ہو کہ مصنف نے ترجمہ اردو میں کردہ مسلمہ گورنمنٹ اور مندرجہ گزٹ سرکاری تھا کچھ تصرف نہیں کیا ہے اگر بہ نظر سرسری کسی مضمون میں اصل انگریزی سے اختلاف صریح پایا اس کو اسی اصل کے مطابق بہ ثبت نشان ذیل صفحے میں مرقوم کیا ہے اور جو ایکٹ منسوخ یا مرمم یا منقضی المیعاد یا ایکٹ کی دفعات منسوخ یا مرمم کر در تنا ترتیب داخل ہو گئی تھیں ان کی فہرست بحوالہ احکام ناسخ یا مرمم صفحہ مابعد میں درج کی جاتی ہے اور جو قوانین متعلقہ دیگر پریسی ڈنسی یا سوپریم کورٹ یا خاص بنگالہ ہیں ان کی تاریخ صدور کے بعد صرف حوالہ نام اس پریسی ڈنسی کا یا سوپریم کورٹ یا خاص بنگلے کا لکھ دیا ہے۔ ایکٹ نمبر (۱) ۱۸۴۳ء ولایت ہند نواب گورنر جنرل بہادر کے حضور سے کونسل کے اجلاس میں ۲۰ نومبر ۱۸۴۳ء میں صادر ہوا[1]

(۵)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۳۸	قصۂ گل صنوبر	نیم چند کھتری	۱۲۱۸ھ، ۱۸۰۳ء	ٹائیٹل پیج زبان فارسی سے زبان اردو میں ترجمہ کیا ہوا نیم چند کھتری کا نام سے بابو گوربچرن کے نواب مستطاب لارڈ جارج الگنڈ صاحب بہادر دام اقبالہ کے عہد میں۔ داتارام برہمن کی تصحیح سے چھاپا گیا۔

نمونہ متن

بعد ازاں فقیر حقیر رضائے الٰہی پر خرسند نیم چند یوں لکھتا ہے کہ اس عالم ناپائدار میں کسی

[1] تاریخ نثر اردو، صفحہ ۱۰۵، ۱۰۶

چیز کو قرار نہیں۔ اور ہستی پہ سب کا مدار ہے اس کی ذات لازوال کے واسطے بقا اور باقی سب فنا ہے۔ مگر ایک گلستان سخن کو خزاں جہاں اس کے گلوں پہ نہیں آتی بیوروں کی چوری اور رہزن کی سرشوری یہ دولت کہیں نہیں جاتی چمن اس کا ہمیشہ تازہ و خرم رہتا ہے اور اس کی نہروں میں زلال زندگی بہتا ہے اس کی مکان کی نیو کو حادثہ کے بھونچال کا کچھ خطرہ نہیں ہوتا۔ [1]

(۶)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۱۳	تاریخ افغانستان	سید فدا حسین عرف نبی بخش	۱۲۵۵ھ ۔ ۱۸۳۹ء	امابعد یہ آوارہ عاجز ناکارہ دور ماندہ و دور افتادہ سید فدا حسین عرف نبی بخش بخاری الحیدری نسب علاقہ روزگار سرکار انگریزی میں بہ عہدہ جمعداری ترک سواروں میں ملازم ہوا تھا، زمانہ ناہنجار کہ ہر دفعہ بازی تازہ بروئے کار لاتا ہے اور شعبدہ نیا اٹھاتا ہے۔ چنانچہ صاحبان عالی شان کو بہ حمایت شجاع درانی بادشاہ

کابل کے مہم اس ملک کی اور بادشاہ کرنا اس کا مصمم ہوا اور رسالہ ہمارا مقام چھاؤنی میرٹھ سے اس مہم میں مقرر ہوا، عاصی بھی چار و چار بندگی وبے چارگی مثل مشہور ہے سب دوست و بیگانہ سے رخصت ہو کر مستعد و آمادہ سفر ہوا۔ تاریخ ۳ ماہ نومبر ۱۸۳۶ء مطابق ۲۵ شعبان ۱۲۰۰ھ کو شاہ جان آباد سے دو تین منزل آگے گئے تھے کہ قضائے الٰہی سے بیماری ہیضہ وبا کی فوج میں پڑ گئی اب پھر آیا میں اوپر مطلب اپنے کے عرض بیچ خدمت سامعان کتاب کے یہ ہے کہ دس ہزار فوج لڑائی پر گئی۔ سب ماری گئی۔ سات ہزار آدمی وہاں سے بچ کر آئے، اور باقی وہیں مدفون ہوئے۔ [2]

[1] تاریخ نثر اردو صفحہ ۱۰۸
[2] تاریخ نثر اردو، صفحہ ۱۱۰، ۱۱۱

(۷)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۲۴	ترجمہ فقہ اکبر	نقی سعید اللہ اسعدی کاظہوری	۱۲۳۵ھ ، ۱۸۲۰ء	یہ کتاب ہے اصل توحید اور اعتقاد صحیح کے بیان میں، واجب ہے ہر مسلمان پر کہ کہے صدق دل سے یقین لایا میں اللہ پر اور اس کے سب فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور جِلا اٹھانے پر پیچھے مرنے کے اور خیر و شر کی تقدیر پر کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہے اور حساب ہونا تمنا اعمال

کا قیامت میں اور بہشت اور دوزخ سب حق ہے اور اللہ تعالیٰ ایک ہے عدد سے نہیں پر اس راہ سے کہ اس کا کوئی ساجھی نہیں۔

(۸)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۲۵	عجائب القصص	حکیم حسن اللہ خاں و فخر الدین حسین دیا حیم، نوبین، سید باقر حسین ولد سید رشید علی نقی خاں مرحوم	۱۲۵۷ھ ، ۱۸۴۱ء	بعد حمد ایزدِ منّان اور نعت و منقبت رسول آخر الزماں الجدخوان دبستان دانش و شعور معتصم بذیل رسول الثقلین محمد فخر الدین حسین نقش پرداز اس دیباچے کا بیچ بیان سبب تالیف اس کتاب فیض نصاب کے گزارش کرتا ہے اوپر خاطر خطیر ارباب عقل و تمیز کے پوشیدہ نہ رہے کہ تحریک سلسلہ انجام اس کام کی

بہ وساطت دست و قلم سیاست مرتبت نجابت منزلت سید باقر حسین خلف رشید علی نقی خاں کے عمل میں آئی اور اس بزرگوار شائستہ کردار نے بمشاطگی ذہن سلیم و فکر مستقیم عرائش مضامین

اس کتاب کو پیرایہ پوش زبان اردو سلیس سے آرائش دی۔

(۹)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۱۳۱	ہدایت نامہ مال گزاری	ولیم میور سکریٹری صدر بورڈ و منشی فیض احمد	۱۸۴۶ء، ۱۸۵۱ء	ہدایت نامہ مال گزاری کا حصہ دوم مجاریہ گورنمنٹ ممالک مغربی اور شمالی ترجمہ کیا ہوا ولیم میور صاحب سکریٹری صدر بورڈ مغربی و شمالی بہ استعانت فیض احمد منشی اول سکندرہ (آگرہ) کے یتیموں کے مطبع میں چھپا فہرست مختصر ایکٹ بابت ۱۸۵۱ء اور احکام ممالک مغربی کے

موضوع واسطے ترمیم قانون ۱۳ سنہ ۱۸۰۳ء منجملہ مجموعہ قوانین بنگالہ جو اپیل کے مقدمہ کے باب میں مقرر ہے۔

واضح ہو کہ عدالت دیوانی صدر ممالک مغربی متعلقہ قلمرو فورٹ ولیم بنگالہ جو بطرز حال موضوع ہے۔ اس میں صرف تین حاکم مامور ہیں اور اس باعث سے مجموعہ بنگالہ کے قانون ۱۳ سنہ ۱۸۰۳ء اور ایکٹ نمبر ۲ سنہ ۱۸۴۳ء کے رو سے اس حالت میں اپیل کی منظوری نہیں ہو سکتی جبکہ فیصلہ جس کی نارضی سے اپیل ہو محکمہ مذکور کے کسی حاکم کی تجویز

بسے صادر ہوا ہو پس مقتضائے مصلحت ہے کہ قانون مذکور اصلاح پاوے۔ لہٰذا حسب ذیل حکم ہوتا ہے عدالتیں دیوانی صدر متعلقہ قلمرو فورٹ ولیم بنگالہ کی کسی عدالت کے تین حاکموں میں سے کوئی حاکم جو بغرض سماعت اور تجویز کسی مقدمہ اپیل کے جلسہ کرے اس باعث سے اپیل کے سننے اور تجویز کرنے سے ممنوع نہ ہوگا کہ اس نے محکمہ ماتحت میں اس فیصلہ کو خود صادر کیا تھا جس سے اپیل کی ہوئی ہے۔ ؎ۡ۱

(۱۰)

شمارہ	تصنیف	مصنف	تصنیف سنہ	نمونہ عبارت
نمبر ۳۲	تقطیع الشعرا	امام الدین طالب	۱۲۶۲ھ ۱۸۴۶ء	بنا اس کے اوپر دو اصل اور چند فرع کے لئے اصل پہلی بیچ بیان علم عروض کے کہ اس میں ایک مقدمہ اور پانچ فرد ہیں۔ مقدمہ جان تو اکہ شعر کے معنی لغت میں گفتگو بازنان

کردن ہیں اور اصطلاح میں اہل بلاغت کی کلام موزوں مقفیٰ کو کہتے ہیں کہ قصداً متکلم سے سرزد ہو۔ دگرنہ اس کو شعر نہ کہیں گے جیسے آیتیں قرآن کی کہ موزوں ہیں۔

تبصرہ وکیفیت فنون لطیفہ میں شعر وشاعری کے متعلق ابتدا بہت کم کتابیں تالیف ہوئی ہیں اور چونکہ اُن سے اکثر اہلِ مذاق واقف ہیں اس لیے زیادہ نمونوں کے لکھنے کی اس خصوص میں ضرورت نہیں۔ اس کتاب سلطان المطابع لکھنؤ میں بہ اہتمام داروغہ مددعلی ۱۲۶۶ھ ، ۱۸۵۰ء میں چھاپی گئی ہے۔ ؎۲

۱؎ تاریخ نثر اردو (احسن مارہروی) صـ ۱۹۰   ۲؎ تاریخ نثر اردو صـ ۱۲۲

(۱۱)

نمونہ عبارت	سنہ تصنیف	مصنف	تصنیف	شمار
فوج کشی کرنا ہارس کا سر ریکنگٹن پر بموجب حکم لارڈ مارنگٹن بہادر اور مشورے ابو القاسم خاں شوستری اور شیر الملک بہادر دیوان حیدر آباد کے لڑائیاں واقع ہونی سلطان اور اس سپہ سالار کے درمیان مسخر ہو جانا دار السلطنت کے قلعہ کا شہید ہونا، سلطان (حیدر علی) کا جو سنہ ۱۲۱۳ھ میں واقع ہوا۔ ان دونوں سلطان عالی مقام نے (جو ملکی کاموں کو بے صلاح و مشورہ انجام کیا کرتا اور اس	۱۲۴۳ھ، ۱۸۲۸ء	ترجمہ شیخ احمد علی گوپاموی	حالات حیدری اور انگریزی حیدری یعنی جنگنامہ نواب حیدر علی والی میسور	نمبر ۲۵

باب میں خیر خواہوں کا کہنا سننا اس کی جناب میں مقبول ہوتا تھا دو سفیر تحفے ہدیوں سمیت ایک کو زمان شاہ کے پاس مرحمت خط محبت خط بھیج کر آئیں دوستی تازہ کیا اور دوسرے کو سلطان روم کے حضور میں روانہ کیا۔ اس عرصہ میں مورس بندر سے کئی فرانسیس جن کا موشیر لوسی سرغنہ تھا حضور میں آن پہنچے چونکہ انگریز اور فرانسیس کے درمیان سات برس سے ان کی ولایتوں میں جنگ و حرب کا ہنگامہ برپا ہو رہا تھا اس لئے یہاں ان فرانسیسیوں کے وارد ہونے سے انگریزوں کے دل میں دھڑکا پیدا ہوا چنانچہ ان لوگوں نے ڈر کر سلطنت خداداد کی بیخ کنی کے لئے تدبیریں کیں اور فرانسیس کو اپنی چڑھائی کرنے کا بہانہ ٹھہرایا۔ شیر الملک اور میر عالم کی صلاح سے شرح واقعہ روداد لارڈ مارنگٹن بہادر کے پاس جو کلکتہ میں تھا لکھ بھیجا۔ لارڈ ممدوح تو ایسی فرصت کے وقت کا طالب ہی تھا۔ جھٹ پٹ گورے کی چار پلٹنیں ہمراہ لے شعبان کے مہینہ میں مدراس میں داخل ہوا۔ اور یہاں سے اس نے فوجیں اکٹھی کر کے جنرل ہارس کے ساتھ سری مارٹنگٹن سمیت آ کر جنرل مذکور سے ملحق ہو گئے اور میر عالم آٹھ ہزار سوار ساتھ لے

اور روشن رائے معہ چہ پلٹن انگریزی کی فوج میں آملے۔ اب لارڈ موصوف نے اتمام حجت کے لیے حضور میں سلطان کے پے در پے کئی مکتوبات اس مضمون کے بھیجے کہ اتفاق اور دوستی کے آئین میں عہد شکنی پر کمر باندھنی جائز نہیں۔ مقتضا محبت خلوص کا تو یہ ہے کہ پہلے تو ان کی فرانسیس تازہ واردوں کو اس مخلص کے حوالے فرمائیے اور دوسرا التماس یہ ہے کہ انگریز بہادر کی طرف کا وکیل بارگاہ سلطان میں حاضر رہا ہے اور تیسرا یہ کہ کوٹہ یال بندر منگلور، تھاور وغیرہ قلعے جو جہازوں کے آنے جانے کی جگہ ہیں سرکار انگریز بہادر کو چھوڑ دیجیے۔

(۱۲)

شمار	تصنیف	مصنف	تصنیف سنہ	نمونہ عبارت
نمبر ۳۴	[illegible] التواریخ سلطانی	مرزا حسن علی بیگ [illegible] لکھنوی	۱۲۱۲ھ ، ۱۷۹۸ء	روایان اخبار و حاکیان آثار متفق ہیں کہ پہلے جس نے گلزار بے ثبات میں روش سلطنت نکالی تخت و تاج کی بنا ڈالی عدل و داد کا رواج دیا محصول و خراج لیا وہ کیومرث تھا۔ بیٹا اس کا سامک نام تھا اس کو عبادت کے سوا اور نہ کچھ کام تھا۔ دیو نے اس کو مارا۔ کیومرث کو بہت قلق ہوا، ہوشنگ سیامک کا بیٹا تھا۔ اس نے باپ کے خون کا بدلہ لیا دیو کو قتل کیا، ۳۰ برس

کیومرث نے سلطنت کی پھر دارِ فنا سے رحلت کی۔ بقولِ فردوسی ہے اس نام کی تحقیق میں کیومرث کاف فارسی اخیر تائے فوقانی اور ائمۂ اخبار امام غزالی نے اس وادی سے رم کیا ہے۔ بزرگ ترین اولاد صلبی آدم لکھا ہے۔ بعضے کہتے ہیں ولیم بن لاذین سام بن نوح ہے اور مصنف روضۃ الصفا لکھتا ہے کہ یافث بن نوح کا بیٹا ہے اور اس کو عام عجم کیومرث کہتے ہیں اور علمائے مجوس آدم اس کو جانتے ہیں۔ کلشاہ کہہ کے مانتے ہیں ہزار برس کا سن اور چالیس برس سلطنت کے دن۔

کیفیت اس نمونے کا انتخاب سیر المصنفین جلد اول مولفہ مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا سے کیا گیا ہے۔ بقول ان کے اس کتاب میں (۱۹۶) صفحات ہیں اور دو مہینے میں یہ ترجمہ ختم کیا گیا ہے اور پہلی مرتبہ ۱۸۵۷ء میں مطبع نول کشور سے اس کی طباعت ہوئی ہے۔[۱]

(۱۴۳)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۲۱	موضح البیان حصہ اول مطبوعہ	مولوی کریم الدین دہلوی	۱۲۶۸ھ ۱۸۵۱ء	دو برس سے مجکو یہ خیال تھا کہ چونکہ سرکار گورنمنٹ پریسیڈنسی آگرہ کا ارادہ اردو زبان کی ترویج اور پھیلانے کا ہے تو اس ارادے کی تائید کے واسطے تو بھی کوشش کرو گرچہ سرکار عالی مقدار کے دربار میں مجھ جیسے بے شمار ہیں اور مثل بھی مشہور ہے نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے پر تب

بھی چونکہ نمک خوار اس سرکار فیض آثار کا ہوں اور مدرسے آگرے میں جو کہ مقام اشاعت علوم وفنون کا ہے مدرس اول اردو کہلاتا ہوں، اگرچہ بالتصریح ملعمہ اس اشاعت کا نہیں ہوا ہوں پر حقیقت میں ارادے سرکار کے بر لانے میں جو کہ میرے عہدے سے تعلق اور لگاؤ رکھتا ہے، ضمناً مامور ہو گیا ہوں جس طرح سے ہو سکے کوشش کروں یہ سوچ کر یوں ٹھہرائی کہ مبتدیوں اور نو آموزوں کو اس زبان کی طاقت بروقت ہونے اس کے قواعد کے ہو سکتی ہے اور سوائے اس کے کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کیونکہ جب جڑ ہی مضبوط نہ ہوگی تو پھل پھول کس طرح سے لگیں گے۔[۲]

---

[۱] تاریخ نثر اردو (احسن مارہروی)، صفحہ ۱۲۸

[۲] تاریخ نثر اردو، صفحہ ۱۳۰

شمارہ	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونۂ عبارت
نمبر ۴۲	نسخۂ اندر سبھا	سید آغا حسن امانت لکھنوی	۱۲۶۸ھ ، ۱۸۵۱ء	سبب تالیف اندر سبھا بندہ خاکسار و ہیچ مداں آوارہ طبیعت سید آغا حسن متخلص بہ امانت کو شعر و سخن سے ہمیشہ سے ذوق تھا موزوں کرنے کا شوق تھا نوحہ سلام کرنے کا ورد تھا دل گیر کا شاگرد تھا القصہ انتہائے شوق طبیعت میں

ایک واسوخت عاشقانہ کہ مطبوع زمانہ ہے۔ طولانی بہ کمال فکر و جانفشانی کہا گیا اور مسجع قرار دے کر مجمع خلائق میں پڑھا گیا غل تعریف کا خوب ہوا سب کو مرغوب ہوا مشتاق خلقت ہوئی چھپ کر روانہ دور دور ہوا فضل خدا سے ہر شہر میں مشہور ہوا۔ بعد اس کے خانہ نشینی اختیار کر کے دن بھر گھر میں بیٹھ کر مرثیہ یا غزل کہتا تھا مگر دل میں در پردہ عشق کی آگ تھی طبیعت کو حسن سے لاگ تھی وضع کے خیال سے کہیں جاتا تھا نہ آتا تھا۔ زباں کی وابستگی سے گھر میں بیٹھے بیٹھے جی گھبراتا تھا ایک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی یگانہ ازلی رفیق شفیق مونس و غمخوار قدیمی جاں نثار شاگرد اول موزوں طبیعت متخلص عبادت عاشق کلام امانت انھوں نے از راہ محبت کہا کہ بیکار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے ایسا کوئی جلسہ ناٹک یا نقلیہ کے طور پر طبع آزاد نظم کیا چاہیئے کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہووے اور خلق میں شہرت ہووے آخر الامر موافق ان کی فرمائش کے بندہ اس کے کہنے پر آمادہ ہوا دم بدم شوق زیادہ ہوا چونکہ یہ جلسہ کہنا سب کو مرغوب تھا مگر اپنے نزدیک بہت معیوب تھا اس لحاظ سے اپنا تخلص اس میں استاد تخلص کیا لیکن لوگوں نے غزلوں کے سبب سے بندے کا کلام دریافت کر لیا غرض کہ چھوڑ دیا تاریخ شوال کی ۲۶ ۱۲ھ میں اندر سبھا اس جلسہ کا نام رکھ کر بجائے چار باب چار پریاں قرار دے کر شروع کیا شہرت گھر گھر ہوئی اہل محلہ کو خبر ہوئی دو شخص اس جلسے کی تیاری

بڑا دہ ہجوم حد سے زیادہ ہوتے رفتہ رفتہ بعد مزاول شہد و فساد اور حجت و تکرار کے
ڈیڑھ برس میں تیار جلسہ ہوا مگر اپنے نزدیک بیکار ہوا کہ کس مرض سے ایک درخت لگایا
آخر کو اس سے رنج کا پھل پایا خیر جو ہوا سو ہوا جو پھل پڑا تو یہ قول ہے

"تقدیر سے گلہ ہے کسی سے گلہ نہیں ہے"

(١٥)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونۂ عبارت
سنہ ١٢٤٨	کارنامۂ سال انفعال	[illegible]	١٢٨٥ھ / ١٨٦٨م	بیان مذمت ترک نماز کا سبب نوکری کے ... اکثر آدمی نماز اس طرح قضا کرتے ہیں کچہری میں نوکر ہوتے ہیں وقت نماز کے کچہری کے کام میں مشغول رہتے ہیں اٹھ کر نماز نہیں پڑھ لیتے سو نوکران کچہری دو قسم ہیں ایک حکام جیسے منصف صدر امین صدر الصدور ڈپٹی کلکٹر دوسرے عملے کے لوگ جیسے منشی سررشتہ دار محرر حکام کو اپنے کام میں اختیار ہوتا ہے جس وقت جی چاہے اٹھ

کر نماز پڑھ لیں کمال محرومی قسمت اور ضعیفت ایمان کی بات ہے کہ باوجود۔
اختیار اور عدم مانع کے نماز نہ پڑھے اور عملے کا یہ حال ہے کہ حاکمان زمانہ
صوم صلوٰۃ کے مانع نہیں ہیں۔ اور جو لوگ کہ نماز پر مستعد ہیں حالانکہ ... ذاتی
گیری وغیرہ پر جو روبرو حاکم رہنے کے کام میں مامور ہیں نماز قضا نہیں کرتے اور بوقت
آنے نماز کے موقع سے جا کر نماز پڑھ لیتے ہیں۔ سب مسلمان بھائیوں کو خدائے تعالیٰ توفیق

سنہ تاریخ نثر اردو ص ... احسن مارہروی

یہ کہ ایسے عذر کو حیلہ قرار دے کر نماز نہ چھوڑیں۔ ۵۵
(۱۶)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۵	رسالہ ہیضہ کا علاج	[illegible]	سنہ ۱۲[illegible]ھ ، سنہ ۱۸۵۳ء	سب زمینداروں اور دیگر لوگوں کو جن کے پاس یہ رسالہ پہنچے صاحب سپرنٹنڈنٹ بہادر کا سلام وہ مرض جس کا ذکر میں کرتا ہوں ہیضہ ہے یعنی اس کے معنی قے کرنا اور دست آنا ہے جس میں ہمیشہ کم بخش ڈرانے کی خاصیت رہتی ہے اور بہت عالم اور فاضل طبیب اس غرض سے کہ مرض مذکور کو روکیں اور باز رکھیں اور چنگا بھی کریں بڑی دل دہی سے اس کی خاصیت دریافت کرنے کو متوجہ ہوتے ہیں صاحبان موصوف اپنی خیر خواہ کوششوں میں یہاں تک کامیاب ہوتے ہیں کہ کمپنی بہادر کے لشکری ہسپتالوں اور ضلع کے جیل خانوں میں اور سرکاری دواخانوں اور دار الشفاؤں میں جہاں بیماری کی خبری حفاظت پہنچے کہ پہلے ہی حملے کے بعد جھٹ پٹ ہوتی ہے موت بہت ہی شاذ و نادر نظر آتی ہے اس میں دیری کرنا ہمیشہ خطرناک اور اکثر اوقات قاتل ہے۔

کیفیت: یہ دس صفحے کا رسالہ الہ آباد کے مشن پریس میں غالباً ایک مرتبہ طبع ہوا ہے کمیابی اور نایابی کے لحاظ سے بطور یادگار اس کا نمونہ لکھ دیا گیا ہے۔ ۵۲

(۱) تاریخ نثر اردو ۔۔۔
(۲) تاریخ نثر اردو صفحہ ۱۷۱

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
[illegible]	[illegible] انگلستان	[illegible]	[illegible]	جاننا چاہیے کہ زمانہ بوقلموں کیا ہر ایک کے فائدے اور نقصان میں [illegible] ہے جب پستی سے بلندی پر اور بلندی سے پستی اب [illegible] ہے حقیقت اس قوم کے عروج کی [illegible] ان آثار قدیمہ سے اس طرح بیان کی ہے کہ انگلستان کا ملک پہلے میں قوم گال یعنی فرانس کے متوطنوں سے آباد ہوا ہے چنانچہ اب تک اس قوم کے نشان اکثر ملک کے گرد کئی قبروں میں پائے

جاتے ہیں اور ان میں بعضی مشہور ان کی قدیم زبان بولتے ہیں اگلے قوموں میں کسی اور کو جزیرہ
کی خبر نہ تھی [illegible] اس وقت روم کے بادشاہ قیصر جولیس نے اس
پر عزیمت کی [illegible] اس قطعہ کو [illegible] اور وہاں کے متوطن علم و ہنر
سے عاری تھے [illegible] جانوروں کی پوستین پہنتے تھے اور بعضے ننگے اور ننگا
رہتے تھے [illegible] کو اکثر رنگوں سے رنگا
کرتے تھے [illegible] صحرائی جانوروں کے شکار پر [illegible] اس
[illegible] اس قوم میں [illegible]

نمونہ عبارت	سنہ تصنیف	مصنف	تصنیف	شمار
ہے سننے کے قابل یہ قصہ ندیم کہ ہر حرف اس کا ہے در یتیم دریائے گنگ کے کنارے پر ایک گاؤں سورج پور نام آباد تھا اور اس میں سانہا سال سے قوم راجپوت کثہ بنشی ٹھاکروں کا دخل اور قبضہ تھا کل رقبہ اس گاؤں کا پچیس سو بگیھہ تھا من جملہ اس کے ایک ہزار سات سو بگیھہ مزروعہ اور چار سو بگیھہ قابل زراعت چار سو بگیھہ بنجر غیر ممکن میں آبادی تھی اور ایک بڑا تالاب بھی اس گاؤں میں تھا اس گاؤں میں	سنہ ۱۲۷۲ھ م ۱۸۵۵ء	منشی [illegible] لال [illegible] تحصیلدار [illegible] ضلع [illegible]	قصبہ سورج پور (پہلا حصہ)	نمبر ۱۸

دو تھوک تھے ایک اروپے سنگھ کا اور دوسرا سوبے سنگھ کی زمین بستی سے پورب کی طرف اور روپے سنگھ کے تھوک کی زمین پچھم کی طرف تھی ان دونوں تھوکوں کی اراضی ایک دوسرے سے علاحدہ تھی لیکن سوائے اس کے چار بیگھہ دھرتی غیر ممکن دونوں کے شاملات تھی سوبے سنگھ کے تھوک میں ایک ہزار بگیھہ دھرتی مزروعہ اڑھائی سو قابل زراعت بھی ساڑھے بارہ سو روپے سنگھ کے تھوک میں سات سو بگیھہ مزروعہ ڈیڑھ سو بگیھہ قابل زراعت سب ساڑھے آٹھ سو بگیھہ دھرتی تھی جو کہ رقبہ اس گاؤں کا کچھ منقسم اور کچھ غیر منقسم اور کچھ شاملات دونوں تھوک کا تھا اس باعث یہ گاؤں از قسم پٹی داری غیر مکمل سمجھا جاتا تھا۔

تبصرہ اور کیفیت

۱۸۵۵ء کے غدر سے پہلے اردو کی ترویج یا اشاعت عامہ کے لئے گورنمنٹ کے ادارے اکثر ایسے چھوٹے چھوٹے رسالے جن سے دینی اور معاشرتی فوائد اہل ملک کو حاصل ہوں تقسیم کئے جاتے تھے یہ قصہ کہانیوں اور

ان پر دو زمینداروں کو پٹواریوں کی چالوں اور فریبوں سے بچانے کی غرض سے شائع کیا گیا تھا جس کو پڑھ کر نہ صرف کاشتکاری کے اصول و قواعد اور کاشت کی اقسام وغیرہ کا علم ہوتا ہے بلکہ اخلاقی حیثیت سے بھی بہت سی مفید باتیں معلوم ہو جاتی ہیں علی الخصوص پٹواریوں کی بدنام جماعت کے ہتھکنڈوں اور ان کی فریب کاریوں کا کچا چٹھا بھی سامنے آ جاتا ہے چنانچہ اس قصہ میں ایک گاؤں کے چند زمینداروں اور پٹواریوں اور ذیلی کاشتکاروں کا حال لکھتے ہوئے پٹواری کی چالاکیوں سے نیک چاہل اور ناواقف دیہاتیوں کے دام فریب میں پھنس جانے کا مختصر سا خاکہ کھینچا گیا ہے، چونکہ اب اس قسم کی کتابوں کی اشاعت مفقود ہے اس لئے بطور یادگار دو ایک نمونے ایسے درج کر دیئے گئے جو تاریخی حیثیت سے غیر مفید نہیں [1]

(۱۹)

شمار	تصنیف	مصنف	تصنیف سنہ	نمونہ عبارت
نمبر ۴۷	بیج گپت	لالہ بیجی لال اگروال باہوری (واعظ)	۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۶ء	پرشیرخاں خلوانرھکار (اندھیرا) میں اول پرش اور پرکرت پیدا کیا یعنی پرش خود و پرکرت استری، یعنی مایا پیدا ہوئی کہ پرکرت کو شکست اور اودکال و حکومت بھی کہتے ہیں بعد پرکرت کے مہنت یعنی فہم پیدا کیا بعد ہنکار (اشعاع پرتی) سہ قسم یعنی ست کر تم وغیرہ دیا انس اس کے ہیں دوم رج کرمن و بصورت انبکہ دکاس خمسہ) وغیرہ اس سے پیدا ہوئے۔

سیوم تم کو وجود پر پنچ تت (جوہر) کا ہے بعد اس کے پانچ تت مع گن یعنی فعل پیدا کئے اول سبد گن اکاس بعد ش اکاس یعنی آسمان اس انان پائے یعنی ہوا سپرش (چھونے کی حس ہوا اس از آں پنج آگ یعنی آتش مع روپ گن اس از آں جل یعنی آب رس گن

(۱) تاریخ نثر اردو صفحہ ۱۴۳، حاشیہ

پس ازاں پرتھی یعنی خاک کے کوہ وغیرہ ہم خاک ہے مع گمندا گن دقوت شامہ آں اپدرشش ہر پنچ تتت وہر تو پنچ گن شان یک جسم ہوکر اپچ گیان اندری گوش یعنی زبان جسم کھال یعنی پوست بدن و پنچ کرم اندری منہ ہاتھ پاؤں عضو بول عضو براز وچار انت کرن (حواس باطنی) من بدھ چیت اہنکار بعد اس کے جان داخل کی کہ یہ پنیلاہ تتت کا ہے پرش ورکرت ۲۷ تتت کہتے ہیں خود مرکب بہ شکل انسان ہو کر اٹھا اور اب نام ہر کر کل عالم آپ ہی دکھایا پرش نام بھی اسی کا ہے اور شروع اور رب مہا بھارت میں لکھا ہے کہ سوائے اندھکار تاریکی کچھ نہ تھا۔ اوّل ایک بیضہ یعنی انڈا کہ تخم کل مخلوقات کا ہے پیدا ہوا اور بموافق اس سے پیدا ہوتے

تبصرہ وکیفیت

یہ کتاب کسی ادبی نامور کی لکھی ہوئی نہیں ہے اس کا اندراج یہاں صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ گزشتہ زمانے میں بھی کہیں کہیں ایسے صاحب قلم پائے جاتے ہیں جو عربی خواں کی عربی آمیز عبارتوں کی طرح اردو سنسکرت کا استعمال بھی ناموزوں نہیں سمجھتے تھے۔

(۲۰)

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۵	تذکرہ معیار الاشعار (مطبوعہ)	مصنفہ سید مظفر علی خاں اسیر لکھنوی	سنہ ۱۲۶۱ھ	بعد حمد وسپاس خدائے عزوجل ۔ کہتا ہے فقیر حقیر سید مظفر علی امیر کہ دریں وا ا اگر دوستان صادق الوداد اور آشنایان صدق وصفا فقیر خانے میں جمع ہوئے اور بیشتر تذکرہ اشعار اردو اور ابیات فارسی کا اور مسائل علم عروض اور قوافی کا ہاں یکدیگر ہا ہوتا تھا چنانچہ صحیفہ رشیقہ اعنی کتاب معیار الاشعار تصنیف عالم کامل فخر اماجد واماثل رئیس الحکما

استاد الکملا محقق طوسی علیہ الرحمۃ کہ اس فنا عمدہ میں ہے اور اس پر بعضے کملائے اصحاب

قلت و بلاغت نے اغنی مولوی سعد اللہ صاحب نے حاشیہ لکھا ہے کہ انصاف بالائے طاق رکھ کر جابجا اعتراض کیے ہیں اور شرح مہدی علی خاں کی مشتہر بہ ملک الشعرا کی بھی ہے۔ بارہا صحبت میں پڑھا گیا بعض مطالب زیادہ حاشیہ اور شرح سے ذہن میں آئے اور معلوم ہوا کہ بعض مقامات کی صحت سے بھی رہ گئے ہیں لہذا یہ تکلیف بعض احباب اور بمصداق وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ احقر العباد نے مطلب تو کئی عبارت اردو میں بطریق ترجمہ لکھے اور نام اس کا زرکامل عیار در ترجمہ معیار الاشعار رکھا اور کہیں کہیں عبارت حاشیہ و شرح بھی بعینہ لکھ دی اس لیے کہ دریافت کرنا اس کا مبتدیوں کو سہل ہو اور جس جس مقام میں عبارت متن پیچیدہ اور حاشیہ و شرح میں سبب عدم فہم کے خلاف واقع ہوگئے منتہیوں پر حال اس کا منکشف ہو جائے طریقہ تحریر یہ ہے کہ م اشارہ عبارت متن کا اور ت عبارت اپنے ترجمے سے اور ح نشان حاشیہ کا اور ش علامت شرح کی وباللہ التوفیق

۲۱

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۴۴	فسانۂ آزاد	پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی	۱۲۹۵ھ، ۱۸۸۰ء	**ثریا بیگم کا مکان** لٹھے پر چوکا بچھا ہے اور اس پر فرش مکلف اُس کے قریب ایک نازک پلنگڑی پر ثریا بیگم سادی اور ہلکی پوشاک پہنے ہوئے آرام فرما رہی ہیں ابھی حمام سے آئی ہیں لباس عطر میں بسا ہوا ادھر ادھر پھول ڈالے ہار اور گجرے رکھے ہیں باغ سے حنا کی خوشبو آتی ہے

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آہستہ آہستہ چل رہی ہے مگر امارت کے چونچلے مہری پنکھا لیے جھل رہی ہے۔ آب دار خانہ والی گڑگڑی لائی تو حباس مہری نے جھک کر کہا اوئی وتی (داہی) بوڑھی ہوئیں

[1] تاریخ نثر اردو صفحہ ۱۶۵

مگر سلیقہ نہ آیا، اسے پیچوان لاؤ بنا جس میں آ پنج دور سے تھوڑی دیر میں پیچوان آیا گنگا جمنی حقہ بیش بہا، پیچوان دو گز کی زیر انداز دو سیر کا تو مشک بو پیچوان عرق بہار انواع و اقسام کی خوشبو کی چیزوں سے بسا ہوا تھا۔ سنگ یشب کی مہنال تھوڑی ہی دیر میں تمام محل مہک اٹھا، ثریا بیگم نے آہستہ آہستہ پینا شروع کیا۔ کہا پیچوان مردوں کے لئے موزوں ہے ہمیں تو گڑگڑی ہی پسند ہے، خبردار آج سے پیچوان نہ لانا۔ آب دار خلے والی نے کہا حضور یہ عباسی کل چھوکری مجھ کو ڈپٹنے لگی وہ گڑگڑی نہیں پیچوان لاؤ ہم نے کہا اچھا حضور لونڈی تو جانتی تھی کہ حضور ایک کش بھی نہ لیں گی وہی ہوا اب حضور ٹھہریں میں اور بھر کے لاتی ہوں، ایک چار منٹ کے عرصے میں آب دار خلنے والی ایک ذرا سی گڑگڑی لاتی ذرا سا نیچہ ذرا سی چلم لا کر کہا۔ حضور اس کو پیئیں۔

خواجہ بدیع کی گفتگو کا ایک ٹکڑا[1]

اما بعد ہمی گوید امیدوار مغفرت ایزد منان غریب بے نوا خواجہ بدیع الزماں علیہ الرحمت کرا ...ا دیرینہ سے اس ایچ مدال کا شعار من سپہ گری جرار تھا باپ گراس کٹ تھا دادا چڑی مار تھا بد نیا فخر خاندان پیدا ہوا عالی شان اور والا دودمان پیدا ہوا جب زمانہ برسر کار ہوا تو وگلے والی پلٹن کا رسالدار ہوا اس پر ایک شاعر نے جل بھن کر ہجو کی اور میں نے ہاتھ لل بلاتھ دلوں کا تحفت ہر چند کہ اس کا قول جان کاہ ہے لا بندہ بھی شاعر ذی جاہ ہے۔

پدرش ہمہ عمر کاشتکاری می کرد
جدش ز تنور مال برآری می کرد
عمش دو دگار رند کور ریان
ایں مرغ کہ کے رسالداری می کرد

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونہ عبارت
نمبر ۱	افادۂ تاریخ	حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی	۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۵ء	بعد اس کے عرض کرتا ہے ہیچمداں ریخ جو بیان خوشہ چین خرمن اہلِ سخن نابلد کوچۂ ہر علم و فن کمترین بندگانِ ایزد متعال سخن و رساں ماضی و حال حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی کہ جو کہ آج تک کوئی رسالہ قواعد تاریخ گوئی و شرح اقسام تاریخ میں اس شرح و بسط کے ساتھ کہ متدرج یعنی تاریخ گو کو قواعد فن تاریخ گوئی سے آگہی وغیرہ کرنے کافی دوائی ہو جاتا

نہیں لکھا گیا اور بعضے احباب کو بھی اس امر میں نہایت مضطر پایا ناچار جس قدر کہ ہیچمداں کو قواعد مذکورہ سے آگاہی و اطلاع تھی اور جو کچھ اپنے اساتذہ محقق سے اس باب میں پایۂ تحقیق کو پہنچا تھا بقیدِ قلم لایا اور بنا اس رسالۂ مختصرہ کی ایک مقدمے اور تین باب اور ایک خاتمے پر کہ وہ بھی مشتمل چند فائدوں پر ہے قائم کی جاتی ہے اور نام تاریخی اس رسالے کے آغاز تالیف کا مادہ التاریخ اور ختم تالیف کا افادۂ تاریخ رکھا جاتا ہے وھو الموفق المستعان

شمار	تصنیف	مصنف	سنہ تصنیف	نمونۂ عبارت
۱۳	سرمایۂ زبان اردو (لغت)	حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی	سنہ ۱۳۰۳ھ، ۱۸۸۶ء	حمد خدائے سخن آفریں و نعت خاتم المرسلین و منقبت سید الوصیین کے بعد عرض کرتا ہے فقیر ہیچمداں ہیچ مج بیاں خرمن سخن وراں کا ادنیٰ خوشہ چیں سخندان پایۂ فصحائے اردو زبان کا زلہ ربا کمترین احقر بندگان ایزد متعال حکیم سید ضامن علی لکھنوی متخلص بہ جلال کہ جب سے اردوئے معلیٰ نے اپنے علم ایجاد کو

میدان گاہ سخن میں بلند کیا کسی سخنور اردو زبان میں لغت ایسا کہ جامع ہو جملہ مفردات و مرکبات یعنی لغات و محاورات و کنایات و مصطلحات و مثلہات زبان اردو کا جن کو جملہ یا بعض فصحائے متاخرین نے استعمال اُن کا ترک کر دیا ہے اور بعض ان لغات کا جن میں باہم فصحا میں اختلاف ہے یعنی کچھ غیر فصیح کسی طرح اُن لغات کو بولتے ہیں اور کچھ فصیح طرح بولتے ہیں۔ آج تک نہیں لکھا گیا۔ پس بنا بریں مولف نے تمام بسعی بلیغ و کوشش و استقرائے تام چند سال کی مدت میں جامع اس کتاب جامع کا بدیں نہج کہ جملہ محاوروں اور کنایوں اور اصطلاحوں اور مثلوں کے معانی اور محل استعمال لکھ دیے اور بیشتر کے اسناد و نظائر کلام شعرائے نامور و معتبر اردو زبان سے ڈھونڈ کر کے تحت میں معانی و مقامات استعمال کے درج کیے اور جن محاوروں اور کنایوں وغیرہ کی فارسی یا عربی و سنسکرت یا بھاشا ہوئی وہ بھی بعد حل معنی و بیان محل استعمال کے لکھدی اور جو محاورے کہ مخصوص تھے عورتوں کے ساتھ یا مشترک تھے مرد و زن میں اُن کی اطلاع بھی جابجا کی گئی اور محاورات خواص اور محاورات عوام یعنی بازاریوں کے محاوروں پر بھی آگاہی دی گئی اور نام اس تالیف کا سرمایۂ اردو زبان رکھا گیا امید دیدہ وران بے انصاف و بالغ نظران والا اوصاف سے یہ ہے کہ جہاں کہیں مولف سراپا خطا

واقع ہوئی ہو حتی الامکان وہاں اصلاح فرمائیں، عفو دامن عطا سے چھپائیں۔

وهو الموفق والمستعان

تبصرہ و کیفیت

مولف مذکور (جلال لکھنوی) مشاہیر شعرائے لکھنؤ میں تھے جن کو مسلم الثبوت مانا گیا ہے اور ان کی نظمیں ہر حیثیت سے اردو کی فصاحت و سلاست کا نمونہ ہیں ان کی قابلیت علمی بھی مستند مانی گئی ہے۔ اس نثر تالیف میں اگرچہ کوئی غلط لفظ بے موقع محاورہ نہیں مگر وہ روانی اور شستہ بیانی مفقود ہے۔ حسن و خوبی جو ان کی نظموں میں پایا جاتا ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بعض حضرات کو فارسی و عربی کی مزاولت زیادہ رہتی تھی چودھویں صدی کے ابتدائی دور میں بھی تیرھویں صدی کی زبان لکھا کرتے تھے۔

دفاتر سلطنت

تجاویز، احکام، عرائض، اطلاع نامجات اور تمسکات

۱۲۵۸ھ سے ۱۲۷۴ھ تک
۱۸۴۲ء ھ ھ ۲۷ ۱۲ ۱۸۵۹ء

شمار	کاغذ	اجلاس	تجویز	نمونہ عبارت
ایک	[illegible]	[illegible]	[illegible]	عنوان روبکاری کچہری تحقیقات لاخراج ضلع علی گڑھ ڈپٹی کلکٹر بہادر کے اجلاس میں لکھی ۱۷ ار فروری ۱۸۴۱ء

تجویز

آج کے روز یہ مسل نمبری ۳۰ مع مسلیں لکھے ہوتے ہالا کے واسطے تجویز کے ملاحظے میں آئی دریافت ہوا کہ یہ اراضی بہ ترتیب اسلہ جداگانہ بعد ملاحظہ فہرست مقدمات باقی کی تحقیقات لائق تحقیقات قانون دوسرے ۱۸۴۰ء کے متصور ہو کر بذریعہ روبکاری ہاتے لکھی اٹھا دیں ۳ مئی ۱۸۴۰ء مشمولہ مسل ہر ایک مقدمے کے اطلاع نامجات جداگانہ نامی ہر یک قابضان اراضی متعلقہ ہر یک مسل کے برادہمن دوسری دفعہ پانچویں میں مذکور بذریعہ پروانجات جداگانہ نامی پیشکار پرگنہ مذہرہ بحکم لکھوا بھیجنے رپورٹ اطلاع یابی کے مدعا علیہم سے جاری ہوتے اور بھی پروانجات جداگانہ ہر یک مسل مقدمیں بنام محافظان دفتر کلکٹری کے لکھے گئے کہ جو کچھ کاغذ اس مقدمے کے آج تک سررشتے میں ہوتے واسطے شمول مسل کے بھیج دیویں۔

تبصرہ و کیفیت

دفتر حکومت میں اردو زبان کا دعمل و دخل ۱۸۳۵ء سے ہوا ہے منکورۃ الصدر نمونہ شاہی حکم جو ہے برس بعد کا ہے۔ ان ۵ ۔ ۶ برسوں کے نمونے بھی دست یاب ہو سکتے ہیں مگر یہ سمجھ کر کہ ان کی زبان بھی بالکل اسی انداز پر ہوگی مزید تلاش کو تحصیل حاصل سمجھا بلکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بار جود حکم اجرائے اردو ۱۸۳۵ء کے بعد تک بہت سے تجاویز فارسی میں لکھی گئی ہیں۔ اس زمانہ کی عام دفتری کاروائیاں اہل عملہ کے مذاق اور انداز تحریر کے ماتحت ہوا کرتی تھیں اگر کسی کی مشرقی قابلیت اردو دانی پر غالب ہوتی تھی تو اس کی تحریروں میں عربی و فارسی مصطلحات و الفاظ کی کثرت پائی جاتی تھی ورنہ نہیں مگر حروف اضافات و صلات و روابط کی صورت ایک زمانہ تک سب میں یکساں رہی۔

شمار	کاغذ	اجلاس	سند تحریر	نمونہ عبارت
نمبر ۱	روبکاری	[illegible]	۱۸۵۰ء / [illegible]	عدالت فوجداری ضلع علی گڑھ با جلاس مسٹر جارج بلنٹ صاحب قائم مقام مجسٹریٹ بتاریخ ۳۰ ۔ اکتوبر ۱۸۵۱ء شاہ پنجش مختار کار ولد رسول بخش غلام نبی الیہ بر مستغیث

حوالا پرشاد آل رسول مستغاث الیہ بعلت تکرار کے ثبت بھی مختار کار مدعا علیہ اور زبان بندی و اظہار اسد اللہ شاہ اور پیر بخش گواہان مظہرہ مختار کار مستغاث الیہ
حسب ضابطہ بحکم گزری اُس سے واضح ہوا کہ مختار مستغیث نے نالش بنام آل رسول
اسی طرح پر کی کہ دیہات متنازعہ حسب تقسیم ہمارے موکلان کے حصے میں آئے اور مستغاث الیہ کے حصے میں اور دیہات آئے ہیں مواہب مستغاث الیہ نے تلاب حصہ دیہات متنازعہ کو جس صاحب کو عوض منافع کے ٹھیکہ دیا ہے اور جس صاحب دخل اپنا واسطے مستحق کے رجا ہے ہیں ہمارے موکلان دخل نہیں دینے نہیں دیتے کو اور منافع

الیہ تقسیم سے منحرف ہو گیا ہے فقط اور مختار کار مستغاث الیہ نے جواب دیا کہ دیہات تقسیم نہیں ہوتے ہیں پہلے دیہات معافی تھے اب سرکار میں ضبط ہو گئے اور دیہات میں فریقین بحصہ مساوی قابض ہیں ... صاحب کمشنر بہادر و صاحب کلکٹر بہادر نے دخل فریقین کا معرفت پیشکار مارہرہ کے کرا دیا ہے اور ضامنی کرا دی اور اپنا حصہ پر جس صاحب کے بعوض ضامنی کرا دی جس صاحب دیہات میں قابض ہیں چونکہ مسودہ مسل سے معلوم ہوتا ہے کہ دیہات متنازعہ پہلے معاف تھے اب ضبط ہو گئے اور بموجب حکم صاحب کمشنر بہادر کے دخل فریقین کا دیہات میں بعد لینے ضامنی کے دلایا گیا اور تینوں شخصوں کے نام دیہات کی مالگزاری لکھے ہیں کچھ تقسیم ہونا دیہات کا معلوم نہیں ہوتا لہٰذا حکم ہوا کہ فریقین بدستور دیہات پر قابض رہیں

شمار	کاغذ	اجلاس	سنہ تحریر	نمونہ عبارت
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۱۲۸۶ ... ۱۸۶۹	سرکاری مدعی بنام شاہ عالم و امیر صاحب وغیرہ مدعا علیہم دعوے بازیافت موازی ۱۴ بسوہ اراضی مندرجہ چہرہ اسناد و پیمائش ۱۴ بسوہ واقع احمد نگر وغیرہ پرگنہ مارہرہ

عزیز القدر لالہ گلاب رائے پیشکار پرگنہ مارہرہ بجانب بخدمت جو آگے اس نے نسبت ثبوت صرف محاصل لاخراج اراضی نیاز درگاہ حضرت شاہ برکت اللہ صاحب رپورٹ اس کی دفعہ ۲۲ چھٹی اگست ۱۸۶۸ء نمبری ۷۰۶ سے حضور میں صاحبان بورڈ کے لکھی گئی تھی چنانچہ آج بجواب اس کے چٹھی صاحب کمشنر بہادر حصہ شمال دوابہ نمبری ۲۱ لکھی دسویں اپریل ۱۸۶۹ء اس مضمون کی کہ ہم اطلاع کرتے ہیں اس بات کی کہ صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر ... حکم ۲۶ مارچ سنہ ۱۸۶۹ء نمبری ۳۴۴ منظور کرتے ہیں واگزاشت موازی لاخراج الاراضی کو جب تک محصول اراضی مذکور کا خرچ ہو دے نیاز درگاہ شاہ برکت اللہ میں موصول اس سر رشتے میں ہوئی اسی واسطے تم کو لکھا جاتا ہے کہ تم مع قانون گویان پرگنہ ہمیشہ خبر گیراں اجرائے خرچ درگاہ کا محاصل الاراضی مذکور میں مراد ہے جس وقت کچھ جانب مدعا علیہ کے سے خرچ نہ ہوتے فوراً اطلاع کرو اندر اجلاس آئیں فرد گزاشت ہو گا ذمہ تمہارے

ہوگا اور مدعا علیہ کو بھی حکم ہذا سے آگاہ کریں فقط لکھا بارھویں تاریخ ماہ اپریل ۱۸۴۶ء)

نمونہ عبارت	سند تحریر	اجلاس	کاغذ	شمار
نقل حکم بمقدمہ شاہ بخش تمار کار سید اولاد رسول مستغیث بنام سید میر صاحب وغیرہ تکرار مکان واقع قصبہ مارہرہ پیش گاہ صاحب مجسٹریٹ بہادر علی گڑھ سے آج کاغذات مسل کے بنظر سے گزرنے معلوم ہوا کہ جس	۱۲۶۱ھ [illegible]	[illegible]	حکم نامہ	نمبر ۴

کھڑکی کی تیاری پر تنازع ہے اس سے کچھ ہرج مدعی کا بجز اس کے نہیں کہ وہ کھڑکی میں جانے کے نقصان اپنی حقیقت احاطے کا جاتا ہے اور احاطے کے اندر مکان متخاصمین کے ہیں اور کھڑکی تیار ہو چکی تھی حکم ہوا کہ بالفعل کھڑکی متنازعہ بدستور رہے مگر تیار رہنا کھڑکی کا موجب نقصان خراب ثبوت حقیقت کسی کا نہ ہوگا جس وقت آپ مارہرے میں تشریف لیجائیں گے اس کو ملاحظہ فرمائیں گے اور جو اس وقت کچھ تنازع پیدا ہوگا تو حکم مناسب صادر کریں گے بالفعل کاغذات داخل دفتر ہیں مرقوم ۲۲ ستمبر ۱۸۴۴ء

(۳۶۶، ۳۶۷)

نمونہ عبارت	سند تحریر	اجلاس	کاغذ	شمار
سید اولاد علی رسول مدعی بنام سید شاہ آل رسول مدعا علیہ دعویٰ اختیار پٹنے اور پرنالہ ۳ روپیہ اور دلایا جانے واصلات اور باپنے اپنے زر لوم مذکور بعوض جدا کرکے تعیین	۱۲۶۲ھ [illegible]	[illegible]	عرضی	نمبر ۵

مبلغ [illegible]

۵ روپیہ

غریب پرور سلامت مقدمہ سید اولاد رسول مدعی کا مرقوم الصدر بنام مجرد مدعا علیہ کے [illegible]

میں جمع۔ بہری زر تجویز ہے کہ تصفیہ بصلح اس مقدمہ میں بیان طرفین اس طرح پر قرار پائی کہ مدعی زر واصلات اور منافع ہو کر زر خرچ عدالت سے باز آ گراس شرح سے راضی ہو دے کہ جب میں مدعا علیہ زر نقد از سرکار سے وصول کر لے تب نصف اس کا بحق ذریت و اولاد حضرات سرکار کلاں و حضرات سرکار خرد کہ اس تفصیل سے کہ نصف کا سید صاحب عالم اور سید محمد امیر اور نصف باقی اس نصف کا حضرت مدعی اور سید غلام محی الدین اور خود من مدعا علیہ بحصص مساوی ادا کیا جائے اور نصف باقی بعد وضع خرچ واجبی وصول کرامی شخص معتمد کے جمع کر دے اور مجھ مدعا علیہ کے مطالبہ زر خرچہ عدالت کا مدعی سے باقی نہ رہے اور بھی آئندہ کو بابت اس زر باقیہ کے بعد میان طرفین کسی طرح کا مناقشہ بجز تصریح بالا کے نہ رہے اور وکیل مدعی تصدیق مضمون سوال ہذا اپنا چاہے اس واسطے یہ سوال گزران کر امیدوار ہوں کہ بموجب تصریح مندرجہ بالا تجویز مقدمہ کی فرمائی جاوے زیادہ حد ادب

نمونۂ عبارت	سنہ تحریر	اطلاس	کاغذ	شمار
شرافت پناہ محمد حسین امیدوار ساکن مارہرہ ضلع اٹیٹہ بعافیت باشند حسب الحکم امروزہ تم کو مہتمم آہن اسلحہ شکستہ کا جو ضلع مذکور سے بروانگی رڑکی کشتیاں بر بار ہو کر براہ نہر گنگ کارخانہ رڑکی کو بھیجا گیا ہے بلدماہہ عنا	[illegible]	[illegible]	[illegible]	نمبر ۱

روپیہ ماہواری کے مقرر کر کے لکھا جاتا ہے کہ فوراً اپنے تیئن پل نہر گنگ مقام بردھار پر پہنچاؤ اور جس وقت کشتیاں نہر پر آ جاویں آہن مذکور کو بعد وزن بار کرا کر بحفاظت تمام رڑکی تک پہنچا دو کہ باعث خوشنودی مزاج کا ہووے اور واضح ہو کہ تم دس روپیہ تنخواہ اس تفصیل سے کہ بابت تنخواہ برقندازی بحولانا نصر برقنداز موقوف شدہ اور پانچ روپیہ سرکار سے پاؤ گے اور علی الحساب واسطے خرچ راہ کے سرکار سے اب دیئے جاتے ہیں چاہئے کہ بعد واپس آنے کے حساب ان کا حضور میں گزرانو المرقوم ۳۰ جولائی

تبصرہ و کیفیت

یہ چند نمونے جو دفتری زبان اردو کے پیش کیے گئے ہیں ان کا انداز تحریر اب بدل گیا ہے ۱۸۳۶ء سے ۱۹۳۰ء ۱۰۰ برس تک قریب قریب یہی رنگ رہا مگر اس کے بعد پرانے اجنبی اور مخصوص انداز کے انداز بیان کا سلسلہ باقی نہیں رہا مثلاً مع متعلقین لکھے ہوئے وارثین مقدمات باقی ہے کے لکھی اطلاع دہی، مہنائی، بجنسہٖ، ویسے، مستغاث الیہ (ملزم) زبان بندی (اظہار) اس طرح کری موکلان دخل نہیں دینے کے بلمبری (نمبر اکرلو) دکرد (د) دغیرہ وغیرہ ایسے اکثر الفاظ و محاورات متروک ہو گئے ہیں متروک الفاظ کی شناخت کے لئے اکثر متون کی عبارتوں پر خط کھینچ دیئے گئے ہیں یہ بات ذہن نشین رہے کہ دفتری زبان علمی زبانوں کی طرح قابل سند یا ادبی زبان نہیں ہو سکتی۔ یہاں ملکی معاملات پیش ہونا فیصلے ہوتے ہیں جن کے لئے عام فہم روزمرہ ہونا چاہیئے نہ کہ انشا پردازانہ تکلفات ۱؎

۱؎ یہ تفصیلات تاریخ نثر اردو ۲۶۰ تا ۲۶۴ احسن مارہروی سے لی گئی ہیں)

حدیقۂ شہداء

حضرت مولانا سید امیر علی شہید رحمۃ اللہ کا حادثۂ شہادت ایسا نہیں ہے جسے عہدِ واجد علی شاہ کا مورخ نظر انداز کر سکے۔ اکثر صاحبانِ نظر کا خیال ہے کہ واجد علی شاہ کے زوال و محرومی کا سب سے بڑا سبب یہی حادثہ تھا منیر الدین گرامی سے متعلق تاریخوں میں جو مواد ملتا ہے وہ بہت تشنہ ہے اور اس کا بڑا حصہ سرکاری نقطۂ نظر کی ترجمانی پر مبنی ہے خوش قسمتی سے مجھے کتاب حدیقۂ شہداء دستیاب ہو گئی۔ پاکستان میں اس کا صرف ایک نسخہ ہے، ہندوستان میں ایک سے زائد ہوں لیکن نایاب میرے سامنے جو نسخہ ہے وہ کرم خوردہ ہے، ناقص ہے لیکن پھر بھی جو کچھ اس سے حاصل ہوا ہے وہ بڑا قیمتی اور گراں مایہ ہے۔ اس کتاب کے مصنف ایک صاحب مرزا جان ہیں۔ یہ امیر المجاہدین کے رفقاء میں تھے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے ذاتی معلومات و مشاہدہ پر مبنی ہے لہٰذا اس کے صحیح اور مستند ہونے میں کلام نہیں ہم عصر مورخین کے بیانات یوں بھی قابلِ توجہ اور لائقِ اعتنا ہوتے ہیں پھر یہ کہ ایسا مورخ جو خود شریکِ معرکہ رہا ہو لہٰذا اس کی صحت اور درستی میں کسی طرح کا شک ہو ہی نہیں سکتا۔

اب میں مختصر طور پر اپنے طریقۂ اخذ پر روشنی ڈالوں گا تاکہ ناظرین کے سامنے صحیح صورت آ جائے اس کتاب کا املا وہی ہے جو آج سے سو برس پہلے کا تھا یعنی یائے معروف و مجہول کا فرق ندارد کا ہے الفاظ ملا کر لکھنا، جہاں پیش ہو وہاں واؤ لکھنا میں نے طریق املا میں اس حد تک تبدیلی کی ہے کہ یائے معروف و مجہول کا فرق قائم کر دیا ہے۔

(۲) ساری کتاب میں کوئی پیراگراف نہیں ہے میں نے حسب ضرورت پیرے قائم کر دیئے ہیں۔

(۳) ضمنی اور ذیلی سرخیاں میری قائم کی ہوئی ہیں۔

(۴) جہاں تشریح و توضیح کی ضرورت سمجھی ہے وہاں فٹ نوٹ میں اپنے نام سے نوٹ لکھ دیا ہے۔

(۵) عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی اس کتاب کی خصوصیت تھی میں نے اس حد تک اس میں کمی کر دی ہے کہ عبارت میں اپنی طرف سے ایک لفظ یا حرف بڑھائے بغیر اس سے زیادہ رواں اور شگفتہ قطع و برید سے کر دیا ہے۔

(۶) جی تو یہ چاہتا تھا کہ ضمیمہ کے طور پر پوری کتاب شامل تاریخ کر دوں، ایسی چیزیں کہاں ملیں گی لیکن ایجاز و اختصار نے دامن پکڑا اور اب میں نے تلخیص سے کام چلا لیا ہے لیکن تلخیص ایسی کہ۔ بڑھایا کچھ نہیں، غیر ضروری عبارت حذف کر دی ہے۔ کتاب کا مفہوم پورا آگیا ہے اس میں کوئی کمی نہیں آئی ہے صرف غیر ضروری عبارتیں حذف کر دی ہیں۔

(۷) یہ حادثہ ۱۲۷۱ھ میں پیش آیا اسی سال یہ کتاب لکھی گئی اور ۱۲۷۲ھ میں شائع ہوئی اتنی قریب العہد تاریخ بجائے خود ایک نادر تحفہ ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمد بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد سراپا عصیان مرزا جان کی یہ عرض ہے کہ شکر پروردگار بزرگ و برتر فرض ہے جس نے کعبۂ دل کو اپنا گذرگاہ بنایا اور کنشت کا نقشہ امتحان کے واسطے کھینچ کے دکھایا بہر تقدیر دیر و حرم دونوں میں کار سنگ و خشت ہے کہیں اس کی پرستش میں دوزخ کہیں اس کی زیارت کے سلسلہ میں بہشت ہے۔

نعت نعت اور نعت رسول امام الثقلین محمد بن عبداللہ ز من نور اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مناسب ہے نام کے ساتھ درود پڑھنا واجب ہے کہ باعث ایجاد کونین ہیں صاحب تمہید ابد و دنیٰ میں مدار سلسلہ لولاک لما رحمۃ العالمین کی مصداق ہیں برگزیدہ آفاق راکب براق طئی کنندہ قصر علی واقع ہیں۔

سبب تحریر

جب مولوی امیر الدین علی قدس سرہ العلی نے جہاد کا قصد کیا یہاں کے علمائے شیعہ یا سب صاحبوں نے بیعت کی۔ اس جلسے میں ہمہ پگناہ الراجی الی رحمۃ اللہ بھی شریک تھا ہنگام نصرت اہر چند ہمراہی کا اصرار کیا لیکن حضرت نے انکار کیا اور فرمایا کہ تمہارا رہنا صاحب بلکہ واجب ہے کہ اکثر خطوط ہمارے یہاں کے عمائد کو آئیں گے تم سے سبب جواب باصواب مل جائیں گے علاوہ اس کے وہ کام انجام ہونگے جو باعث تقویت مجاہدین نیک فرجام ہوں گے پس عاصی نے ناچار اس خادم رسول کی اطاعت قبول کی پھر کچھ نہ کہا میں یہاں اس دن سے بعد مولوی صاحب کے ہند لینا امر ارشاد فرمایا بسرو چشم بجالایا اور کیفیت کو قلمدان میں بھر دیا جب امیر المجاہدین رئیس المسلمین نے شربت پیا میں نے بھی افسردہ ہو کے قلم کو روک لیا اور اس کا نام حدیقہ شہداء رکھ دیا۔

مسجد بابری کی تاریخ

آغاز معرکہ عبرت انگیز حیرت آمیز یوں ہر کہ کتب سابقہ اور بیان ناحال صحیحہ احوال معلوم ہوا ہے جو بے کم وکاست مرقوم ہوتا ہے کہ بعد تسلط سلاطین سو نہ ادی کے سلاطین ماضیہ کی بھی بلاد ہندوستان جنت نشان میں جہاں کہیں معابد عظیم ہنود کے پائے مسجدیں بنائی تھا مسافر خانے بنوائے اور موذن مدرس میر سامان مقرر کرکے دین محمدی کو خوب شائع کیا۔ اسلام کو رونق اور زینت دی لشکر کفار کو ہزیمت دی فیض آباد اور اودھ کو بھی اسی طرح ضلالت کی نجاست سے شغاف کیا کہ یہ بڑا پرستش کا مقام تھا تخت گاہ پسر رام تھا جہاں بڑا بت خانہ تھا وہاں بڑی مسجد بنائی اور جہاں چھوٹا مندر تھا مسجد مختصر تیار کی تعمیر فرمائی۔ چنانچہ بت خانہ جنم استھان مسقط راس رام اہلیہ کی متصل سیتا کی رسوئی ہے سیتا اس کی جورو کا نام ہے وہاں ایک عظیم مسجد سربلند بابر شاہ نے ۹۲۳ھ میں باہتمام سید موسیٰ عاشقان بنوائی ہے۔ آج تک وہ مسجد سیتا کی رسوئی مشہور نزدیک و بعید ہے اور پہلو میں وہ دیر باقی ہے اور رام دربار کی مسجد فدائی خان صوبیدار نے بنائی تھی جس کو کفار نے بیانک مٹایا کہ ایک دو منار بعد تھوڑی دیوار ایک کنارے رہے ہے بلکہ امجد علی شاہ کے وقت میں اس کی تعمیر کا حکم بھی ہوا تھا مگر ان کو موت نے مہلت اجل نے فرصت نہ دی یہ حسرت ساتھ گئی اور قلعہ کی مسجد گنبد بالخصوص وہ قلعہ چھین لبسنت کو معاف ہو گیا ہے اور مسجد کو بھی گزشتہ حصار میں اعدا کا ف ہو گیا ہے وہاں گذر مسلمانان

رہے
اکسیر ہے وہ جنت ہے یہ ہے ایسی مسجدوں کا حال جو قبضہ اختیار ہنود میں ہوا۔ اظہر خدا حافظ ہم
رہے
اب طرفہ ماجرا سنیئے جس سے دل دو نیم ہوتا ہے قطع نظر اور مسجدوں کے

مسجد ہنومان گڑھی کی تاریخ

اور جنوب میں ایک ٹیلہ تھا کافروں کی پرستش کا چلہ تھا جس مقام پر جیلد
اس مقام پر ہنومان اپنے رفیقوں کو بٹھایا تھا بعد فتح لنکا اس کی زندگی کا وسیلہ تھا اس لئے ہنومان برمت اس
کو ہنومان بیٹھک کہتے تھے۔ بالفعل اسی کا نام ہنومان گڑھی ہے۔ سب دستور وہاں اور رنگ ڈھب
عالمگیر بادشاہ غازی نے ایک مسجد قنائی بنوادی تھی۔ ہنودوں کو اس مسجد کے مٹانے میں اصرار رہا۔
بعد چندے مسلمانوں کو غافل پاکے چاہا کہ پھر ٹھاکر دوارہ بنا کے پوجا کا ڈھنگ جمائیں اور جس پر مورت ہنومان
کی ہے یہاں وہی سنگ جمائے لیکن قاضی محمد عاقل نے جرأت کی اس مسجد کی مرمت کی اور
انہی کی اجازت سے پاتی شاہ محمد فقیر مسلمان اس میں رہتا تھا نماز پڑھتا اذان کہتا تھا جب شجاع الدولہ
بہادر بکسر کو گئے۔ متصل مسجد کے چھپر ڈال لیا اور ہنومان کی مورت کو اس میں قائم کیا مگر حاصل میں فقیر کا
بھی حصہ رہا۔ جب فقیر کو تسخیر کر لیا رفتہ رفتہ مکان معقول تعمیر کر لیا تو آمد بھی زیادہ ہوتی سلک ہجوم بھی
زیادہ ہوئی۔ اس عرصہ میں فقیر مذکور نے انتقال کیا۔ اس کے وارثوں سے ٹال ٹال لیا اور علیحدہ مسجد
سے متصل اس میکری کے کہہ دینا مالاب پر تکیہ جا لیا لیکن اذیت مراعات کئے جاتے تھے جوق فقیر
دیئے جاتے تھے۔ بعد چندے بیراگیوں نے انہیں کو نکالا اپنا عمل کر کے مسجد کی منبر کو توڑ ڈالا۔ اس
بات پر قاضی حبیب اللہ نے بلا کیا اور اقرار نامہ عدم تعرض مسجد لکھوا کے اور کسی فقیر مسلمان کو اذان
کے واسطے مقرر کر دیا۔

بیراگیوں کی شرارت

جب پھپلا اٹھ کا ناظم درشن سنگھ برہمن ہوا مسلمانوں کا سخت دشمن ہوا اس
پاس اس ٹیلہ کے احاطہ کھنچوایا۔ لڑائی کے قابل قلعہ بنوا۔ پھر تو کیا
مثل مشہور ہے کہ ایک تو کریلا دوسرے نیم چڑھا۔ اس کے سبب روز بروز بیراگی زور پکڑ گئے مسجد کے آثار مٹتے گئے
ہندوؤں کی نظامتیں ہوئے لگیں مسلمانوں کو ان کے مقابل کی طاقت نہ رہی۔ حکام کو غیر دشرک لیاقت نہ رہی
گرد اس مسجد کی حصار قائم کر کے ہنومان گڑھی اس کا نام رکھا۔ پرستش کا شغل صبح و شام رکھا اس سامان

فقیر کو پہلے تو کچھ دیتے رہے۔ بجز و کرہ اس کی خبر لیتے رہے جب وہ درویش مسلمان مسجد کا حبیب کوسنا[1] بیراگیوں نے میدان مارا اس خانۂ خدا کو اپنا گھر سمجھ کے ہنومان گڑھی میں داخل کر چکے تھے اب کچھ نشان باقی نہ رکھا طاق محراب و منبر کو برابر کر کے مسجد کا نشان باقی نہ رکھا۔ جب انہاکو درش کی حکومت پہنچی تو جھیر تو اودھ میں یہ نوبت پہنچی کہ کئی برس تک اذان اور گاؤ کشی موقوف رہی۔ اطلاع اس کی اہل دربار کو ہوتی لیکن مفصل خبر نہ سرکار کو ہوتی۔

نظم حسب حال زمانۂ حال

حکام کافروں کی خوشامد سے کہتے ہیں
کیا خوش نما شوالہ یہ بندہ نواز ہے
کس طرح سے اودھ میں ہو بانگ اذاں بند
حاکم کو بت پرستوں سے راز و نیاز ہے
اختر نگر[1] میں گاؤ کشی کیوں نہ بند ہو
گو سالہ پوجتا ہے جو بیٹھ نماز ہے
سب کو تلاش زر ہے جو ہیں اہل کار یاں
چاندی کی جوتی کھاتے ہیں یہ حرص و آز ہے
ہندو کھلے خزانہ تعلی کی لیتے ہیں!!
واعمل بہ زور زر یہ الخیس امتیاز ہے
واں کربلا میں خیمہ جلاتی کیا غضب در
یاں اب کلام حق[2] کے جلاتے یہ ناز ہے
بھٹکے ہوئے ہیں چھوڑ کے یہ دیں کی راہ راست
متھرا کو رب سمجھتے ہیں یا ملک حجاز ہے

---

[1] اختر نگر لکھنؤ واجد علی شاہ کا تخلص اختر تھا رئیس اعظم جعفری ہے [2] کلام حق یعنی قرآن پاک۔

اے خامہ ابتدا کر اب اس داستان سے
جس میں تمام سوز سراپا گداز ہے

شاہ غلام حسین کا عزم جہاد

الغرض جب یہاں تک ہنگاموں کی نوبت آئی ملک بے پیر نے یہ صورت دکھائی کہ کافروں نے صحن مسجد میں بتخانہ بنالیا اور سرکار دولتمدار کی مسجد خدا شناسوں کی ناپاکی ہی ہٹ گئی۔ اسلام کی قدر و منزلت گھٹ گئی تب ۱۲۷۱ھ میں کہ عہد دولت محمد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کا ہے شاہ غلام حسین صاحب کہ مرد خدا حقیقت شناس تھے خدا کی راہ میں جان دینی فرض عین جانتے تھے اور صاحب ان کی مولوی محمد صالح اسم با مسمی صلاح و تقوی میں درست راہ خدا میں بہت چالاک و چست عالم باعمل حق پرستوں میں بے بدل دونوں صاحبوں نے باہم مشورہ کر کے راہ خدا میں سر دینے کو قدم گاڑا۔ ڈھال تلوار اٹھائی مشرکوں کی قتل پر بنیت درستی بھی باندھی اور مسجد آباد اور بت خانہ برباد کرنے پر مستعد ہوئے کمر ہمت چست باندھی بغرض جہاد حیدرآباد میں گوگرگی کے پاس ہے محمدی جھنڈا قائم کیا۔ سامان عزم جزم کیا اگر سچ پوچھئے تو پیر سید احمد صاحب مرحوم[1] سے کچھ کم نہیں۔ اس لئے کہ ان کو سب سامان میسر تھا یہ مفلسی میں اس عزم پر کھڑے ہوئے احسان علی خاں رسالدار معین علی خاں بانکے کی بیٹی ان کی معین و مددگار ہوئی رستم علی خاں اور بہادر علی خاں دونوں بھائی شریک ہو کے مستعد کارزار ہوئے اس زمانے کے مسلمانوں کا حال ظاہر ہے کہ بات بات پر ایمان بدلتے ہیں تیر مسجد یا امام باڑہ یا سبیل تو کوئی سبیل نہیں کنوئیں مہمان سرا بنائیں گے۔

مسلمان جہاد کو ترک کر بیٹھے تھے

وہ لوگ جن پر جہاد فرض تھا یعنی مال و زر رکھتے تھے اشراف کہلاتے تھے پڑھے لکھے تھے مگر رکھتے نہ تھے نہ کسی کا فرض تھا صاف نکل گئے رنڈیوں کی طرح مچل گئے محمدی جھنڈے کو طمع دنیا نے جھولا کیا جہاد میں حجتیں کرنے لگے جانا قبول کیا مولویوں کی خدمت میں آ مسئلہ پوچھتے تھے کہ جہاد کیا چیز ہے؟ جان بہت عزیز ہے اگر کسی نے کہا جہاد فرض کفایہ ہے[2] مصدق اس کا ہدایہ ہے[3] خوش ہو گئے اور تعریفیں کرنے لگے کہ آپ بڑے عالم ہیں

۱۔ حضرت سید احمد شہید رح ۔ ۲۔ فرض کفایہ وہ ہے کہ انجام نہ دیا جائے تو تمام مسلمان گنہگار ہونگے لیکن اگر ایک مسلمان بھی ادا کر دے تو فرض باقی مسلمانوں سے ساقط ہو جاتا ۔ ۳۔ ہدایہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہے جو مدارس اسلامیہ عربیہ میں داخل نصاب ہے

خوب آفت سے بچا یا جیسا آپ کو سنتے تھے ویسا ہی پایا ماشاء اللہ اگر کسی نے کہا جہاد فرض ہے[1] اس میں سعادت دارین ہے۔ سنتے ہی جان نکل گئی رنگت بدل گئی جیتے جی مر گئے ہزار حیلے نکالے کہ ہمارے گھر میں سوا ہمارے کوئی اور نہیں جانے کا طور نہیں کوئی کہتا تھا جورو کو کس پر چھوڑیں کیونکر رشتہ الفت توڑیں کوئی کہتا تھا کہ علیل ہیں کوئی کہتا تھا ہندوؤں کی کثرت ہے ہم قلیل ہیں یہ بزدل تو یوں ہی کھچڑی پکا لیے گئے۔

اسلام کے مجاہد: مساکین

مگر بعض مساکین کہ بالفعل اسلام اگر ہے تو ان میں باقی ہے ذرہ کیا حال اس درویش ولریش ملک خصائل کے ہوا اور حسب ارشاد روانہ اودھ فیض آباد ہوتے شاہ صاحب کچھ شاد ہوتے ردنا ہی تک پہنچے تھے کہ لکھنو کا رستہ لیا اور جو جو فیض آباد میں پہنچ گئے تھے ان کو شار حسین نائب کوتوال اور کپتان انگریز عہدہ دار بد خصائل نے نکال دیا یہاں سے شاں دریا سبحان اللہ حمدہ آرہ تو انگریز تھا اس کو مسلمان سے عار بجا ہے لیکن نائب کوتوال کے ایمان کو دیکھیے کہ بیراگیوں کے چیلے بنے کافروں کے جانب دار ہوئے۔

مسجد بابری میں قیام

بعد چندے فیض آباد سے پرچہ اخبار کا ہندو مسلمانوں کی ٹکر کا بارگاہ حکام میں گزرا ملاحظہ کے بعد ناظم اور کوتوال کے نام پر دستخط ہوا کہ مسجد کی تحقیقات کر داس بات کو اثبات کرو اس سہارے پر شاہ صاحب نے پھر خیل مسلمان بسر کردگی قاضی نور علی ساکن مقامات اعظم گڑھ اودھ کو بسجادہ مردان خدا مسجد بابری میں مقیم بے خوف و بیم ہوتے خدا کی شان نظر آتی ہے یہاں انسان کیا فرشتے کی عقل جاتی ہے کہ پڑھے لکھے بالدار جہاد سے کنارا کریں اور جاہل مفلس مرنے کو گوارا کریں۔ تھوڑے دنوں کے بعد شاہ صاحب بھی بہ نفس نفیس توکلت علی اللہ تعالیٰ کہہ کے وارد مسجد مذکور ہوتے اور مولوی محمد صالح ان کے پاس سے دم بھر نہ دور ہوئے۔ شب و روز اسی تصور اور خیال میں رہتے تھے۔ یہ تصور تھا کہ کوئی ایسا سامان یزداں کر دے کہ سب بیراگیوں کے تصرف سے باہر آئے اودھ کا کفرستان مٹ جاتے۔ ترقی اسلام ہو۔ منتوں کا بیڑا پار ہو۔

جہاد کی دعوت قبول کرنے سے مسلمانوں کا گریز

اسی خیال میں دو تین مہینے گزر گئے

[1] فرض عین ہر مسلمان جس کی بجا آوری پر حتی الامکان مجبور ہے (رئیس اور جعفری)

شاہ صاحب شرکت کی تجویز ادھر ادھر گئے مگر کسی نے ساتھ نہ دیا اور رخ نہ کیا بلکہ بعض مسلمان اس امر
منع کرنے والے تھے مسجد و دیر میں مشہور ہوئے بانی فتنہ ہوئے تفصیل اس کی لکھنا مناسب نہیں میں قاضی نہیں
محاسب نہیں مگر شاہ عبدالحق ردولی کے عرس میں جو بدگوار گئے تھے علی آباد میں ان سے شاہ مولوی محمد صالح
سے جلوہ میں تقریر ہوئی وہ گوش زد ہر تقریر ہوئی حضرتوں کی تقریر میں حق و باطل کی تمیز کھل گئی۔ خلاصہ
یہ کہ مولوی محمد عبدالصمد نے ثبوت جہاد تھے اور وہ دیگر صاحب ایسی باتیں کرتے تھے کہ دران کے واعظ
نہ سے کوئی بندہ خدا نے ارادہ جہاد کا نہ کیا رخ اودھ فیض آباد کا نہ کیا۔ سچ ہے خدا کی راہ میں جان و مال
دینا بہت بڑی نیکی ہے۔

کفر بردوش مجاہد اور بیراگیوں کے حامی اور مددگار ان سنگھ لوکش دت پانڈے تھے چکلہ دار اور ضلع
اس قرب وجوار سمجھتے یہاں تک کہ دس بارہ ہزار گنوار اور بیراگی نا بکار اس گڑھی میں جمع ہوئے۔ مستعد
کارزار کے ہو رہے۔ گھاگرہ کے گھاٹ روک لیے کہ شاید کوئی مسلمان جاہل قصد بھی کرے اترنے دریا کے
پار سر ٹیک کر مر جائے اور مولوی صاحب اور شاہ صاحب کے ساتھ سو دو سو اہل سنگ کی کیفیت یہ تھی
کہ اگر کچھ ملا تو روزی نہیں تو روزہ۔ لیکن فاقہ کا فاقہ عریانی تن کو صبر خدا کی چھوٹی کچھ کے دہان اڑے
رہے خدا کے گھر میں پڑے رہے کہ شاید کچھ مسلمان بحرارت حمیت ایمان بہ نیت جہاد شریک
معرکہ فیض آباد ہو کے کافروں کو تہ تیغ کریں اس امر خیر میں جان و مال سے دریغ نہ کریں کسی نے خبر نہ لی
آخر ش ۱۲ تاریخ ذیقعدہ الحرام ۱۲۷۱ھ جمعہ کے دن دو تین سو مسلمان بارادہ شہادت سی مسجد میں یکجا
ہوئے شاہ صاحب سب کے پیشوا ہوئے یہ خبر برائیگیل کو پہنچی فرصت کو غنیمت جانا دل میں کچھ ڈر
ہی تھا کہ سرکاری لوگوں کی طرف سے تو ہر گونہ اطمینان تھا ان میں سے کب ہے کہ کوئی مسلمان تھا اور بعض
جو مومن بھی تھے کافروں سے زیادہ سفاک تھے بےخوف و خطر خانہ خدا کو گھیر لیا مسلمانوں نے جو دیکھا
خواہ مخواہ گھیرے میں مرتے ہیں بیکار جان سے گزرتے ہیں ہم بھی کچھ کام کریں اس میدان میں نام کریں مستعد
ادائے لوہب مجاہدین پیادہ ہوئے واللہ علم کیا سمجھ کے کوتوال کے پیادوں اور [illegible] شدہ تو کے
سواروں نے متوسط ہو کے رفع شر کیا

مجاہد کی شان

دوسرے روز شنبہ ۱۲ تاریخ اسی مہینے کی کہ اس کو ماتم میں عشرہ محرم سے کم نہ جانیے بیری وانگریز بھی لکھنؤ سے داخل فیض آباد ہوا بیراگیوں کا گروہ شاد ہوا پہلے تنہا انگریز مددگار تھا مگر اس کا مخالف مددگار تھا اب دوسرا بیری نابکار آیا۔ دونوں صاحب تثلیث نے مشورہ کیا خانہ خدا کا رستہ لیا شاہ صاحب کی خدمت بابرکت میں بکمال خیر خواہی یہ فقرہ عرض کیا کہ مسجد کے دروازے میں کواڑ نہیں کسی طرح کی آڑ نہیں مناسب ہے بلکہ واجب ہے کہ ایک جوڑی کواڑ کی قائم ہو جائے مخالف دفعتاً آنے نہ پاتے۔ شاہ صاحب غافل مکر و فریب سے جھٹ پٹ دو مجاہدوں کو کواڑ لانے کے واسطے بیگم پورہ کہ ایک محلہ اودھ میں ہے بھیجا کسی مرد مسلمان نے ایک جوڑی کواڑ کی بہت اچھی گاڑی پر لدوا کے دونوں مجاہدوں کے ساتھ روانہ کی۔ گاڑی کچھ آگے بڑھی تھی کہ بیراگیوں نے خبر پائی خدا جانے اس میں افراط موج کا اشارہ تھا یا کوئی ہرکارہ تھا کہ دفعتاً کافروں کی بھیڑ آئی ان کو گھیر لیا مار ڈالنے کا قصد کیا قریب تھا ان دونوں کو باب جنت تک پہنچائیں۔ یکایک مسجد والوں کو خبر ہوئی رستم علی خاں اور بہادر علی خاں دونوں بھائی اللہ میاں فقیر بخش نائی اور بہادر خاں اور ایک مجاہد پھر تو اللہ رے اور بندے کہاں وہ سینکڑوں کہاں فقط سات جرار لیکن خدا کی شان ساتوں نے تلواریں کھینچ کے اسی دم وہ جرات اور سینہ سپر ہو گئے وہ بہادری کی کہ ساتوں طبقے زمین کے تھرانے لگے۔

کربلا کا نمونہ

جس پر ایک بار تلوار پڑی تھی وہ سوتا گیا بسکہ شمشیر پڑتی تھی کافروں سے جہنم بھر گیا میدان خالی ہوا جو شہید ہوا اس کا مرتبہ عالی ہوا جو کوئی دیکھتا تھا معرکہ کربلا یاد آتا تھا ہر ایک جوان شجاعت سے سر سوا دو کہتا تھا جب اللہ اللہ کہہ کے تلوار لگاتے تھے کافروں کے غول پیچھے ہٹ جاتے تھے بید کی طرح تھرتے تھے جو جوان گڑھی کا شتہ تھا وہاں کشتہ پر کشتہ تھا کسی نے نیزہ مارا کسی نے تلوار لگائی کسی نے چقماق خالی کو کسی نے تمنچہ کو آگ بتائی کوئی بھاگ گئے جانے کو للکارتا تھا جھپٹ کے تلوار مارتا تھا یہ ساتوں سلیمانیوں کی طرح بڑھے چلے جاتے تھے کسی کو خیال میں نہ لاتے تھے وہ در پر بڑھتے چلے جاتے تھے جو کافر جہنم واصل ہوا مردود تھا اسی طرح لڑتے ہوئے گڑھی تک [illegible] پہنچے مجاہدوں کے نعرے تا بہ فلک پہنچے وہاں ایک بڑا گھمسان کا رن پڑا بڑی لڑائی بڑی دھوم کا بیری کا گروہ

تھوڑوں نے بہت کام کیا سینکڑوں کو تہ تیغ خون آشام کیا آخر جام شہادت پیا سید صاحب نے جنت کا لیا لطف حیات
جاودانی کا پایا۔ رستم علی خاں اور بہادر علی خاں دونوں بھائی حقیقی بیں رستم تھے اور میاں خیر بخش گونائی
تھے مگر حلال زادے دانائی میں کسی سے کم نہ تھے ساتوں کو تحشش جنت میں نام رہیگا پنج تن اور چار یار حامی رہیں گے
گوہی کے متصل یہ ہنگامہ ہوا مسجد کے مجاہدوں کو خبر ہوئی ہتھیار باندھ کے ادھر بڑھے۔ مان سنگھ کے
لوگ سد راہ ہو کے ان کے منہ چڑھے یہاں بھی ایسی تلوار چلی اور اس طرح سے لڑائی پڑی دین والے ملو ہوئے
کہ فیصلے کے بعد مقتولوں کا جو حساب ہوا تو مسلمان سے ہندو بہت زیادہ مقتول ہوئے کافروں کو بھاگنے
کی راہ نہ ملی مجاہد وہاں ایسے بچھاڑے گئے زمین میں پاؤں گڑ گئے۔ مان سنگھ کے لوگ وہاں مارے گئے مسلمانوں کی
تلوار سے دوزخ کو بے ایمان بہے۔ شہیدوں پہ باران رحمت برسا زخمی کافر ایک بوند کو ترسا کیے
پھر بڑی خوب گھر آئی شاہ صاحب کی جماعت پھر مسجد میں پھر آئی اسی وقت ایک طرہ فروش

غداری

بیدرد عجب سے مدہوش معتقد خاص مرید باختصاص تھوڑا سا کھانا مجاہدوں کے واسطے لایا
دین کے خدا کے مہمان تھے بلا منتظر ہر آن تھے دسترخوان بچھایا کھانے کا لگا لگایا۔ دونوں انگریزوں نے بھی
غازیوں سے کہلا بھیجا تھا کہ اب بکریں کھول کے بہتا طرح اپنی مسجد میں رہو تمہیں کوئی نہ لوٹے گا جب تک فیصلہ
نہ ہوئے گا وہاں کے قول پر اعتماد کر کے مشغول طعام ہوئے ہنوز نوبت سیر ہونے کی نہ آئی تھی کہ دونوں
انگریزوں اعلیٰ اعلیٰ اور شاہ احسن نائب کو قرار باہم کچھ قیل و قال کے اپنے ہمراہیوں کو نامزد
سپاہیوں کو رے کر کے مع چند ضرب توپ مسجد سے دور جا کے ٹھہرے خدا ہی کو خبر ہے کہ آپس میں کیا شدہ
تھا کہ فوج سرکاری کے آگے ہوتے ہی تخمینا دو ہزار بیراگی لاکھیں گنوار ہاتھوں میں تلوار سواد بلخ کی طرح خانہ
خدا کو گھیر لیا۔ یہ فوج شاہی اور کوتوالی بلا نعال کے ہمراہی تھے انھوں نے اسلام سے منہ پھیر لیا۔ پھر
تو کافروں نے رجب علی شاہ کے کوٹھے پر چڑھ کے جو لوگ خدا کی راہ میں مسجد کے بیچ بیٹھے جسم زار ان کا
گولیوں سے غربال کیا مسجد کی حرمت کا کچھ خیال نہ کیا صحن مسجد لالہ گوں ہوا۔ غازیوں نے بھی گولی برسنے
کو باران رحمت جان کے اور بجائے برچھیاں تان کے ہتھیار نکلے ہاتھ پاؤں نکالے حتی الوسع
جرات کی داد دی۔ جب یہاں صفائی ہو گئی موقوف لڑائی ہو گئی۔

مجاہد اس طرح ذبح کئے گئے جیسے قصائی گائے کو ذبح کرتا ہے

تب وہ تین سو خونخوار بیراگیوں کے مددگار مہادیو اور ہر ہر کرتے مسجد کے اندر بے خوف و خطر آئے اور جیسے قصائی گائے کو ذبح کرتا ہے ۶۹ غازیوں کو جو اس وقت تک زندہ تھے شہید کیا جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کلہ نیلا کیا پانی کی طرح مسجد کے صحن سے خون بہتا تھا اور ہر غازی دم بازپسیں اللہ اکبر کہتا تھا۔ مولوی محمد عالم بھی اسی وقت شہید ہوتے خلد کے نزدیک، دنیا سے بعید ہوتے لیکن عین شورش ہنگامہ جدال و قتال میں اسی ضرب و حرب کے حال میں غازیوں نے شاہ صاحب سے گزارش کی کہ ہم ایسے طوفان میں گھرے ہیں کہ نکلنا معلوم اور ایسے دریائے ناپیدا کنار میں گرے ہیں کہ اچھلنا معلوم۔ خدانخواستہ آپ کی زندگی میں اگر خلل آ گیا تو اس بیڑے کا تحمل بیڑا نہ ہوگا۔ نام و نشان ڈوب جائے گا کوئی ہمارا نام نہ لیگا سب گناہوں کا انتقام نہ لے گا۔ آپ کے جینے میں فاتحہ کا۔ ہمارا ہے جہاد کی امید ہے اس دم چلے جانا مناسب ہے چنانچہ شاہ صاحب بمجبوری حسب مجاہدین کے کسی سمت کو چلے گئے اور مجاہد ستم دیدہ آپ سے نظر سے دیکھے گئے۔ جب کافروں نے مجاہدوں کا کام تمام کیا پھر یہ سرانجام کیا کہ قرآنوں کو یعنی سیپاروں کو تلوار سے پارہ پارہ کیا اور ایک کو جلا دیا۔ یہ بلا دیکھئے کس پر پڑتی ہے؟ آج تک کہ ایک مہینہ ساون کا اور نور نزول بھادوں کے گزرے پانی نہیں برسا ہے یہ قہر نازل ہوا ہے چاروں طرف شور عطش ہے گرمی کی شدت سے ہر شخص کو غش ہے اور وبا کی وہ شدت ہے کہ ہزاروں آدمی ہیضے سے مرتے ہیں۔

مسجد توڑی لاشیں پھینک دیں

اور صحن میں کھڑا ہو کر تیر ستیا کی رسوئی اور خدا کی مسجد کے واسطے حد تھا اس کو توڑ بندوق کی گولیوں سے مسجد کو تو ڈھا دیا کو ثابت نہ چھوڑا۔ پھر مسجد سے نکل کے لاشیں پھینک کے گنواروں نے گھر کی راہ لی جہنموں نے گڑھی میں پناہ لی لاشیں شہیدوں کی بے گور و کفن چادر نہ پیرہن عریاں ٹنگ رہیں بلبلیں دیکھا کیں کھڑی رہیں کوئی ایسا بھی نہ تھا کہ ان کی خبر لیتا دو گز کفن دے کے دفن کر دیتا۔ دوسرے روز نثار حسین نائب کوتوال

بدافعال نے اسی مسجد کے دروازے پر گؤ ماکھور کے قریب دیا۔ کسی نے تاریخ ان مظلوموں کی کہی
تھی مصرع تاریخ بلغ العلیٰ بکمالہ ۔ ۱۲۷۱ھ

مقام شہداء کی بے حرمتی

یہاں تو حاکم ہندو ہیں ہمارے ہیں مسلمان مجرم گنہگار بے سروپا ہیں اسی زیادتی
ہندوؤں کی مسلمان دیکھیں جلے ہوتے اوراق قرآن دیکھیں اور پھر حمایت
کفار ہو اسی رعایت پر خدا کی مار ہو جائے عبرت ہے مقام حیرت ہے نہ کسی کو شرم ہے نہ غیرت رکھتے ہیں
ہے ظاہر میں تو مسلمانی کے ٹھاٹ ہیں باطن میں یزید علیہ اللعن کے بھائی ہیں بعد اس معرکہ کے بیراگیوں نے
صحن مسجد میں آکے ہوم کیا سنکھ بجایا دھی موہن بھوگ کھایا کہتے تھے ہنومان جی نے کرپا کی ہے جھوٹ کپٹ
کیا غرض کوئی بے ادبی اٹھا نہ رکھی اسلام کی توقیر خدا نہ رکھی اس کی تفصیل لکھنے سے کچھ حاصل نہیں بلکہ لکھنے
کے قابل نہیں۔ متصل اسی مسجد کے ایک ٹیلہ تھا۔ مسلمانوں کی دعا کا وسیلہ تھا خواجہ مٹی اس کا نام تھا بعد
شہداء کا مقام تھا قبروں کو کھودنے کے نیست و نابود کر دیا اور ایک بت وہاں بھی دھر دیا بعض کہتے
ہیں کہ بیراگیوں کی کیا حقیقت تھی یہ جو افعال صادر ہوئے سب مان سنگھ کے لوگوں سے ہوئے مگر ہم مجبور
ہیں زبان ہلا نہیں سکتے۔ ان کا نام لب پر نہیں لا سکتے کس واسطے کہ وہ سرکار کے زعم میں خیر اندیش ہیں
سب سے زیادہ وفا کیش ہیں

بیگم پورہ میں مسلمانوں کی درگت

اب حال بیگم پورہ دادا کا سنیے اعلیٰ علی ستی کے حکم سے منادی
نے ندا کی کہ جو مسلمان اس کا شریک ہوگا جان سے مارا جائے گا گھر
لٹے گا سر اتارا جائے گا یہ سن کر وہ بچارے ڈر کے مارے شاہ صاحب کے شریک نہ ہوئے اس پر ناکردہ
گناہ آفت میں پھنسے بعد فراغت کے قتل مسلمانوں سے بیراگیوں نے چلے حملے ان کے مکانوں پر کئے بہت
زور دکھایا مگر خدا کے فضل سے دخل نہ پایا چنانچہ افضل بیگ نامی ایک شخص وہاں کا ہے جو اللہ ان
کے ہاتھ سے زخمی ہو کے اب تک صاحب فراش ہے صورت تماشا ہے جب ان بچاروں نے دیکھا کہ
وہ بہت ہیں اور ہم تھوڑے ہیں ناچار گھر چھوڑ کے فیض آباد میں آ رہے۔

واجد علی شاہ کا حکم دو چار دن پیشتر اس معرکہ کے حکام سرکار سے جب کچھ

پہنچ آئی تب یہ بات ٹھہرائی کہ مولوی نہال الدین صاحب اودھ میں جا کر بصلاح ۱۶ صدا بیر مولوی حفیظ اللہ صاحب دار وغہ عدالت العالیہ دیوانی اس باب خاص میں ساکنان اودھ و فیض آباد سے استفسار کریں بلکہ قلم بند اظہار کریں بعد تحقیقات منفی بے سدو رعایت کیفیت واقعی بارگاہ ظل اللہ میں حاضر کریں اور اگر نشان مسجد کو دیکھیں مشاہدہ اپنا ظاہر کریں چنانچہ ۱۶ ذیقعد الحرام ۱۲۷۱ھ قدسی کو یہاں سے روانہ ہوئے و منزل پہنچے کہ اپنا فیصلہ ہو گیا مگر امتثالاً للہ مر وہاں پہنچے بنگام تحقیقات اور تحریر اظہارات وہ بزرگ مولوی صاحبین ممدوحین اور میر سید علی صاحب محتسب فیض آباد اکثر رئیسوں نے دیکھنا مسجد کا اور یعقوب نے اس میں نماز پڑھنا ظاہر کیا اور قاضی یاد علی نبیرہ قاضی حبیب اللہ نے کئی محضر سابق کے دکھائے کہ ان سے صاف مسجد ثابت تھی اور طرفہ یہ کہ کئی ہندوؤں نے بھی مسجد پر گواہی دی مگر دلکو سیاہی دی چنانچہ ان دو تین صاحبوں نے کیفیت راست براست بے کم و کاست کہ بعینہ اس کا موافق تحریر عاصی کے ہے بارگاہ شاہی ہند و پناہی میں ارسال کی حسب ضرورت تفصیل مہر و گواہی مندرجہ کیفیت ہذا لکھی جاتی ہے۔

تحقیقاتی رپورٹ کا خلاصہ

نقول مہر و گواہی مندرجہ کیفیت مرسلہ مولوی حفیظ اللہ صاحب و مولوی نہال الدین صاحب مرقوم ذیقعدہ سنہ ۱۲۷۱ھ

ابراہیم بیگ	سید علی جعفری	حسین علی	مرزا جان
ساکن خلدہ آباد فیض آباد	زمیندار محلہ میاں پور متعلقات	زمیندار محلہ قضیانہ سیکھ از اولاد	علاقہ قلعہ حاکمی محل مسجد
سلور الملک واقعی است	از وہ بیان واقعی است	سے لطف اللہ مسجد بچشم خود دیدہ ام	بنام گڑھی خود دیدہ ام

سید باقی علی	عبدہ سید حسین مرزا	آغا علی	علی مرزا
مسجد بچشم خود دیدہ ام	لاریب فیہ	لاریب فیہ	بیان واقعی است دربورن مسجد گڑھی گشت
گواہ شد حمیدی ایم	قوم متولی اظہار خود نویسانیدہ است که بارہا مسجد را بچشم خود دیدہ ام		

گواہ شد
محمد روشن خان ساکن اودھ مسجد مذکور بعنوان گڑھی بچشم خود دیدہ ام سماعت آنجناب بن نشین ودرانخط

گواہ شد۔ محمد علی خاں ساکن اودھ خاص بعمر یکصد و چہار سال مسجد واقع گڑھی بچشم خود دیدہ ام فقط

احمد علی	ساکن فیض آباد و کوز محلہ بہ قبیلہ ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام و نیابات و مقام و سمت آں تجربہ یاد دارم و بر محراب آں اسم یا اللہ نقش بودہ است
سید محمد علی	وثیقہ محلہ ساکن فیض آباد مسجد قناتی گر بہ قبیلہ ہنومان گڑھی بودہ بچشم خود دیدہ ام فقط
مرزا علی	ساکن اودھ مسجد واقع ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ مقام و نیابات آں بخوبی یاد دارم فقط

اظہار دینی سنگھ چپراسی عدالت فیض آباد برائے ترقی حسب الحکم سرکار در عہد نیابت منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں بہادر بہ ہنومان گڑھی رفتہ بودم مسجد واقع ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام فقط۔

خدا فراموش، ناحق کوش

جب یہ کیفیت بارگاہ ہندوستان پناہ میں گئی اور جھوٹے درباریوں نے اہل خلل فرمائی۔ نواب کے پاس آکر عرض کرنے لگے کہ حضور عالم یہ کیفیت جو دولو سوریوں کی دو حرفی ہے اس کا کیا اعتبار یک طرفی ہے اس پر تعمیر مسجد کا حکم لگانا اور اپنی رعایا کو [illegible] ہمہ حیثیت آزادی ہے آپ اب مختار ہیں آپ کے نزدیک ہر ہندو اور مسلمان ایک ہیں انصاف یہ چاہتا ہے کہ راجہ مان سنگھ اور آغا علی خاں کو ارشاد ہو وہ جا کے دیکھیں اس امر کو خوب جانچیں گو صاحب عالم علیہ ہیں لیکن ایمان کا مقدمہ ہے۔ نواب صاحب کو خود یہ منظور تھا نیت میں فتور تھا کیفیت کی جانب خیال نہ کیا ٹال دیا مگر مان سنگھ بے ایمان اور آغا علی نمک حرام کو روانہ کیا وہ دونوں خدا فراموش ناحق کوش جس وقت اودھ میں پہنچے مسلمانوں کو دھمکایا ہندوؤں کو سر چڑھایا کہ مسلمان بیچارے بقول شخصے درویش بجان درویش صلح پر راضی ہوئے آغا علی اور مان سنگھ نے ایک اقرار نامہ اور صلح نامہ ہندوؤں سے لکھوا کر حضور میں بھیج دیا کہ اب کسی طرح کا یہاں فساد ہندو اور مسلمانوں میں باقی نہیں ہے۔

لکھنؤ کے مسلمانوں میں اضطراب

جب اقرار نامہ اور صلح نامہ نواب نے ملاحظہ کیا مارے خوشی کے ہنس دیا اور کہا الحمد للہ جو ہونا تھا سو ہوا مگر اب فساد مٹ گیا۔ غرض ایسی کچھ صورت ہوئی کہ نواب کے نزدیک جو خون مسلمانوں کا ہوا تھا اس کے انتقام کی صورت نہ ہوئی تب بعض علماء لکھنؤ کے کان کھڑے ہوئے ان کے ساتھ کچھ مسلمان کھڑے ہو کر ہم دیگر یہ کلام کیا کہ یہاں کے

حکام نے اسلام کو سلام کیا آج ہندوؤں نے ہنومان گڑھی کی مسجد گرا دی ہے اگر ایسے ہی مسلمان بودے رہے تو کل لکھنؤ میں عمل کریں گے ہر خانۂ خدا میں ایک ایک بت دھر دیں گے۔

مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی و مولانا سید امیر علی

آخر شدہ رفتہ باب فرنگی محل سے مولوی عبدالرزاق صاحب کہ فضل و کرم و تقویٰ و ورع اور تہجد میں کامل جانے جاتے ہیں عبادت میں طاق ریاضت میں مشتاق شب بیدار تہجد گزار اور مولوی امیر الدین علی صاحب ساکن قصبہ امیٹھی کہ امور مذکورہ میں بمراتب بڑھے ہوئے ہیں ہر دن کو مسجد میں کھڑے ہوتے ہیں نماز کو آرام سے پاؤں پھیلا کے سوتے ہیں دونوں صاحب بعزم جہاد مستعد ہوئے اور مولوی تراب علی اور مولوی برہان الحق اور مولوی حیدر علی وغیرہ سے مشورہ تھا۔ سب نے فرضیت جہاد کا اقرار کیا اور کہا کہ جب تک ہنود نے تا ہنوز ہاتھ نہ اٹھایا تھا اور مسجد بابری میں مقاتلہ نہ ہوا تھا تب تک یہ فرض کفایہ تھا اب بے شبہ فرض عین ہے ہمارے نزدیک اب ہنگام نفیر عام آیا ہے۔

سید امیر علی کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت

الغرض جب یہ پانچوں ارکان دین متین یعنی تلامذہ حبیب خادم پنجتن وارث مسند رسول ذوالمنن یک دل اور یک زبان ہوئے تب یہ خیال آیا کہ انھیں پانچوں میں ایک کو امام ٹھہرائیے اس کے حکم کو بجا لائیے آخر قرعہ یاد جو ہوا کہ سب صاحبوں نے مولوی امیر الدین علی صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اپنا کام کیا اور کہا کہ بالفعل آپ اور مولوی عبدالرزاق صاحب روانہ ہوں انشاءاللہ تعالیٰ سامان سفر کر کے ہم بھی دو ہی چار دن میں حاضر خدمت شریک رنج و راحت ہوتے ہیں پس سلطان المجاہدین اور مولوی عبدالرزاق صاحب نے حسب تجویز ان سب صاحبوں کے یہ بات ٹھہرائی پنجشنبہ کو یہاں سے کوچ کر کے ایک دو مقام راہ میں کیجیے اور بعد اجتماع سامان جہاد فیض آباد میں چل کے انتظام کیجیے۔

فرنگی محل میں ہلچل

ادھر یہ مشورہ ہوا ادھر جہاد کی خبر ہی کو شیطان کے کان بہرے کہیں ہوں نہ ہو گا ان صاحبوں کو خبر پہنچائی جن کے ترکیب تمہید کرنا مسلمانوں کا اور جلانا قرآن کا مطلب نہ کھتا تھا انھوں نے طرفہ حرکت کی شام سے شہرت کی عزم مولوی عبدالرزاق کا چھپا نہیں ظاہر ہے

ہرکس وناکس اس سے ماہر ہے کو قوال نے سنا ہی ہوگا کسی نہ کسی نے کہا ہی ہوگا ظن غالب بلکہ یقین ہے کہ
گھڑی ہی دور آتی اور سارا فرنگی محل بے جرم و گناہ اسیر دام بلا ہو جاتے ایسی لغو حرکت کرنا اپنے ساتھ سب
کو فضیحت کرنا ہے ایسی ایسی باتیں کیں کہ سارے فرنگی محل میں ہلچل پڑ گئی کہیں پڑ گئے آرام کی صورت بگڑ گئی
ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہو کیا ہوگا انجام اس کا برا ہوگا یا بھلا ہوگا ماما اصلین لونڈی باندیاں کہتی تھیں
دیکھئے کیا پیش آئے گا حاکم زیر و زبر کرے گا برے دن دکھائے گا۔

مولانا عبدالرزاق فرنگی محل کا عزم مردانہ

غرض ایسا کچھ منتر پڑھا کہ انھیں کا طوطی بولنے لگا چھوٹا
بڑا مولوی عبدالرزاق صاحب پر زبان طعن کھولنے لگا یہاں
تک شور و غوغائے محشر برپا ہوا کہ یہ خدا دوست فرمانے لگے کہ یہ سب سامان فقط میرے روکنے کے واسطے
ہوا ہے وہ ممکن نہیں ہیں خواہ مخواہ جاؤں گا کافروں کو جہنم میں پہنچاؤں گا میرے نزدیک اور ہو دارالحرب ہے
فرض مبین حرب و ضرب ہے ہاں صبح تک اگر میں نے قیام کیا پھر جانا دشوار ہوگا محلہ بھر کے لوگ کیئے تیار
ہوگا یہ سوچ کر یکایک اپنی دوگوش فقط ایک چادر لنگی کندھے پر ڈالے پیری ہاتھ میں رمضان خدمتگار
ساتھ میں محلہ رسمی کو روانہ ہوئے امیر المجاہدین وہاں اترے تھے آدھی رات گذری ان کے پاس پہنچے
وہ تو ان سے زیادہ چلنے کیلئے آمادہ تھے گو سواری نہ تھی پیادہ تھے جس دم ارکیہ آراستہ سپہر جلوس ان
بزرگوں میں دیکھئے مشرق سے نکل آیا یہاں کمر بندی ہوئے لگی خدا کی راہ میں قدم بڑھایا۔ ان علماء کی سواری
کا بیان قلم کی طاقت زبان کی قدرت سے باہر تھے۔

قافلۂ مجاہدین کی روانگی

بیچ میں دونوں خورشید راہ خدا پیارے ایک بنس پر سوار ہو گئے
کی۔ ان کے راہوار نمازیوں کی قطار خدا کی قدرت نظر آتی تھی کافروں
کی ہیبت سے جان جاتی تھی۔ سب کہتے تھے۔ اس فوج محمدی کی ایسی شان ہے کہ عقل حیران ہے
ایک ایک انہیں ہزار پر بھاری چہروں پر نور برستا ہے جو ان سے لڑے گا۔ وہ ناری ہے
اس شان و شوکت خاص جہاد کی نیت سے بحر مواج کی طرح لہراتے ہوئے صوبہ بنارس میں پہنچ گئے
میں داخل ہوتے سبحان اللہ و بحمدہ خدا اگر ایمان دے تو ان لوگوں کے قدموں پر ایمان جانے دے

حاکم کی یہ منادی کہ کوئی فیض آباد اور اودھ کا حرم نہ کھے بے فائدہ رزم نہ کرے مگر ان اللہ والوں کو نہ کسی منادی سے غرض نہ دوڑ دھوپ سے کام فقط خدا اور رسول کی خوشنودی سے طبیعت کو جن یوں کو آرام تھا

محمدی جھنڈا

ایک طرف محمدی جھنڈا کھڑا ایک جانب لشکر قلیل بارعب جلال ٹپا نقارہ پر چوب پڑتی تھی ہیبت سے برہمن کی لڑکی کمر پر چڑھتی تھی غازیوں کا جوا سپہ گری کا بانو کوئی نیزہ تانتا تھا کوئی رستم کو پیر زال جانتا تھا۔

یہ تھے مجاہد اسلام

خلاصہ یہ کہ اس جلسہ میں کیسا کیسا نوجوان اور کیا کیا شیخ زادہ شوکت و شان تھا۔ مولوی عبدالرزاق صاحب کہ افسر فوج ان نامداروں کے سب کے سردار تھے ہمہ صفت موصوف دیار و جوار میں معروف ہیں ہمراہ ان کے محمد خورشید حسین مجاہدان بلند ہمتین کے ہم پہلو بہادر دوسرے حسام الحق مولوی نورالحق صاحب مرحوم و مغفور کے پوتے ہیں تمام سے جلادری عیاں ہے تیسرے لمعان الحق مولوی برہان الحق صاحب کے فرزند بلند کی پیشانی سے شجاعت کا نور چمکتا ہے ہر دم میرا شمیر امام کا منہ تکتے ہیں کہ اجازت پاؤں اور ہوا کی طرح اودھ کو جاؤں چوتھے محمد شیر فرزانہ احمد کی چہرہ ارغوانی دماغ کا کوری کے رہنے والے جناب ہیں۔ پانچویں عبدالغفار مولوی عبدالجامع کے فرزند اہل اسلیقہ شجاعانہ کردار جوانی عالم تجار اور اسلام سے یکسی طرح کتنے ہی جوان نادرہ روزگار یادگار تھے۔

علی نقی خاں کی برہمی

یہاں کا حال سنئے اور جناب امیر المجاہدین اور مولوی عبدالرزاق کا جانا ادھر سارے لکھنؤ میں قیامت کا آنا ہر مسلمان سے جتنے پہ کمر باندھی کافر کشی پر تیغ و سپر باندھی جس کو دیکھئے رہی ہے ماتم فوراہی ہے۔ جب یہ خبر نواب علی نقی خاں کو پہنچی کہ علماء فرنگی محل بھی جہاد پر آمادہ ہیں یہ سنتے ہی پریشان حد سے زیادہ ہوئے اور مولوی مفتی محمد یوسف کو بلوا کے استفسار کیا کہ فرنگی محل میں کون کون صاحب نے یہ فساد اٹھایا ہے؟ ہم تو اس خاندان کو بہت مانتے ہیں کہ خدا اور رسول جلد جائیے فتنہ خوابیدہ نہ جگائیے ہنگامہ کو مٹائیے۔ ترغیب و ترہیب کے ساتھ سے پھیر لائیے وہ جو فرنگی محل میں آئے اور غیظ و غضب نواب کی خبر لائے پھر تو گھرا کے مولوی عبدالرزاق کے گھر پہنچا مستکبرانہ تھی نصیحت کیا کیا تھی مفتی صاحب نے جو بھی زبانی کوئی بات اٹھا نہ رکھی ایمان کو ہمیشہ ادب یا فرزانہ کسی کو تو

اودھم بن کر کے اپنے گھر سورت ہی کو تشریف لے گئے۔

نفسا نفسی کا عالم

اب دوسرے صاحب کا عمل ہوا گیا دشمنوں کے باغ میں خلل بپا آدھی رات تک لوٹ کی خبر گرم رہی۔ دروازے کی طرف سب کی نظر رہی اور مولوی عبدالحق کے اہل و عیال کو گنہگاروں کی طرح چھپا کے اپنے گھر لے گئے مکان میں قفل دے گئے ہر شخص ہمت ہارا ہوا تھا جیسی مولوی عبدالرزاق نے ڈاکہ مارا تھا اور اسباب کا عجب حال تھا اٹھاتا لٹا تھا آدھا گھر پہنچا تو نصف راہ میں رہا اور کہیں چھپانے کا قصد کرتے تھے تو لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے کہتے تھے ہمارے گھر میں نہ لانا ہمیں اس آفت سے بچاتا کیا ہمارا گھر بھی لٹوا دو گے کوئی طعنے سے کہتا تھا کیا تم بھی جہاد کو جاؤ گے، قصہ کوتاہ اسی حیص بیص خوف و ہراس میں اوقات گزر گئی چار پہر رات گزر گئی نہ سوار آتے نہ پیادے نظر آئے۔

شاہی پیامبر

نور کے تڑکے حسب الحکم نواب قطب الدولہ شرف الدولہ غلام رضا سندی الاصل بلال دو میر مقدر علی چکلہ دار حیدر گڑھ اٹھی کو روانہ ہوئے معلوم نہ ہو دیکھنے دیکھتے تھے کہ مجاہدین کو پھیرنے جاتے ہیں دیکھئے کس طرح لاتے ہیں لیکن اتنی خیر گزری کہ دونوں صاحبوں نے کچھ اپنی رائے کو دخل نہ دیا بکمال نرمی فقط ابلاغ حکم سرکار کیا کہ حضور عالم کا ارشاد یوں ہے کہ تم کو اضطراب کیوں ہے پہلے تمہارا کہ اس کا ہم پر واجب ہے اگر خدانخواستہ ہم اس امر دینی میں کچھ پہلو تہی کریں اس وقت تم کو مناسب ہے امیر المجاہدین نے بھی بکمال لطف ان سے خطاب کیا مناسب وقت کے جواب دیا آخر کوئی امر طے نہ ہوا گو انہوں نے بہت التیام کیا ناچار فوج محمدی سے علیحدہ کسی باغ میں قیام کیا۔

کار ملا فی سبیل اللہ فساد

اب پھر چند فقرے یہاں کے سننا چاہئے خاد غن دریا چاہتے کہ بعض مولویوں نے میدان خالی پا کے نواب کے پاس جا کے سارے عالم کو ہم آپ کو بھلا دیا اس کو صاف کہہ دیا کہ جہاد فرض کفایہ ہے کتب فقہ میں یوں ہی آیا ہے جو فرض عین کہتا ہے خطا پر ہے، شاید قتل بندگان خدا ناحق مد نظر ہے بلکہ یہ معرکہ جہاد ہی نہیں گر اب مطلق جہاد نہیں وہاں تو لڑنا بھی ناروا ہے وہاں تو جہاد کی شرط نہیں پائی جاتی وہ دار الحرب کب ہے یہ راگ نعمان گومتی کے مطیع الاسلام ہیں جس کا جی چاہے ہم سے گفتگو کرے مناظرہ آپ کے روبرو کرے آپ تنازع فاحق فرماتے ہیں کہ یہ غصہ

کہاتے ہیں اگر سرکار ہمیں خلعت اور زادِ راہ دے کر فیض آباد کو رخصت ہوئے ابھی گلی تا باہر نہ جانے پائے تھے میر امیا وعظ کہتے ہیں کہ ملامت جاتا ہے ایک شخص وہاں نظر نہیں آتا ہے۔ غرض میاں کچھ تراق پڑاق سے سبز باغ دکھایا کر نواب نے دو شالہ اور رومال کوئی بیس پچیس روپیہ منگا کے اسی وقت اڑھایا اور سو روپیہ نقد دینے کی زبانی مولوی یہ تو خلعت پہن کر ایسے خوش ہوئے گویا سلطنت کی بڑی دولت ملی۔

اصحاب فیل

اپنا قلم تھرّاتا ہے کاغذ کا خندکا سینہ پھٹا جاتا ہے لکھنا دشوار ہے ان کا دربار سے نکلنا اور گھر کی طرف چلنا دم بھر میں سارے شہر میں یہ خبر منتشر ہوئی دنیا زیر و زبر ہوئی انگشت نمائی ہونے لگی۔ اشعار ہجو برملا ہونے لگے تھے جس کے دل میں آتا تھا بے تکلف زبان پر لاتا تھا۔ الغرض سامان سفر ہوا ساتھ لے جانا عزیزوں کا بد نظر ہوا۔ ہاتھی تعینات ہوا اصحاب فیل بنے عقل پر پتھر پڑے طیراً ابابیل بنے۔ درباریوں سے صحبت ہوئی بلا قید کے اجازت ہوئی ہر روز یہ ہاتھی پر چڑھ کے جانے لگے۔

مولانا عبد الرزاق فرنگی محل کی واپسی

وہاں امیٹھی میں بعد قتل و قتال ایک روز میر صفدر علی نے پڑھے نہ لکھے نام مولوی محمد فاضل نے یہ نوشتہ لکھدیا اور لڑائی بھی بحلف اقرار کیا کہ اگر مسجد ثابت ہو گئی تو نواب صاحب بہادر اسی وقت بنوا دیں گے اور بیراگیوں سے بیہادیوں کا انتقام بھی لیں گے اور اگر نہ ثابت ہوئی مجبوری ہے بیراگیوں کی بے قصوری ہے۔ حکایات نہ کہیئے گا جہاد کا نام پھر نہ لیجئے گا اور جہاد پر فوقیت ہوتی تھی کے مولوی عبد الرزاق مع اعوان و انصار اپنے گھر کو تشریف لے گئے امیر المجاہدین تشریف نہ لائے۔ مولوی عبد الرزاق سے حسب الطلب نواب صاحب سے ملاقات کی اور ہنگام استفسار و حکایات کی لیکن وہی تیور وہی جہاد فرض عین تھا یہ رہا۔ ایسی تقریر دل نشین کی کہ خروج واجب ہر مسلمان پر رہا۔

مولانا عبد الرزاق کا شاہی خلعت قبول کرنے سے انکار

خلاصہ یہ ہے کہ خلعت دینے میں نواب نے بہت اصرار کیا مولوی صاحب نے انکار کیا رخصت ہو کے مکان پر آئے کلمات حسرت و افسوس زبان پر رہ گئے وہ ایک بار اور دربار گئے مجبوری کا ناچار ہو گئے۔ جب نواب تعمیر مسجد میں حیل و حجتیں کرنے لگے تب اپنے آنے پر خود نفرین کرنے لگے

بھی چاہا کہ پھر عزم کریں، سامان رزم کریں لیکن سرد ستان تھا، راستے نکلنا دشوار تھا کہ برف سے پہاڑوں کا گھاٹ پر بند و بست میسر کار تھا۔

امیر المجاہدین سے واجد علی شاہ کی ملاقات

جب مولوی عبدالرزاق کے پھر آنے پر بھی اہلکاران سرکاری کا اطمینان نہ ہوا تو منشی امیر حیدر نے بشیر الدولہ بہادر خواجہ سرا کو روانہ کیا کہ اپنا کچھ نشیب و فراز دکھاؤ کہ مولوی امیر الدین علی صاحب کو بھیج لاؤ۔ چنانچہ حسب الحکم امیر حیدر نے امیٹھی میں جا کے جناب ممدوح سے عہد بیان کیا۔ مولوی صاحب نے بھی زیادہ اصرار نہ زیادہ کیا گفتگو کا ارادہ کیا خلاصہ یہ ہے کہ دو تین دن کے بعد امیر المجاہدین منشی امیر حیدر کے ساتھ لکھنؤ تک پہنچے اور وہاں سے بشیر الدولہ بہادر کے ساتھ کہ وہ استقبال کو گئے تھے تشریف لاتے ہی آن بان سے مع سپر و شمشیر اپنے مجاہدین کو ساتھ لئے ہوئے صاحب کے پاس آئے۔ نواب صاحب کی مروت اور اخلاق چھپا نہیں ہے وہ خاطر داری کی کہ جتنے حضار مجلس تھے دنگ ہو گئے سب کے نزدیک دنگ ہو گئے امیر المجاہدین کا بھی وہ رعب چھایا کہ سارا دربار تھرایا۔

امیر المجاہدین اور واجد علی شاہ کی گفتگو

پہلے کشتی خلعت کی منگائی اور اس کے ساتھ پانسو روپے کی تھیلی آئی دربار گفتگو باز ہوا قصہ دنیا سازی کا کروم بازی کا آغاز تھا۔ نواب نے فرمایا سرکار تمھارے عزم بالجزم سے کہ تن خدا کی راہ میں جان دینے کو موجود ہو بہت خرسند ہے نہایت خرسند ہے کہ مردانہ کرتے ہو خدا کی راہ میں قدم دھرتے ہو خلعت پہنیے روپیہ لیجیے چندے بسر کیجیے ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب بشرط ثبوت تعمیر خانۂ خدا ہو جائے گی جھتوں کو سزا مل جائے گی۔ امیر المجاہدین نے کہا ہم لوگ خدا کی راہ میں جان پر کھیلے ہوئے ہیں مصیبتیں جھیلے ہوئے ہیں ہمیں خلعت اور انعام سے کیا کام ہے۔ اس خلعت کا بد انجام ہے کہیں کے حامل نہیں جو کچھ عار نہیں مصاحب نہیں سپہ سالار نہیں خلعت سے کیا کریں آپ کو اوروں کی طرح کیوں نہ سمجھیں یہ خلعت اور انعام نہیں ایمان فروشی ہے دنیا کے لیے دین سے چشم پوشی ہے ہمارا خلعت یہ ہے کہ رخصت جہاد ہو اجازت سفر فیض آباد ہو کہ بیراگیوں سے انتقام خون ہر فرد مسلمان اور بے ادبی ہائے قرآن لیں۔ نواب نے بھیجا بعض علماء سے

سنا تھا فرمایا کہ یہ جہاد نہیں

دربار واجد علی شاہ میں امیر المجاہدین سے مناظرہ

تھوڑی دیر قدح ہوئی تھی کہ ناگہاں
وہی صاحب کہ اسی بات کا خلجان پہنچے

ہوئے بیٹھے تھے، بادشاہ حضور دور سے نزدیک آئے اور تائید کلام حضور زبان پر لاتے کہ واقعی فرض عین ہونا جہاد کا کتب فقہ میں دیکھا نہیں خصوصاً ہندوؤں کی زیادتی کا کچھ لکھا نہیں۔ مولوی صاحب نے کہا سبحان اللہ آپ کو عبارت شرح وقایہ کی بھی نفرض عین ان هجم العدو تخرج المرأة والعبد یاد نہیں کس طرح کہتے ہیں کہ جہاد نہیں۔ اس میں کلام چند در چند ہوتے آخر کو بند ہوئے اور کہنے لگے کہ بالفرض اگر فرض بھی ہو تو شرط امامت ہے کہ اولی الامر منکم قرآن کی آیت ہے۔ امیر المجاہدین نے پھر خطاب کیا اور یوں انھیں کو جواب کیا کہ ہمارا امیر کوئی نہیں کس واسطے کہ یہاں شرطیں امارت کی مفقود ہیں چھوٹی بڑی بات کہ بڑے صاحب[2] موجود ہیں۔ یہ سنتے ہی دونوں صاحب کے باختہ ہوش ہوئے۔ امیر المجاہدین خاموش نہ ہوئے بعض کہتے ہیں کہ مولوی خادم احمد صاحب نے یہ کہا کہ فرضیت جہاد سے ہم کو انکار نہیں بلکہ ہم نے ہی تو آپ سے بیعت کی تھی۔ بندہ بھی عازم ہے مگر بجا آوری حکم حاکم کی لازم ہے تھوڑے دن دیکھیے اگر بآسانی تعمیر خانہ خدا ہوگی۔ مشرکین کو سزا ہوگی تو پاؤں پھیلا کے گھر میں سوئیے۔

واجد علی شاہ کی بے بسی انگریزوں کے مقابلہ میں

نواب نے بھی ارشاد کیا کہ آپ اتنی جلدی
کیوں کرتے ہیں ہم کو آپ سے زیادہ خیال

ہے واللہ کفار کی زیادتیوں کا بڑا ملال ہے مگر کیا کریں قابو نہیں صاحب کلاں[2] سے مجال گفتگو نہیں۔ جب سے کلام اللہ کے جلنے کو سنا ہے دل کباب ہو گیا ہے کلیجہ پھٹتا ہے لیکن آپ کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا کلام یاد نہیں دیر آید درست آید۔ آپ تھوڑے ہی دن تامل کریں، وانگی میں تساہل کریں ہم حکمت عملی سے مسجد بھی بنوا دیں گے اور انتقام بھی بے ادبوں کا لے لیں گے۔ اس بات پر امیر المجاہدین باوجود اصرار خلعت

---

[1] اور فرض عین ہے اگر غلبہ کریں کفار کسی شہر پر نکلے عورت اور غلام بے اجازت کے۔

[2] انگریز صاحب کلاں کہلاتے تھے۔ (رئیس احمد جعفری)

وغیرہ سے انکار کر کے نواب کو سلام کر کے مع مجاہدین مسجد مقبرہ امجد علی شاہ میں با انتظار حکم نواب ٹھہرے

امیر المجاہدین کا جوش جہاد

لیکن امیر المجاہدین کو عجب طرح کا جوش تھا اور ہر مجاہد مشتاق تھا جہاد سے مدہوش تھا ہر دم یہی چاہتے تھے کہ جس طرح ہو جلد کوچ کر کے فیض آباد اودھ میں پہنچائیں اور خدا کی راہ میں جوہر شجاعت و جوانمردی دکھائیں۔

شیعہ بھی امیر المجاہدین کے ساتھ تھے

حاجی بشیر الدولہ بہادر باوجودیکہ مذہب اثنا عشری رکھتے تھے دن بھر میں دس گیارہ مرتبہ مزاج کی خبر منگاتے تھے آٹھ پہر انہی کی خاطر داری میں رہتے تھے اور اکثر یہ کہتے تھے کہ خدا اسلام کی آبرو اور دین کی دھوم چار سو کرے اس خدا دوست کی حرمت پر حرف نہ آئے جو اس شہر میں بجز نہیں حامی خدا کے سوا دوسرا انہیں گو اکیلا ہوں مگر اس بزرگ کے واسطے جان پر کھیلا ہوں اکثر خود تشریف لاتے تھے اور مولوی صاحب کی تسکین فرماتے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ ہاتھ میں ہاتھ بات کے اس لڑائی میں ساتھ دیجیے مگر چار و ناچار مسجد سے اٹھ جاتے تھے ایسا ملال تھا کہ کچھ پیتے تھے نہ کھاتے تھے دنیا کے کام سے منہ پھیر لیا تھا۔ اس ملال سے آنکھوں میں اندھیرا تھا اور دو پہر اسی کا چرچا رہتا تھا سلطان عالم سے بھی موقع پر ذکر آجاتا تھا لیکن نواب کے خوف سے ٹال دیا جاتا تھا جیسا یہ ایک ہے اگر دو چار بھی اور ہوتے تو کاہے کو مسلمان مسجد کو روتے۔

عبرت انگیز واقعہ

دہم ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ قدسی کو سر شام مولوی خادم احمد صاحب کی انتہا آئی عالم تہ و بالا ہوا بر تمام رنج و ملال اور دو شالہ ہوا۔ دم بدم مرض بڑھتا تھا۔ دم گھٹتا تھا رگ رگ میں نیش غم کھٹکتا تھا خویش و اقربا نے دوڑ دھوپ میں کیا کیا نہیں مرض الموت کی دوا نہیں نہ نواب کام آئے نہ روپیہ پیسہ کام آیا جو کچھ کیا تھا سامنے وہ کام آیا ۱۲ تاریخ ظہر کے وقت بیک اجل کو لبیک کہہ گئے سب کے سامنے کلمہ پڑھتے ہوئے سیدھے جنت الماویٰ کی راہ لی مورد رحمت الٰہی ہوئے گنہگار بھی بے گناہ ہی ہوئے سب بکھیڑا پڑا گیا حسرت کے عالم میں کوئی بیٹھا کوئی کھڑا رہ گیا اس مرگ ناگہانی سے سب کو حیرانی ہوئی۔ حسرت کی نشانی ہوئی آخر جنازہ لے کے چلے۔ سینکڑوں آدم ماتم کرتا ساتھ تھا کوئی نالہ و آہ کرتا تھا کسی کی زبان پر یہ بیات تھا ہندو مسلمان روتا تھا لیکن وہ بھی ذکر ہوتا تھا۔

ناچار نماز پڑھ کے پیوند زمیں کیا۔

امیر المجاہدین کی دوبارہ روانگی

جب امیر المجاہدین کو مسجد میں بہت دن بسر ہو گئے تعمیر مسجد کبھی کا نواب کو کبھی جھوٹے میں بھی دھیان نہ آیا کسی کو ٹھہرایا ہے وعدہ فرمایا ہے اور مجاہدین کا تقاضہ شدید تھا جماعت قدیم کے سوا اور بھی بہت اہل اسلام بہ نیت جہاد آئے کہنے لگے ہم ایسے جھوٹے وعدوں سے بہت گھبراتے اب مناسب ہے کہ چلیے اس منحوس شہر سے نکلیے۔ ناچار مولوی صاحب نے رخصت کے باب میں اصرار کیا۔ اب یہاں ٹھہرنا بے سود ہے۔ دینداری کار گزاروں سے ہے مسجد سکے نہ ہونے کا اب تک گمان ہے کیفیت اور محضر مرسلہ مولوی نہال الدین نے مولوی حفیظ اللہ خاں سے ہے۔ بشیر الدولہ نے بھی کہا تعمیر مسجد ان لوگوں کے ہاتھ سے دشوار ہے حیلہ انگریزی ان کا شعار ہے چلیے ان شاء اللہ تعالیٰ ہم بھی آتے ہیں بلکہ دیانت الدولہ بہادر کو ساتھ لاتے ہیں۔ بگڑی پھر میں گرمی کو تاخت و تاراج کریں گے۔

مولوی مسیح الزماں کا ایثار

قصہ مختصر نوروہم ذی الحجہ سن مذکور کو مولوی امیر الدین علی صاحب نے اسی شان و شوکت جاہ و حشمت سے نصر من اللہ و فتح قریب پڑھ کر کوچ کیا اور مولوی مسیح الزماں صاحب ایمان صاحب اپنا کارخانہ بنا بنایا بگاڑ کے دنیا سے دل اٹھا کے منہ موڑ کے بہ نیت خالص جہاد کان پور سے آئے تھے وہ بھی مولوی صاحب سے بیعت کر کے ہمراہ ہوئے۔ ان کی خوش بیانی اور شیریں زبانی سے گروہ مسلمانوں کا موج در موج آنے لگا لشکر اسلام کی طرح ابر لہرانے لگا۔ بایں تزک و احتشام قریب شام امیٹھی شریف میں داخل ہوئے وہاں سے بھی بہت مسلمان لشکر میں شامل ہوئے شب کو آرام کر کے بفضل خداوند کریم بحفظ مستقیم فیض آباد کو راہی ہوئے۔

حکم امتناعی

۲۴ ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ تھی کہ اہلکاران سرکاری کو اجازت ملی کہ جاؤ اور مولوی امیر الدین علی صاحب کو لاؤ آگے بڑھنے نہ پائیں ہنومان گڑھی پر چڑھنے نہ پائیں کسی طرح لوٹا دیں یا روکو۔ چنانچہ میر صفدر علی اور رمضان علی ان کے نائب اور دو شہر بٹیا نصرت جنگ نواب کا مصاحب اور محمد تہور خاں بہادر رسالدار اور میر محمد حسین کلکٹر سحر گنتہ رادہ شیخ حسین علی کارندہ نواب علی خاں محمود آباد

اس عہدے پر ممنون ہوئے۔

ناحق چوٹ جولاہا کھائے

سرکاری لوگوں پر لشکر اسلام کا امیار رعب چھایا کہ ڈر کے مارے کوئی
فوج محمدی کو گرد نہ آیا سب ٹھٹھک کر رہ گئے محمد حسین خان لشکر کوٹ والے تو پر
خان اور شیخ حسین علی وغیرہ بڑے بڑے تھے نہ جا سکے۔ لشکر اسلام اسلام سے دور قیام کیا کسی ان کی معرفت
پیغام سلام کیا۔ اگر اجازت ہو تو ہمیں بھی آپ کی زیارت سے سعادت ہوگی یہ لوگ تلاش فکر میں تھے کہ
جو شخص ہے ناحق چوٹ جولاہا کھائے گرگہ چھوڑ تماشے جائے مصداق ہوگی۔ رمضان علی اور عامل نواب
تک پہنچ کر وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ ہو گئے۔ یہ دونوں آگے ہو گئے تھے غازیوں نے منہ چڑھایا کہ امیر المجاہدین
سے ملاقات کریں۔ لوگوں نے آنے نہ دیا آگے قدم بڑھانے نہ دیا۔ جب امام المجاہدین سے اجازت ملی ہتھیار
رکھ کے ملنے کے لئے یہ سب نہتے دربار میں پہنچے جس دم مولوی صاحب سے گفتگو کرنے لگے۔ وہ دم تقریر
کرتے کلمے زبان پر لائے کہ سبحان اللہ آپ دو تین سو جولاہے لے کے گڑھے کھودنے چلے ہیں۔ خوب
جو ملے ہیں وہاں پر مچھر نہیں مار سکتا۔ اگلوں کی طرح جان دے دو گے اور کیا ہوگا۔ اسلام کا تعلق
عیاں ہوگا برا ہوگا! اتنا کہنا تھا کہ آفت آئی بعض کہتے ہیں کہ سوائے ہشت و مشت کے نوبت کی نوبت
آئی۔ آخر کو ذلیل و خوار ہو کے دو تین آدمی گرفتار ہوئے۔

نئی چال نیا جال

القصہ جب مجبور ہوئے تو غدر کرنے جانے لگے دلیں لغاوظاہر میں
رفاقت کا دم بھرنے لگے کہ ہم لوگ ملازم سرکار ہیں لیکن آپ کے
تابعدار ہیں۔ سرکار فیض آثار کو منظور ہے کہ آپ ایک مہینہ اور تامل فرمائیے اگر اس عرصہ میں مسجد تعمیر
ہو گئی تو بالمراد ورنہ بے تکلف فیض آباد کو چلے جائیے اور ایام موعودہ تک آپ جماعت کے ساتھ چہلالی یا فتح پور میں
بسر کریں۔ جو کچھ کھانے پینے میں آپ کے صرف ہوگا وہ سرکار سے ملیگا اور ہم بھی عہد کرتے ہیں ایک
قرآن مجید پر ہاتھ دھرتے ہیں کہ اگر اس میعاد کے اندر مسجد نہ بنوائی تو انشاء اللہ ہم بھی آپ کے شریک
یعنی شامل جدال و قتال ہوں گے۔ جب ان سب نے کئی دن تک بہت باتیں کیں اور ایسی غلط
قسمیں کھائیں تب سلطان المجاہدین بھی سمجھے کہ اگر مرائی ضرور نہیں اور مہینہ کچھ دور نہیں بعد میعاد کے جیسا

پھر اہالی سرکار کیا کہیں گے۔ یہ سوچ کے حسین علی کیساتھ سہالی میں کہ قطب الدین شہید رحمۃ اللہ کا مدفن ہے رونق افروز رہے مشغول عبادت خدا شب و روز ہوئے اور مولوی مسیح الزماں صاحب تھو خاں کیساتھ لکھنؤ میں تشریف لائے تھا انھیں کیساتھ دو چار بار نواب کی خدمت میں گئے تھے نواب نے تعمیر مسجد کے باب میں ایسے کچھ کلمے لکھے کہ مجھے تقریر سا بت ہو فقط جب زبانی جھوٹی کہانی تھی آخر مولوی تراب علی صاحب اور مولوی حسین احمد صاحب اور مولوی عبد الرزاق صاحب سے ملاقات کر کے چلنے پر آمادہ کیا آپ سہالی کا ارادہ کیا۔

راجہ مان سنگھ کے جاسوس

سہالی میں ایک روز تین فقیر بھیک مانگتے ہوئے خروج اسلام کی طرف سے گزرے۔ نمازیوں نے ان سے دریافت کیا کہ یہ زنانہ وار ہر کارے ہیں، ہمارے ہی غازی کا جامہ پہنے ہیں۔ اس گمان سے ان تینوں کو الغرض تازیانہ کی مار مارنا شروع کیا۔ مارے بھوت بھاگتے ہیں اور لکڑی کے بل بندر ناچتا ہے۔ جب خون کے فوارے بدن سے نکلنے لگے تب ہاتھ باندھ کے کہنے لگے ہم راجہ مان سنگھ کے نوکر ہیں خفیہ خبر پر مقرر ہیں جیسا کیا تھا دیا بھر پایا اب اگر آپ سے خلاصی پائیں گے تو تمہاری جماعت کی دعا مانگتے چلے جائیں گے۔ اس کی خبر امیر المجاہدین کے گوش زد ہوئی فرمایا کہ کان مروڑ دو اور چھوڑ دو ہمارا خدا مددگار ہے راجہ بیچارہ کیا نابکار ہے۔

مسیح الزماں کی بیوفائی

اب کی بار مسیح الزماں بعد ملاقات ہائیاں کر کے جب سہالی میں گئے خدمت فیض درجت میں کچھ عجیب حالت اور کیفیت میں پہنچے ظاہر ملے باطن میں خلاف رہنے لگے۔ مجاہدین کو بہکانے لگے نفاق کی باتیں کرنے لگے۔ اپنا گروہ الگ جمایا لیکن وہ لوگ جیسے مسلمان جلد ہوشیار ہو گئے۔ آخر جب ان کو بالکل بہکا ہوا پایا تب یہ مشورہ ٹھہرا کہ لشکر اسلام سے خارج کرو پھر ان کا نام نہ لو اپنا سا منہ لیے چلے آتے۔ سبحان اللہ وبحمدہ مسیح الزماں کا وہ آنا تھا کہ لشکر اسلام مشہور ہوئے۔ انجام یہ ہوا کہ لوگ نفرین کرنے لگے یہی نمک حرام مشہور ہوئے۔

مولوی تراب علی و مولوی عبد الرزاق

جب مسیح الزماں کی کجروی کی خبر مولوی تراب علی صاحب و مولوی عبد الرزاق صاحب کو پہنچی کہ وہ ہی نیت سندیلہ کو تشریف لے گئے تھے گو ابھی تک سامان درست نہ ہوا تھا لیکن سید صاحب سہالی کو رعایت پھر تو مجاہدین کو

بڑی تقویت ہوتی بہت قوت ہوتی اور اکثر مسلمان ان صاحبوں کے باعث شریک لشکر اسلام ہوتے جو کوئی
سمجھتا تھا کہ ہمارے پیشواؤں نے حکم نفیر عام دیا ہے اور لکھنؤ اودھ بہالی میں مقام کیا ہے چلنے کا سامان کرتا تھا
اور جو کوئی جانے سے معذور تھا مگر زردار صاحب مقدور تھا وہ سلاح وغیرہ اسباب جنگ حاضر کرتا تھا تو پیکر خاطر
کرتا تھا جس وقت ایام موجودہ میں وہی ایک خلفشاری زمانہ ہو گیا امیر المجاہدین نے مولوی تراب علی اور مولوی
برہان الحق وغیرہ سے کہا کہ واہیان سرکار کو اب کیا عذر باقی رہا وہ شامت میں خواہ مخواہ حیلے نکالتے ہیں اور سراسر
ٹھنڈی ہوا ہے صاحبو ہم تو بسم اللہ کرتے ہیں ان لوگوں کو عذر تھا اعمدار تھے سب کے سب کہنے کے ساتھ ہی
تیار تھے۔ تاریخ روانگی مقرر ہوتی تیاری لشکر ظفر پیکر ہوتی۔

طفل تسلیاں

جب خبر کوچ مشتہر ہوئے یہاں کے حکام کو اضطرار ہوا امیر المجاہدین کے توقف میں
اصرار ہوا اسلئے ادھر مان سنگھ کو فیض آباد اودھ کی طرف روانہ کیا کہ جلد جاکے مسجد بنوا دو اور اگر
کچھ مسجد کی اثبات میں شبہ ہو تو مہنتوں کو در دولت پیسہ دربکاری کے واسطے لاؤ غرضیکہ زبانی جھوٹ سچ تہدید
کی اور دھمکایا اور ایک دوشالہ رومال بہت بھاری منگا کے اوڑھایا اس نے بھی جی میں کہا چلو مفت میں کھاگئے
احسان کرو حضور عالم کی مہربانی ہے لطف زندگانی ہے اب کی کا گر آؤں گا تو ایک دو مہنت کو بھی ساتھ لیتا
آؤں گا کیا نقصان ہے میرا سامی بنو بان ہے۔ ایسی احمق سرکار کہاں ملتی یعنی غنیمت ہے دوشالہ وغیرہ خرابات
ہوائے ہنگام فسادی شاید حکومت ہندوستان ملنگی اور ادھر افسران فوج کو حکم ہوا کہ پھر مولوی امیرالدین علی
صاحب کی خدمت میں جاؤ اور بکمال تملق سمجھا بوجھا کے جس طرح بن پڑے متوقف کرو یہاں تک کہ سر بھی ان
کے قدموں پہ دھر دو کہنا کہ اب عزاداری محرم سے فراغت ہوئی ہے ماتم امام علیہ السلام سے فرصت ہوئی ہے
تعمیر مسجد میں خوب اہتمام ہوگا ایک دم نہ آرام ہوگا بعض افسروں نے بلطائف الحیل جانے سے انکار کیا۔

امیر المجاہدین کی مصالحت پسندی

مگر بعض افسر بہائی کے پہنچے معاذ اللہ گویا عذر کی گوشمالی
پہنچی لیکن اجازت حضوری امیر المجاہدین علامہ الانام علی
بہ ہولی بکمال عرض و معروض محمد تہور خاں رسالدار اور مرزا قدرت اللہ بیگ چکلہ دار اور میر محمد حسین ککڑ اور
شیخ حسین علی کارندہ نواب علی خاں کو حضور بلایا اور کہا اب کیا ہے جواب دیا کہ گرچہ مقتدائے حمیت اسلام تھا

آپ کی خدمت میں آتے اور پھر منھ دکھلاتے لیکن کیا کریں تابعدار ہیں حاکم کے فرمانبردار ہیں کیا مشکل ہے اگر آتے ہیں تو آپ سے شرماتے ہیں ورنہ روزگار سے جاتے ہیں اب پھر نواب صاحب بہادر نے آپکا پیغام دیدیا اور یہ عذر پیش کیا ہے کہ یہ مہینہ ماہ ماتم فرزند رسول مقبول تھا میں عزاداری محرم میں مشغول تھا. انشاءاللہ تعالیٰ اب تھوڑے توقف میں بہت کام بن جائیگا. بے تامل خانہ خدا لیے قدوالجلال والاکرام بن جائیگا. چنانچہ مانک جگو کو سوتے لودھ بھیجا ہے اگر وہ مسجد بنواتا ہے تو بہتر نہیں تو یہیں ہنتوں کو لاتا ہے کما ینبغی روبکاری ہوگی بہرحال مسجد کی تیاری ہوگی اب ہرگز تامل نہ ہوگا اس امر میں کسی طرح تعلل نہ ہوگا. آپ کو بھی مناسب ہے کہ مولوی برہان الحق صاحب اور مولوی عبدالرزاق صاحب اور مولوی تراب علی صاحب کو بطور رسالت و سفارت روانہ فرمایئے اب یہیں. جایئے ان کے ساتھ بخوبی روبکاری ہوگی. عیاں کیفیت ساری ہوگی. غرضکہ ایسی کچھ باتیں بنائیں نشیب و فراز کی صورتیں دکھائیں کہ امیر المجاہدین نے ان کی گفتگو بظاہر معذرت آمیز و بباطن فتنہ انگیز سن کے توقف کیا اور تینوں مولویوں کو فقط پانچ دن کے وعدے پر مع عرض کے روانگی کا حکم دیا۔

چار ثالثوں کا واجد علی شاہ کیطرف سے تقرر

۲۷ تاریخ محرم الحرام سنہ ۱۲۷۲ھ قدسی کو وکلائے لشکر اسلام مقام لکھنؤ میں داخل ہو دربار میں شامل ہوئے وہاں ایک منت بھی حسب الطلب آئے اور نواب احمد علی خاں اور مولوی غلام جیلانی اور مولوی غلام امام شہید[1] اور مولوی فضل حق خیرآبادی[2] چار ثالث مقرر فرمائے۔

ہنتوں کے ساتھ شاہی سلوک

لیکن عجب یہ ہے کہ ایکدن بھی وکلائے اسلام اور ہنتوں کا روبکاری پر سامنا نہ ہوا. نواب صاحب نے کچھ بھی خیال کیا کہ کون ہیں کہاں سے آئے ہیں کسی کا پیغام لائے ہیں بلکہ ہنتوں کی توقیر بھی ہوئی صوبہ سنگھ کپتان کی پلٹن میں جگہ بسنے کو ملی. انھیں کے تلنگے حفاظت کے واسطے مقرر ہوئے۔

پھر جبر کا رہا

ظاہر یہ پنچایت وغیرہ ٹھہرانا فقط ایام گزاری تھی مسجد بنوانا کسی طرح منظور نہ تھا. چاہتے تھے

---

[1] جن کا میلاد اب تک مشہور ہے۔

[2] مشہور فلسفی عالم اور بزرگ جن کا بجرم بغاوت کالے پانی میں انتقال ہوا (مرتب احمد جعفری)

کہ یہاں تک مولوی صاحب کو روک لیے کہ جماعت ٹوٹ جائے۔ میر الزماں کو دوں چھپڑا لیا علماء کے وکالت کے بہانے سے بلا لیا اب کیونکر جماعت کم نہ ہوگی۔ الغرض دروغ گو را حافظہ نباشد نہ نبھایت ہوئی۔ مسلمانوں کی حمایت ہوئی وکلائے لشکر اسلام بھی نواب کی عدم توجہی دیکھ کے تھک کر بیٹھ رہے۔ پانچ دن کا وعدہ کر کے گئے تھے کئی ہفتہ گزر گئے مگر نہ ہوئے لشکر ظفر پیکر گئے۔ حاکم کے خوف سے دل رنج ہوتے۔ بعض اشخاص سر عام کہتے ہیں کہ یہ لوگ اس بہانے آئے ہیں ان کا جانا دشوار ہے۔ بہیار سے کاغذ کے گھوڑے دوڑانے لگے نام و پیام سے امیر المجاہدین کی تسکین فرمانے لگے۔ بجنبہ کو لشکر اسلام نے مہالی سے کوچ کیا۔ زمین تھراتی تھی ہاتھی پر لشکر کا نشان ہم پہلو تھے سمان نشان و نکلو کوئی پیادہ کوئی سوار مگر بے شمار کوئی اپنا گھوڑا کودتا تھا کوئی پیادہ نہیں ہیں ملے جرات کے آگے جاتا تھا قلب گاہ میں سلطان المجاہدین کی پالکی القبلتین بڑھتے چلے جاتے تھے کس ملاحظہ ادب سے قدم بڑھاتے تھے۔

مجاہدین کی وحشت

جو یہ شان و شوکت لشکر اسلام کی خبر یہاں عام ہوئی گھر گھر پہنچی کشتی لکھنؤ کی طرف اپنی سندروں کے ہوش بجتے ہے بدحواس سب اور کوہ دم فاتحہ ہے مغلیں جھانکنے لگے۔ حاکم سے رعایا تک ہر بشر درد مند تھا یا نہ صبرا ہوا کہ پہروں سے صراف بند ہوا۔ کوتوال پر تہدید ہوئی تاکید شدید ہوئی کہ شہر سے خبردار رہنا اپنے کام سے شعبہ نہ بالٹ جانیکا ڈر ہے

بادشاہ کا اضطراب

اگر صبح کو خبر آئی کہ نزد مجاہد جو میں تو شام کو پرچہ لگا کر دور بار ہیں۔ تب تو نواب کمال اضطراب ہوا کہنے لگے کہ یہ گھر خراب ہوا اب یہ انبوہ کب رکے گا صفائی ہو جائیگا۔

بادشاہ کی مجتہدوں سے گفتگو

آخر اسی اضطراب میں طرفہ تدبیر عقل میں آئی کسی استاد نے سمجھائی کہ مسئلہ جہاد میں اختلاف ہے آپ کیوں نہیں ارشاد دیتے ہیں عالموں کو کیوں نہیں حکم دیتے ہیں وہ ابھی چلے جائیں سب کو پھیر لائیں۔ یہ سنتے ہی نواب بحال ہو گئے اور سب ملال ہو گئے۔ پہلے نواب نے سلطان العلماء سید محمد اور سید العلماء میر حسین صاحب دونوں

مجتہدوں کو بلایا اور فرمایا کہ آپ کو یہ معلوم ہے کہ باعث فروغ مذہب اثنا عشری خاندان ابوالمنصور خان مرحوم ہے نیز اتحاد اسی خاندان سے چمکا ہے یہی خاندان سبب تمہاری جاہ و حشم کا ہے خصوصاً سعادت علی خاں کی اولاد نے تمہیں سر چڑھایا ہے۔ امجد علی شاہ نے تمہارا رتبہ بڑھایا ہے اگر یہ گھر نہ ہوگا تو آپ کہیں رتبہ معتبر نہ ہوگا آپ اس گھر کو مٹاتے ہیں مولوی امیر الدین علی صاحب کو رغبت دلاتے جہاد دلاتے ہیں لوگ آپ کی تحریروں اور ترغیب سے چلے جاتے ہیں اب آپ کو مناسب ہے کہ جا کر مولوی امیر الدین علی صاحب کو پھیر لائیے مجتہد نے تخلیہ کر کے جواب دیا کہ لا حول ولا آپ کا کیا خیال کدھر ہے شاید کلام عوام پر نظر ہے ہمارے نزدیک ہنود اگرچہ بت پرست ہیں لیکن ذمی مطیع الاسلام ہیں۔ خروج ان پر روا نہیں مذہب امامیہ میں بدون امام جہاد جائز نہیں۔ لیکن اگر ہم منع کرتے ہیں اچھا کلمات افہام و تفہیم زبان پر لائیں گمان کیا ظن غالب ہے کہ مبادا مضمون دستخط سے آگاہ ہو جائیں اور ہمیں کو ہدف تیر جہاد بنائیں۔ اس صورت میں آپ بدنام ہوں گے مطعون خاص و عام ہوں گے مناسب ہے کہ علمائے سنت و جماعت کو افہام کے واسطے ارشاد کیجئے۔

علماء آلہ کار بنائے گئے

غرض نواب کو یہ معقول کیا کہ انھوں نے بے عذر قبول کیا اور اسی وقت سب عالموں کو حکم پہنچایا کہ جلد جاؤ اور جس صورت ممکن ہو اس فتنہ کو مٹاؤ تمہارے واسطے بہت فروغ ہوگا۔

یہ حکم سنتے ہی ان لوگوں کے دل کی کلی کھل گئی۔ علماء نے خدا کی کتاب پیغمبر اسلام کی حدیث بھول گئی کتابیں کھلیں روایات ضعیفہ کے لئے ورق الٹے گئے؛ جناب مولوی احمد اللہ صاحب اور جناب مفتی محمد یوسف صاحب وظیفہ نمک خوار سرکار تھے حیلہ شرعی بھی بموجب حکم کے ساتھ تیار تھے مگر ان لوگوں کو دیکھئے جن کو کسی طرح کا تعلق سرکار سے نہ تھا زیادہ ان سے اصرار نہ تھا سلطان المجاہدین سے ملاقات کا پیغام کیا سب طلب دونوں مفتی صاحبین اور مولوی حسین احمد صاحب اور مولوی ابو الحسن صاحب لشکر اسلام میں رونق افروز ہوئے اور ملازمت امیر المجاہدین کو نذر دی اور زبان حمد و صفت میں کھولی کہ یہ جو ہے کہ آپ نے اس زمانہ آخر میں اسلام رکھ لیا دین محمدی کا نام رکھ لیا ماشاء اللہ صاحب ہمت اولو العزم

کہاں ہے۔ ایسی دو چار باتیں سنا کے خلق خدا کو رام کیا اپنا کام کیا کہ ہم کو آنے کی غایت دھمکی مطلق حاکم کی رعایت نہ تھی لیکن بقول شیخ سعدی شیرازی علیہ الرحمۃ ؎

اگر کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینم گناہ است

حاکم صدر صاحب نے کہا کہ یہ سرکار کی سپاہ ہے اور یہ بھی عیاں ہے کہ فوج حاکم آپ سے زیادہ ہے کئی سو ضرب توپ تیار گولنداز مستعد ہوشیار آپ کی طرف ٹوٹی پھوٹی دو چار بندوقیں جو کبھی نہیں اس وقت نہ یا واجب بلکہ فرض ہے کہ اودھ[1] کو نہ جائیے یہیں عزیمت فرمائیے اور اگر خواہ مخواہ قصد کوچ کا کریں گے اور نواب کی فوج سرکار سے لڑ کے مریں گے۔ اس صورت میں ثواب کہاں ہے۔ اگر آپ کو اس کا خیال ہو کہ ہم اور مولوی محمد یوسف ملازم سرکار ہیں پابند دنیا داری ہیں تو مولوی ابوالحسن صاحب اور حسین احمد صاحب کسی طرح کا سرکار سے سروکار نہیں رکھتے ہیں۔ دولت دنیا پر ملازمت نہیں رکھتے ہیں دنیا سے ناراض ہیں دونوں صاحب مقام قرب میں ان سے احقاق حق کیجئے پھر نہ انکار مطلق کیجئے وہ دونوں صاحب بھی مصدق کلام ہوئے امیر المجاہدین نے بھی مناسب وقت کے جواب دیا۔ اس گفتگو کے صحبت برخاست ہوئی۔

عوام میں ہلچل

اس وقت لشکر اسلام میں کچھ صورت اور ہوئی ہلچل فی الفور ہوئی بلکہ کچھ خلاف لشکر اسلام سے اٹھ کے عالموں کے پاس آئے علماء کی خلاف آمیزی تک غل گیا مفتیوں کی دیری کا پردہ فاش کھل گیا اس پر بھی مفسدوں کو قرار آیا زیادہ فتنہ بڑھایا مسلمانوں کو تعمیل فتوے و دستخط علماء پر راضی کیا۔

فتوے پر علماء کے دستخط

خوف سے علماء پر ایسا آیا کہ سب دستخط پر آمادہ ہو گئے مفسدوں کی بن آئی۔ جب یہ مضمون حسب عادت بندھ گیا تب الشیخ قمر جو سرکار سے محض فتنہ انگریزی اور تفرقہ پردازی کو جمع ہو کے مامور ہوتے تھے۔ بظاہر جبہ و خرقہ عبا اور قبا اوڑھے اسلام سے ایک مسودہ فریب آمیز گانٹھ کے استفتا کیا مفتیوں نے بے تکلف صاحب ... از راہ خلاف دستخط کر دیے۔

---

[1] اودھ سے مراد فیض آباد ہے۔ (رئیس احمد جعفری)

استفتا اور فتوی

بادشاہ باعث فساد حکم بالادست مجبور شد مصلحت چند ایام مع رو انگی سے فرماید دریں حال اگر مولوی امیر الدین علی صاحب کو بچ سازند مقاتلہ و مجادلہ از مجاہدان وافواج سلطانات اسلام آنسپرمیں مرگ مسلمان طرفین چگونہ خواہد بود
جواب

دریں حال جماعت مولوی امیر الدین علی ۔ اہر گز قتل روا نیست بل در نہی قولہ تعالیٰ داخل شد نست کذا فی العالمگیر کتبہ محمد سعد اللہ عفی عنہ فی الواقع عزلت بباید در شہادت و غدغہ است کتبہ محمد یوسف صح الجواب حررہ حسین احمد صح الجواب کتبہ محمد عبد اللہ اگر از حاکم بالادست سلطنت فراجرا سے کلمۃ الرفاہی النین توی متصور و متیقن باشد بحکم انکم من تبغی الباغین فاہم علیہ ان ما ہو شما و ما کان تحت الامر با جدا و متناسب واللہ اعلم بالصواب حلیہ الشکان حررہ انقر العباد ابو الحسن عفاعنہ ۔ سب علماء کی عبارت اسی قسم کی ہے کہ خوف حاکم سے مبہم کر دیا ہے ۔

شہادت دلچسپ مادہ تاریخ

انھیں عالموں کی شان میں تاریخ ہے کہ ایک ترکیب سے کہ تشتر وا کہ تحت لا میں واقع ہے بحکم الامادہ امیر سے خارج ہوا اور لا شریک اعداد تاریخ ہوا ۔

ایک اور دلچسپ مادہ تاریخ

کسی نے مفتی اور مولوی برہان الحق صاحب اور مولوی تراب علی صاحب اور مولوی عبد الوالی صاحب کی بھی شان میں کہ ہر چند نواب شمس اور علماء کے بلایا اور کہار بھیجے کہ مولوی امیر الدین علی صاحب کے پاس جاکے انہام و تفہیم کرو مگر اپنی حق پرستی سے نہ گئے ، تاریخ لکھی ہے کہ ـــــ اسی ترکیب سے مشرون کہ تحت لائیں واقع ہے وہ تاریخ لکھی ہے اور لا شریک اعداد ہوا اور لطیفہ اسمیں یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ صیغہ نفسانی کافر مانا ہے کہ لوگ سادہ میں کہ نہیں لیتے ہیں میری آیات کی قیمت ۔ صیغہ مضارع کا حقیقی پرستی پر دلالت کرتا ہے کہ خداوند تعالیٰ بکمال خوشی سے ان کی صفت کی حکایت کرتا ہے بخلاف صیغہ نفی کے ۔

فوج شاہی درغلانے میں آگئی

شہر میں غوغا پڑ گیا چار وں طرف ایک تہلکہ پڑ گیا بہادر شاہ بیچارا اس کے ڈرانے میں دغا سے ناحق ڈنا ر دا جا دینی گوارا

نہیں کیا قول علماء سے چارا نہیں۔ شہادت کے لئے جان و مال نوکری چاکری سے ہاتھ اٹھایا تھا خوب موقع ہاتھ آیا تھا اگر اس معرکہ میں شہادت نہیں تو ہمیں لڑائی کی حاجت نہیں ہم عالموں سے اپنی تسکین کر چکے ہیں ان کے کہنے پر یقین کر چکے ہیں قصہ کوتاہ فوج شاہی صاف امیر المجاہدین سے پھر گئی جہاد کی عظمت در اشک کی طرح نظروں سے گر گئی علماء نے بھی وہاں سے آگے اپنے اپنے گھر کو آباد کیا حضور عالم کے دل کو شاد کیا

عوام پر علماء کی غلط کاری کا ردعمل

یہاں عجب طرح کا معاملہ علماء کے پیش آیا کسی نے زبان طعن و تشنیع کھولی کسی نے قصیدہ ہجویں کہہ کے اکبری دروازہ میں لٹکایا۔ اب یہ حال ہے کہ جدھر نکلیے ہجو علماء کی نظر آتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عالموں کی پتھر کی چھاتی ہے سنتے ہیں اور خاموش ہیں دوسرا ہوتا تو زہر کھا کر مر جاتا مگر شکر خدائے عز و جل

جوش جہاد پر کوئی اثر نہیں پڑا

کہ تفریق جماعت کی بڑی بڑی تدبیریں ہوئیں کیا کیا تحریریں اور تقریریں ہوئیں اگر ایک بہانے سے لشکر اسلام سے اٹھ جاتا ہے تو دوسرا آتا ہے جماعت مجاہدین بدستور ہے اور ہر دم زبان پر یہ مذکور ہے کہ ادھر کا چلنا ضروری ہے۔ وہی کثرت جماعت ہے وہی شان و شوکت ہے نامرد جان کے خوف سے چلے جاتے ہیں۔ کھٹکا اتنا ہے کہ فوج شاہی گھیرے ہے لشکر اسلام کی طرف توپیں پھیرے ہے لیکن ان جوانمردوں کو کچھ خیال نہیں جینے کی خواہش مرنے کا ملال نہیں ہر روز تیاری ہے اور لب پر یہ کلمہ جاری ہے کہ جب اس لشکر نے سیلاب وار کوچ کیا فوج شاہی کائی کی طرح ہٹ جائے گی۔ ایک کنارے ہٹ جائے گی لشکر اسلام موجیں مارتا لہراتا چلا جائے گا ڈنکے کی چوٹ پر بڑھا جائے گا اگر فوج شاہی لڑے گی تو آفت میں پڑے گی غرض جو مشیت ایزدی میں ہوگا وقوع میں آئے گا۔ بے کم و کاست لکھا جائے گا۔ ان اللہ[1] قریب من المحسنین

---

[1] تحقیق کہ اللہ نزدیک ہے نیکوں سے۔

کوچ کا فیصلہ

۲۰ صفر المظفر ۱۲۷۲ھ بروز پنجشنبہ معلوم ہوا کہ شب کو مولوی امیر الدین علی صاحب نے فرمایا کہ علی الصباح بعد نماز فجر جانب ردولی کوچ ہے لشکر اسلام میں تیاری ہونے لگی۔ تدبیر بار برداری ہونے لگی۔ یہ خبر جو افسران شاہی کو پہنچی گھبرا گئے۔ امیر المجاہدین کی خدمت میں حاضر ہوکے عذر کیا کہ ابھی کوچ واجب نہیں خلاف رائے حاکم مناسب نہیں چند روز اور تامل کیجئے تھوڑا اور تساہل کیجئے مخدوم الانام نے فرمایا یہی حکم سنتے سنتے کئی مہینے گذر گئے اب ہم رکنے کے نہیں تم بھی اگر ایمان رکھتے ہو تو ہمارے ہاتھ میں ہاتھ دو کام نیک ہے ہمارا ساتھ دو ہمارے تمہارے درمیان بھی عہد و پیمان تھا بلکہ قرآن درمیان تھا اگر تم بھی اپنے عہد پر مستقیم نہیں تو جو حکم تمہارے حاکم کا ہو بجا لاؤ توپیں سر کرو بندوقیں سر کرو لشکر اسلام کی خونریزی پر شوق سے آمادہ ہو۔

امیر المجاہدین کا نعرہ

جب صبح نمودار ہوئی اور فوج محمدی چلنے کو تیار ہوئی امیر المجاہدین نے بعد فراغت نماز فجر یکبارگی تاسف سے ایک نعرہ اللہ اکبر کا کیا آگاہ سب اہل لشکر کو کیا تو پھر یہ حال تھا کہ تمام لشکر کہتا تھا کہ یا اللہ تجھ سے فریاد کرتے ہیں ہم بر سر حق ہیں ہم پر یہ ناحق بیداد کرتے ہیں،

امیر المجاہدین کی شرائط صلح

آخر لشکر اسلام روانہ ہوا افسران سلطانی نے ہزار منت اور عذر خواہی دو تین دن کی رخصت چاہی خصوصاً تہور خاں بہادر نے خدمت سراپا افادت میں عرض کیا کہ حکام کو بہر حال قتل لشکر اسلام منظور ہے اور آپ کو اودھ جانا ضرور ہے کوئی صورت ایسی فرمائیے کہ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے کسی طرح جان عذاب سے چھوٹے۔ مخدوم الانام نے کہا کہ آپ ہی تصور کیجئے کہ میرا بے جا سوال نہیں میں طالب ملک و مال نہیں اتنا چاہتا ہوں کہ ایک آدمی نواب کا اور ایک اس خادم رسالت مآب کا ہنومان گڑھی میں چلا جائے مسجد قدیم پر فقط ایک مسجد کا خط کھینچ کر اذان کہہ کے نماز پڑھ آئے پھر مجھ کو دعوی نہ رہے گا

یہ مجمع اصلاً نہ رہے گا اور اگر نواب کو بھی یہ نامنظور ہو تو وہ جب تک کہیں گے ہم یہاں رہیں گے مگر امداد مصارف وغیرہ ہو۔ اس امر میں نہ کوتاہی ہو اور اگر یہ بھی خلاف ہو تو کہنا کہ ہم اپنے لشکر کے ساتھ عیش باغ میں مقام کریں گے دو مہینہ اور خاطرداری لشکر اسلام کریں گے اس مدت میں ایسی تدبیر ہو کہ مسجد تعمیر ہو جب مسجد بن جائے گی تو ہم جدھر چاہیں گے چلے جائیں گے ان کے ملک میں بھی نہ آئیں گے۔

بادشاہ کی بے پروائی

تہور خاں مولوی صاحب کے کلام نیک انجام سن کے بہت خوش ہوئے ابھی جاتا ہوں اور نواب کو سمجھاتا ہوں غرض دو تین دن کا وعدہ کر کے یہاں آئے ہر چند چاہا کہ نواب صاحب متوجہ ہو کے حال سنیں اور کوئی صورت نکالیں انھیں خون ناحق سے مطلب تھا ایسی باتوں کا خیال کب تھا وہ بیچارے دو دو پہر اسی قیل وقال میں رہے نواب صاحب مست اپنے حال میں رہے نوبت ملاقات بھی نہ آئی اور اگر اتفاقاً ملاقات ہو گئی تو نواب صاحب نے توجہ نہ فرمائی آخر وہ بھی خون جگر پی کے خاموش ہوئے ندامت سے بدلحاظ ہوئے اسی ہنگام میں اور نمبر والوں نے وزیراعظم کو عرضی رخصت کی کہ امید ہے کہ حکم قطعی لکھا جائے کہ ہر فدوی بجا لائے

حکومت کی چال

پہلے یہ حکمت کی کہ فوج شاہی میں جو اہل اسلام تھے مثل پلٹن علی غول اور پلٹن عسکری وغیرہ انھیں برخواست کر دیا فقط کفار کو تسلی کے واسطے چھوڑ دیا کہ مبادا اخراج نہ آ جائے مگر وہ مسلمان جو ہندوؤں سے بدتر تھے خواہ پیادے تھے خواہ افسر تھے انھیں بدستور رکھا چنانچہ شیخ حسین علی جو بالفعل اس فوج ستم کے کلکٹر تھے اور ظالموں کے رہبر تھے اور رجب خاں افسر کاتنان گلابی پلٹن کے زرد رو سالار عمر سعد کی نجوی یادگار اور فرزند علی امام علی داروغہ توپ خانہ کہ خوشخواہ زمانے کے دینی رہے اور باقی لوگ انگریز کو یہاں سے دور کیا۔ خوف خدا دل سے دور گیا۔

وزیر اعظم کا حکم نامہ

جب یہ صبغۂ انتظام ہو گیا قتل کا سر انجام ہو گیا تب بجواب عرضی افسران یہاں سے وہ حکمنامہ جاری کیا جس کے

مضمون قتل شبخون سے عالم کو مشغولِ گریہ و زاری کیا۔ کہ مولوی صاحب نے باوجود فہمائش ہمارا کہنا نہ مانا فساد کو مصلحت جانا خونریزی پر تیغ و سپر باندھی اب جس وقت کوچ کا قصد کریں ایک بھی قدم آگے دھریں، تو بے تکلف توپ سے اڑا دینا اس خیرخواہی کے عوض انعام اور خلعت ملے گا۔

بے وفائی مردماں ہمراہی امیر المجاہدین

جب اس طرح کا حکم قطعی آیا بے غیرتوں نے شرم کا پردہ اٹھایا افسران فوج شاہی کمال دلیر ہوئے خصوصاً یار محمد انگریز داد و شیخ حسین علی گرگ باراں دیدہ اس خون بے گناہ پر نہایت شیر ہوئے لیکن ہیبت لشکر اسلام کو دیکھ کے فوج کو قلیل پایا تب ان مکاروں کے دل میں خیال آیا کہ تفریق جماعت کی تدبیر کیجئے اپنے رسالہ مولوی محمد اسمٰعیل اور مولوی محمد شاہ کو لیا ان ظالموں نے بڑھ کر ظلم کیا ایسا دام مکر بچھایا۔ دانا دانا مجاہدین کو بہکا دیا کہ لوگ اس بھیڑ سے چھٹنے لگے معرکہ سے قدم ہٹنے لگے جس کو مفلس پایا روپیہ کھلا دیا دے کے سرکایا جس کی حیثیت ظاہری درست پائی طبع پر طبیعت سست پائی اس پر زن و فرزند کی گرفتاری، قہر و عتاب سرکاری کا ڈر ڈالا اور جب پر یہ دونوں زور نہ چلے اس پر یہ جوڑ توڑ ہے کہ جھوٹا نسبت بنا کے قدم رسول کی قسمیں کھا کے کسی سے کہہ دیا کہ فلاں شخص تمہاری غیبت کرتا تھا بلکہ لعنت و ملامت کرتا تھا سننے والوں کو غصہ آیا بگڑنے لگے یہاں تک کہ نفسانیت بڑھی کہ آپس میں لڑنے لگے۔ آخر اسی غصہ و غضب میں لشکر اسلام سے نکلے کسی کو یوں اپنا کیا کہ نوکر رکھ لیا سب مصارف اس کا اپنے سر پر رکھ لیا چنانچہ حاجی مرتضیٰ جی مجاہد قدیم ہمراہی سید احمد صاحب مرحوم بحیلہ تیاری سرمائی اختر نگر میں داخل ہوئے ہمراہی ان کے اپنے اپنے گھر میں داخل ہوئے اور میر عباس صاحب تھانہ دار کو کوتوال لشکر دیندار انھیں فسادوں کے باعث ڈیڑھ سو مجاہدوں کو لے کے علٰحدہ سرا میں مقیم ہوئے گو نیت میں فساد نہ تھا عزم عدم اشتراک جہاد نہ تھا لیکن بالفعل باعث قلت لشکر عظیم ہوئے اسی طرح بہت لوگ، اپنے قول و قرار سے نکل گئے جب وقت جان دینے کا آیا، بدل گئے

میدان کربلا کا سماں

ان افسروں نے دوسری یہ تدبیر کی اطراف کے ہندو زمینداروں کو یہ بات تحریر کی کہ عنقریب ہم لشکر اسلام کو لیا چاہتے ہیں بے گناہوں کو قتل کیا چاہتے ہیں تم بھی ہوشیار رہنا توپ کی آواز سے خبردار رہنا آواز کے ساتھ ہی تیر کی طرح آنا گولیاں لگانا جب سب طرف سے نشانہ ہو جائیں گے پھر ہر دم لشکر اسلام ایک دم میں عدم کو روانہ ہو جائیں گے

غرض جب دیکھا کہ جماعت میں یہی خلل ہے اور ایک دل ہیں تب ۲۵ صفر المظفر سہ شنبہ کی صبح سے بالکل رسد بند کر دی چاروں طرف آواز بلند کر دی کہ کہیں سے رسد پہنچنے نہ پائے پانی تک لشکر اسلام میں نہ آئے جو کوئی اس امر میں کوشش کرے گا گنہگار رہے گا سزا کا سزاوار ہوگا کافروں نے اس مقام کو میدان کربلا بنا دیا سب وہی سامان دکھا دیا اہل اسلام کو تمام رات اور دن بے دانہ و آب رکھا اور اس پر یہ طرہ ہوا کہ افسروں کے اشارے سے گنوار ملعون کئی بار بعزم شبخون آئے غازیوں نے للکار لیا نامرد بڑھنے نہ پائے لشکر اسلام تک گذر نہ ہوا بد خواہوں نے جو چاہا تھا اس کا اثر نہ ہوا شدید قلم جولانی پر ہے طبیعت بحر مواج کی صورت طغیانی پر ہے ہر چند بند روکتا ہوں نہیں رکتا ہے بیساختہ قلم کی زبان سے نکلتا ہے کہ یزید بد انجام نہیں اور حسین علیہ السلام نہیں باقی سب سامان وہی ہے مظلوم کشی وہی میدان دکھلاہے وہی انسداد آب و دانہ ہے بے دردی جفا کا کارخانہ وہی لوگوں کی بے وفائی ہے وہی دین کی لڑائی ہے وہی فوج کی چڑھائی ہے وہی سر وہی علم ہے وہی جور ہے وہی ستم ہے جو حسین علیہ السلام پر گذر اتھا وہی ستم عیاں ہے قدم بقدم یہ قافلہ رواں ہے فرق اتنا ہے کہ وہ امام تھے اور یہ غلام امام ہیں وہ پیشوائے دین تھے یہ اسلام میں یہ سرنام ہیں۔

شدائد و مصائب و شہادت امیر المجاہدین

۲۶ صفر المظفر ۱۲۷۳ھ روز چہارشنبہ کو رایات

ظفر آیات لشکر اسلام نے کوچ کیا منزل مقصود کا رستہ لیا لیکن امیر المجاہدین نے ہنگام روانگی یوں لشکر آراستہ کیا کہ مجاہدوں کے چار غول کئے ایک غول کو آگے بڑھنے کی اجازت دی ایک فرسخ کے فرق سے دوسرے کو رخصت دی تیسرے غول کو لے کے آپ تشریف فرما ہوئے طریق خدا میں گام فرما ہوئے چوتھے غول کو ارشاد کیا کہ جب ہم ایک فرسخ کے اندازے نکل جائیں تم چلنا اس سے پہلے نہ نکلنا دفعتہ نہفت زبان فیض ترجمان سے برجستہ یہ مصرع جس کو الہام غیبی یا القاء لاریبی کہئے نکلا کہ مصرع

سر میدان کفن بردوش دارم

بارلو کی چوکسی اور حکمت عملی

اب یہاں قدرت خدا دیکھئے اس کی مشیت کا ماجرا سنئے کہ فوج شاہی کو باوجود ہوشیاری کے نوم غفلت سے ایسی شکست ہوئی کہ مطلق خبر نہ ہوئی جب امیر المجاہدین کا غول کچھ دور پہنچا بارلو خواب غفلت سے چونکا کوچ کی خبر سنتے ہی ہوش جاتے رہے. تو اس باختہ ہوا اور دیوانہ بے ساختہ ہوا اور شیخ حسین علی سے کہا یہی وقت عیاری اور مکار گذاری کا ہے غافل کیوں ہو ہنگام ہوشیاری کا ہے اگر یہ لشکر محمد پور پہنچا تو سمجھ لو کہ بات دور پہنچی پھر اگر سب الملک محروسہ کی فوج جمع کر دو گے تو بھی ان لوگوں کا قلع قمع نہ کر سکو گے برائے خدا منزل سے اتر گھوڑے پر چڑھو لیکن بعد حکمت عملی سے تم مولوی صاحب کے غول کو مقام زد پہ ٹھہراؤ ان کو باتوں میں لگاؤ پھر ہم سمجھ لیں گے ایک دم کی فرصت آگے بڑھنے کی مہلت نہ دیں گے جب سردار کو مار لیا کوئی قدم میدان میں نہ جمے گا سب کے سب بھاگ نکلیں گے کوئی نہ تھمے گا تمہارے اوپر مولوی صاحب کو اعتماد ہے یہ کام تمہیں سے بن پڑے گا شیخ بھی اس وقت بڑی جرأت کر کے بادھر سے سرعت کر کے چشم زدن میں گھوڑا دوڑا کر آ پہنچا اور شجاع گنج کے اس پار امیر المجاہدین کے غول کو ٹھہرایا ساتھ ہی بارلو بھی معہ آتش خانہ آیا حسین علی امیر المجاہدین سے باتیں بنانے لگا ادھر بارلو کا ہر گولہ انداز موقع سے توپیں جمانے لگا.

علی حسین کی مکاری وعیاری

ادھر شیخ نے مخدوم الانام کے آگے ہاتھ باندھ قدموں پر ٹوپی رکھ منہ بنا کے عرض کیا کہ اگر آپ ایک بار اور ہمارا کہنا مانیں اور دہلی میں تشریف

فرمائے دو تین دن مقام کریں تو بہتر ہے۔ دجال مسجد بن جائے گی اور بندگان خدا پر آنچ نہ آئے گی یہ پھیرا ہے کا ہے بندہ ذمہ دار ہے خدا کو مانئے مجھ کو جھوٹا نہ جانئے کیسی نرم نرم ملایم باتیں کیں کہ مولوی صاحب کے دل میں اتر گئیں ادھر انگریز نے اسی راہ پہ ایک اونچا ٹیکرا دیکھ کر توپیں لگا دیں تفنگوں کی صفیں جما دیں

ادھر سلطان المجاہدین تاج العارفین اس دغا باز کی چرب زبانی سے رضامند ہو کے رودولی کو روانہ ہوئے اور ادھر شیخ صاحب اپنا کام تمام کر چکے تھے موضع کھلار کو چل دیے فقط اس واسطے نا پدید ہوئے کہ جائے انکار باقی رہے کہ بندہ جا چکا تھا تیر ، لوگ شہید ہوئے راہ لگانا اس واسطے تھا کہ نمک حرامی نہ ہو اور چلا جانا اس واسطے تھا کہ بدنامی نہ ہو لیکن اس کی خبر نہ تھی کہ جس نے یہ کلام سنا ہو گا کہ چلتے وقت انگریز سے کہہ گئے کہ میں اپنا کام تمام کر چکا تم کو اختیار ہے۔

قضاء کار لشکر اسلام ہمراہ امام حسب رہنمائی حسین علی اس ٹیکرے کے برابر پہنچا وہیں قابض روح کو حکم خالق اکبر پہنچا کہ مسلمانوں کو گلستان ارم دکھاؤ رضوان اور مالک دونوں ہشیار ہوئے اپنے عہدے سے خبردار ہوئے موت کی گرم بازاری ہونے لگی جہان کا بیع دین ٹھہرا سر کی سر دست خریداری ہونے لگی وہ دن روز رستاخیز سے کیا کم تھا زمین و آسمان درہم برہم تھا ساکن آسمان الاماں کہتے تھے۔ بے گناہوں کو ذبح ہوتے دیکھ کر فرشتے "کل یوم ھو فی شان" کہتے تھے وحش وطیر اس میدان کی قیامت کا گمان کرتے تھے "اقترب للناس حسابھم وھم فی غفلۃ معرضون" کا دھیان کرتے تھے اشجار کو بار غم سے زندگی بار تھی جس دم حسرت سے فرماتے تھے زبان پہ یہ مصرع لاتے تھے

سر میدان کفن بر دوش دارم

عرش سے آواز آتی تھی۔

بیا مظلوم اکنوں در کنارم

یعنی وقت شہادت

تاریخ اودھ کا
ایک سیاہ باب
اودھ پر انگریزوں کا قبضہ

انگریز اس ملک میں تاجر اور سوداگر کی حیثیت سے آئے تھے، مسلمان فرمانرواؤں نے ان غریب الوطن سوداگروں کو سہولتیں دیں، ان کے ساتھ رعایتیں کیں ان کی غلطیوں پر عفو و کرم سے کام لیا۔ انھیں پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کا موقع دیا، انھیں نوازا ان پر بذل و عطا کی بارش کی لیکن انھوں نے صلہ کیا دیا؟ ـــــــــ یہ تاجر تھے لیکن فرمانروائی کا خواب دیکھنے لگے یہ غریب الوطن تھے لیکن بادشاہت کی آرزو کرنے لگے یہ مفلس تھے لیکن کروڑوں آدمیوں کے ایک ملک کو اپنا غلام اور محکوم بنا لینے کا پروگرام بنانے لگے ان کے پاس کچھ نہ تھا لیکن آرزو یہ تھی کہ سب کچھ بن جائیں

اس حوصلہ کو دیکھئے اور رہم کو دیکھئے!

لیکن کتنی عجیب بات ہے، مسافروں کی ایک جماعت بادشاہت، اور حکومت کا خواب دیکھے اور یہ خواب بغیر کسی دشواری کے شرمندہ تعبیر بھی ہو جائے ہاں۔ یہ عجیب بات ہے لیکن! تاریخ کے آئینہ میں واقعات کا مشاہدہ کیجئے تو معلوم ہوگا یہ معجزہ انگریزوں کا نہ تھا بلکہ اس دیس کے باشندوں کا تھا مٹھی بھر انگریز، اتنے بڑے ملک کے مالک کیسے بن سکتے تھے، اگر اس ملک کے رہنے والے، وطن دوست، اور حریت خواہ ہوتے ہیں؟

انگریزوں کی ساری کامیابیاں، اور کامرانیاں رہین منت ہیں اس نیم براعظم

کے باشندوں کی خود غرضی، جاہ طلبی اور حرص و آز کی، ہم آپس میں لڑے انگریز ثالث بالخیر بن کر پہنچ گئے، ہم نے ایک دوسرے کا خون بہایا انگریز اپنے مصالح کے اعتبار سے ایک کے دوست دوسرے کے دشمن بن گئے ہم نے توسیع مملکت کے لیے بخیلی کی اور انگریزوں سے مدد مانگی انھوں نے مدد کی اور منہ مانگی قیمت اس امداد و اعانت کی وصول کر لی ہم نے سب کچھ کھو دیا، انھوں نے سب کچھ پالیا۔

یوں تو انگریز متحدہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر، جوڑ توڑ، سازش اور فریب کاری کے جال پھیلاتے رہے لیکن اودھ پر ان کی نظر مدت سے لگی ہوئی تھی، یہ زرخیز ملک تھا یہاں کی زمین سونا اگلتی تھی اودھ پر قبضہ کر لینے کے معنی یہ تھے کہ سارا ہندوستان انگریزوں کا ماتحت بن گیا انگریزوں کی پالیسی ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ وہ اپنا اثر و نفوذ، رفتہ رفتہ اور آہستہ آہستہ بڑھاتے ہیں اور یک بیک چھاپہ مار کر قبضہ کر لیتے ہیں پھر ان سے بڑھ کر خون آشام درندہ خو اور بہایم صفت کوئی دوسرا نظر نہیں آتا، ان کی وفاداری، دوستی، دلداری سب افسانہ ماضی بن جاتی ہے پھر ان میں اور بھیڑیے میں کوئی فرق نہیں رہتا، بلکہ ان کی سفاکی اور شقاوت دیکھ کر بھیڑیا بھی شرم سے گردن جھکا لیتا ہے اور زبان حال سے پکار اٹھتا ہے

ہم تو مرشد تھے تم ولی نکلے

انگریزوں نے جب اور جہاں اپنا پرچم لہرایا، قوت اور طاقت کے بل پر نہیں مکر و فریب کے بل بوتے پر، دوستی کے پردہ میں دشمنی کر کے

بکسر کی لڑائی ۱۷۶۴ء میں ہوئی اور فیصلہ کن ثابت ہوئی، اس جنگ میں انگریزوں کے خلاف شاہ عالم، شجاع الدولہ اور میر قاسم شریک تھے، لیکن انگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ نہ تھا بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنی فکر میں تھا مقابلہ انگریزوں سے درپیش تھا لیکن انگریزوں کو شکست دینے سے زیادہ فکر اس کی تھی کہ ہم میں سے کون زیادہ اقتدار و اختیار کا مالک بنتا ہے؛ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا باہمی رشک و حسد، بے اعتباری و بے اعتمادی اور

خود غرضیوں کی سازش اور غداری سے، انگریزوں نے پورا فائدہ اٹھایا وہ جیت گئے شاہ عالم نے بنگال و بہار و اڑیسہ کی دیوانی دے کر اپنی جان چھڑائی، شجاع الدولہ کو عافیت اس میں نظر آئی کہ پیمان دوستی باندھیں، انگریزوں نے پیمان دوستی باندھ لیا لیکن چند شرائط کے ساتھ، چند تحفظات کے ساتھ، چند مخصوص مفادات کے ساتھ، شجاع الدولہ کے لیے سر تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہ تھا، بڑی گراں قیمت پر، انگریزوں کی دوستی خریدنے پر وہ مجبور ہو گئے اور یہ قیمت انگریزوں نے اس وقت بڑے ٹھاٹھ سے وصول کر لی جب شجاع الدولہ نے روہیل کھنڈ پر قبضہ کیا اور حافظ رحمت خاں کو شکست دی ــــــ جو تلوار انگریزوں کے مقابلہ میں کند تھی وہ انگریزوں کے ساتھ مل کر حافظ رحمت خاں کے مقابلہ میں دو دھاری بن گئی۔ لیکن شجاع الدولہ عمر نوح لکھا کر تو آئے نہیں تھے آخر ایک دن اس دنیا سے رخصت ہوئے ان کے مرتے ہی وہ انگریزوں کی دوستی اور زیادہ گراں قیمت بن گئی ان کے شرائط اور زیادہ سخت ہو گئے ان کا مفاد اور زیادہ وسعت ڈھونڈھنے لگا۔

آصف الدولہ قبل اس کے سریر آرائے مملکت ہوں، انگریزوں نے بغیر کسی مروت اور جھجک یہ صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک تمام پچھلا قرض، مع سود در سود نہ بیباق کر دیا جائے اور اودھ میں متعین انگریزی سپاہ کے مصارف میں پچاس ہزار مزید اضافہ نہ منظور کر لیا جائے اور ریاست بنارس ہماری ماتحتی میں نہ دے دی جائے دوستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا آصف الدولہ مجبور تھے، جانتے تھے کہ جس کی دوستی اتنی خوفناک ہو اس کی دشمنی قیامت سے کیا کم ہو گی؟ شرائط لکھے گئے اور انھوں نے دستخط کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کا اثر و اقتدار بڑھ گیا۔ اور ان کے رعب و داب سے بادشاہ تک خائف نظر آنے لگے۔

آصف الدولہ بھی، اپنی سخاوت اور دریا دلی کی بہار دکھا کر عازم خلد ہوئے ان کے بیٹے وزیر علی خاں انگریزوں کو ہیچ سمجھتے تھے چنانچہ انگریزوں کی خلاف مرضی وہ تخت حکومت پر متمکن ہو گئے لیکن جم نہ سکے، تخت خالی کرنا پڑا۔ نظر بندی کی زندگی بسر کرنی پڑی بڑے

دلاور اور مدبر تھے، لیکن مرتے دم تک کام آئی نہ دلاوری، اب سعادت علی خاں نمایاں ہوئے
انگریزوں نے دوستی کی قیمت یہ مانگی کہ نصف سے زیادہ ملک پر اپنے تسلط کا معاہدہ کر لیا
سعادت علی خاں نے یہ سوچا تھا کہ وہ انگریزوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں، تخت حکومت پر
بیٹھ کر، تمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر، وہ اتنے طاقتور ہو جائیں گے کہ انگریز چوں بھی نہ کر
سکیں گے، چنانچہ وہ کئی سال تک تکمیل معاہدہ میں ٹال مٹول اور لیت و لعل کرتے رہے
ایک دن ریزیڈنٹ بہادر یعنی کرنل اسکاٹ[1] نے سعادت علی خاں کے دبیر مولوی سدن
کو بلایا اور کرنج نکال کر سامنے رکھ دی پھر فرمایا اس کا جواب کیا دیتے ہو؟

مولوی سدن نے بڑی برجستگی سے فرمایا۔

"اس کا جواب بکری کی لڑائی میں ختم ہو گیا۔ اب کس کی مجال جواب ثانی کی ہے یہاں
تو سعادت علی خاں بھی بڑے جیالے، بہادر، سیاست داں اور مدبر تھے لیکن
انگریزوں سے "سعادت مندی" کا برتاؤ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اس نئے معاہدے کے بعد، اودھ پر انگریزوں کا اقتدار اور زیادہ بڑھ گیا
اور بڑھتا ہی چلا گیا یہاں تک کہ بادشاہ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں وہ انتہا کو پہنچ
گیا۔ نصیر الدین حیدر کے ایک انگریز مصاحب نے اپنے تاثرات و مشاہدات جو شائع
کئے ہیں اس میں اس نے انگریز ریزیڈنٹ[2] کی تمکنت اور جلالت شان کا طنز کے
ساتھ نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

میری تقریب بڑے صاحب سے ہوئی۔ یہ لندن میں ایک معمولی حیثیت کے
آدمی تھے۔ لیکن یہاں ان کے اختیارات، ایک بادشاہ اور اس کے پچاس
لاکھ رعایا پر ایسے لامحدود تھے جو یورپ میں کسی بادشاہ کو حاصل نہیں ہو سکتے

---

[1] قیصر التواریخ صفحہ ۲۷۱ [2] شباب لکھنؤ صفحہ ۷

حقیقت یہ ہے کہ ملک اودھ انگریزوں کے لئے سونے کی چڑیا تھا اس سے وہ کسی قیمت پر دست بردار نہیں ہو سکتے تھے اس سے وہ زیادہ سے زیادہ نفع اٹھانے اور استحصال کرنے پر مجبور تھے ان کی قومی بقا اور ملکی فلاح کے لئے یہ ایک ناگزیر اقدام تھا

میک ناٹک سکریٹری گورنر جنرل لکھتا ہے :۔

"اودھ ہندوستانی حکومت کی مشین کا ایک پُرزہ ہے جس کی بدولت ہم بہت سی آفات سے محفوظ رہتے ہیں ۔"[1]

اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انگریز اودھ کی بدولت بہت سی آفات سے محفوظ رہے اور ان کا دامن ہیرے جواہرات سے بھر گیا اور ان کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی رہی یہانتک کہ واجد علی شاہ سریر آرائے مملکت ہوئے

واجد علی شاہ کی مایوسی

شروع میں واجد علی شاہ نے بھی اپنے اجداد کی طرح یہ چاہا کہ امور مملکت میں انگریز مداخلت نہ کریں لیکن جیسے ہی انھوں نے آنکھ دکھائی واجد علی شاہ نے سعادت مندی اور اطاعت کیشی کا اظہار شروع کر دیا خود عیش و نشاط کی سرمستیوں میں گھر گئے اور امور مملکت قسمت کے حوالے کر دیے ۔ صاحب ریزیڈنٹ سے انھوں نے کبھی سرتابی نہ کی، جو ایما ہوا سر آنکھوں سے اس کی تعمیل کی ۔

شاہان اودھ غازی الدین حیدر کے عہد تک "نواب وزیر" کہلاتے تھے اور بعد میں انھیں انگریزوں نے بادشاہ تسلیم کر لیا، اس خاندان نے انگریزوں کے ساتھ کیسے وفادارانہ اور نیازمندانہ روابط قایم رکھے اسے ایک انگریز دوست مورخ بھی تسلیم کرتا ہے اودھ کے نواب وزیر بے شک بدحکمراں و بدکار تھے، مگر وہ سرکار کمپنی کے بڑے صادق

---

[1] واجد علی شاہ صفحہ ۵۷ (تقی الدین ایم۔اے)

وفادار دوست تھے وہ اپنی رعیت اور آدمیوں کے ساتھ جھوٹے تھے مگر وہ برٹش گورنمنٹ کے ساتھ سچے تھے نہ انھوں نے برٹش گورنمنٹ کے ساتھ علانیہ عداوت کی نہ وہ اس کے خلاف سازش ودغابازی میں مخفی شریک ہوئے انھوں نے گورنمنٹ کی خدمات عظیمہ بھی کیں انھوں نے جنگ کے وقت انگریزی سپاہ کے لئے غلہ کی رسد رسانی اور بار برداری کے لئے جانور بہم پہنچائے اور سب سے بڑھ کر یہ کام کیا کہ زر نقد اس حالت میں عنایت کیا کہ بہت تھوڑا قرض گورنمنٹ کا دینا تھا، لکھنو کے خزانہ میں روپیہ تھا اور کلکتہ کے خزانہ میں روپیہ نہ تھا ایسے وقت میں انگریز حکمرانوں کو نواب وزیر سے روپیہ مانگنے کی ضرورت تھی لارڈ ہیسٹنگز ایک جنگ عظیم لڑ رہا تھا جس میں بہت روپیہ کی ضرورت تھی دو کروڑ روپیہ ان کو اپنی مہم کے سرانجام کرنے کے لئے درکار تھا یہ روپیہ عین وقت پر نواب وزیر نے دیدیا جس کے عوض میں برٹش گورنمنٹ نے اسے خطابات اور ملک عطا کئے۔ اس مبارک وقت انگریزوں کی فتح نیپال کی جنگ کا خاتمہ ہوا اور اس کے سبب سے پہاڑوں کے نیچے ترائی کا ملک ان کے قبضہ میں آیا۔[1]

ملک اودھ کے حدود

ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ انتزاع سلطنت کے وقت اودھ کے حدود کیا تھے؟

زمان آخر واجد علی شاہ تک جو حدیں اس ملک (اودھ) کی قائم تھیں وہ یہ ہیں:

شمال میں ملک نیپال علاقہ بلرام پور و تلسی پور متعلقہ اودھ سے ایک سو نواسی کوس براہ بٹول ہے جنوب میں دریائے گنگا سے دھار تھا گنگا پار کانپور وغیرہ انگریزی علاقے تھے۔

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ صفحہ ۵۹ (ذکاء اللہ)

مغرب میں بانس بریلی و شاہجہان پور وغیرہ
مشرق میں جون پور کاشی عرف بنارس
یہ قلمرو شاہ اودھ پانچ نظامتوں پر منقسم تھی۔

(۱) خیرآباد
(۲) گونڈہ بہرائچ
(۳) سلطان پور
(۴) بیسواڑہ
(۵) سلون

ہر نظامت میں تین تین چار چار چکلے تھے، حاکم نظامت ناظم، و منتظم چکلہ چکلہ دار کہلاتے تھے۔ ان کی ماتحتی میں تحصیلدارانِ محال مقرر ہوا کرتے تھے۔

ناظم کو پورے اختیارات حاصل ہوتے تھے وہ بڑے مرتبہ کا آدمی ہوتا تھا جملہ سامانِ شان و شوکت مہیا رکھتا تھا اس کی سواری کے سامنے نوا خواں رفت کے حاکمانہ جلوس جیسے چوب دار، عصا بردار، علم بردار چلتے تھے نقیب آگے آگے بولتے جاتے تھے نقارہ اسپی آگے آگے بجتا، توپوں کی سواری ہمراہ ہوتی پیادے و سوار بیش از پیش۔

سوائے چکلہ جات متعلقہ نظامت کے جو علاقے زاید تھے ان کی تفصیل یہ ہے

(۱) باڑی بسواں۔
(۲) دریاباد رودلی
(۳) دیوا کرسی
(۴) نواب گنج
(۵) گوشائیں گنج
(۶) موہان

(۷) رسول آباد

(۸) لسنفی پچرہ

(۹) بانگر مئو بلا نوابل

(۱۰) ساندی پالی

(۱۱) محمدی

(۱۲) میاں گنج لہ

لارڈ ڈلہوزی کی رپورٹ

لیکن ان وفاداریوں اور اطاعت شعاریوں کے باوجود انگریز اودھ پر قبضہ کر لینے کا فیصلہ کر چکے تھے قبضہ کرنے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ قبضہ کر لیا جاتا اور کسی اصول اور ضابطہ کو پیش نظر نہ رکھا جاتا دوسری صورت یہ تھی کہ سانپ مر جاتا لیکن لاٹھی نہ ٹوٹتی۔ بادشاہ برائے نام بادشاہ رہتے اور سارا کاروبار مملکت انگریزوں کے قبضہ اور تصرف میں آجاتا گورنر جنرل ہند، لارڈ ڈلہوزی کا ضمیر اور اخلاق اور کسی حد تک زمانہ تھا وہ اس آخری رائے کے حامی تھے انھوں نے کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرس کو اس مسئلہ میں جو رپورٹ بھیجی ہیں

> برسوں سے جو شہادتیں بدنظمی ملک اودھ کی پیش ہوتی تھیں ان کو با تفصیل لکھا اور جو رائیں اس معاملہ میں تھیں لکھیں اور انھوں نے اس سے قطع نظر آسودگی رعایا کے خاطر سلطنت کا لینا گورنمنٹ پر واجب ہے اس میں بیان کیا گیا کہ اگر ہماری سپاہ اودھ میں نہ ہوتی تو رعایا نے اپنا ہاتھ تھر کے تلے سے کبھی کا نکال لیا ہوتا اور ان پر ہرگز ظلم و ستم نہ ہونے پاتا اس لئے چپ رہنا ہمارے انصاف اور عدالت کا مقتضی نہیں ہے کہ بادشاہ نے ان عہدوں میں جو رعایا کی آسائش کے لئے کئے گئے تھے بے وفائی کی مگر برٹش گورنمنٹ سے جو اتحاد اور اخلاص کے

لہ تاریخ اودھ جلد ۵ صفحہ ۱۹۲

پیمان تھے ان میں سرمو عہد شکنی نہیں کی بلکہ وہ ہمیشہ برٹش گورنمنٹ کی ضرورتوں کے وقت میں اپنے مقدور کے موافق مددگار اور معاون رہے اس لئے احسانمندی اور انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم رعایا کی آسودگی اور بہتری کے لئے بادشاہ کی علومرتبگی اور عالی منصبی میں جس قدر ممکن ہو تنزل کم کریں ملک کی ترقی اور رعایا کی بہبودی بغیر اس کے بھی ہو سکتی ہے کہ ملک اودھ سرکار کمپنی کے ملک کا ایک صوبہ بنایا جائے اور تخت شاہی بالکل الٹ دیا جائے اس لئے میری رائے نہیں ہے کہ ملک اودھ سرکار کمپنی کے ملک کا ایک صوبہ بنایا جائے بلکہ جس قدر ملک بادشاہ کے قبضہ میں ہے وہ اس کے بدستور بادشاہ بنے رہیں لیکن دیوانی و فوجداری اور سپاہ کا انتظام کمپنی کے سپرد کر دیں اور سالانہ روپیہ ان کو اس قدر ملا کرے جس سے وہ اپنی شان شاہی کو نباہے رکھیں۔

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں

لیکن لارڈ ڈلہوزی کی رائے صاحبان انگریز کے لئے قابل قبول نہ تھی چنانچہ اس رائے کے ساتھ سر برنجی کاک ممبر کونسل نے اتفاق کیا سر جان گرنیٹ نے اختلاف کیا اور کہا کہ اودھ سرکاری عملداری میں شامل کرنا چاہیے جنرل لو نے جو پہلے لکھنؤ کے ریزیڈنٹ رہ چکے تھے یہ کہا ملک اودھ میں بدانتظامی اس مدت دراز سے پھیل رہی ہے کہ جب تک وہ سرکار کمپنی کے ملک کا ایک صوبہ نہ بنے گا وہاں کا عمدہ انتظام ہی نہ ہو گا۔ غرض یہ لارڈ ڈلہوزی کی اس رائے کے مخالف ہو گئے کہ سلطنت کا ست نکال لینا چاہیے مگر اس کی کھال میں اتنا دم باقی رکھنا چاہیے کہ وہ مردہ صورت زندہ نظر آتی.. رہے اور بالکل نظروں سے غائب ہو کر دفن نہ کی جائے۔ آخر کو یہ سب رائیں اور کرنیل سلیمن اور جنرل اوٹرم ....

کی رپورٹیں کورٹ ڈائرکٹرز کی خدمت میں بھیجی گئیں۔ دو مہینہ تک ہاں بہت غور و خوض کیا گیا۔ لارڈ ڈلہوزی کی رائے کے خلاف سب ڈائرکٹروں کی بالاتفاق یہ رائے ہوئی کہ اودھ کو ممالک سرکار کمپنی میں داخل کر لینا چاہیے اور تخت شاہی کو قائم نہ رکھنا چاہیے۔[له]

لارڈ ڈلہوزی کی رائے کو کورٹ آف ڈائرکٹرس نے اس لیے نہیں مانا کہ اودھ کی بدنظمی کا بغیر اس کے سدباب نہیں ہوسکتا تھا لیکن یہ بدنظمی جس کا اتنا چرچا کیا گیا ہے صرف ذہن و دماغ اور صفحۂ قرطاس پر تھی ورنہ خارج میں اس کا کہیں وجود نہ تھا۔ انگریزوں کے دور حکومت میں اودھ کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا انھیں دیکھ کر تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ عہد واجد علی شاہ میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں۔

انگریزوں کی فریب کاری

انگریزوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اودھ کا الحاق کر لیا جائے لیکن آخر وقت تک اپنے اس ارادہ کو چھپاتے رہے اگر بادشاہ کو انگریزوں کی فوجی نقل و حرکت کا کسی طرح شبہ پیدا ہوا تو بڑی ڈھٹائی سے اس کی تردید کر دی۔

سپاہ کو سرحد پر جانے کا حکم ہوا جب انگریزی فوج کے کان پور میں جمع ہونے کی خبریں اڑیں اور اس بات کے [illegible] میں چرچے ہونے لگے تو بادشاہ نے ریزیڈنٹ کے اسسٹنٹ سے اس [illegible] خاص میں دریافت کیا اس نے جواب دیا کہ راجہ نیپال اپنے لاکھ آدمیوں [illegible] جمعیت کے ساتھ اپنے مقام پرستش کو جاتا ہے اس کے اہتمام کو فوج سرکاری جمع ہوئی ہے کہ آپ رعایا کی تشفی کے لیے اشتہار جاری کر دیں تاکہ فوج کا منتظمہ دل سے جاتا رہے اور جو کوئی اس کے خلاف سمجھے گا مجرم سرکار ہوگا [illegible] مجسٹریٹ نے پور کو شہر میں [illegible]

له تاریخ اودھ جلد پنجم (نجم الغنی) صفحہ ۱۵۸

کر دینے کے لئے لکھتا ہوں ؎

صاحب بہادر تشریف لاتے ہیں آخر جنرل اوٹرم صاحب، ریزیڈنٹ اودھ شاہانہ جاہ و جلال اور تزک و احتشام کے ساتھ گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی سے صلاح و مشورہ کر کے ۳۰ جنوری ۱۸۵۶ء مطابق ۲۰ جمادی الاول ۱۲۷۲ھ کو تشریف لائے۔

بادشاہ کو اپنے انگریز دوستوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا علی نقی خاں بعد زوال شمس نہایت اطمینان کے ساتھ استقبال کو گئے اس وقت تک کسی طرح کا وسوسہ و کھٹکا بلکہ گمان بھی دل میں نہ تھا اور جو کچھ افواہ خلائق یا دوستان دور و دراز سے سنتے تھے اسے ژٹل افسانہ بازاری جانتے تھے۔ بمبئی کے کئی تاجروں اور عملہ انگریزی نے متواتر بذریعہ خطوط اور بعض بالمشافہ خبر پہنچائی اور بعض انگریزوں نے پارلیمنٹ لندن کی تجویز کی بھی اطلاع کر دی اور اس کی صورت اصلاح امکانی بھی بتائی لیکن ارکان سلطنت ان سب باتوں کو لغو و مہمل سمجھے اور اگر کسی نے مقربان شاہ سے کہا مثل خواب پریشان سمجھ کر اڑا دیا غرض ۳ بجے جنرل اوٹرم صاحب داخل ریزیڈنسی ہوئے۔ توپیں سلامی کی چلیں۔ اس وقت جنرل صاحب نے علی نقی سے کہا کل دس بجے ہمارے پاس آؤ گورنر جنرل کے احکام تم کو سنائیں گے اور سرکار کمپنی کی فوج ممالک محروسہ کے انتظام کے لئے آتی ہے آپ کسی امین کو اہتمام رسد کیلئے روانہ کریں غرض اسی وقت راجہ جےلال سنگھ اہتمام رسد کو روانہ ہوئے۔ پنجشنبہ کو علی نقی خاں وزیر خواب غفلت سے بیدار ہوئے معلوم نہیں تمام رات کس خواب میں کٹی اب دل پر افکار کا ہجوم ہوا۔

؎ تاریخ اودھ جلد پنجم (نجم الغنی) صفحہ ۲۵۲

علی نقی وزیر اعظم کو اوٹرم کی دھمکی:۔ وقت خاص پر صاحب ریزیڈنٹ کے پاس پہنچے انھوں نے کہا کہ نواب گورنر جنرل نے حسب الحکم کورٹ ڈائرکٹرز ۱۲ لاکھ روپیہ سالانہ مصارف ذات بادشاہ کے لیے اور تین لاکھ روپیہ عملہ و شاگرد پیشہ کے لیے مجموعہ ۱۵ لاکھ روپیہ مقرر فرمایا ہے اور نواب شجاع الدولہ کی اولاد کی تنخواہ اپنے ذمہ لی ہے اور ملک محروسہ کا انتظام موافق دستور سرکار کمپنی کے ہوگا۔ محبت نامہ بھی انھیں احکام کا بادشاہ کو پہنچے گا اور یہ جدید عہد نامہ گورنر جنرل نے تجویز کیا ہے۔ چاہیے کہ اس پر بادشاہ اپنی مہر کمال رضامندی سے کردیں اور اس بارے میں تمھاری بڑی خیر خواہی سرکار کمپنی میں ہوگی کیونکہ تم کو بادشاہ کے مزاج میں پورا دخل ہے اس کے صلہ میں لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر یا بدستور قبضہ جمہرسٹہ نسلاً بعد نسل تمھارے واسطے مقرر ہوگا۔ ورنہ در صورت خلاف مجرم سرکار قرار پاؤ گے۔

علی نقی اور بادشاہ کی ملاقات:۔ بعد زوال شمس جس سے اقبال سلطنت پر زوال آیا وزیر نے مراجعت کی اور نہایت مضطرب الحال بادشاہ کے پاس آئے اور حقیقت حال مشروحاً بادشاہ سے عرض کی اور بہت سا نشیب و فراز سمجھایا اور مقربان خاص نے بھی بالاتفاق وزیر کے خوف سے لغائے دولت کی یہی صلاح عرض کی بلکہ مہاراج بال کرشن نے اصل مطلب کا راضی نامہ لکھ کر نظر انور میں گذرا نا[1]

موت کے اس محضر نامہ پر دستخط کرو! آخر اوٹرم صاحب لارڈ ڈلہوزی کا پیام محبت لیے کر خود واجد علی شاہ کے پاس پہنچے اوٹرم اور واجد علی شاہ کی ملاقات اور بادشاہ کی بیباکانہ گفتگو کا نقشہ ذکاء اللہ نے بڑا اچھا کھینچا ہے:۔

---

[1] تاریخ اودھ جلد ۵ صفحہ ۲۵۴

Gul am Rasool
P.U.C.
14|11|65

اوٹرم کو یہ بڑا نازک اور دشوار کام سپرد ہوا کہ بادشاہ کو سمجھا کر اس عہدنامہ پر راضی کرے کہ وہ ملک اپنی خوشی سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کرے اور اگر بادشاہ اس پر راضی نہ ہو گا تو اشتہار دیا جائے کہ کل اودھ سرکار کمپنی کا ملک ہو گیا۔ انگریزی سپاہ لکھنؤ میں اس قدر بھیجی گئی کہ وہ ہر مقابلہ کے دبا دینے کے لئے کافی تھا۔

بادشاہ اور اوٹرم کی گفتگو:۔ اوٹرم صاحب نے وزیر اودھ سے صاف صاف کہا کہ گورنمنٹ کے آخری احکام ناطق آ گئے ہیں چار بجے تک آپس میں گفتگو ہوتی رہی مشرقی وضع میں یہ داخل ہے کہ دربار شاہی یہ کوشش کرتا ہے کہ مہلت ملے۔ اوٹرم صاحب سے بادشاہ کی ماں اس باب میں گفتگو کرتی تھی اس میں بیٹے سے بھی زیادہ بہت مردانہ بڑے استقلال کے ساتھ تھی وہ اوٹرم صاحب سے یہ عرض کرتی تھی کہ وہ اپنی گورنمنٹ کو سمجھائیں کہ بادشاہ کو جب تک اور مہلت ملے کہ نیا گورنر جنرل آ جائے اور جن اصلاحوں کو وہ چاہتا ہے اس کا حکم واجد علی کو دے مگر اوٹرم صاحب اس کی ساری باتوں کے جواب میں یہ ایک بات کہتے تھے کہ اب آزمائش اور عمل کا وقت گزر گیا اب میں سوا اس کے اور کچھ نہیں کر سکتا کہ ان کا پیام بادشاہ کو دوں۔ واجد علی شاہ نے منظور کیا کہ ریزیڈنٹ اس سے ملاقات کرے۔

اوٹرم اور واجد علی شاہ کی ملاقات:۔ ۱۰ فروری کو اوٹرم صاحب مع اپنے اسسٹنٹوں کے گئے تو محل میں یہ عجیب تماشا دیکھا کہ محل کے دروازہ پر سے توپیں اتار لی گئیں متعین محل کے پہرہ کے سپاہیوں کے پاس ہتھیار نہ تھے اس نے ریزیڈنٹ کو ہاتھ سے سلام کیا۔ مقام معینہ پر بادشاہ نے اس

کے بھائی اور بعض معتمد وزراء نے ریذیڈنٹ کا استقبال کیا مراسم ملاقات کے ادا کرنے کے بعد کام شروع ہوا۔ اوٹرم صاحب نے گورنر جنرل کا خط بادشاہ کو دیا جس میں نہایت اخلاق کریمانہ کے ساتھ حکم جو بادشاہ کی نسبت دیا گیا تھا لکھا ہوا تھا اور اس سے عرض کیا گیا تھا کہ وہ اس حکم کے مقابلہ کرنے میں اصرار کرے پھر عہد نامہ کا مسودہ بادشاہ کو دیا گیا

واجد علی شاہ کا جواب:۔ بادشاہ نے نہایت غم زدہ ہو کر غصہ سے کہا کہ عہد نامہ صرف برابر والوں سے ہوتا ہے (یعنی زیردست کا زبردست سے عہد و پیمان نہیں ہوتا) اس کی ضرورت نہیں ہے کہ میں اس پر دستخط کروں۔ برٹش کو اختیار ہے کہ میرے ساتھ اور میرے ملک کے ساتھ جو چاہیں سو کریں میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے انگلینڈ جانے کی اجازت ملے کہ اس کے تخت کے آگے اپنے دکھ درد کا درماں چاہوں۔ بادشاہ کو کسی بات نے اپنے ارادہ سے باز نہ رکھا اور عہد نامہ پر اس نے دستخط نہیں کیے اس نے اپنی دستار اتار کر ریذیڈنٹ کے ہاتھ میں رکھدی اور غمگین ہو کر کہا کہ خطاب و عزت وجاہ و منصب اور سب چیزیں جاتی رہیں یہ برٹش گورنمنٹ نے ہی اس کے دادا کو بادشاہ بنایا تھا (وہ) مجھے ناچیز کر سکتی ہے اور تاریکی میں ڈال سکتی ہے

اب کرنیل اوٹرم کو سوا اس کے کچھ اور چارہ نہ تھا کہ کلکتہ سے جو اشتہار آیا تھا اس کا اعلان کرے کہ صوبہ اودھ ہمیشہ کے لئے سرکار کمپنی کی سلطنت کا ایک حصہ ہو گیا[۱]

بادشاہ اور مادر شاہ کے دلائل اس موقع پر بادشاہ نے اوٹرم سے جو گفتگو کی اس میں عجز بھی ہے اور طنز بھی۔ بادشاہ نے جو باتیں کیں ان میں دلائل بھی ہیں اور اپیل بھی۔ بادشاہ نے کہا:۔

[۱] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (د... اشٹ) صفحہ ۱۷۸

"اگر مدار المہام اور اہالیان سلطنت کی غفلت سے امور رجوع سلطنت میں خامی پائی جاتی ہے تو اس صورت میں اس کی اصلاح ان کے تغیر و تبدل سے ممکن ہے نہ یہ کہ اس حیلے سے ملک پر قبضہ کر کے وارث سلطنت کو معطل و بے دخل کر دیا جائے نواب گورنر جنرل کے ارشاد سے تعجب ہے کہ مواخذہ ہمارے آبائے کرام کا جو قدیم سے مکنون خاطر ہوتا چلا آیا ہے وہ سب میرے زمانہ پر منحصر رکھا تھا ہمارے آبائے کرام نے کبھی عہد شکنی نہیں کی اس واسطے کہ ہر عہد سلطنت میں جس طرح عہدنامہ مذکور خاطر اہالیان سرکار کمپنی ہوا ہر تاریخ کو جب چاہا منسوخ کر کے دوسرا دخل کیا ہمارے آبائے کرام نے اسے بجمالِ رضامندی بلا اکراہ قبول کیا اور کبھی سبقت اپنی طرف سے کسی عہدنامے کے تبدل و تغیر کی نہیں کی۔ بہر حال سرکار کمپنی کے مرضی کے تابع رہے اور مشکل وقتوں میں فوج اور روپے اور اسباب اور سامان ضروری سے اعانت میں مضائقہ نہیں کیا اور اپنے آپ لاکھوں روپیہ کا نقصان گوارا کیا اور کبھی اس کی شکایت نہیں کی اور سلطنت کی بعض رعایا اور اقربا کی حمایت سرکار کمپنی نے اپنی عدالت کے خلاف کی اس کے لئے اپنے حلم و بردباری سے سرکار کمپنی کی مرضی کو مقدم سمجھا۔"

اس موقع پر واجد علی شاہ کی والدہ بھی موجود تھیں انھوں نے اور ٹرم سے اپیل کرتے ہوئے کہا:۔

"خود تاج بخشی کی وزارت سے مرتبہ بادشاہی دیا۔ اب بے قصور ایسے امر کا کا صدور شان و شوکت شاہنشاہی کے خلاف ہے کہ فقط حیلہ غفلت ٹھہرا کر ایسی اہانت و توہین سے چھینا جاتا ہے۔ ہندوستان میں جن ریاستوں میں نوبت فتنہ و فساد و جنگ و جدل کی پہنچی پھر ان کا ملک ان کے وارثوں کو دے دیا اور ہمارے ساتھ باوجود اس اطاعت و فرمانبرداری کے جو

ہمیشہ سے ہوئی بے التفاتی ظاہر ہو۔ اگر سلطنت کے کاموں میں بادشاہ
کی طرف سے غفلت شعاری ہے تو سرکار کمپنی نے پہلے جلوس کے وقت لیاقت
وقابلیت کا امتحان لے لیا ہوتا اور اگر مدار المہام سلطنت کی غفلت ہے تو
مواخذہ اور ریاست ان پر ہونا چاہیئے۔ کوئی بھی انتظام اور اصلاح حال
کے بہانے سے کسی کا گھر چھینتا ہے یہ بات انصاف سے دور ہے جس کی
طرف آپ کو مظنہ تخریب ہو ہم اس کو آپ کے حوالہ کر دیں۔ ریذیڈنٹ نے
جواب دیا کہ ہم کو تمام باتوں کا مواخذہ منیب سے چاہیئے نہ کہ نائب سے
متبادل تجویز بھی ریذیڈنٹ نے نہ مانی۔ پھر والدہ واجد علی شاہ نے
اوٹرم سے کہا اگر آپ واجد علی شاہ سے ناراض ہیں تو میرے دوسرے
بیٹے سکندر حشمت کو وارث سلطنت کیجیئے یا مرزا ولی عہد کو بادشاہ بنایئے
اور اجرائے امور سلطنت عملداری سرکار کمپنی کے موافق اہالیان سرکار کمپنی
کی طرف سے عمل میں آئے والدہ بادشاہ کی اس تقریر کے بعد جہان آرا بیگم
عرف کھیتو بیگم زوجہ محمد علی شاہ نے کہ واجد علی شاہ کی دادی ہیں کہا کہ سب
سے بالاتر یہ ہے کہ امجد علی شاہ کے بیٹے مصطفےٰ علی خاں کو تخت پر بٹھایئے
اگرچہ وہ ہماری غیر کفو عورت سے ہیں۔ ریذیڈنٹ نے جواب دیا کہ انکی
تخت نشینی سے تم کو کیا فائدہ۔ کھیتو بیگم نے کہا کہ اس نظریے سے کہ نام سلطنت
باقی رہے اور یہ بدنامی ہمارے سر سے جاتی رہے یہ سن کر جنرل اوٹرم صاحب
رخصت ہوئے اس خبر وحشت اثر کے مشہور ہوتے ہی بادشاہی محلات اور
تمام شہر میں، گھر گھر میں عجیب ماتم برپا ہوا اور ہر ایک در و دیوار سے
وحشت و ویرانی برس رہی تھی تین دن تک کسی نے کچھ نہ کھایا۔

اب بادشاہ کو اپنے وزیر کی دیانت داری و وفا شعاری اور لیاقت و

خوش کرداری کا حال معلوم ہوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا وقت تدبیر کا ہاتھ سے جا چکا تھا اس کی کردار نامزا وار کا علاج اور چارہ کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ کف افسوس مل کر رہ گئے۔[1]

اشتہار واجب الاظہار واجد علی شاہ نے جب نئے معاہدہ پر دستخط کرنے سے انکار کیا تو اوٹرم صاحب نے ہر تھانہ پر گورنمنٹ انگریزی کا یہ اشتہار (خلاصتہً) چھپوا کر دلایا:۔

حسب الحکم خاص واستصواب آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹرز کے یہ بات ٹھہری کہ عہد نامہ ۱۸۰۱ء جس سے ہر ایک والی اودھ نے انحراف وتجاوز کیا ہے آج کی تاریخ سے بہ تمامہ جائز وساقط ہے چنانچہ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کو ایک نئے عہدنامے کے مقرر کرنے کے لئے نصیحت کی گئی جس کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے ملک اودھ کا انتظام بلا اشتراک غیر سرکار انگریز بہادر کے سپرد کیا جائے مگر شاہ موصوف نے ایسے دوستانہ عہدنامے کے انعقاد سے انکار کیا شاہ اودھ واجد علی شاہ اور جملہ والیانِ سابق ملک اودھ کی نسبت عہدنامہ ۱۸۰۱ء کی تعمیل میں منکر یا سہل انکار یا غافل ہوئے جس کی وجہ سے اصرار ایسے بندوبست کا ملک اودھ میں جو رعایا کی رفاہ اور خیریت کا موجب ہو لازم کیا گیا اور عہدنامہ ۱۸۰۱ء کو جس سے یوں ہی انحراف ہوا ناجائز وساقط گردانا گیا اور چونکہ شاہ موصوف عہدنامہ جدید کے انعقاد سے جو عہدنامہ سابق کی جگہ منظور تھا انکار اور عہدنامۂ سابق کی شرائط جبکہ بحال نہیں بسبب عدم مداخلت اہالیان کمپنی انگریز بہادر کے ملک اودھ میں نافع نہ ہوئیں اور بدون ایسی مداخلت کے شائستہ بندوبست کا جاری ہونا اس ملک میں ممکن نہیں ان وجوہات سے تمام

---

[1] تاریخ اودھ جلد پنجم (نجم الغنی) صفحہ ۲۵۹

عالم کو ظاہر ہے کہ سرکار کمپنی انگریز بہادر کو دو صورتوں کے سوا اور کوئی چارہ نہیں یا تو ملک اودھ کی رعایا کو ترک کرے اور ان کے ہاتھ پاؤں باندھکر مرض ظلم وتعدی میں ڈال دے یا سرکار اپنے اقتدار عظیم کو ان لوگوں کے حق میں نفاذ کرے جن کی رفاہیت کے واسطے پچاس برس کے عرصے سے دست اندازی کا وعدہ کیا تھا اور اودھ کے بندوبست کا تمام وکمال نظم ونسق ہمیشہ کے واسطے اپنے اختیار میں کرے ان دونوں صورتوں میں سے سرکار کمپنی انگریز بہادر نے بلا تامل دوسری صورت کو اختیار کیا ہے اس لئے اشتہار دیا جاتا ہے کہ آج کے دن سے ملک اودھ کا نظم ونسق بلاشرکت غیر ہمیشہ کے لئے کمپنی انگریز بہادر کے قبضۂ اختیار میں آگیا ہے۔ سب عامل وناظم وچکلہ دار وجملہ نوکران دربار اور سب اہل کاران مالی وملکی دیوانی وفوجداری وسپاہیان دربار اور جملہ سکنان اودھ کو لازم ہے کہ آئندہ کمپنی انگریز بہادر کے اہل کاروں کی اطاعت اور فرمانبرداری کلی کرتے رہیں اگر کوئی اہلکار دربار یا جاگیردار یا زمیندار یا کوئی دوسرا شخص ایسی اطاعت وفرمانبرداری سے اغماض کرے گا یا کوئی مالگزاری دینے میں عذر کرے گا یا اور کسی طرح سرکار کمپنی انگریز بہادر کی حکومت میں تعرض ومزاحمت پہنچائے گا تو شخص مذکور مفسد گنا جائیگا اور قید بھی کیا جائے گا اور جاگیر یا اراضی اس کی ضبط کی جائے گی اور وہ لوگ جو فوراً بلاعذر سرکار کمپنی انگریز بہادر کی تابعداری قبول کریں گے عامل ہوں یا اہالیان دربار یا جاگیردار یا سکنائے اودھ سب سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ وہ حفاظت و لحاظ والتفات اہالیان کمپنی انگریز بہادر کا پائیں گے پاتے رہیں گے تعداد مالگزاری کا تعین انصاف اور بندوبست واجبی کے ساتھ عمل میں آئے گا اور ملک اودھ کی آبادی وآراستگی کے باب میں بتدریج کوشش برابر ہوتی رہے گی

ہر کسی کو بلا طرفداری کسی کے عدل گستری ہوتی رہے گی۔ جان ومال کی حفاظت کی جائے گی اور ہر ایک شخص اپنے حقوق واجبی پر بے اندیشہ اور بغیر کسی کی دست اندازی کے قابض ومتصرف رہے گا۔ فقط ۱؎

قصور ڈھونڈ کے پیدا کیے جفا کے لیے

اس اشتہار کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ واجد علی شاہ کے آباؤ اجداد کی کوتاہیاں بھی واجد علی شاہ کے کھاتے میں رکھی گئیں دوسرا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ سارا نظام گو عملاً انگریز کے ہاتھ میں تھا لیکن اس کی ذمہ داری بھی واجد علی شاہ کی عیش پرستی پر رکھی گئی۔

خار کو گل اور گل کو خار جو چاہے کرے
تو نے جو چاہا کیا اے یار جو چاہے کرے

اصل میں طاقت کی منطق خود اپنی دلیل ہوتی ہے انگریز چونکہ طاقت ور تھے، لہٰذا انھوں نے اپنی ہر غلطی اور غلط کاری، بدعہدی اور عہد شکنی کو جائز قرار دے دیا کون تھا جو انھیں چیلنج کرتا؟

۱؎ تاریخ اودھ (نجم الغنی) صفحہ ۲۷۰

باب ۱۰

زوال اودھ کی کہانی

کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے

اس کتاب میں انگریزوں کی چیرہ دستیوں اور سفاکیوں، باشندگانِ اودھ کی مجبوریوں اور حسرت نصیبیوں شہر نائے شہر کی ذلتوں اور رسوائیوں خاندان شاہی کی بے آبرئیوں اور حرماں بختیوں، واجد علی شاہ کی نامرادیوں اور تیرہ روزگاریوں کی داستان آپ کو مختلف ابواب میں اپنے اپنے موقع سے نظر آئے گی لیکن اس باب میں زوال اودھ کی کہانی ایک خاص ترتیب اور تاریخی تدریج کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔

یہ کہانی "کوہ نور" (جنوری تا جون ۱۸۵۶ء) کے فائل سے مرتب کی گئی ہے یہ اخبار لاہور سے نکلتا تھا اس کے ایڈیٹر لالہ ہر سکھ سہلا تھے، اس کہانی کے مستند ہونے میں شبہ نہیں اس میں بہت سی ایسی باتیں ملیں گی جو وقت کی دوسری تاریخوں میں نظر نہیں آتیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مورخ خاص خاص واقعات سے بحث کرتا ہے جن باتوں کو اپنے موضوع سے متعلق پاتا ہے انھیں لے لیتا ہے۔ باقی کو نظر انداز کر دیتا ہے لیکن اخبار نویس کسی واقعہ کی جزئیات سے بھی پوری دلچسپی لیتا ہے مورخ جن باتوں کو چنداں اہمیت نہیں دیتا اخبار نویس نہ صرف انھیں اہمیت دیتا ہے بلکہ انھیں اچھالتا بھی ہے کوہ نور کے پرچوں میں داستان اودھ کے جو پہلو نظر آتے ہیں وہ عہد جدید کے مورخ کے لیے دلچسپ بھی ہیں اور اہم بھی۔ یہی وجہ ہے کم تاریخ وار

ترتیب کے ساتھ داستان مرتب کی گئی ہے۔ اس داستان میں زوال اودھ کا پس منظر بھی ملیگا انگریزوں کی پیمان شکنی اور نقض عہد کی تفصیل بھی ملے گی اودھ پر برطانوی استیلا کے اسباب عوامل اور اور موثرات دمحرکات بھی نظر آئیں گے اور سب سے بڑھکر یہ کہ بعض ایسی جزئیات ملیں گی جنھیں پیش نظر رکھکر بحث وگفتگو اور فکر ونظر کے لئے موضوع تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

اب اس داستان کے جستہ جستہ ٹکڑے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔

اٹھیں افسانہ غم ڈرتے ڈرتے
سنایا کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے

---

(۱) بغاوت کا اندیشہ

واجد علی شاہ کے کردار اور سیرت کو آج کتنے ہی بھیانک اور گھناونے روپ میں پیش کیا جائے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی رعایا اور فوج دونوں میں حد درجے ہر دل عزیز تھے جو ہر دل عزیزی واجد علی شاہ کو اپنے ملک میں حاصل تھی وہ بہادر شاہ ظفر کو کبھی حاصل نہ ہوسکی اگرچہ بہادر شاہ اور ان کی رعایا کا مذہب ایک تھا لیکن واجد علی شاہ اور ان کی رعایا کے مذہب میں اختلاف تھا، وہ شیعہ تھے یہ سنی تھے اور دونوں اپنے مذہب پر سختی سے قائم تھے پھر بھی دونوں کے درمیان طبیعت اور عقیدت کا ایسا رابطہ استوار تھا کہ گو ضبطی اودھ کے کاغذات مرتب ہوچکے تھے واجد علی شاہ کی معزولی کا فیصلہ ہو رہا تھا لیکن بغاوت کے اندیشے سے انگریزوں کے دل دھڑک رہے تھے ملاحظہ ہو:۔

افواہ ہے کہ جو فوج کانپور میں جمع ہوئی ہے وہ نیسویں تاریخ کو دریا پار اترے گی پانچویں رسالے کو حکم ہے کہ بالفعل کانپور میں مقیم رہے تا کہ عند الضرورت اودھ کیلئے کار آمد ہو اودھ میں ہر طرح امن وامان ہے سب کو حیرت ہے کہ سرکار انگریزی کو فوج جمع کرنے کی کیا حاجت ہے وہ گمان کرتے ہیں کہ شاید نیپال پر یورش ہوگی آخر ماہ رواں جنرل اوٹرام صاحب

کلکتہ سے واپس آویں گے اور اس وقت فوج دیا پار اترے گی جس وقت صاحب خبر لکھتے ہیں کہ کہ اب ماحصل سالانہ اودھ کا ڈیڑھ کروڑ روپیہ سالانہ سے زیادہ نہ ہوگا مگر جس وقت سرکار انگریزی کی پولیس مقرر ہوگی اور چیکلہ داروں کے ظلم سے لوگوں نے نجات پائی تو اس سے بہت زیادہ ہوگی یہاں کے لوگ سرکار کی آمد کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے ہیں اور جانتے ہیں کہ اب ظلم ناحق سے رہائی پائیں گے کہیں بھی افواہ ہے شاہ اودھ بھی اس بات پر راضی ہیں اور تمنائے ملاقات کی نواب گورنر جنرل بہادر سے رکھتے ہیں۔ اخبار "ایسٹرن اسٹار" میں بذریعہ فرینڈ آف انڈیا کے زیب رقم ہے کہ چند روز میں یہ سلطنت داخل ممالک محروسہ سرکار کمپنی کے ہوا چاہتی ہے لکھا ہے کہ چند روز سے کاغذات متعلقہ ملک اودھ کے تیار ہو چکے ہیں مگر ہنوز ان پر دستخط نواب گورنر جنرل بہادر کے نہیں ہوئے ہیں بعض کہتے ہیں کہ نواب ممدوح کو یہ تامل ہے کہ مبادا فساد برپا ہو جاوے اور اب کہ وہ ولایت کو جانے والے ہیں کسی تردد میں کیوں پڑیں ہم کو یہ بات قابل اعتبار نہیں۔ جناب ممدوح ایسے مستقل مزاج ہیں کہ جو کچھ تجویز کرتے ہیں کر ڈالتے ہیں تامل اور تشویش نہیں کرتے مگر تامل کی وجہ یہ ہے کہ ایسا انتظام ہو جاوے جس سے احتمال فساد کا رفع ہو اور ملک چپکے سے ہاتھ آجاوے اور سوائے اس کے ملک اودھ بلا توقف معرض ضبطی میں لانے سے سپاہیان فوج میں سرکشی ہو جاوے گی مگر یہ خیال خام ہے یہ بات تو سچ ہے کہ فوج سرکار میں بہت سے سپاہی رہنے والے اودھ کے اور قوم کے راجپوت ہیں مگر وہ جانتے ہیں کہ اس تدبیر سے ان کو کس قدر نفع ہوگا ہر چند کہ بعض اہل دربار اودھ نے ان لوگوں کو برانگیختہ کرنے کے واسطے تدبیریں کی ہونگی (بہر حال) آج کل میں حکم ضبطی ہوا چاہتا ہے ایک اور خط کانپور کا اخبار دہلی گزٹ سے نقل کیا جاتا ہے یہ خط لکھا ہوا ۱۸ تاریخ کا ہے تاریخ مذکور کا پانچواں رسالہ اور ایک بڑا توپ خانہ وہاں پہنچا اور تا اجتماع فوج یہاں تھوڑے دور میں مقیم رہیں گے اب تک لوگوں کو معلوم نہیں کہ سرکار نے کیا تجویز کی ہے مگر لکھنؤ والوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ کیا ہوگا؟ صاحب خبر لکھتے ہیں کہ میری دانست میں ضبطی نہیں بلکہ انتظام ملک بطور سرکار اور باہتمام سرکار ہوگا۔ اخبار "سرکار" کے ذریعہ اخبار "لاہور کرانکل" میں درج ہے۔

کہ حکم ضبطی اودھ کا جاری ہو گیا۔ سنا ہے کہ میجر جنرل اوٹرام صاحب وہاں کے چیف کمشنر اور مارٹن گبین صاحب اور رابرٹس صاحب اور راوماتی صاحب ان کے اسسٹنٹ جوڈیشل و فنانشل اور ریونیو ڈیپارٹمنٹ میں ہوں گے اور کپتان نیڈر صاحب ملٹری سکریٹری"

(اخبار کوہ نور لاہور مطبوعہ ۲۹ جنوری ۱۸۵۶ء)

ہوا کا رخ انگریزوں کی بدنیتی اور بدعہدی اب زبان زد خاص و عام تھی انگریزوں کے طور طریقے دیکھکر ہر شخص محسوس کر رہا تھا "کچھ ہونے والا ہے"! عوام میں تو ہلچل تھی ہی رؤسا اور تعلقدار بھی مضطرب تھے اور اپنی تیاریوں میں مصروف :-

"دہلی گزٹ" میں بحوالہ ایک چٹھی لکھنؤ کی نقل ہے کہ اب تک تو لکھنؤ کے چھپے بے خبر چین کرتے تھے مگر جب سے کانپور میں لشکر جمع ہوا ہے اور ملک اودھ کی ضبطی کی خبر گرم ہوئی ہے تب سے ان کے بھی کان کھڑے ہوئے ہیں مگر یہ نہیں معلوم کہ ظل سبحانی حضرت جہاں پناہ ارادہ جنگ رکھتے ہیں (راضی برضا) کا معاملہ ہے بعض اشخاص کی یہ رائے ہے کہ شاید واجد علی شاہ کچھ سپاہ سے بمقابلہ پیش آوے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے لوگ سرکار انگریزی کے خیر خواہ ہیں اور امداد رسانی کی موجود اور خیر خواہ بادشاہ کے بہت کم نظر آتے ہیں تلسی پور کے راجہ نے تقریباً دس ہزار آدمی جمع کیے ہیں اور اپنے باپ کو قید کر لیا ہے اور بادشاہ کے عامل سے بھی سرکش ہو گیا ہے اندیشہ ہے کہ مبادا اسی طرح اور رئیس بھی بن بیٹھیں اور بادشاہ کو بھی خبر نہ ہو۔ اور سرکار کو رعایا سے لڑنا پڑے الغرض ہر طرح کے گمان ہیں جب تک سرکار کا تسلط نہ ہو جاوے جب تک اطمینان نہیں ہے

(اخبار کوہ نور لاہور مطبوعہ ۵ فروری ۱۸۵۶ء ص ۹۲)

"جس وقت کا دھڑکا تھا وہ وقت آ گیا آخر" بالآخر افواہوں نے واقعہ کی حقیقت کی صورت اختیار کر لی

انگریزوں نے تمام عہد ناموں کو بالائے طاق رکھکر اودھ پر قبضہ کرلیا کوہ نور نے "لاہور کرانیکل" اور سنٹرل اخبار کلکتہ سے سرکاری گزٹ کا ترجمہ شائع کیا ہے :-

ضبطی ملک اودھ

ضمیمہ غیر معمولی ۱۲ فروری ۱۸۵۶ء "کوہ نور"

اخبار کوہ نور تیار ہو چکا تھا کہ اس عرصے میں اشتہار ضبطی ملک اودھ امیر کبیر نواب گورنر جنرل بہادر ابھی ساتویں تاریخ فروری کو مشتہر ہوا بذریعے پرچہ ضروری "لاہور کرانیکل" و "سنٹرل اشتہار" کلکتے کے اس کشور ہند کا ترجمہ اس کا ناظرین اخبار کے واسطے درج کیا جاتا ہے۔

اشتہار

۱۸۰۱ء میں جو صلح نامہ لکھا گیا تھا اس میں آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے عہد کیا تھا کہ ہم بادشاہ اودھ کی حفاظت مخالفان غیر ممالک اور اندرونی سے کرینگے اور بادشاہ اودھ نے عہد کیا تھا ہم انتظام اس قسم کا موافق اپنے اہل کاروں کے رکھیں گے کہ رفاہ رعایا کا ہو اور جس سے (رعایا کی) جان اور مال کی محافظت رہے چنانچہ جو وعدہ سرکار ایسٹ انڈیا کمپنی نے کیا تھا اس کا لحاظ قریب پچاس برس تک ایمانداری سے برابر کامل طور پہ بجا رکھا اور ہمیشہ اور ہر طرح اس کی پابندی کی۔

اس عرصے میں ہر چند سرکار کمپنی نے بہت سی لڑائیاں کیں مگر کسی مخالف غیر نے زمین پر پاؤں نہ رکھا اور نہ کوئی ایسا مفسدہ ہوا کہ جس سے ریاست میں خلل کا اندیشہ ہوتا اور جب کبھی رفتے بادشاہ کے حکم کی عدولی کی تو ہمیشہ فوری امداد ایک خاص اور ضروری شرط صلح فرمان روایان اودھ کی جانب سے برابر ملحوظ ہوتی رہی اور جو (بادشاہ) وعدہ تھا کہ ایسا انتظام ہوگا کہ جس سے جان و مال سکنائے اودھ کی حفاظت اور ان کی سرسبزی کا باعث

ہوا۔ ابتداء سے انتہا تک عملاً خلاف ہوتا رہا۔ اس عہد شکنی کے باعث اگر سرکار انگریزی کبھی اس عہد نامے کو باطل کر دیتی تو جائز تھا۔ اب حالت یہ ہے کہ انصاف اور قانون نام کو نہیں۔ جبر اور خونریزی روزمرہ ہے جان و مال ایک کا بھی محفوظ نہیں۔ سرکار انگریزی اودھ کی برائیوں اور خرابیوں کو نہیں دیکھ سکتی۔

پچاس برس کے تجربے سے معلوم ہوا کہ ۱۸۰۱ء کے عہد نامے سے سکنائے اودھ کو خوشی اور برتری مطلق نہ حاصل ہوتی اور بخوبی ظاہر ہوا کہ اس ظلم سے سکنائے اودھ کو بے انکہ انتظام کل اضلاع اودھ کا ہمیشہ کے لئے سرکار انگریزی کے ہاتھ میں آوے اور کسی صورت میں ممکن نہیں۔

واسطے حصول اس مدعا کے آنربیل کورٹ آف ڈائرکٹرز کے یہ بات قرار پائی کہ ۱۸۰۱ء کا معاہدہ جس کا بادشاہ نے لحاظ نہیں کیا آئندہ کو قطعاً منسوخ سمجھے۔

آنربیل ایسٹ انڈیا کمپنی (نے طے کیا ہے کہ) بادشاہ کو اور ان کے خاندان کو مواجب معقول دیا جاوے۔ واجد علی شاہ بادشاہ سے اور نیز ان کے مورثوں سے ایفائے شرط عہد نامہ ۱۸۰۱ء کا کیا گیا اس کی رو سے ان کو ملک میں ایسا انتظام کرنا فرض تھا جس سے رعایا کو سرسبزی اور خوشحالی اور امان بجا کہ وہ عہد نامہ جس کو بادشاہ نے توڑا وہ منسوخ سمجھا گیا اس لئے سب پر ظاہر ہے کہ حکومت انگریزی کو بجز ایک امر کے اور کوئی چارہ نہ رہا۔

یعنی یا تو رعایا اودھ کو ظلم اور تعدی میں چھوڑ دے کہ ایسی حالت میں بہ سبب شرط صلح کے وہ لوگ مدت سے پڑے ہوئے ہیں یا آنکہ اپنے زور قوی کو واسطے حمایت ان لوگوں کے حق کے واسطے پچاس برس

سے زیادہ (انتظار کیا کام میں لائے)" ناتمام[1]

(ضمیمہ اخبار کوہ نور مطبوعہ لاہور ۱۲ فروری سنہ ۱۸۵۶ء)

یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے!

اودھ کی سلطنت ضبط ہو چکی ہے۔ نظم جدید کا دور دورہ ہے

ابتک انگریزوں نے اپنی پالیسی متعین نہیں کی ہے۔ نظم مملکت کے مستقبل سے متعلق مختلف افواہیں اڑ رہی ہیں۔ بادشاہ کو ہموار کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوئی۔ اودھ "راضی نامہ" پر کسی طرح دستخط کرنے کو تیار نہیں ہیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس دھاندلی کے خلاف برطانوی حکومت سے استغاثہ کرنا چاہتے ہیں۔ رعایا مایوس، فوج برخاست، "نئے لوگ" نئی دنیا، نیا ماحول:۔

"پہلے اس سے اخبار انگریزی سے حال اودھ کا لکھا گیا تھا اب جو تازہ ترین خبریں ملی ہیں وہ بھی واسطے ملاحظہ شائقین اخبار درج کی جاتی ہیں۔ تحقیق خبر ہے کہ اودھ میں صرف انتظام سرکاری نہیں ہوگا بلکہ یہ ملک داخل ممالک محروسہ سرکار کمپنی بہادر کے کیا جاویگا۔ یہ بھی سنا ہے کہ مسٹر کوپر صاحب جو گورنمنٹ کے ڈپٹی سکریٹری ہیں چیف کمشنر اودھ کے سکریٹری مقرر ہوئے اور چار کمشنر ہونگے یعنی کریچن صاحب، ماسٹر ویکغلڈ صاحب، میجر بنکس صاحب، اور کرنل گولڈنی صاحب اور صاحبان ذیل بہ عہدہ ڈپٹی کمشنر اضلاع کے مامور ہونگے یعنی مسٹر ڈینس صاحب، مسٹر فورلنس صاحب پنجاب سے اور مسٹر باسلو صاحب ضلع بدایوں سے، مارٹن صاحب مرزاپور سے، مسٹر ہڈنس صاحب مظفرنگر سے، مسٹر پاٹک صاحب بنارس سے، مسٹر تنیا ڈیلی صاحب مراد آباد سے، مسٹر کنلف صاحب روہیلکھنڈ سے، مسٹر جی لارنس صاحب اٹاوہ سے، مسٹر گڈن صاحب روہیل کھنڈ سے اور مسٹر بیڈک صاحب انگلینڈ سے تشریف لائیں گے۔ مسٹر گبن صاحب فنانشل کمشنر اور مسٹر اوانی صاحب جوڈیشل کمشنر تجویز ہوئے ہیں اور کپتان گوشن صاحب

---

[1] اصل ماخذ میں (یہ) ضمیمہ جابجا سے کرم خوردہ اور ناتمام ہے۔

۲۷ رجمنٹ ہندوستانی اور لفٹیننٹ سلیس صاحب لفٹیننٹ گورنر کے مصاحب اور لفٹیننٹ ہار صاحب جنٹ مجسٹریٹ چھاؤنی کانپور کمانیر رجمنٹ ہائے جدید ہونگے کہ واسطے ملک اودھ کے بھرتی کئے جائیں گے۔

اخبار لاہور کرانیکل مطبوعہ ۹ ماہ رواں میں بذریعہ ایک چٹھی مورخہ ۴ تاریخ مقام لکھنؤ کے درج ہے کہ اول تو حضرت بادشاہ ترکِ سلطنت پر راضی ہو گئے تھے مگر اب عزم جنگ رکھتے ہیں کہ ہم حکام ولایت سے استغاثہ کرینگے۔ اب حضرت کے حال پر کوئی رحم نہیں کرتا۔ صاحبان انگریز اور نہ ان کی رعایا۔ جنرل اوٹرم صاحب نے حال ضبطی ملک کا بادشاہ کا بہ کمال آہستگی اور حلم ظاہر کیا مگر یہ گولی بہت کڑوی تھی۔ بادشاہ بآسانی نہ کھا سکے مگر اب نہ ان کے پاس فوج ہے نہ رعایا۔ اس لئے چارو ناچار اس کو گوارا کرنا پڑا۔ سابق میں سنتے تھے کہ افواج سرکاری فیض آباد میں مقیم ہوگی۔ اب سُنا ہے کہ لکھنؤ کے قریب رہیگی۔ سب لوگ متحیر ہیں کہ دیکھئے انتظام جدید کب ہوتا ہے عہدہ داران کلاں کو بڑی تشویش ہے۔ ایک شخص یہاں کے رہنے والے نے درخواست کی ہے کہ اگر مجھ کو پچاس ہزار روپیہ مل جائے تو تمام قلعے اور گڑھیاں ملک اودھ کی مسمار کر دوں۔ صاحب خبر لکھتے ہیں کہ یہاں کام اس سے بھی آسان ہو سکتا ہے صرف حکم کی دیر ہے اور ایک خط اسی تاریخ کا مقام کانپور سے آیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ بادشاہ نے راست بردوی سے کام لیا۔ تحقیق بات یہ ہے کہ آج تک جنرل اوٹرم صاحب نے بادشاہ کو حال ضبطی ملک نہیں سنایا اور ملاقات ہوتی تو اقرار و انکار بادشاہ کا معلوم بھی ہو سکتا۔ حال یہ ہے کہ سب طرح خیریت معلوم ہوتی ہے۔ صاحب ریزیڈنٹ نے وزیر سے مشورہ کیا تھا کہ اب وزیر ہر طرح سرکار انگریزی کا مددگار ہے درخواست سرکار انگریزی کی یہ ہے کہ بادشاہ لکھنؤ میں مقیم رہیں اگر ۱۵ لاکھ روپیہ سالانہ پنشن سے لیا کریں اور دو رجمنٹ اپنی کار خدمات کے واسطے متعین رکھیں۔ باقی فوج یا تو برطرف ہو جائے یا کمپنی سرکار انگریزی کی ماموری ہوں گے۔ اور کرنل گری صاحب کمانڈنٹ ہونگے بالفعل برگیڈ اول راہ راست فیض آباد کو چلا جاویگا

اور وہاں جاکر مقیم ہوگا۔ دوسری گورہ رجمنٹ کو بذریعہ تار بجلی کے حکم کیا گیا ہے کہ بلا توقف صرف
کانپور کے کوچ کر جائے۔ اخبار "دہلی گزٹ" میں بھی ایک چھٹی مقام لکھنؤ کے ذریعہ سے لکھا ہے کہ
بادشاہ نے ایک دستاویز پر مہر کردی ہے مضمون دستاویز کا یہ ہے کہ ہم نے ملک اپنا سرکار کمپنی بہادر
کو عطا کیا اور پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ لینا قبول کیا۔ ملازمان فوج شاہی کو خبر کی گئی کہ آئندہ سے
وہ اپنے تئیں بادشاہی نوکر نہ سمجھیں اور بادشاہ اپنے ملازمین دیگر رفتہ رفتہ برخاست کرتے ہیں
صدہا بیگمات کہ زینت بخش محل شاہی ہیں برطرف ہوتی جاتی ہیں ان کو اجازت ہے کہ جو جو زیور
اور مال ان کے پاس ہے وہ لے جاویں۔ اب بادشاہ تیاری کرتے ہیں کہ فیض آباد میں مقیم رہیں۔
بادن رجمنٹ شاہی اور دو ہندوستانی پلٹن اودھ سے چھ کوس کے فاصلے پر مقیم ہیں۔ اخبار سنٹرل
سٹار میں از روئے چھٹی مقام لکھنؤ مورخہ ۳ فروری کے خبر ہے کہ اس روز بادشاہ اودھ نے حکم دیا کہ
سب توپیں وغیرہ پھکوا دی جائیں اور فوج کے ہتھیار لے لیے جاویں۔ جنرل اوٹرم صاحب نے یہ حال
سنکر وزیر کو سمجھایا کہ امور در حاصل ہیں اگر حضرت گورنمنٹ سے کچھ کیا چاہتے ہیں تو لکھ کر دیں اور ہم سے
جہاں تک ہو سکے گا سعی کرینگے بادشاہ کے حق میں بہتر یہی ہے کہ راضی نامہ ترک سلطنت کا لکھ دیں ورنہ
انکے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ چنانچہ وزیر نے یہ حال فوراً بادشاہ سے جاکر کہا۔ کپتان میٹر صاحب کہتے ہیں
کہ بادشاہ کا ارادہ راضی نامہ پر دستخط کر دینے کا تھا مگر نہ معلوم اب کیوں انکار کرتے ہیں۔ اب عزم بادشاہ
کا یہ ہے کہ اگر ہماری سلطنت ہاتھ سے نکل گئی تو ہم سیدھے لندن کو جاوینگے حکم دیدیا ہے کہ پچھلا سب
حساب بنایا جائے اور فوج کو طلب تقسیم کردی جاوے اور کل فوج کو آخری جنوری تک تنخواہ دے کر
معزول کردیویں بیگمات کے تمام ملازمین اور متعلقین برطرف ہوتے جاتے ہیں اور وزیر مال کاغذات
حساب مال کے لغایتہ جنوری تیار کر رہا ہے۔ ایک خط سے دریافت ہوتا ہے کہ بادشاہ نے راضی نامہ پر
دستخط کر دیئے مگر صاحب خبر لکھتے ہیں کہ شام تک تو دستخط ہرگز نہیں ہوئے تھے۔ چوتھی فروری کی یہ خبر
ہے کہ جنرل اوٹرم صاحب بادشاہ کی ملاقات کو گئے اور ان سے درخواست کی کہ راضی نامہ ترک
سلطنت کا لکھ دیجیے اور ملک اپنا بنام کمپنی لکھ دیجیے بادشاہ نے صاف انکار کیا اور جنرل اوٹرم صاحب

نے بادشاہ کو تین دن کی مہلت دی ہے و ارہ بادشاہ نے صاحب ریزیڈنٹ کو بلایا اور یہ پوچھا کیا تم راضی نامہ ترک سلطنت کا لکھایا چاہتے ہو؟ جنرل اوٹرام صاحب نے کہا کہ ہم کو جیسا حکم ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں تب انہوں نے کہا کہ ہم سرکار میں نالش کریں گے اور جلسہ پارلیمنٹ ہاؤس آف کامنز میں استغاثہ کریں گے۔ تب جنرل صاحب نے جواب دیا کہ خواہ ولایت کو آپ جاؤ خواہ وکیل کو بھیجو کچھ حاصل نہیں۔ کیونکہ اس انتظام میں کچھ فرق نہیں ہوگا اور ۹ تاریخ کو بادشاہ کو ہمارا جھوٹ سچ کھل جاوے گا۔ ریزیڈنسی سے حکم جاری ہو گیا کہ اب عرائض نہ سنے جاوینگے بلکہ جو افسر جس پرگنہ تعینات ہے وہاں نالشیں دائر ہونگی۔ بادشاہ نے اپنے امراء کو جمع کر کے مشورہ کیا اور آخر کار شرف الدولہ کو صاحب ریزیڈنٹ کے پاس بھیجا۔ اس کے بعد بیگم سے ملاقات ہوئی اور شرف الدولہ نے بادشاہ کو صلاح دی کہ تم کوئی بات قبول نہ کر لینا۔ بادشاہ کے واسطے بہتر ہے کہ بزور فوج مقابلہ نہ کریں بلکہ یہ استقلال یہ بات کہیں کہ گورنر جنرل کو ہمارے ملک پر تسلط کرنے کا منصب نہیں اس صورت میں جبراً ان سے سلطنت چھین لی جاویگی تو اہالیان انگریزی کو ضرور ان کے حال پر رحم آویگا۔ فوج کو حکم ہے کہ لکھنو سے ایک منزل ادھر مقیم رہیں "

(اخبار کوہ نور لاہور، مطبوعہ ۱۲ فروری ۱۸۵۶ء)

تاج شاہی چھنتا ہے

بالآخر کیفیت منتظرہ ختم ہو گئی۔ کمپنی بہادر نے عنانِ مملکت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ واجد علی شاہ اب بادشاہ نہیں رہے رعایا بن گئے۔ زیادہ سے زیادہ ایک معزز شہری ——— "کوہ نور" یہ داستان سناتا ہے:۔

" اخبار دہلی گزٹ میں از روئے ایک خط مقام لکھنو مورخہ ۱۸ تاریخ کی خبر ہے کہ اب فوج وہاں کی تقسیم ہو گئی ہے کہ ۲۲ رجمنٹ فیض آباد کو گئیں کہ وہاں کرنل گولڈنی صاحب کمشنر مقرر ہوئے ہیں۔ اور ۱۱ رجمنٹ سیتاپور کو گئیں اور ۳۷ رجمنٹ سراب کو پانچویں رسالہ کا ایک ترپ رجمنٹ کے ہمراہ اپنا لشکر ہیں اب صرف ۴۸ رجمنٹ باقی ہیں۔ اب لشکر لکھنو سے ۲ میل کے فاصلے پر مقیم ہے سنا ہے کہ فوج کنجنٹ اودھ میں سب عہدہ دار مامور ہو گئے ہیں۔ رسالوں میں صاحبان متذکرہ

ذیل بھی بھرتی ہوئے ہیں یعنی کپتان ویلی صاحب اور کپتان ہارنگ صاحب اور لفٹننٹ گیل صاحب
سے سنا ہے کہ جو عہدہ داران انگریزی شاہ اودھ کے ملازم تھے ان کیواسطے عہدہ ہائے معقول سرکار
انگریزی کی سلطنت سے مامور ہونگے اور جو ضعیف اور لائق کام کے نہ تھے ان کو پنشن ملیگی اور باقیماندہ
میں بہ لحاظ قدامت خدمت اور لیاقت کے عہدہ ہائے جلیلہ کپتان ہیری صاحب اور کپتان آور
صاحب اور ان کے بھائی اور کپتان سرسی صاحب وغیرہ کا نام فہرست کے سرے پر درج ہے
بعض ان میں سے ہزار یا بارہ سو روپے ماہواری تنخواہ پاوینگے۔ کپتان ونسٹن صاحب شہر کے
مجسٹریٹ مقرر ہوئے اور کپتان آور صاحب انکے ڈپٹی مقرر ہونگے۔ جتنے محکمہ جات بادشاہی شہر میں
تھے سب پر کارندہ انگریزی تعینات ہو گئے۔ جو توپ اتاری گئی تھیں وہ پھر چڑھا دیں۔

اخبار "لاہور کرانیکل" سے نقل ہے کہ ۱ رجمنٹ ہندوستانی کو جنرل ویلر صاحب کے کیمپ میں
شامل ہونے کا حکم ہے اور بجائے اس کے وہاں چوتھی رجمنٹ جائیگی جنرل اوٹرم صاحب کی رائے یہ
ہے کہ ملک اودھ میں کچھ لڑائی نہیں ہوگی بلکہ انتظام بخوبی ہو جائیگا۔ ۱۷ رجمنٹ ہندوستانی آن پہنچی
اور ۴۸ رجمنٹ بہرائچ کی طرف کوچ کر گئے۔ کرنل گولڈنی صاحب فیض آباد کے کمشنر ہو گئے۔ یہ صاحب
وہاں کی پلٹن کے کمانڈنٹ رہیں گے" اخبار مذکور میں از روئے ایک چٹھی مورخہ ۱۷ تاریخ کی خبر ہے کہ
اشتہار ضبطی ملک یہاں چپ چاپ جاری ہو گیا ہے۔ یہاں کے لوگ سرکار کی عملداری سے ناراض
نہیں معلوم ہوتے مگر ابھی تک بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ بادشاہ تو حکم ضبطی کا سنکر چپ ہو رہے اس
واسطے ان کو کچھ اختیار نہ تھا اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر ہم نے کچھ تامل کیا تو پنشن سے بھی محروم
رہیں گے مگر درباری لوگ کہ جواب برطرف ہو گئے اور یہ لوگ صدہا بلکہ ہزارہا ہیں۔ یہ البتہ کچھ تکلیف دینگے
اور ان کی خبر ضرور دریافت سے ہے۔ یہ لوگ ابتدا سے دربار میں رہتے ہیں اور اپنے عمر حیلہ اور فریب میں
گزاری ہے ان سے امید نہیں کہ سیدھی طرح چپ ہو دینگے۔ ایک کانپور کے خط سے دریافت ہوا کہ
جس وقت صاحب ریزیڈنٹ نے حال ضبطی ملک کا بادشاہ کو سنایا تو حضرت نے تاج شاہی کو پھینک
دیا اور جواب دیا کہ تم میرا ملک اور مال بہت سے لو میں نے توپیں اتروا دیں اور میں مقابلہ نہیں کرونگا۔

مگر مجھ پر جبر و تخط کرنے کا نہ کرو میں اپنی موروثی سلطنت کو ہاتھ سے نہیں دے سکتا۔ غالب ہے کہ بادشاہ دستخط راضی نامہ پر نہ کرینگے اور نتیجہ اس کا اور بھی برا نکلے گا۔ ضبطی ہر طرح سے ہوگی۔ صاحب ریزیڈنٹ دونوں امور کیواسطے راضی ہیں۔ ۷ فروری کو جنرل اوٹرم صاحب نے حکم دیا کہ تمام اہالیان شاہی کو ریزیڈنسی میں حاضر کردو۔ دوپہر کے وقت علی نقی خاں وزیر راجہ بال کشن مختار امورات مال شرف الدولہ داروغہ پرمٹ اور کوتوال شہر اور دیگر اہل کاران شاہی حاضر ہوئے۔ صاحب ریزیڈنٹ نے راجہ بالکشن کو حکم دیا۔ تمام حساب کتاب سمجھا دو اور کوتوال سے کہا کہ کپتان ونسٹن صاحب کو رپورٹ تھانہ جات کی دیدو اور صاحب ریزیڈنٹ نے جابجا گارد تعینات کردئے اور حکم دیا کہ کام بدستور جاری رہیگا مگر روپیہ باہر نہ نکلنے پائے۔ بادشاہ نے سب زمینداروں اور تعلقہ داروں اور عاملوں کے نام اشتہارات جاری کردئے ہیں کہ کمپنی بہادر نے ہمارا ملک لے لیا اس لئے جس کسی کو صاحب ریزیڈنٹ مقرر کریں اسے خراج دیتے رہو اور کسی سے دنگہ فساد نہ کرو۔ ہم خود ولایت کو جاکر استغاثہ کرینگے اور غالب ہے کہ کامیاب ہوکر آویں گے۔ صاحب ریزیڈنٹ نے تین کمپنی واسطے ریزیڈنسی کے طلب کی ہیں۔ بادشاہ نے دروازہ محل کا بند کردیا اور کہتے ہیں کہ ہم راضی نامہ پر ہرگز دستخط نہیں کرینگے۔ (اخبار کوہ نور لاہور مطبوعہ ۱۹ فروری ۱۸۵۶ء)

"لوگ ناراض ہیں مگر خاموش"

شاہی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ بادشاہ نے مقابلہ نہیں کیا۔ رعایا نے خاموشی سے یہ انقلاب برداشت کرلیا۔ انگریزوں نے بغیر کسی کشت و خون کے ایک بہت بڑی مملکت پر بغیر کسی خطا اور قصور کے قبضہ کرلیا۔ پھر بھی انگریز سپاہیوں کا برتاؤ اہالی شہر کے ساتھ کیسا رہا؟ اور عوام کے غم و غصہ کا کیا عالم ہے۔ یہ قصہ کوہ نور کی زبانی سنئیے:۔

" سنا ہے کہ جنرل اوٹرم صاحب نے بادشاہ سے کہہ دیا ہے کہ جب تک تنخواہ تمام افواج کی روانہ نہ ہوجائے آپ لکھنؤ سے نہ جاویں اور ہم نواب گورنر جنرل کو اس باب میں لکھیں گے اور آپ جانتے ہیں کہ انجام اس کا کیا ہوگا۔ افواہ ہے کہ فوج نیپال نے بہرائچ میں آکر اس ضلع

ہیں تصرف کر لیا ہے اور دریائے گاگرا پار جس قدر ملک تھا سب دبا لیا ہے اور فوج سرکار کو دریائے
پار آنے میں مارچ ہیں راجہ تلسی رام کہ راجہ نیپال سے اس کی قرابت ہے اس معاملہ میں ساعی
ہے سنتے ہیں کہ اب تمام ملک اودھ کا سرکار کمپنی کی عملداری سے ناراض ہے اور سپاہ سرکار
کا خیال ہے کہ ہم اپنے اقربا اور ہم کفو لوگوں سے کیونکر مقابلہ کریںگے ؟ بادشاہ ۱۶ تاریخ کو لکھنؤ
سے روانہ ہوا چاہتے تھے مگر صاحب ریزیڈنٹ نے ان کو روک دیا۔ فوج لکھنؤ میں ہر طرف سے
چلی آتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان خبروں کا کچھ وجود ضرور ہے۔ بادشاہ کے مقدمہ میں
روز بروز جان پڑتی جاتی ہے۔ بادشاہ کو تقویت ہے کہ قوم انگریزی بڑی انصاف دوست ہے
اور سرکار کمپنی سے بالادست حکام بادشاہ کا انصاف کریںگے۔ اخبار دہلی گزٹ سے اندازہ ہوتا
ہے کہ تخمینہ اخراجات اس ملک کا اس طرح پر ہوا ہے۔ اخراجات جنگی ۷۲ لاکھ روپے
اخراجات سول ۴۱ لاکھ روپے اور محاصل ملک کا ایک کروڑ ۵۰ لاکھ روپے۔ راجہ بال کشن کی
زبانی معلوم ہوا ہے کہ بقایا تنخواہ فوج صرف بقدر ۲۵ لاکھ روپے کے ہے۔ مردمان متعلقین توپخانہ
شاہی کچھ تاوان معلوم ہوتے ہیں۔ چند پلٹنیں شہر کی چھاؤنی میں آ گئی ہیں۔ اب شہر میں دائمی
انتظام ہو گیا۔ اضلاع کا انتظام جلد ہو جائے گا۔ اخبار مذکور میں از روئے چٹھی مقام کانپور
مورخہ ۷ ارماہ رواں کے خبر ہے کہ لکھنؤ سے دفعتہً فوج کی طلبی ہوئی ہے۔ چنانچہ دو رجمنٹیں
روانہ ہو گئیں اور سوار ان پندرھویں رسالہ اور ایک جزو ۳۸ رجمنٹ تحت حکم شر صاحب کے
خزانہ لے کر گئے ہیں۔ افواہ ہے کہ دریا آباد کے قریب فساد ہو گیا کہ یہ مقام فیض آباد کے
راہ میں ہے۔ ۱۹ رجمنٹ ۱۵ تاریخ کو کوچ کر گئی ہوگی۔ ۴۳ رجمنٹ ۸ مارچ کو جاوے گی۔
منجملہ فوج شاہی کے فوج کنجنٹ میں دو سو سوار اور دو سو پیادہ اور سو گولندا ز بھرتی ہو
گئے ہیں اور روز بروز بھرتی جاری ہے۔ ۵۲ رجمنٹ شاہی باغ دل کشا میں اور فوج کنجنٹ
موتی باغ میں مقام کرے گی۔ اب شہر کا بندوبست ہو گیا ہے۔ اضلاع کا بندوبست ہووے گا۔
اب اودھ کے لوگ ضبطی ملک سے خوش نہیں۔ ہزار ہا لوگ شور و غل مچاتے ہیں اور کہتے ہیں

کہ سرکار کو سوائے ملک اودھ کے غیر مقامات کے آدمیوں کو نوکر رکھنا بعید از انصاف ہے۔ بادشاہ کے قدیم ملازمین میں بجز چند آدمیوں کے سب برخاست ہو گئے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ تمام حقوق کا لحاظ رکھا جائیگا۔ اب بادشاہ کی حالت پر سب کو رحم آتا ہے۔ بادشاہ نے جو ہر معاملے میں سرکار کی اطاعت کی۔ یہ بہت اچھی تجویز ہوئی کہ بعض لوگ اس بات سے ناراض بھی ہوئے۔ اور ایک زمیندار مفسد نے یہاں تک کہا کہ ایک پوشاک زنانی بھیج کر پیغام دیا کہ تم کو یہ لباس زیب دیتا ہے کیونکہ اس طرح سے بلا تکرار ملک میں دخل دے دینا اس لائق ہے کہ عورت کا لباس پہن کر بیٹھئے۔ جب سے ۵۲ رجمنٹ شاہی اور توپ خانہ پیدل شہر میں آیا ہے باشندگان شہر کی نظر میں انگریزوں کی اہانت ہوتی یعنی گورہ لوگوں نے بحالت مستی شراب کے شہر میں جا کر بہت نامعقول حرکات کیں اور جبر کئے۔ بعض آدمیوں کو حیرت ہے کہ انگریز اور گورہ میں کیا فرق ہے جو لوگ ہمیشہ لکھنؤ میں رہتے ہیں اور خصوصاً شہر کی مستورات کو تمیز نہیں کہ گورہ اور انگریز کو شناخت کریں۔ اس لئے ان کو بھی گمان ہے کہ یہ حرکات ناشائستہ صاحبان انگریز کی طرف سے ہوئیں۔ بروز جمعہ گزشتہ شہر لکھنؤ میں ایک بلوہ کی صورت پیدا ہوئی تھی۔ مگر ۴۸ رجمنٹ جلد جا پہنچی اور فساد رفع دفع ہو گیا۔ ۳۴ رجمنٹ کو جو روانگی کا حکم ہوا تھا منسوخ ہو گیا اور اب رجمنٹ مذکور مقیم رہیگی۔ کہتے ہیں کہ اضلاع میں فساد برپا ہے مگر شہر میں خیریت ہے۔ ہر چند لوگ ناراض ہیں مگر خاموش ہیں۔ اس ملک میں چار قسمتیں مقرر ہوتی ہیں یعنی لکھنؤ اور بہرائچ۔ خیر آباد اور محمدی۔ مردمان توپ خانہ شاہی نے توپیں دینے سے انکار کیا تھا۔ اس لئے فساد کی صورت نظر آتی تھی۔ مگر تمام فوج کانپور وہاں جانے کو تیار ہوئی۔ پر ان لوگوں نے مجبور ہو کر ہتھیار رکھ دئے۔ اخبار لاہور کرانیکل میں بذریعہ ایک خط مقام لکھنؤ کی خبر ہے کہ بادشاہ نے عزم ولایت جانے کا مصمم کر لیا ہے اور نواب گورنر جنرل بہادر نے اجازت دے دی ہے جہاں تک سرکار کا ملک ہے وہاں تک بلا کرایہ پہنچ جاوینگے مگر معلوم نہیں ولایت میں ان کا مہماندار

کون ہوگا۔ فہرست تعزری جدید اودھ جو اخبارات میں چھپی ہے واسطے ملاحظہ شائقین کے درج کی جاتی ہے۔

میجر جنرل اوٹرم صاحب چیف کمشنر و ایجنٹ گورنر جنرل، کپتان ہیز صاحب ملٹری سیکرٹری اور اسسٹنٹ ایجنٹ گورنر جنرل، مسٹر اون صاحب جوڈیشل کمشنر۔ مسٹر مارٹن گبین صاحب فنانشل کمشنر۔

صاحبان ذیل فوج جدید اودھ تو کل بھرتی مقرر ہوئے:-

جنرل اوٹرم صاحب اور کپتان ہیز صاحب سے انتظام بہت جلد ہو رہا ہے صاحبان کمشنر نے اپنا کاروبار جاری کر دیا۔ کپتان ونسٹن صاحب چیف مجسٹریٹ اپنی کچہری چوک میں کیا کرینگے کہ وہاں شہر میں آبادی کا زور ہے۔ بادشاہ کو محل میں رہنے کی اجازت ہے اور احاطہ دلکشا میں ممانعت نہیں جو آداب بادشاہانہ ہے وہ ان کے واسطے قائم رہے گا۔ پندرہ لاکھ روپے سالانہ رزیڈنسی کے خزانے سے ملا کرے گا۔

اور باقی سب عمارات تصرف عہدہ داران انگریزی میں آئیں گی۔ شہر کی ابھی سے حالت تبدیل معلوم ہوتی ہے اب مسلح آدمیوں کو بازار میں پھرتا نہیں دیکھتے۔ ہزارہا آدمی اشتہار ضبطی کو پڑھتے نظر آتے ہیں۔ یہ کسی کو خیال نہ تھا کہ بلا فساد کے اس طرح ملک ضبط ہو جاویگا۔ نیپال کی طرف راجوں کا مجمع معلوم ہوتا ہے کہ وہ زر محاصل نہیں دینا چاہتے۔ راجگان تلسی پور اور بلرام پور اور بنگا ان میں سرگروہ ہیں۔ یہ بھی خبر ہے کہ اہل نیپال ان کی مدد کرینگے۔ تنخواہ فوج بادشاہی کی رزیڈنسی میں تقسیم ہو رہی ہے۔ ستر ہزار آدمی تنخواہ دار ہیں۔" (از اخبار کوہ نور لاہور، مطبوعہ ۲۶ فروری ۱۸۵۶ء، ص ۱۴۲ تا ۱۴۵)

نئی حکومت نیا نظام

اب بادشاہ کو لوگ بھولتے جاتے ہیں۔ بادشاہ خود اپنے آپ کو فراموش کر چکے ہیں۔ انگریز نہایت اطمینان سے تسلط اور تصرف کی پالیسی پر عامل ہیں:-

اخبار لاہور کرانیکل میں از روئے خط مقام لکھنؤ کے خبر ہے کہ جنرل اوٹرم صاحب بہادر کے حسن انتظام سے انتظام ملک کا بتدریج ہوتا چلا جاتا ہے۔ بادشاہ کی فوج میں قریب دو ثلث ملازموں کا حساب بیباق ہو گیا جو جو خواہاں نوکری تھے ان کو اجازت دی گئی ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ بھرتی ہونے پر راضی ہیں۔ فوجوں کی دونوں رجمنٹیں حاضر آگئیں۔ صاحب لکھتے ہیں کہ جنرل صاحب کو اختیار ہے کہ بادشاہ کے ساتھ بہ سختی پیش آئے مگر اس حالت میں بدنظمی اور خونریزی کا احتمال تھا اور اس انتظام سے نہ ان کے وقار میں نہ نام آوری میں فرق آسکتا ہے۔ اثبات حق بہت ہے۔ مشکل یہ ہے کہ لوگوں نے اپنے حقوق اوروں کے ساتھ فروخت کر دئے تھے جو لوگ مخالفانِ سلطنت انگریزی ہیں وہ بادشاہ کے مشیر اور صلاح کار ہیں۔ اس لئے حضرت لا دعویٰ سلطنت کا لکھ کر دیتے ہیں۔ ابھی متامل ہیں اور ارادہ ولایت جانے کا رکھتے ہیں گر اس باب میں جنرل اوٹرم صاحب کا کچھ نقصان نہیں بلکہ بادشاہ کے چلے جانے سے انتظامِ ملک میں آسانی ہوگی۔ یہ بات کہ حکام بادشاہ کے ولایت جانے میں حارج ہیں، سو یہ قول غلط ہے کہ یہاں کوئی ان کا مانع نہیں بلکہ صاحب رزیڈنٹ نے ہر طرح سے ان کی مدد کی ہے اور تجویز کر دی ہے کہ جہاں وہ ہو دیں انکی تعظیم و توقیر ہووے۔ اگر واقعی بادشاہ ولایت جاوینگے تو ایک عہدہ دار انگریزی بھی ان کے ساتھ جاویگا۔ عہدہ داران بادشاہی متابعت سرکاری کی کرتے جاتے ہیں بعض لوگ اوائل میں سرکشی کرتے ہیں مگر اب انہوں نے جان لیا کہ نتیجہ انحراف کا برا ہے اس لئے خاموش ہو بیٹھے۔ ضبطی ملک سے وہ لوگ البتہ ناراض ہیں کہ جو بسبب دربار کے ٹکڑا کھاتے تھے مگر عوام الناس اس کو غنیمت سمجھتے ہیں اور شکر کرتے ہیں اگر جنرل سلیمن صاحب کی رائے پہ بادشاہ متحمل ہوتے تو تھوڑے دن کو اور سلطنت بچ جاتی۔ سرکار کی طرف سے بادشاہ کو پیغام تھا کہ اگر آپ راضی نامہ پر دستخط کر دیں تو ۱۵ لاکھ روپے سالانہ پنشن آپ کو اور تیرہ لاکھ روپے آپ کے متعلقین کو ملے گی مگر چونکہ بادشاہ نے دستخط نہ کئے اور وہ شرط قائم نہ رہی۔

اخبار دہلی گزٹ میں از روئے خط مقام بہرائچ ذکر ہے کہ جب سپاہ انگریزی نے سُنا کہ راجہ تلسی پور سرکشی کیا چاہتا ہے تو نیپالیوں نے اس ملک پر تسلط کر لیا تو وہ اپنے دل میں خوش ہوئے مگر ان کی تمنا حاصل نہ ہوئی۔ حال یہ ہے کہ اس ضلع میں فوج سرکاری آرام سے مقیم ہے اور سپاہی لوگ اپنے عزیز و اقارب سے مل کر خوش ہیں اور اپنے بھائی بندوں کو نوکر کرانے کی فکر میں ہیں۔ ملک میں ارزانی ہے۔ نخود ایک روپیہ من فروخت ہوتا ہے لوگ وہاں کے ایک بات سے راضی ہوئے کہ جو شخص ان سے کوئی چیز خریدتا ہے اس کے دام فوراً مل جاتے ہیں۔ بہ عہد سابق سپاہ بادشاہی ان سے جبراً خریدتے تھے اور اگر وہ انکار کرتے تھے تو انکی دکانوں کے چھپر اتار لئے جاتے تھے کہتے ہیں کہ ضلع بہرائچ سیر و شکار کیواسطے اچھی جگہ ہے اور اس مقام میں تجارت بھی ہوتی ہے۔ اسلحہ وغیرہ لوہے کا کارخانہ یہاں بہت ہے اور یہاں کی تلوار ہندوستان بھر میں مشہور فوج سرکاری بھی ڈویژن میں مقیم ہے۔ بارکیں جلد تیار ہونگی۔ ابھی بادشاہ نے کوئی وکیل اپنی جانب سے مقرر نہیں کیا۔ مگر گورنر جنرل کے جواب کا انتظار ہے۔ بادشاہ کو اجازت ہے کہ دو پلٹن پیلود، ایک رسالہ سواران اپنی ملازمت میں رکھیں۔ چھاؤنی میں مکانات کرایہ پر دستیاب نہیں ہوتے۔ اور خیمہ میں رہنا اس موسم میں دشوار ہے۔ ایک اور شخص لکھتا ہے کہ ضلع بہرائچ میں سب طرح امن و امان ہے تیلسی پور کے راجہ نے قریب بیس ضرب توپ کے بھیج دی ہیں اور باقی پیچھے سے بھیجا چاہتا ہے۔ حکام نے بادشاہ سے پوچھا ہے کہ آپ کب جاتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں اگر بتلا دیجئے تو انتظام آپ کی آسائش اور مہمانداری کا ہو جائے۔

اخبار دہلی گزٹ میں ایک اور خط لکھنؤ کا درج ہے اور صاحب خبر رساں فرماتے ہیں کہ یہ حال معتبر ہے یعنی ملک میں امن چین ہے۔ عہدہ داران سرکاری کا کسی نے مقابلہ نہیں کیا اکثر مقامات پر رعایا بہت خوش ہوئی اور شکر گزار صرف سپاہی فوج سابق بادشاہ کی دشوار ہے۔ حساب ان کے بڑے مہمل اور مبہم ہیں۔ فوج بادشاہی سرکار انگریزی کی ملازمت کرنے کو تیار ہے۔ مگر پلٹن ہائے نجیب کہ یہ لوگ ہمیشہ سے اوباش ہیں اور لوٹ کھسوٹ سے

اپنا گزارہ کرتے ہیں۔ البتہ ناراض ہیں۔ سو یہ امراؤں کی شامتِ ایام میں داخل ہے۔ تمام ملک شاداب اور سیر حاصل ہے۔ دریائے گھاگرا نہایت سبز سبز مگر اکثر قصبات غیر آباد مکانات اور دوکانیں پڑی ہیں اور جوار اضیاعات بدرجہ عنایت سیر حاصل ہیں ان میں تردد کشتکاری نہیں ہوتا بادشاہ اپنی صلاح کاروں کی مرضی کے کاربند ہیں۔ اکثر خوجہ اور مستورات ان کے مشیر ہیں۔ اہلیان دربار شاہی اکثر حضرات کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں مگر بجز نائب ریاست کے اور کسی کو بار نہیں ملتا۔ اول بادشاہ کا ارادہ کلکتہ جانے کا تھا اور کانپور شامیانہ اور خیمہ استادہ ہوتے تھے اور آمد آمد کی خبر گرم تھی مگر اب تک شک ہے کہ بادشاہ کہیں جانے کا عزم کرینگے یا نہیں۔ ملک کی چار قسمتیں مقرر ہوئی ہیں۔

(۱) خیر آباد (۲) لکھنؤ (۳) گونڈا بہرائچ (۴) فیض آباد

(اخبار کوہ نور لاہور۔ مطبوعہ ۴ر مارچ ۱۸۵۶ء)

واجد علی شاہ بستر علالت پر

غموں اور صدموں نے واجد علی شاہ کی جان پر بنا دی تھی اور وہ مسندِ شاہی کی بجائے بسترِ علالت کو آباد کیے ہوئے ہیں:۔

" سنتے ہیں کہ اب اودھ میں انتظام واقعی ہو گیا ہے۔ بادشاہ بیمار ہیں۔ ابھی علی نقی خاں وزیر بادشاہ کے ساتھ ہم جلیس رہتا ہے لوگ اس بات سے ناراض ہیں۔ غالب ہے کہ بادشاہ ارادہ ولایت جانے کا نہ کرینگے۔ گورنمنٹ نے درخواست ان کی منظور کی ہے۔ اضلاع بہرائچ اور سلطانپور کے زمیندار صاحب کمشنر کے روبرو حاضر آئے اور اطاعت اختیار کی۔ ابھی تلسی پور کا راجہ سرکشی کا دم بھرتا ہے۔ صاحب چیف کمشنر نے حکم دیا تھا کہ اپنی توپیں سرکار میں داخل کر دو تو اس نے ایک عذر معقول کر دیا ہے وہ سمجھتا ہے کہ میری گڑھی پر فوج سرکار کچھ نہیں کر سکتی اور اس لئے متابعت میں تامل کرتا ہے۔ (دا نا اخبار کوہ نور لاہور۔ مطبوعہ ۱۱ر مارچ ۱۸۵۶ء)

واجد علی شاہ کے بارے میں افواہیں

واجد علی شاہ ابھی تک لکھنؤ میں مقیم

ہیں لیکن ان کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں اڑ رہی ہیں اور سارے ملک میں گشت کر رہی ہیں۔

افواہ ہے کہ کپتان بڑ صاحب بہمراہی شاہ اودھ کانپور آئیں گے وہاں سے انگلستان کو ان کے ساتھ جائیں گے۔ اخبار دہلی گزٹ سے معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے۔ تمام ملک میں خیر و عافیت ہے اور انتظام جنگی اور ملکی روز بروز ترقی پر ہے۔ چند پلٹنیں بادشاہی سرکار کی ملازم ہو گئیں اور انتظام میں مصروف ہیں۔ سب امیر رئیس تعلقہ دار اطاعت کرنے جاتے ہیں۔ اب افواہ ہے کہ بادشاہ جمعہ کے روز عازم ولایت ہونگے اور لوگوں کو بھروسہ ہے کہ وہاں جاکر ناکام نہ آئیں گے مسٹر کمرٹی صاحب کو بادشاہ نے بمشاہرہ دو ہزار روپے کے اپنا منیر مقرر کیا ہے۔

(از اخبار کوہ نور لاہور، مطبوعہ ۸، مارچ ۱۸۵۶ء)

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت؟

واجد علی شاہ اختر۔ اختر نگر (لکھنؤ) سے سدھار گئے اور ان کے جاتے ہی سارے شہر کا نقشہ بدل گیا۔ اب

نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

نہ اب شاہی نقیب اور چوبدار نظر آتے ہیں۔ نہ دربار شاہی کا طمطراق اور جاہ و جلال نہ وہ شاہی دبدبہ ہے نہ طنطنہ۔ شہر میں اب انگریزوں کا راج ہے اور وہ اپنی میموں کے ساتھ بگھیوں پر اُڑے پھرتے ہیں۔ شاہی محلات و قصور —— جہاں زندگی اپنی پوری رعنائی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی تھی۔ اب ویران و سنسان پڑے ہیں۔ مکان کے دروازے بند اور مکین ندارد!

کوہ نور و قمطراز ہے:۔

"سنا ہے کہ جنرل اوٹرم صاحب بہادر عہدہ چیف کمشنری سے استعفا دیا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جنرل اوٹرم صاحب کیواسطے یہ عہدہ غیر مناسب ہے۔ سنتے ہیں کہ سپاہیان پولیس نے شہر میں کچھ ہنگامہ کیا تھا یعنی تنخواہ لینے اور ہتھیار رکھ دینے سے عذر کیا تھا۔ یہ لوگ چار سو بیس تھے مگر مسٹر سمین صاحب بہادر اور کپتان ہنر صاحب بہادر اڑتالیس رجمنٹ ہندوستانی اور کوتوال

شہر نے جاکر یہ فساد رفع کیا۔ جس وقت کپتان صاحب نے حکم دیا کہ بندوقیں بھر لو اور ان سے کہا کہ اب تم پر باڑھ چھوڑی جاویگی۔ تو دب کر چپ ہو رہے۔ فوراً ہتھیار رکھ دئے اور خاموش زمین پر بیٹھ گئے۔ اگر چند گھنٹے یہ ہنگامہ بند نہ ہوتا تو اندیشہ زیادہ فساد کا تھا کہ بلا فوج کشی اور دفاع ان کا محال نظر آتا اور خونریزی ہو جاتی۔ فوج سرکاری نے آرام کیواسطے چھپر تیار کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ بقایا تنخواہ کے کمیٹی جمع ہوئی ہے ایک پلٹن وہاں گئی۔ اگرچہ ابتداً ان کو تنخواہ لینے میں عذر تھا۔ مگر انجام کار دل میں کچھ سوچ کر چپکے سے تنخواہ لے لی اور اب خواہانِ نوکری ہیں جنرل اوٹرم صاحب چاہتے ہیں کہ کسی صورت ہیں سب ملازمان شاہی کو نوکری مل جائے۔ عوام لوگ تبدیل سلطنت سے راضی ہیں۔ صرف چکلہ دار لوگ جن کے پاس ملک کا ٹھیکہ تھا البتہ ناخوش ہیں کیونکہ انکی معاش میں فرق ہو گیا۔ مگر ایسے تھوڑے سے آدمی ہیں۔ ایک ان میں سے تلسی پور کا راجہ ہے مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اب موسم گرمی کا آگیا ہے اس لئے بندوبست جدید نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ یہ لوگ دینا قبول کرتے ہیں وہ غنیمت سمجھا جاتا ہے مگر آغاز موسم سرما میں صاحب کمشنر دورہ کرنے جاوینگے اور جو قلعہ اور گڑھی وغیرہ سرکشوں کے ہیں ان کو مسمار کر دینگے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے قلعے رئیسوں کے ہیں اور گرد ان کے بانس کے جنگل ہیں اس لئے یہ سب مقامات مسمار کروائیں گے۔

خبر ہے کہ حقیقت میں بادشاہ دریا پار اتر گئے اور کلکتہ کی جانب روانہ ہوئے۔ مگر یہ امر بادشاہ کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ ان کے تعظیم اور توقیر میں فرق آجائے گا۔ اب ولایت کے لوگوں کو کبھی امرائے ہند کے دیکھنے کا شوق نہیں رہا۔ اول بابو رام موہن رائے، اور بعد ان کے دوار کا ناتھ ٹھاکر اور واں بعد جنرل جنگ بہادر اور پھر مہاراجہ دلیپ سنگھ جو گئے تھے ان کی البتہ توقیر اور تعظیم ہوئی تھی۔ مگر شاہ اودھ کی عادات ناشائستہ ایسے ایسے مشہور ہیں کہ لوگوں کو ان کے حال پر چنداں توجہ نہ ہوگی۔ لکھنؤ میں بسبب مہاجرت بادشاہ کے بڑی بے رونقی ہو گئی ہے جہاں بازار میں بادشاہی نقیب اور چوبدار اور اہالیانِ دربار نظر آتے تھے۔ اب ان کے بجائے صاحبان انگریز نظر پڑتے ہیں۔ محل شاہی کہ جہاں تمام شہر سے زیادہ رونق رہتی تھی اور ہزارہا آدمی باشان د

شوکت موجود ہوتے تھے اب خالی نظر پڑتے ہیں، دروازے ان کے بند ہیں۔ سنسان معلوم ہوتے ہیں۔ قبل از روانگی کے بادشاہ چند روز کانپور مقیم رہیں گے بہت سے امیر امرا و قدیمی بادشاہ کے پیچھے کانپور میں گئے ہیں۔ وزیر کا بھی ارادہ تھا۔ مگر صاحب رزیڈنٹ نے ان کو نہ جانے دیا کہ جب تک تمام حساب کتاب پاک نہ ہو جائے تم کہیں نہ جاؤ۔ ابھی خبر آئی ہے کہ دریا آباد میں درمیان ایک پلٹن بادشاہی اور زمیندار کی لڑائی ہو رہی ہے۔ نام اس زمیندار کا جنڈی سنگھ ہے اور تھوڑے عرصے سے سرکار انگریزی اس سے ناراض ہے۔ مفصل اب تک معلوم نہیں ہوا۔

(از اخبار کوہ نور لاہور۔ مطبوعہ ۲۵ مارچ ۱۸۵۶ء)

(۱۱) بے بس بادشاہ!

واجد علی شاہ نے لکھنؤ چھوڑ دیا۔ اب وہ کلکتہ جا رہے ہیں وہاں سے انگلستان کا قصد ہے تاکہ وہاں اپنا استغاثہ پیش کریں۔ اس آئینی اقدام کے سلسلہ میں بھی انہیں کسی طرح کی سہولت نہیں دی جاتی بلکہ رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں۔

"اخبار سنٹرل اسٹار سے معلوم ہوا کہ شاہ اودھ کانپور میں پانچ بجے صبح کے بتاریخ ۱۴ مارچ تشریف فرما ہوئے۔ سنا ہے کہ بادشاہ کا ارادہ اپنے وزیروں کو ہمراہ لے جانے کا تھا مگر جنرل اوٹرم صاحب بہادر ج ہوئے۔ کوتوال کو حکم دے دیا گیا ہے کہ وزیر علی نقی خاں اور راجہ بالکشن کو لکھنؤ سے نہ جانے دے پاسبانے اس کے کہ بادشاہ کچھ کاغذات اسناد وغیرہ بطور وجہ ثبوت اپنے مقدمے کے ساتھ لے جانا چاہتے تھے وہ بھی نہ لے جانے دیئے۔ اب بادشاہ کہتے ہیں کہ بلا ہمراہی وزرا اور اتفصیل معاملہ اور کاغذات کے مقدمہ کی پیروی اور ثبوت کیوں کر کرینگے؟ مگر غالب ہے کہ لارڈ کیننگ صاحب بہادر گورنر جنرل جدید ایسی تجویز کرینگے کہ جس میں بادشاہ کو حسب دلخواہ موقعہ اثبات مدعا کامل جاوے۔

(از اخبار کوہ نور لاہور۔ یکم اپریل ۱۸۵۶ء)

فردِ جرم بدل گئی!

اب تک واجد علی شاہ کی عیش پرستی اور شوق رقص و سرود کا پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔ اب یہ الزام واپس لے لیا گیا اس لئے کہ چلنے والی چیز نہ تھی۔ اب ان کی بدانتظامی، غفلت اور وزرا کی نمک حرامی کا ذکر باقی رہ گیا ہے۔ "کوہ نور" لکھتا ہے:-

ایک عنایت نامہ ملک اودھ سے ہمارے پاس پہنچا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تھانہ بندی اور چوکیات کا انتظام ہو رہا ہے۔ مالگذاری کے واسطے یہ تجویز ہوئی ہے کہ بابت بقایا سنہ ۱۲۶۳ فصلی بنام قابضان بدستور بند و بست رہے گا اور بعد اس کے بند و بست سرسری تین سال کا تجویز ہو کر تشخیص جمع ہوگی۔ منشی بیر سکھ رائے تحصیلدار قصور کو مسٹر سمن صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر لاہور کے ہمراہ لکھنؤ گئے تھے۔ بعہدہ تحصیلداری مقرر ہوئے اور منشی موہن لال سابق سررشتہ دار کلکٹری لکھنؤ میں مقرر ہوئے۔ بہت عہدہ دار ملازمان شاہی میں سے بھرتی ہوئے ہیں۔ صاحب خبر لکھتے ہیں کہ بادشاہ اودھ گو شوق ناچ رنگ، گانے بجانے کا بہت رکھتے تھے مگر مزاج ان کا بہت حلیم اور متحمل تھا اور ان کی طرف سے کسی نوع کا ظلم بجال رعایا نہیں ہوا۔ ضبطی ملک صرف بسبب غفلت کار اور نمک حرامی علی نقی وزیر سلطنت ملقب بخان عالم کے ہوئی۔ اب جہاں پناہ ولایت کو تشریف لئے جاتے ہیں۔ (از اخبار کوہ نور لاہور مطبوعہ ۱۸ اپریل ۱۸۵۶ء)

توڑ پھوڑ، تخریب، انہدام

قبضہ مکمل ہونے اور تصرف کامل ہونے کے بعد مہذب انگریزوں نے کیسی غیر مہذب ذہنیت اور اطوار کا ثبوت دیا۔ اسے "کوہ نور" یوں بیان کرتا ہے:-

"صادق آباد کے بڑے معتبر کارسپانڈنٹ اپنی تحریرات مصدرہ پہلی اپریل میں لکھنؤ سے تحریر فرماتے ہیں کہ سرکار انگریزی کا ارادہ ہے کہ دولت خانہ نواب آصف الدولہ مغفور کا منہدم کر کے بجائے اس کے چھاؤنی ڈالیں اور توپ خانہ و دروازہ جنوب رویہ پر رکھا گیا ہے اور چار مکان عالیشان جو تالاب حسین آباد پر واقع تھے انکے دروازے توڑ پھوڑ کر بند کر دیے ہیں اور چھ محل کہ

ہر ایک ان میں سے عجیب و غریب منظر تھا کھدوانے شروع ہو گئے ہیں اور علیٰ ہذا القیاس فرحت بخش میں بھی ہر چند تمام مکانات میں ابھی کما ینبغی دخل نہیں ہوا لیکن اس عمارت وسیع میں کہ چار کوس کے چکر میں واقع ہے۔ من جملہ بہت سی کوٹھیوں کے کوٹھی تارا میں کچہری مجسٹریٹی اور جائزہ فوج شاہی کا ہوتا ہے اور جس کوٹھی میں کہ دفتر خزانہ تیاری کا تھا ہفتہ عشرہ سے اس میں کچہری ڈپٹی مجسٹریٹی مقرر ہوئی اور اکثر مقامات میں انگریز فردکش ہیں اور بعض کارسپانڈنٹ کہتے ہیں کہ لکھنؤ میں گھر بہ گھر ماتم برپا ہے۔ میں نے تخمینہ کیا ہے کہ ضبطی اودھ سے سات آٹھ لاکھ آدمی بے چارہ اور بے روزگار ہو گئے۔ (کوہ نور ۸ اپریل ۱۸۵۶ء)

واجد علی شاہ بنارس میں

آخر کانپور اور الٰہ آباد ہوتے ہوئے واجد علی شاہ کا لٹا ہوا قافلہ بنارس میں دم لینے کے لئے ٹھہرا۔ کوہ نور بتاتا ہے:-

"صاحب "بنارس گزٹ" تحریر فرماتے ہیں کہ عرصہ ایک ہفتہ سے خبر آمد آمد شاہ اودھ گرم تھی اور ہر صغیر و کبیر واسطے حصول زیارت کے نگراں تھا۔ چنانچہ تاریخ ۱۵ ماہ رواں (اپریل ۱۸۵۶ء) بوقت گیارہ بجے رات کے بہ سواری ڈاک گاڑی ساڑھے تین سوار رونق افزائے کوٹھی راجہ کاشی (بنارس) ہوئے اور تمام بردہ شیرازہ کوچک و بزرگ نے خرید و فروخت آثار سے بہرہ یاب ہو کر ان کی جان و مال کو دعا دی۔ (اخبار کوہ نور لاہور مطبوعہ ۲۲ اپریل ۱۸۵۶ء)

واجد علی شاہ کے مویشی نیلام کر دیئے گئے

جیسے جیسے انگریزوں کا اقتدار کامل ہوتا گیا ان کی استعماری اور سامراجی ذہنیت کا رنگ نکھرتا گیا۔ "کوہ نور" سے معلوم ہوتا ہے:-

"اخبار "ایسٹرن سٹار" سے واضح ہوا کہ شاہ اودھ نے لینا پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ کا اپنے واسطے اور تیرہ لاکھ روپیہ سالانہ واسطے لواحقین اور متعلقین کے قبول کر لیا اور راضی نامہ تحویل ملک کا لکھ دیا۔ مگر اخبار "ایسٹرن ٹائمز" اس خبر کو غلط کہتا ہے۔ ملک اودھ میں کوئی خبر تازہ نہیں

ہر طرح سے امن ہے بادشاہ کے مویشی وغیرہ نیلام ہو گئے۔ قریب ستر ہزار روپے کا نیلام ہوا۔ سنا ہے کہ کوئی کپتان صاحب جنہوں نے خدمت سرکار سے استعفے دیا تھا بادشاہ کے وکیل مقرر ہوئے ہیں اور بہت سا روپیہ بادشاہ نے ان کو دیا ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ میجر جنرل اوٹرم صاحب بہادر بسبب بیماری کے بہ صلاح ڈاکٹروں کے رخصت لے کر ولایت یا دریا کو جانا چاہتے ہیں۔ یہ عہدہ ایسا جلیل اور اختیار طلب ہے کہ بہت سے حکام اس کے خواہاں ہیں۔ دیکھئے کس کا اقبال یاوری کرتا ہے۔ اگر رکیس صاحب کے نام یہ عہدہ ہوا تو یقین ہے کہ بہت سے حکام انگریز متعلقہ اضلاع بنگال اور آگرہ اور نیز حکام پنجاب کو جائے شکایت ہوگی کیونکہ ان صاحب سے کتنے ہی صاحبان عہدہ اور قدامت اور رتبہ میں زیادہ ہیں اور بہت کارگزار بھی ہیں۔ اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ شاہ اودھ ۱۴ تاریخ کو الہ آباد کے آگے تشریف لے گئے۔ الہ آباد میں بابت کرایہ مکان کے مالک مسافر خانہ سے تکرار ہوئی تھی۔ اخبار انگلش مین سے منضبط ہے کہ بادشاہ اودھ کی سلامی جس وقت کلکتہ میں پہنچیں گے، سلامی نہ ہوگی۔ صاحب خبر لکھتے ہیں کہ شاید ہوتے ہوتے کرسی کبھی نہ ان کو دی جایا کرے گی۔"

(از اخبار کوہ نور لاہور مطبوعہ ۱۹ر اپریل ۱۸۵۶ء)

بادشاہ کا انگریز شکاری

جنرل اوٹرم کا عہد اقتدار آخر ختم ہوا، اور وہ بصد حسرت و افسوس لکھنؤ سے رخصت ہو گئے۔

اخبار کوہ نور اس حادثہ پر رقمطراز ہے:-

"میجر جنرل اوٹرم صاحب چیف کمشنر بہادر ممالک اودھ لکھنؤ تشریف لے گئے۔ بنارس تک پہنچنے کی خبر آئی ہے کہتے ہیں کہ ممدوح بہت افسردہ خاطر اور مضمحل ہو گئے ہیں۔ اخبار نویسوں نے لکھا ہے کہ سو شیروں کا شکار کرنے سے اس قدر ضعف ان کے قویٰ میں نہ آتا کہ جیسا کہ ایک بادشاہ کے شکار میں آگیا۔"

(از اخبار کوہ نور لاہور مطبوعہ ۶ مئی ۱۸۵۶ء)

بادشاہ پر حقیقت میں جبر ہوا ہے

جب تک واجد علی شاہ سے حکومت نہیں چھینی گئی تھی وہ ظالم تھے ان کے اہلکار راشی تھے۔ ان کا انتظام ناقص تھا لیکن جب تختِ حکومت ان سے چھین لیا گیا تو رفتہ رفتہ لوگوں نے ــــ اپنوں نے بھی اور غیروں نے بھی ــــ محسوس کیا اور اعتراف کیا۔ بادشاہ ظالم نہیں تھا۔ ضبطی اودھ قانونی اور اخلاقی ہر اعتبار سے ایک شرمناک اقدام ہے۔ پہلے کہا جاتا تھا۔ بادشاہ کے جانے سے رعایا شاد اور آباد ہو گئی۔ اب اعتراف کیا جانے لگا۔ نہیں پہلے شاد تھی اب ناشاد ہے پہلے آباد تھی اب برباد ہے۔

خبر "شاہ اودھ" کے نام سے "کوہ نور" میں جو مضمون چھپا تھا وہ اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"سنا ہے کہ جب سے شاہ اودھ بنارس سے تشریف لے گئے ہیں تب سے ان کی کوئی خبر نہیں آئی۔ کلکتہ میں ان کے آنے کا ہر روز انتظار ہے بعض لوگوں کی زبانی سنا کہ حضرت کیواسطے لارڈ کیننگ صاحب بہادر گورنر جنرل جدید نے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ کی تجویز کر دی ہے۔ بادشاہ رفتہ رفتہ کلکتہ کی جانب جاتے ہیں، اور وہاں ان کے واسطے ایک جہاز کرایہ کا کیا گیا اس میں بیٹھ کر ولایت جائیں گے۔ غالب ہے کہ ان کے پہنچنے کے وقت ملکہ معظمہ تحقیقات ان کے مقدمے کی کریگی، اب بہت لوگوں کی یہ رائے ہے کہ بادشاہ پر حقیقت میں جبر ہوا ہے اور کوئی وجہ معقول ان کے بحردم کرنی نہ تھی۔ ایک اخبار نویس ولایت نے ایک مضمون بابت بے قصوری بادشاہ کے بڑی دھوم دھام کا لکھا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ سرکار نے جو اس عذر سے بادشاہ سے سلطنت لے لی ہے کہ وہاں بدنظمی تھی اور یہ بات شرائطِ صلح کے خلاف ہے۔ سو حال اس کا یہ ہے کہ سرکار انگریزی کی عملداری میں بھی بہت مظلمہ ہوتے ہیں۔ ہر حاکم انصاف پسند نہیں ہوتا اور یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ رشوت ستانی بھی کچھ اہالیانِ دربار پر ختم نہیں بلکہ تمام ملک ہند میں اہالیان سرکار انگریزی بھی رشوت لیتے ہیں۔ اور سرکشی مشہور ہیں۔ پس اگر بادشاہ کے

اہلکار بھی مرتشی تھے۔ تو کیا بڑی بات تھی اور رعایا کے دفاع کا یہ حال ہے کہ وہاں کے لوگ پہلی سلطنت سے زیادہ خوش تھے اور خراج بھی کم لیا جاتا تھا۔ اب ارادہ سرکار انگریزی کا بڑھادینے کا ہے تو وہ نفع بھی جاتا رہا۔ سوائے اس کے یہ بات تمام صاحبان میں روشن ہے کہ شاہ اودھ اور ان کے مورثوں۔ نے سرکار انگریزی کے ساتھ کیا کیا مدد کی ہے اور کیسے کیسے وقت میں کام آئی ہے ——— اس کا نتیجہ یہ نکلا سابق میں ایک گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز صاحب نے ملک اودھ سے اس قدر مال رشوت کا لیا تھا کہ ان کے نام ولایت میں نالش ہوئی تھی۔ اور صاحب موصوف کی بڑی بدنامی ہوئی تھی۔

(از اخبار کوہ نور لاہور مطبوعہ ۱۳ر مئی ۱۸۵۶ء)

ضبطی اودھ کا معاملہ پارلیمنٹ میں

ضبطی اودھ کے سلسلے میں برطانوی پارلیمنٹ میں جو مباحثہ ہوا اس کی کیفیت :-

"دوبارہ ضبطی اودھ جو جلسہ گزشتہ پارلیمنٹ میں مباحثہ ہوا اس کا ترجمہ از روئے اخبار ٹیمس ۲۳ر فروری ۱۸۵۶ء جو کیا گیا بجنسہ ملاحظہ ناظرین کے لئے درج ہے۔

"درباب ضبطی سلطنت اودھ"

مسٹر انوی (رکن پارلیمنٹ) نے کہا کہ ارباب گورنمنٹ انڈیا ممالک اودھ کے واسطے جو نیت رکھتے تھے سو چند روز پیشتر لوگ انواع و اقسام سے مشتہر کرتے تھے۔

اوّل مشہور ہوا کہ اس ملک کے مہمات کو جنرل اوٹرم صاحب رزیڈنٹ لکھنؤ بذریعے اچھا انتظام انصرام کریںگے۔ من بعد یہ کہ اس ملک کو ضبط کریںگے۔ اب کہتے ہیں کہ بادشاہ اودھ کو معزول کرکے ملک اس کا ممالک انگریزیہ واقع ہند سے ملحق کیا جاوے۔ رکن مذکور نے یہ بھی کہا کہ بالفعل میں نہیں چاہتا ہوں کہ اس مقدمہ میں کچھ گفتگو و بحث تکرار کروں یا درباب تعلق گورنمنٹ انڈیا جو وہاں کے روسا کے ساتھ ہے حرف رکھوں لیکن اتنا کہنا

ہوں کہ سیکرٹری گورنمنٹ ہند نے جو ۱۸۴۲ء میں بذریعے مراسلات میجر بیلی صاحب کو جو اس وقت کے رزیڈنٹ تھے لکھا ہے کہ مبلغ کروڑ روپیہ اودھ کے نواب سے قرض لیا جاوے کس لیئے کہ گورنمنٹ مبتلائے تصدیعہ مالا یطاق تھی - بدوں قرضہ کے رہائی تصدیعہ وبلائے سے متصور نہیں - رزیڈنٹ نے درجواب لکھا کہ ہر وقت دست تمام پچاس لاکھ روپیہ حاصل کیا ہے لیکن حضور کو اشتباہ خاطر ہوا اس لیئے کہ بعض لوگوں نے ذہن نشین حضور کیا ہے کہ مقصود اس قرضہ کشی سے غارتی زر نقد حضور ہے' جب دیکھیں گے کچھ زر خزینہ سرکار میں باقی نہ رہے گا - تب تسخیر ملک پر مائل ہوں گے -

غرض اظہار اس امر کا ضروری ہے کہ جو مبلغ کہ بدفعات بادشاہ اودھ بہ سبیل قرض لئے سو پھر ادا نہیں کر سکے - اب میں چاہتا ہوں کہ ان ابواب میں کلام کو طول نہ دوں اور میر محفل بورڈ آف کنٹرول سے فقط ایک دو سوال کر کے اکتفا کرتا ہوں کہ آیا لارڈ ڈلہوزی کو واسطے ضبط ملک شاہ اودھ کے باختیار ان کے ملا دینے ملک انگریزی میں حکم روانہ ہوا تھا ؟ یا مردم ملک اودھ نے ہمارے علاقہ اور حکومت کے تابع ہونے کی خواہش وتمنا کی تھی ؟ اور یہ بھی پوچھتا ہوں کہ آیا ان مقدمات کے لیئے جو معاملات ظہور میں آئے - سو وہ روبکار اس جلسہ کے ہو ویں گے یا نہیں ؟ مسٹر ورنی اسمتھ میر محفل بورڈ آف کنٹرول نے کہا کہ روبکاری کسی ایک مقدمہ کے مراسلات کی جب تک انصرام تمام اس کا نہ ہووے' خلاف عادت ہے - پچاس سال کی مدت سے حالات ممالک اودھ اس عنوان سے قرار پذیر ہیں کہ باعث تحصیل وتفکر خاطر اہالی گورنمنٹ آف انڈیا ہوئے ہیں - چنانچہ ایام تابستان گزشتہ میں بدانتظامی ملک اودھ اس حد کو پہنچی تھی کہ جنرل اوٹرم صاحب نے گورنر جنرل کی خدمت میں اس مضمون کی رپورٹ کی کہ بحال رکھنا بدانتظامی امور کا اس سے زیادہ محالات سے ہے - اس رائے سے جنرل اوٹرم کی گورنر جنرل نے ارباب گورنمنٹ ولایت کو اطلاع دے کر لکھا کہ میری رائے یہ ہے کہ تباہ حالی ملک اودھ اختتام واتمام کو پہنچانا چاہیئے - اب

گورنر جنرل کے خط کو اور باب گورنمنٹ آف ڈائریکٹر اس دربار گورنمنٹ ملکہ محترمہ نے مشورہ و تجویز لاکر بعد ردّ و بدل بسیار مباحثہ و تکرار بے شمار یہ بات قرار دی کہ نظر بنام وری و تجربہ کاری لارڈ ڈلہوزی کے یہی انسب و احسن ہے کہ امور مملکت اودھ ان کی رائے و اختیار پر سپرد کر دیں۔ چنانچہ یہی قرار داد ۲۱ نومبر گزشتہ کو لارڈ موصوف کو لکھ کر بھیج دی۔ اب تو یہ مقدمہ اس صورت پر ہے کہ جس وقت کہ جواب مصرحہ و مفصل گورنر جنرل کے پاس پہنچیگا اور با ہم کہ مراسلات ختم ہو جاوینگے تو ان کو اس جلسہ میں پیش کرونگا۔ دوسرے سے سوال کا جواب یہ کہتا ہوں کہ مجھے معلوم نہیں کہ سکنہ اودھ کے ہماری تخت حکومت و علاقہ میں آنے کی تمنا کے لئے عرائض گزری ہیں یا نہیں؟

مسٹر سری بری (یعنی ایک رکن پارلیمنٹ) نے کہا کہ اظہار آنریبل جنٹل مین سے ہرگز تشفی نہیں ہوتی ہے اور یہ تو اظہر من الشمس ہے کہ چند سال کی مدت سے لارڈ ڈلہوزی آئیں اور تازہ در باب تدابیر مدتی قرار دے کر اس پر عمل پیرا رہتا ہے اور وقت تعجیل عمل بالکل تامل و حیص بیص نہیں کرتا ہے بلکہ مسٹر رو بک (یعنی رکن پارلیمنٹ) نے ارکان ہاؤس کو یوں متنبہ کیا کہ افواہ عام ہے کہ ملک ہند میں رواج ظلم و ستم بہت ہے۔ سو یہ بھی بے اصل و غیر صحیح ہے۔

(از اخبار کوہ نور لاہور مطبوعہ ۲۷ مئی ۱۸۵۶ء بہ حوالہ "صبح صادق" مدراس)

باب (۱۱)

واجد علی شاہ کا دورِ جلاوطنی

واجد علی شاہ لکھنؤ میں حاتم دوراں تھے، سکندر صولت اور دارا حشمت تھے۔ کیواں بارگاہ اور خسرو مرتبت تھے، والا جاہ اور فلک بارگاہ تھے۔ شاہِ زمن اور شہنشاہِ دوراں تھے۔ ان کے ایک اشارۂ چشم پر دوسروں کی قسمتیں بنتی اور بگڑتی تھیں جسے نگاہِ لطف سے دیکھ لیا وہ شاد اور نہال ہو گیا۔ جس پر نگاہ عتاب پڑ گئی خسر الدنیا کا نمونہ بن گیا۔ شاعروں کی تمنا یہ تھی کہ بادشاہِ ذی جاہ کے دامنِ دولت سے وابستہ ہو جائیں۔ عالم اس فکر میں رہتے کہ بادشاہ سلامت کے معتمد بن جائیں۔ فن کاروں کی معراج یہ تھی کہ دربارِ شاہی میں پہنچ جائیں دور دراز مقامات کے تاجر مال تجارت سے لدے۔ پھندے لکھنؤ پہنچتے تھے۔ کہ بادشاہ عالم و عالمیان کے قصر فلک رفعت میں کسی طرح اذن باریابی حاصل کر لیں۔ اور مالا مال ہو کر واپس جائیں۔ سپاہیوں اور افسروں، وزیروں اور امیروں، مہاجنوں اور ساہوکاروں، دولت مندوں اور سرمایہ داروں کا یہ عالم تھا کہ لڑکھڑاتے ہوئے لرزتے ہوئے۔ کانپتے ہوئے، باادب۔ ملاحظہ ہوشیار کی آوازوں کے شور میں ظل اللہ کے سامنے حاضر ہوتے تھے اور اپنی زندگی کی سعادت یہ سمجھتے تھے کہ ان کے ایک اشارہ چشم پر اپنی جان قربان کر دیں۔

لیکن واجد علی شاہ اور ان کا دورِ حکومت،

خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود

ثابت ہوا، دس سال کی مدت میں سارا جاہ و جلال قصّۂ ماضی بن گیا۔
انگریزوں نے حکومت چھین لی۔ بادشاہ سلامت ایک "معزز" شہری بن گئے۔
لیکن "معزز" لوگ بھی نظرناک ہو سکتے ہیں، ان کے وجود سے خطرہ محسوس ہوا۔ کچھ ان کا بھی جی نہ لگا اور

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

کہتے ہوئے کلکتے سدھارے،

واجد علی شاہ کی کلکتہ کی زندگی کے بارے میں سب سے زیادہ مستند بیان مولانا عبدالحلیم شرر کا ہو سکتا ہے جو آغاز شباب تک وہاں مقیم رہے اور اپنی آنکھوں سے بادشاہ کی نقل و حرکت، رفتار و گفتار اور حالات کا مطالعہ و مشاہدہ کرتے رہے۔ انہوں نے مٹیا برج کی جو کہانی سنائی ہے وہ مستند ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔ اس کے چند خاص اجزا ذیل میں درج کرتے ہیں ان سے واجد علی شاہ کے دورِ جلا وطنی کا ایک مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جو پکار پکار کر کہہ رہا ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

معزولی کا حکم

اگرچہ ساری رعایا خوش تھی ہر مذہب و مذاق والے مطمئن تھے۔ اطراف مملکت کے تمام ہندو مسلمان امراء اور زمیندار جان فدا کرنے کو تیار تھے مگر انگریزی ریذیڈنٹ صاحب ناراض تھے اور ان کی نظر قہر آگیں تھی۔ اہلِ فوج تمام قوت والے ملکی رئیس راجہ اور ٹھاکر لڑنے اور کٹنے پر تیار تھے مگر بادشاہ نے لڑنا نہ پسند کیا اور اطاعت و اعتقاد کا معاوضہ یہ ملا کہ محض صاحب ریذیڈنٹ کی رپورٹ پر (جو ممکن تھا کہ کسی بدنیتی پر مبنی ہو) ان کے ملک پر قبضہ کر لینے کا حکم ہو گیا۔
بادشاہ کو جب یہ حکم سنایا گیا تو انہوں نے بہت کچھ عذر و معذرت کی خوشامد

کی اور جب کسی طرح سماعت نہ ہوئی تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اپنی مصیبت پر ہر شخص روتا ہے مگر بادشاہ کا رونا بھی قابلِ مضحکہ سمجھا گیا اور تاریخوں میں مثبت ہو گیا۔ کہ "شاہ اودھ بچوں کی طرح رونے لگا۔ (جان عالم صفحہ ۲۱)

لکھنؤ سے رخصت ہونے کا منظر

آخر بادشاہ نے ارادہ کیا کہ لنڈن جا کر دربار انگلستان میں فریاد کریں۔ ایک مخصوص گروہ کے ساتھ جس میں والدہ محترمہ ایک بھائی محلات عالیات ولی عہد اور مخصوص ارکان دولت اور ملازمین تھے۔ کلکتہ کا ارادہ کر کے لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ چلتے وقت یہ شعر

در و دیوار پر حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

پڑھا تو سننے والوں کے کلیجے پاش پاش ہو گئے اور کون نہ تھا جو زار و قطار نہ رو رہا ہو۔ واجد علی شاہ تو چلے گئے مگر ان کی یاد شہر کے ہر مرد و زن کے قلب و جگر پر تیر و خنجر کا کام کر رہی تھی۔ ان کے فراق پر غزلیں تصنیف ہو گئیں گیت بنائے گئے۔ بھاٹوں نے اپنے مذاق کی نظمیں گلیوں گلیوں پھر کے سنانا شروع کیں اور کوئی گھر نہ تھا جس میں عورتیں وہ غزل نہ گا رہی ہوں جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

واجد علی پیارا کلکتہ کو سدھارا
سڑکیں نکلی رہی ہیں سونی گلی گلی ہے

کلکتہ پہنچ کر سلطان عالم ہجوم رنج و الم سے بیمار پڑ گئے ہمراہی اطباء نے مشورہ دیا کہ آپ یہیں ٹھہر جائیں اور عرضی دے کر اپنی والدہ اور ولی عہد کو مع اپنے ایک مختار عام کے لندن روانہ فرمائیں۔ اسی پر عمل ہوا۔ (ص ۲۱-۲۲)

کلکتہ کی زندگی

بادشاہ کو جانوروں کا شوق تھا اور رستے میں بہت سے جانور

جمع ہو گئے تھے ان کی دانہ خوری سماء الدولہ کے سپرد تھی۔ انہوں نے ایسی لاپروائی کی تین روز تک جانوروں کو دانہ نہ ملا بادشاہ بوچہ پر سوار سیر کو گئے تو سب جانور ہر طرف سے دوڑ کے بوچے کے گرد شور کرنے لگے بادشاہ نے سبب پوچھا تو کسی جانور باز نے عرض کیا کہ جہاں پناہ ان کو تین دن سے دانہ نہیں ملا ہے۔ بادشاہ نے فوراً دانہ منگوا کر اپنے سامنے ڈلوایا اور سب جانور اس پر بیتابی سے ٹوٹ پڑے۔ (ص ۲۳)

مرزا رمضان بیگ

اسی وقت سے بادشاہ نے جانور خانہ ایک نئے شخص مرزا رمضان بیگ کے سپرد کیا جو لکھنو کے ایک ہندو رئیس رائے دلارام کے بیٹے تھے رمضان بیگ کو منشی السلطان بہادر کا خطاب تھا تمام قلم اور محرر چاہے کسی دفتر میں کام کرتے ہوں انہی کے ماتحت تھے اور ان کی برطرفی بحالی ان کے سپرد تھی وہ سنّی المذہب بڑے دیندار روزے نماز کے پابند اور بڑے لسان و بذلہ سنج تھے بادشاہ کو ان کی باتوں میں بڑا مزہ آتا رات کو گاڑی پر سوار ہو کر اپنی کوٹھیوں کے باغوں میں گشت لگاتے تو منشی السلطان کو خواصی میں بٹھا لیتے۔ (ص ۲۴)

ملکہ نواب محل

بادشاہ کی پہلی محترم ملکہ نواب خاص محل تھیں ان کا تخلص عالم تھا۔ وہ اچھی شاعرہ تھیں۔ ان کا دیوان چھپ چکا تھا اور اس کی اکثر غزلیں عوام کی زبان پر تھیں۔ (ص ۲۶)

بادشاہ کی وضع

بادشاہ کی وضع یہ تھی کہ بڑے بڑے بال تھے جن کا پیچھے کی طرف جوڑا باندھ لیتے بڑی بڑی کھڑی مونچھیں، اور منڈی ہوئی داڑھی چندیا پر ایک چھوٹی سی نکے دار بھاری ٹوپی گلے میں جامدانی یا ململ کا چست انگرکھا اس کے نیچے نہ کرتہ ہوتا نہ شلوکہ بائیں جانب کی چھاتی کھلی رہتی پاؤں میں پرانی وضع کا عرض کے ڈھیلے پائنچوں کا بر کا پائجامہ، جاڑوں میں کوئی شالی رومال کندھوں پر ہوتا لیکن محلات اور باغات شاہی سے باہر نکلتے تو سر پر کوئی شالی پھٹیا باب لپیٹ لیتے اس کے ساتھ سچے کام کا گھٹیلا جوتا پہنتے۔ (ص ۲۷)

لارڈ میئو کی بدتمیزی

۱۸۷۱ء کا واقعہ ہے کہ گورنر جنرل بہادر لارڈ میئو نے جو ہندوستانیوں کے حال پر بڑے مہربان تھے بادشاہ سے ملنا چاہا۔ پہلے وہ خود ہی بادشاہ سے ملنے کو آئے اور بادشاہ سے مل کر خوش ہوئے دوسرے دن بادشاہ ان کی بازدید کی ملاقات کو گورنمنٹ ہاؤس میں تشریف لے گئے وہاں تخت گاہ کے کمرے میں لارڈ میئو نے پہلے بادشاہ کے برابر کرسی پر بیٹھ کر ان سے باتیں کیں اور تھوڑی دیر کے بعد خدا جانے کیا دل میں آیا کہ اپنی کرسی سے اٹھ کر بغیر رخصت ہوئے واپس چلے آئے اور اس کے بعد سے پھر کبھی کسی انگریز سے نہ ملے۔ (ص ۲۸-۲۹)

مہاراجہ بنارس کی ملاقات سے انکار

مہاراجہ بنارس جنہوں نے بادشاہ کو کلکتہ جاتے وقت اپنا مہمان کیا تھا اور حق عقیدت ادا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی پرنس آف ویلز کے دربار میں شریک ہونے کے لیے کلکتے آئے وہاں وہ وزیر السلطان نواب امیر علی خان سے ملے ان کو بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کرنے کے لئے اپنی ایک عرضداشت دی اور زبانی کہا میں اپنی حقیقی سرکار جہاں پناہ ہی کو سمجھتا ہوں۔ لہذا مجھے جتنی مسرت ان کی باریابی میں ہوگی اور کسی بات میں نہیں ہوسکتی اس کے علاوہ میرے پاس چند قیمتی جواہرات بادشاہوں کے قابل ہیں چاہتا ہوں انہیں بادشاہ کی نذر کردوں۔ وزیر السلطان نے ان سے ملادینے کا وعدہ کرلیا اور خود حاضر ہو کر عرض کیا کہ مہاراجہ کو باریابی کی بڑی تمنّا ہے۔ بادشاہ نے ہوں ہاں کردی۔ اور وزیر السلطان یہ سمجھ کر کہ بادشاہ قبول کرلیں گے واپس آگئے مگر جب مہاراجہ کی وہ عرضداشت دستخط ہو کر واپس آئی۔ تو اس کی پیشانی پر لکھا تھا حسب دستور سابق وزیر السلطان بہادر ملاقات نمایندۂ شاہی ہیں معمول تھا کہ باہر کے راجہ مہاراجہ اور تعلقدار جو ملنے کو آتے انہیں صرف وزیر السلطنت کی باریابی نصیب ہوتی۔ اسی بناء پر بادشاہ نے عرضداشت پر یہ حکم لکھا دیکھتے ہی وزیر السلطان کے ہوش اڑ گئے اور دوسرے روز جا کر عرض

کیاکر جہاں پناہ نے مہاراجہ کی بڑی دل شکنی فرمائی ارشاد ہوا وزیر السلطان بہادر مہاراجہ بنارس کے مجھ پر بڑے حقوق ہیں اور میں اس سے ضرور ملتا مگر کہتے ہو کہ وہ کچھ جواہرات نذر کرنا چاہتا ہے اب خیال کرو کہ اگر میں اس کی نذر لوں تو ضروری ہے کہ اس سے زیادہ قیمت کا خلعت بھی اسے دوں مگر ہمارے پاس کیا رکھا ہے جو اسے دیں۔اس سے بہتر یہ ہے کہ اس کی ملاقات کو ایک اچھے عنوان سے ٹال دیا جائے۔ (ص ۳۰-۳۱)

بادشاہ کی شانِ محبوبیت

بادشاہ نہایت ہی متواضع منکر المزاج تھے وضع سادگی اور باتوں میں نہایت بھولے پن کے ساتھ عجیب قسم کی دلکشی تھی جس سے وہ باتیں کیں گرویدہ ہو گیا۔کبھی کسی اعلےٰ وادنیٰ ملازم ادنیٰ طبقے کے نوکر چاکر خادم یا خادمہ کو نہ گالی دی نہ بُرا بھلا کہا۔فحش اور سخت الفاظ انکی زبان ہی پر نہ تھے جس سے ملتے ایسی بے تکلفی سے باتیں کرتے کہ اس کا دل کھنچنے لگتا اور بجائے ہیبت و رعب کے اس میں محبت و جانبازی کے جذبات پیدا ہو جاتے اس کی ہمت بڑھتی حوصلہ زیادہ ہوتا۔

جس کسی سے ناراض ہوتے چپ ہو جاتے اور کبھی عجیب انداز سے ادب آموزی فرماتے ۔ (ص ۳۲)

ممنوعات کی کثرت اور اس کا سبب

بے شک ممنوعات کی کثرت تھی اور بادشاہ پر جو فرد قرار داد جرم لگائی گئی ہے اس میں سب سے زیادہ سنگین یہی جرم تصور کیا جاتا ہے اس پر کوئی شرعی الزام تو آہی نہیں سکتا۔اس لئے کہ بادشاہ مذہب شیعہ اثنا عشری کے پیرو تھے اہلِ ان کے اعتقاد میں متعہ بغیر کسی حد اور قید کے شرعاً جائز تھا۔جس عورت کے ساتھ متعہ ہوتا اس سے خود قبلہ و کعبہ تشریف لے جاکر دریافت کر کے اطمینان کر لیتے کہ اس کے ساتھ متعہ جائز ہے بعد ازاں وہی متعہ کراتے اب رہا یہ کہ اخلاقی اور تمدنی حیثیت سے بادشاہ کو اتنی عورتوں

سے منتعہ کرنے کی کیا ضرورت تھی اس کی حالت یہ ہے کہ بادشاہ نہایت ہی محتاط اور پرہیزگار تھے اور مٹیابرج کی زندگی میں انہیں ایک گھڑی کے لئے گوارا نہ تھا کہ کسی نامحرم عورت پر ان کی نظر پڑے مگر شاہی محل تھا جس میں پیش خدمتوں محلداروں مغلانیوں، مرکاندارنیوں یہاں تک کہ بہشتنوں اور خاکروبنوں کے ایک گروہ کثیر کے موجود رہنے کی ضرورت تھی۔ ممتوعات میں چند ہی تھیں جن کے ساتھ خلوت گاہ میں داخل کرنے کی غرض سے منتعہ کیا گیا ہو سب خدمت گارنیاں تھیں۔ (صفحہ ۳۵-۳۶)

ممتوعات کے خطابات

معترضین نے اس بارے میں بادشاہ کی حالت پر غور نہیں کیا اس لئے کہ ممتوعات کی کثرت تو ان کے اور پابندی شرع کی دلیل تھی اور اتقاء بھی ایسا جیسا کہ معمولی مسلمانوں میں کم دیکھا گیا ہے تمام بادشاہان اسلام کی نسبت آپ سنتے ہیں کہ ان کے محل میں چند بیویوں کے ساتھ ہزاروں کنیزیں بھری ہوئی تھیں۔ بنی امیہ بنی عباس اور بنی فاطمہ خلفا کے حریم خلافت کا یہی حال تھا سلاطین آل عثمان کے محلوں کی یہی کیفیت تھی۔ شاہانِ مغلیہ ہند کی حرم سراؤں کا یہی رنگ تھا اور اب اگرچہ بردہ فروشی ممنوع اور جائز کنیزوں کی فراہمی کا سلسلہ مسدود ہو گیا مگر ہندوستان کے مسلمان والیان ملک کے محل اور زنان خانے اسی طرح بے شمار عورتوں سے بھرے ہوئے ہیں جن کے جائز اور ناجائز ہونے کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ لہٰذا واجد علیشاہ نے شرعی پہلو کی نگہداشت کے ساتھ اپنا شوق پورا کیا تو کون اعتراض کر سکتا ہے؟ انہیں ممتوعات میں بھنگن تھی جو کپڑے کی چادر سے آبدست کرایا کرتی اور دو بہشتنیں تھیں جو پانی ڈالتیں۔ اول الذکر کو ممتوعہ بنا کر نواب مصفا بیگم اور دوسری کو نواب آبرسان بیگم کا خطاب دیا تھا۔ (ص ۳۸)

شوق عمارات و باغات

عمارات اور باغات کا بڑا شوق تھا اور ان کی تعمیر و تکمیل میں ایسی ایسی جدت طرازیاں کرتے

کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہو جاتی۔ نازک مزاجی اس درجہ تھی کہ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ عمارات اہتمام سے بنوائی، تیاری کے بعد کج یا بد نما نظر آئی اور اسی وقت کھڑے کھڑے مالیوں کو بلوا کر کھدوا ڈالی اور پھر بنوائی۔ چمنوں کی ترتیب اور روشوں کے قائم کرنے میں ایسی مناسب شکلیں اور ترتیبیں قائم کرتے کہ سالانہ میلے کے موقع پر بڑے بڑے انگریز انجینیر، آکر متحیر ہوتے اور پوچھتے کہ یہ ڈیزائن کس کا ہے؟ اور جب بتایا جاتا کہ خود بادشاہ نے اپنی طبیعت سے بنوایا ہے تو حیران رہ جاتے اور کہتے معلوم ہوتا ہے وہ ڈرائنگ اور ڈیزائن بنانے کے بہترین استاد ہیں۔ (ص ۳۹)

سانپوں سے شوق

ایک کوٹھی شہنشاہ منزل بنوائی جس کے دیواروں کے اوپر کے سرے تاج کے پتوں کی طرح آگے کو جھکے ہوئے تھے۔ اس نے ایک خاص صورت پیدا کر دی تھی۔ اسی کے آگے سانپوں کے لئے کوٹھی کے طول کے برابر ایک، قد آدم گہرا حوض کھدوایا اس کے چاروں طرف کی دیواریں خوب گھٹوا کے اور چکنی کرا کے اوپر کے سرے آگے کو کانس کی طرح جھکوا دئے پھر اس کے اندر ہر طرف سے دو دو گز کا فاصلہ چھوڑ کر ایک مصنوعی پہاڑ بنوایا۔ جس کے اندر سینکڑوں مٹی کی نالیاں رکھیں جو نیچے سے اوپر تک ہر طرف دوڑتی اور چکر کھاتی ہوتی باہر نکلی تھیں ایک طرف ایک خط کاٹ کر آبشار جاری کیا تھا کہ نل کھولتے ہی پانی کی چادر گرنے لگتی۔ نیچے پہاڑ کے دامن میں چاروں طرف ایک پتلی سی نہری بنائی گئی جس میں صاف پانی بھرا رہتا۔ تیاری کے بعد اس میں ہزاروں دہامنیں چھوڑ دیں۔ یہ بڑے بڑے ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو گز کے سانپ ایک بل سے دوسرے بل میں سے اندر جاتے اور باہر نکلتے رہتے۔ ان کی غذا کے لئے ہزاروں مینڈک پکڑ پکڑ کر وہاں چھڑوائے جاتے۔ مینڈک اس موہری میں بھاگتے اور سانپ دوڑ دوڑ کر ان کا شکار کرتے اور بڑا تماشہ نظر آتا۔ اس کے مہتمم اور مار پروروں کے داروغہ مرزا ٹی نام ایک شخص تھے۔ جن کو سانپوں کے پکڑنے اور رکھنے

کی بہترین اور خاص قابلیت حاصل تھی۔ ان کے پاس تانبے اور مٹی کے ظروف میں بہت سے کالے اور رنگ رنگ کے چھوٹے اور بڑے زہریلے سانپ بھی رہا کرتے جن کا راتب مقرر تھا اور جس قسم کے سانپ چاہیئے ان سے منگوا کر دیکھ لیتے۔ (صفحہ ۴۰-۴۱)

شاہی کوٹھیوں کے نام

کلکتہ میں انہوں نے بیسیوں کوٹھیاں بنوا ڈالیں سلطان خانہ مرصع منزل اور اسد منزل تو برٹش گورنمنٹ سے ملی تھیں۔ ان کے علاوہ بیسیوں کوٹھیاں انہوں نے بنوائیں یا خرید لیں۔ جن کا سلسلہ میلوں تک چلا گیا تھا۔ ان میں سے چند کوٹھیوں کے نام جو مجھے یاد ہیں ان کو پیش کرتا ہوں۔

نور منزل۔ پری منزل۔ تہنیت منزل شہنشاہ منزل۔ عدالت منزل۔ قصر البیضا گوشہ سلطانی (یہ ایک کوشک نما بنگلہ تھا) آسمانی۔ بادامی تفریح بخش۔ (ص ۴۳)

نازک دماغی اور نفاست پسندی

بادشاہ کی نازک دماغی اور نفاست پسندی کی یہ حالت تھی کہ کلکتہ میں گیس کی روشنی کو دور سے دیکھ کر پسند آیا تھا حکم ہوا کہ ساری کوٹھیوں میں گیس کی روشنی کی جائے گیس کا سلسلہ مٹیا برج تک نہ تھا لہٰذا تقریباً تین لاکھ کے صرف سے مرصع منزل کے پھاٹک کے باہر ایک فرلانگ سے ہو گیا با عمارت شاہی کے چاروں طرف گیس کی لالٹینیں قائم ہو گئیں۔ پہلے ہی دن روشنی ہوئی اور بادشاہ حسب معمول گاڑی پر سوار ہو کر گشت کو نکلے تو فرمایا بھئی روشنی تو آنکھوں میں گھسی جاتی ہے اور گشت ملتوی کر دیا۔ دوسرے دن لالٹینوں پر سبز شیشے چڑھا دیئے گئے دوسری رات نکلے تو سبز شیشوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے مگر دو ہی چکر لگائے ہوں گے کہ یکایک ناک سکوڑنا شروع کی پھر ناک بند کر لی۔ اور فرمایا اس میں تو بڑی بو آتی ہے۔ میں ایسی روشنی نہیں برداشت کر سکتا۔ غرض دو تین لاکھ کا کارخانہ بالکل بیکار ڈال دیا گیا اور جب میں مٹیا برج سے آیا ہوں پڑا خراب

ہو رہا تھا اور پرزوں میں زنگ لگ رہا تھا۔ (ص ۴۴)

دعوت قبول کرنے کا انوکھا انداز

ایک معمول یہ تھا کہ معززین دربار میں جس کسی کا جی چاہتا سال میں ایک دن جہاں پناہ کی دعوت کرتا اس دعوت کی شان یہ تھی کہ کھانا تکلف سے پکواتے اور خوانوں میں لگا کے امکانی اہتمام کے ساتھ ملاحظہ میں بھیج دیا جاتا اور بادشاہ اسے تناول فرماتے لیکن شاہی باورچی خانے میں اس روز جو کچھ پکتا وہ دعوت کرنے والے کے وہاں بھیج دیا جاتا معمولاً دعوت کا کھانا ہزار زیادہ ہو مگر محدود ہوتا اور اس کے معاوضہ میں شاہی باورچی خانے کا جو کھانا ان کو ملتا اقسام اطعمہ اور الوان نعمت کے اعتبار سے اتنا خوش ذائقہ ہوتا کہ ویسا کھانا ایں ان کو کبھی نصیب نہ ہوتا اور اتنا زیادہ ہوتا کہ محلہ بھر کھاتا،

(ص ۴۵)

جانور خانہ

شاہی جانور خانہ اتنا عجیب ہوتا کہ ویسا شاید اب ہیں کہیں نظر نہ آئے گا۔ نور منزل ایک کوٹھی بادشاہ نے دریائے بھاگرتی سے سو دو سو گز کے فاصلے پر خاص اپنے اہتمام سے بنوائی تھی اس سے ملا ہوا ایک تالاب تھا جس کے چاروں طرف پختہ زینے بنوا دیے گئے تھے۔ تالاب کے اس پار نور منزل کے مقابل ایک بڑا کٹہرا تھا جس میں شیر ببر رہتا اور جب وہ گرجتا تو سارے مٹیا برج میں اس کی آواز گونج جاتی اور کوٹھی اور تالاب کے گرد ایک بڑا کمپونڈ چھوڑ کے آہنی کٹہرا نصب کر دیا تھا اور ایک طرف اس کمپونڈ میں ایک نہایت نازک اور خوبصورت آہنی بنگلہ تھا۔ اس کمپونڈ میں دنیا بھر کے چرند پرند لا کے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ ہرن اور چکاورے چوکڑیاں بھرتے پھرتے بارہ سنگھے متانت سے ٹہلتے پھرتے۔ سارس۔ قازین۔ بگلے۔ ہنس۔ مور وغیرہ ادھر ادھر پھرتے یا تالاب کے کنارے ایک ٹانگ اٹھائے گھنٹوں کھڑے رہتے کٹہروں میں وحشی جانور اور درندے رکھے گئے تھے۔ جن میں سیار۔ بھیڑیے۔ کینگرو وغیرہ

بند تھے۔ کینگرو کا بچہ ماں کے پیٹ سے نکل کر ٹہلتا اور جہاں کسی نے دھمکایا دوڑ کے پھر ماں کے پیٹ میں گھس جاتا۔ چھوٹے ہوئے پرندوں میں بیسیوں شتر مرغ اور کشوری تھے جو پھر کے بڑے بڑے روڑے اور لوہے کے ٹھوٹے تک بلا تامل نگل جاتے کئی ایک بڑے بڑے کچھوے چھوٹے پھرتے تھے جو زیادہ تر خشکی میں رہتے اور جب جی چاہتا پانی میں چلے جاتے۔ یہ کچھوے بھاری سے بھاری بوجھ کو اٹھائے جاتے وہاں کے تمام لوگوں میں سب سے موٹے منشی السلطان تھے جن کا بوجھ پانچ چھ من سے کم نہ ہوگا۔ بادشاہ نے ایکدن ان کو کچھوے کی پیٹھ پر بٹھا دیا اور وہ بے تکلف اپنی معمولی چال سے تالاب کے کنارے تک اٹھائے گیا۔

(ص ۴۶-۴۷)

چیتے اور سیاہ گوش

چیتے اور سیاہ گوش تھے مگر وہ بجائے کٹہرے میں بند کرنے کے زنجیروں میں بندھے پلنگوں پر بیٹھے رہتے ان پر تعلیم دینے اور رکھنے والے مقرر تھے جو انہیں شکار کی تعلیم دیتے۔ چیتے آنکھیں کھول کے بھیڑ یا بکری پر چھوڑے جاتے تو اس طرح زمین سے ملے ہوئے جھپٹتے کہ معلوم ہوتا ہوا کا بگولا خاک اڑاتا چلا جاتا ہے۔ چیتے پالنے والے ان کی خوشامدیں کرتے اور چیتے کو یار بناکے ان کا غصہ فرو کرتے سیاہ گوش میں بلا کی پھرتی تھی کہ اس کے سامنے کبوتر چھوڑا جاتا۔ تو پندرہ بیس گز تڑپ کے پکڑ لیتا۔

(ص ۵۰)

بٹیر بازی

ایک معرکہ آرا پالی میں سردار مرزا صاحب کا کریز "شہرہ آفاق" میدان میں اترا اور اس کے مقابل داروغہ عباس علی خاں کا نامی اور مشہور بٹیر کھنچو آیا اور آدھ گھنٹہ تک قیامت خیز لڑائی ہوتی رہی۔ مگر میں بٹیروں کے عوض آخر تک داروغہ عباس علی خاں کی حالت وصورت دیکھتا رہا وہ اکڑوں بیٹھے تھے۔ ہمہ تن بٹیروں میں محو تھے دونوں ہاتھوں میں بلا کا تشنج تھا۔ سارے جسم سے اینٹھے اور برائے جاتے تھے۔ ان کا بٹیر چونچ مار کے کھینچتا تو وہ اس طرح منہ جھٹیاتے کہ معلوم ہوتا

انہیں نے چونچ ماری ہے جب حریف کا بٹیر ان کے بٹیر کو لات مارتا تو معلوم ہوتا کہ انہیں کو کسی نے کس کر لات رسید کر دی الٹے پیچھے گرتے اور چوٹ کھانا انکی صورت سے محسوس ہوتا۔ (ص ۵۷)

انگریزوں سے نفرت

بادشاہ کو انگریزوں کی ملاقات کا قطعاً انکار تھا۔ وزیر السلطان امیر علی خاں بہادر تمام اعلےٰ درجہ کے انگریزوں اور وائسرائے بہادر تک سے ملنے اور بہت چاہتے کہ بادشاہ بھی ان لوگوں سے ملاکریں مگر جہاں پناہ نے کسی طرح منظور نہ کیا۔ امیر علی خاں یہ حسرت لئے ہوئے مرگئے۔ اس بارے میں بادشاہ کی قید اور احتیاط اس درجہ تک بڑھی ہوئی تھی کہ شاہی کوٹھیوں کے باغوں میں سواری نکلتی تو بیرونی پھاٹک بند کروا دئے جاتے اس لئے کہ ایک مرتبہ کوئی انگریز ایک پھاٹک کے باہر سے بادشاہ کی سواری کو دیکھ رہا تھا اور بادشاہ کی اس پر نظر پڑ گئی۔ (ص ۵۹)

جنت ارضی کی حوریں

مٹیا برج کی شاہی عمارتیں عجیب نزہت و شادابی رکھتی تھی۔ عالی شان کوٹھیوں کے گرد پر فضا باغ و دلکش چمن بندیاں اور ان کے آس پاس محل سرائیں جن میں سے بعض کے پردوں سے سر نکالے ایسی پیاری دلربا صورتیں نظر آجاتیں کہ معلوم ہوتا اس جنت ارضی میں حوریں بھی موجود ہیں۔ (ص ۶۵)

موسیقی میں کمال

گانے میں کمال حاصل تھا اگرچہ گلا اچھا نہ تھا مگر اصولِ موسیقی کو ایسا اچھا سمجھتے تھے کہ بڑے بڑے گوئیے ان کے سامنے کان پکڑتے۔ تاریخوں میں ہندوستان میں کئی مسلمان بادشاہ موسیقی کے کامل استاد بتائے گئے ہیں مگر میں نہیں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے کسی کو بھی اتنی اعلیٰ معلومات حاصل ہوں جتنی واجد علی شاہ کو حاصل تھیں اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ولی عہدی سے لے کر آخر

عمر تک ہمیشہ بڑے بڑے مستند گویوں کا ان کے گرد ہجوم رہا اور ان میں سے بعض کو دولہ کا خطاب دے کر امرا اور شرفاء کے طبقے میں داخل کر دیا۔ رشنی الدولہ جو برلی کا ایک ڈھاڑی تھا۔ انیس الدولہ اور مصاحب الدولہ جو آخر میں بادشاہ کے بڑے مہذب مصاحب بن گئے تھے۔ سب اسی قسم کے شریف نما ڈھاڑیوں میں تھے۔ (ص ۶۸)

اسلامی تمدّن کی آخری شمع

میں نے بادشاہ جمجاہ کو ان کے دربار کو محلات عالیات کے رہنے کی شان کو شاہزدگان والا تبار کی دلچسپ صحبتوں کو اور سواد بنگالہ میں لکھنؤ کے اجڑے ہوئے کرّو فر کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ مٹیا برج مٹی میں مل گیا کلکتہ کا وہ کونا لارڈ ڈفرن کے بے مہری پر قربان ہو گیا نہ اب وہ سر بفلک کوٹھیاں باقی ہیں، نہ وہ مینو سواد باغ اور چمن نہ وہ زندہ مخلوق کا عجائب خانہ نظر آتا ہے نہ وہ بہشت آئین مرغزار ودنہ نہ وہ محلوں کی ڈیوڑھیاں ہیں نہ وہ شعرا اور ادبا کی نکھری صحبتیں ——— خواب و خیال ہو کر دامن فضا میں پہنچ گئیں مگر میری آنکھوں کے سامنے آج بھی اسی طرح پھر رہی ہیں میں نے دنیا میں آنکھ کھولکر اس مشہور لکھنؤ کو تو نہیں دیکھا جو تہذیب کا مرکز، شائستگی کا منبع علمی و ادبی برکتوں کا خزانہ بتایا جاتا ہے مگر مٹیا برج کو دیکھا ہے جو شمع اودھ کا آخری شمعدان اور در اصل اس زمانہ کا زندہ لکھنؤ تھا۔ لکھنؤ اجڑ گیا تھا مگر اس کے منتخب صاحبان کمال وہاں پہنچ کے ظل اللہ جہاں پناہ کے سایہ عاطفت میں دریائے بھاگرتی کے کنارے لبس گئے تھے۔ مٹیا برج نہ تھا بلکہ دربارِ مغلیہ اودھ اور ہندوستان کے اسلامی تمدّن کی آخری شمع بنگالے کے ایک کونے میں روشن ہوئی تھی اور چونکہ بجھنے کو تھی لہذا اکثر اوقات چراغ سحری کی طرح بھڑک کر زیادہ نورانیت دکھا دیتی تھی۔ (ص ۷۰)

غدر۔ ظالم اور مظلوم کی کشمکش

ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرس کے سامنے، لارڈ ڈلہوزی کی جو رپورٹ پیش کی گئی تھی، کرنل سیمن، جنرل لو، جنرل اوٹرم وغیرہ نے اس رپورٹ کی تائید یا مخالفت میں جو کچھ کہا تھا، ان سب باتوں کی قدر مشترک یہ تھی کہ

واجد شاہ مردم کش تھا، ظالم تھا، ستم گر تھا

لیکن یہ دعوے واقعات وحقائق کی کسوٹی پر جب کسا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ جھوٹ کا طومار تھا۔ واجد علی شاہ سے ان کی رعایا خوش تھی، مطمئن تھی، ان سے محبت کرتی تھی اور اسکا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اپنی اولین فرصت میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کردی۔ انگریز اور ہندوستانی مورخوں کی ایک بہت بڑی جماعت اس پر متفق ہے کہ ۱۸۵۷ء کا غدر درحقیقت نتیجہ تھا۔ الحاق اودھ کا، یہ الحاق اگر عمل میں نہ آیا ہوتا اور واجد علی شاہ تمام معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر معزول نہ کردئے گئے ہوتے تو یہ بغاوت رونما نہ ہوتی۔ اِس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ غدر اور بغاوت کی حقیقی شدت اودھ میں تھی کسی دوسرے حصۂ ملک میں نہ تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارفرماؤں نے بتایا تھا کہ الحاق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک اودھ کی خوش حالی بڑھ جائے گی لیکن کیا حقیقتاً ایسا ہوا؟ واقعات کا جواب نفی میں ہے۔

اودھ کے سپاہیوں میں بددلی

۱۷ فروری ۱۸۵۶ء کو انگریزوں نے اودھ کا الحاق کرلیا۔ انہیں نتیجہ کی بالکل خبر نہ تھی۔ اسکی وجہ سے ہزارہا آدمی جو بادشاہ کی ملازمت میں تھے برطرف ہوگئے اور وہ اپنی آمدنی کے ذرائع سے محروم کردئیے گئے۔ جتنا زیادہ نظام حکومت خراب ہوتا گیا اتنا ہی زیادہ سپاہیوں، درباریوں، پولیس کے ملازموں اور زمینداروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا جو خرابی حکومت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر موٹے ہوتے جا رہے تھے۔ جن لوگوں نے انگریزوں سے دادرسی چاہی تھی۔ بالعموم غریب اور مظلوم تھے لیکن مظلوموں نے برطانوی حکومت میں خود اپنی تباہی دیکھی۔ اودھ پوربیوں کا مولد و مسکن ہے اور بددلی کے ان جذبات نے ان تمام پوربیوں کو جو انگریزی ملازم تھے متاثر کردیا۔ ہندوستانی باشندوں کے نزدیک الحاق کی کارروائی صریح ظلم کے مترادف تھی اور اسی وجہ سے عام مقابلہ کے جذبات مشتعل ہوگئے تھے۔

اس کے بعد سے بادشاہ اور ان کے تمام متعلقین (اگرچہ فیصلۂ قسمت کے سامنے انہوں نے چاروناچار سر تسلیم خم کر دیا تھا) انگریزوں کے جانی دشمن ہوگئے تھے اس وقت لکھنؤ میں دو پلٹنیں (انیسویں چونتیسویں) مقیم تھیں جن کو انگریزی حکومت تنخواہ دیتی تھی انہوں نے الحاق کی غیر منصفانہ کارروائی کے بارے میں آپس میں مشورے کئے اور طے کیا کہ انگریزی راج الٹ دینے کی غرض سے بغاوت برپا کرنے کی کوشش کرنی چاہئیے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ۱۸۵۷ء میں جب پلٹنوں کے بدلنے کا وقت آیا تو ان میں سے ایک پلٹن بیرام پور اور دوسری بارک پور بھیجی گئی ان دونوں پلٹنوں کے دلوں میں انگریزی حکومت کی جانب سے سخت نفرت کا جذبہ موجود تھا اور انہوں نے دوسری پوربی پلٹنوں کے نام چھٹیاں روانہ کیں۔ ۳۴ ویں پلٹن نے اس کارروائی میں پہل اختیار کی۔ ان چھٹیوں میں ہر پلٹن کو ہندوستان کے قدیم شاہی خاندانوں کی یاد دلائی گئی اور یہ

ظاہر کیا گیا تھا کہ اودھ کی فوج کو بھی برطرف کر دیا گیا اور اسکی بجائے نئی پنجابی فوج بنائی گئی ہے جو سکھوں اور پنجابیوں پر مشتمل ہوگی۔ سپاہیوں کو یہ بات جتلائی گئی کہ جو لوگ صرف تلوار کے دھنی تھے اور جنہیں سوائے تلوار کے اور کوئی کام نہ آتا تھا ان کے منہ سے روٹی چھین لی گئی ہے۔ پلٹنوں میں اس امر کا اندیشہ بھی ظاہر کر دیا گیا تھا کہ عنقریب اور صوبے بھی ملحق کر لئے جائیں گے اور ہندوستانیوں کو آئندہ سے فوج میں ملازم نہیں رکھا جائیگا اور اگر رکھا جائیگا تو نہایت قلیل تعداد میں اس طریقہ سے سپاہیوں پر زور ڈالا گیا کہ وہ سابقہ بادشاہوں کو از سر نو تخت پر بٹھانے کے لیے بغاوت کریں اور غاصبوں کو ملک سے نکال دیں۔ سپاہیوں کی بہبودی اسی امر کی مقتضی ہے ان دونوں پلٹنوں کے قریب قریب ہونے سے باغیوں کو باہمی خط و کتابت کا بہت موقع مل گیا (یہ خطوط نویسی بہت خفیہ طریقہ سے کی جاتی تھی) آپس میں کثرت سے مشورے ہونے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ ہندوستانیوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ کون کون سی پلٹنیں سازش میں ملوث ہیں اور بتدریج یہ بات مذہب میں داخل ہو گئی کہ ہر یورپیئے کو غیر ملکی سے ترک موالات کر لینی چاہیئے اس کی حکم عدولی کرنی چاہیئے اور اس کی عملداری کو الٹ دینا چاہیئے۔[1]

الحاق کے بعد جاگیرداروں کی پریشانی

اودھ پر انگریزوں کے قبضہ نے ملک کے ہر طبقہ میں پریشانی اور بد دلی پیدا کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حالات روبراہ ہونے کے بجائے اور زیادہ خراب ہونے لگے۔

"الحاق اودھ نے جاگیرداروں کی مالی حالت کو بہت خراب کر دیا۔ شاہ اودھ کے برخاست شدہ فوجی افسر اور سپاہی مصائب کا شکار ہو رہے تھے۔

جاگیرداروں، فوجی افسروں اور سپاہیوں نے اپنی بدحالی کا راز الحاق اودھ میں پایا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کمپنی کی حکومت کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

---

[1] خدنگ غدر صفحہ ۵۱

اودھ انقلاب کا مرکز تھا۔ اودھ کے جدید صوبہ کا افسرِ اعلیٰ سر ہنری لارنس کو مقرر کیا گیا ہنری لارنس نے حالات پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن بیسُود۔ بے اطمینانی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ انقلاب پسندوں کی جماعت بہت مضبوط ہو گئی۔ جب لکھنؤ کے انقلابیوں کو میرٹھ اور دہلی کے واقعات کا علم ہوا تو انہوں نے بھی برطانوی ریذیڈنسی کا محاصرہ کر لیا۔ اودھ ایک ایسی مشین کی مانند تھا جس کا ہر پرزہ انقلاب کے لئے حرکت کر رہا تھا۔ انقلاب پسندوں نے واجد علی شاہ کے بیٹے کو ملکہ حضرت محل کی سرپرستی میں اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ انگریز محصورین کی مدد کے لئے جنرل اوٹرم اور جنرل ہیولاک لکھنؤ کی طرف بڑھے لیکن یہ دونوں جرنیل اپنی فوج کے سمیت محصور ہو گئے۔ آخر سر کولن کیمبل کی آمد پر انقلاب پسندوں کو شکست کھانی پڑی۔ خاص بازار کے در و دیوار خون سے رنگین تھے۔ عالم باغ۔ دلکشا باغ اور سکندر باغ کے ہر پھول پر لالہ کا گمان ہوتا تھا[1]

اس صوبہ اودھ کی ہر چھاؤنی میں سپاہ نے بغاوت کی ہے تمام اضلاع میں اندھیر ہو رہا ہے۔ تعلقہ دار اپنے علاقہ سابقہ پر از راہ زبردستی قبضہ کر رہے ہیں لیکن جو ان کا مقابلہ کرتا ہے اس کے گاؤں کو جلاتے ہیں۔ اور باشندوں کو قتل کرتے ہیں۔ ان کے آپس کے پرانے بغض و کینے از سرِ نو زندہ ہو گئے ہیں اور وہ سارے ملک میں کم و بیش آپس میں توپوں اور

---

[1] کمپنی کی حکومت صفحہ ۲۶۸

بندوقوں اور ہتھیاروں سے لڑتے ہیں۔ ہر صیغے کے سول کے حاکموں کو مجبوری اپنا صدر مقام چھوڑنا پڑا۔ سب تھانے و تحصیل برباد ہوگئیں۔ کسی طرح کی بدنظمی اور بدعملی کی مزاحمت نہیں ہوسکتی۔ اگر باغی چلے جاتے تو سول کے حکام جاکر پھر انتظام کر لیتے مگر باغی گئے نہیں۔ صوبہ میں منڈلا رہے ہیں کہ لکھنؤ پر حملہ کرنے کا موقعہ ملے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ لکھنؤ کو کبھی نہیں لے سکیں گے۔ خود ہی تباہ ہو جائیں گے۔ بالفعل صوبہ اودھ کی چھاؤنیوں اور ضلعوں کی یہ کیفیت ہے۔

خیرآباد کی قسمت میں سیتاپور و محمدی و ملاؤں بالکل چھوڑ دئے گئے ہیں شاہجہان پور اور محمدی میں انگریزوں کا ہولناک قتل عام ہوا ہے۔ باغیوں کی سپاہ میں سے اہم دیں ہندوستانی پیدل رجمنٹ اور دسواں اودھ کا غیر آئینہ رسالہ اور گیارہ سو سپاہی جو اودھ کی غیر آئینی سپاہ میں باغی ہیں اور پولیس کی سپاہ یہ سب لکھنؤ سے ۱۸ میل کے فاصلے پر محمود آباد میں موجود ہیں جو تعلقہ داروں کو اغوا کر رہی ہے کہ وہ ان کے ساتھ شریک ہوں۔ وہ روز گھٹتے جاتے ہیں قسمت لکھنؤ (لکھنؤ۔ اناؤ۔ دریاباد) میں لکھنؤ کے گرداگرد آٹھ میل میں کل اودھ کے اندر ہمارا انتظام و بندوبست ہے۔ ہمارے پاس دو مقام رزیڈنسی اور مچھی بھون ہیں۔ علاوہ اس کے ایک بدنصیب یورپین سپاہ چھاؤنی میں ہے۔ مچھی بھون اور لوہے کے پل پر تو اہل شہر سوار ہیں۔ شہر کے آدمی بھی جانتے ہیں کہ اور انجینئروں نے بھی کہدیا ہے کہ یہ مقام استوار و مستحکم نہیں ہے۔ اگر اس کا محاصرہ ہوگا تو وہ اڑ جائیگا۔ ریذیڈنسی کے مستحکم و استوار کرنے کا بڑا انتظام کیا گیا ہے۔ جس میں بڑی کوٹھی اور مکانات ہیں۔ مدت تک محافظت کر سکتے ہیں۔ دریاباد میں

پانچویں اودھ کے غیر آئینی باغی رجمنٹ ہے مگر اس کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے وہ فنتر کے پندرھویں رسالہ سے اور آٹھویں غیر آئینی پیدلوں کی رجمنٹ سے جو سلطانپور سے آئی ہے مل گئے ہیں۔ بھڑائچ کی قسمت میں دوسری و تیسری اودھ کی غیر آئینی پلٹنیں اور نللوہ کا توپ خانہ اور سو سوار باغی ہیں ابھی انہوں نے گھاگرا سے عبور نہیں کیا ہے۔ وہ انتظار میں بیٹھے ہیں کہ فیض آباد کی قسمت سب سے زیادہ ہولناک ہے۔ ۲۲ ویں ہندوستانی پیدل اور اعظم گڑھ کی ۱۷ ویں رجمنٹ اور چھٹی اودھ کی غیر آئینی پیدل رجمنٹ اور اودھ کے سواروں کا ایک حصہ اور رل کا توپ خانہ یہاں سب باغی جمع ہیں اور اودھ کا پندرھواں رسالہ کانپور کی طرف گیا ہے سلطانپور میں سپاہ نے آگ لگادی اور وہاں سے چلی آئی۔ بہت سے یورپین قتل ہوئے۔ سلون میں یورپین کی جانیں بچ گئیں۔

لارنس کی ہلاکت کا غم۔ یورپین کی بڑی خاطر جمعی یہ تھی کہ سر ہنری لارنس ان کے لئے طاقت و قوت کا حصن حصین ہے۔ آخر جون کو چنہٹ میں انگریزوں کو بڑی شکست فاش ہوئی تھی۔ ساری جولائی میں لکھنؤ کا محاصرہ رہا۔ کانپور کی فتح میں جنرل ہیولاک کو اس خبر کے سننے سے نہایت دل میں رنج والم ہوا کہ لکھنؤ کے محاصرہ میں اول سر ہنری لارنس کی قربانی ہوئی وہ جنرل کے قدیمی دوست تھے ان کے مرنے سے جو نقصان ہوا تھا اس کو جنرل صاحب بھی خوب سمجھتے تھے۔[1]

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاءاللہ) صفحہ ۵۴۶

سقوط دلی کے بعد بھی اودھ نے جنگ جاری رکھی

انگریزوں نے دلی فتح کرلی۔

لیکن اودھ کے باہمت لوگوں کے حوصلہ میں اس حادثہ سے بھی فرق نہ آیا۔ وہ اور زیادہ جوش وخروش کے ساتھ لڑنے لگے۔ راقم الدولہ ظہیر دہلوی سقوط دہلی کے بعد جان بچانے کے لئے بھاگے۔ کیونکہ بہادر شاہ کے متوسلین میں تھے اگر پکڑے جاتے تو پھانسی کے پھندے سے کسی طرح نہیں بچ سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی میں بہت سے دلچسپ اور عبرت انگیز مشاہدات لکھے ہیں۔ ذیل کے واقعہ سے اودھ کے مسلمانوں کے جوش وخروش کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے:۔

"بریلی میں نانا راؤ اور فیروز شاہ وغیرہ اور دلی اور لکھنؤ کے آدمی جمع ہیں۔ رامپور کے ۳۰ ہزار آدمی بریلی میں ملازم ہیں اور مردمان رامپور کا یہ حال ہے کہ ایک ایک تھان کا دوپٹہ سر سے بندھا ہوا ہے اور اس پر گوٹا لگا ہے۔ آدھا دوپٹہ سر پر بندھا اور آدھا گھوڑے کی رکاب سے نیچے لٹکتا ہے۔ چار چار طپنچے کمر میں لگے ہوئے ہیں۔ دوہری تلواریں ڈاب میں لگی ہیں۔ گھوڑوں پر سوار ہیں اور شہر میں گھوڑے کوداتے پھرتے ہیں۔ ۵۰ ہزار سوار کا اجتماع بریلی میں موجود ہے اور چار طرف سے سپاہ انگریزی کے آنے کی خبر گرم ہے۔ قصہ مختصر دوسرے دن ہم سات آدمی بریلی کو چھوڑ کر راستہ سے ہٹ کے جنوب کی جانب روانہ ہوئے اور یہ ارادہ کیا کہ غیر راہ سے رام پور داخل ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ہم بریلی سے روانہ ہوکر ایک قصبہ آنولہ پہنچے اور ایک مسجد میں مقیم ہوئے۔ اس روز وہیں قیام کیا۔ دوسرے روز صبح کو مقام شاہ آباد عملداری رامپور کا قصد کیا۔ وہ مقام آنولہ سے اٹھارہ کوس تھا۔ غرضیکہ بارہ کوس راہ دن میں طے کی۔ پھر تھک کر چور ہوگئے۔ آگے چلنے کی ہمت نہ ہوئی۔ پاؤں سوج گئے۔ تلوؤں میں آبلے پڑ گئے۔ جاٹوں کا ایک گاؤں

تھا۔ اسکے باہر ایک تالاب کے کنارے ایک درخت کے نیچے قیام کیا۔ اسی اثنا میں ایک مسلمان بنجارہ گاؤں سے پانی بھرنے آیا اس نے ہمیں دیکھ کر کہا کہ تم لوگ یہاں کیوں پڑے ہو؟ جاؤ اپنا رستہ لو گاؤں والے دیکھیں گے تو جان سے مار ڈالیں گے۔ یہ لوگ مسلمان پٹھانوں کی جان کے دشمن ہیں۔ کیونکہ خان بہادر خاں کی عملداری میں جو لوگ ان پر حاکم ہیں انہوں نے ان پر بڑے ظلم و ستم کیئے ہیں۔ اس لیئے یہ اب بدلہ لے رہے ہیں۔ ہم نے کہا ہم بھی مرنے کو پھرتے ہیں مگر ہم ایسے سخت جان ہیں کہ ہمیں کسی صورت موت نہیں آتی۔ ہم خدا سے چاہتے ہیں کہ کوئی ہم کو مار ڈالے اور اس روز روز کی مصیبت سے چھٹکارا ہو۔ وہ بنجارہ پانی کا گھڑا سر پہ رکھ کر گاؤں کو روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر واپس آیا اور بولا تم کو مقدم جی بلاتے ہیں۔ ہم نے کہا ہم فقیر ہیں ہمارا گاؤں میں کیا کام؟ ہم کو یہیں پڑا رہنے دو۔ رات کو بسیرا ہے کر صبح کو چلے جائینگے۔ اس شخص نے نہ مانا اور ہم کو اپنے ہمراہ چوپال میں لے گیا ہم نے وہاں جا کر دیکھا کہ ایک بہت قوی ہیکل جوان داڑھی چڑھائے ہوئے ایک ماچھے پر لیٹا ہے اور آگے اس کے ایک بہت بھاری لٹھ دھرا ہے۔ نوجوان نے ہمیں دیکھ کر کہا او میاں جی بیٹھ جاؤ برابر اس کے ایک اور اونچے پایوں کا ماچھا بچھا ہوا تھا۔ اس پر ہم کو بیٹھنے کی اجازت دی۔ اس مرد نے استفسار حال دریافت کیا۔ ہم نے کہا ہم مسافر ہیں۔ دلی کے رہنے والے ہیں۔ تباہ و برباد ہو کر گھر سے نکلے ہیں۔ انگریزوں کے ڈر سے چھپے پھرتے ہیں۔ رام پور جانے کا ارادہ ہے اس مرد رحمدل نے ہمارے حال زار پر بہت تاسف کیا اور ہمارے منہ ہاتھ دھلوائے۔ تھوڑی دیر میں مکئی کی روٹیاں گھی میں چپڑی ہوئی اور

دال اور ایک برنجی شکر کا سے میں دودھ اور شکر منگوا کر ہمارے سامنے رکھے اور ہم سے کہا اچھی طرح خوب سیر ہو کر کھالو۔ بعد تناول کے ہم اسی چوپال میں جاکر سو رہے۔ صبح کو ہم نے چلنے کا ارادہ کیا تو اسی مرد بامروّت نے ہم سے کہا کہ تمہارے پاؤں تو سُوجے ہوئے ہیں راستہ کیونکر طے ہو گا؟ اور اپنے گاڑیبان کو بلا کر کہا کہ ان کو گاڑی میں سوار کرا کر شاہ آباد تک پہنچا آئے۔ علاوہ بریں پانچ روپے اپنے پاس سے زادِ راہ ہم کو دئے ہم نے ہر چند انکار کیا مگر عالی ہمت نے نہ مانا اور ہم کو سوار کرا کر شاہ آباد پہنچا دیا۔ ہم نے خدا کی رزق رسانی کا شکر ادا کیا۔[1]

انگریزی فوج کے چھکے چھڑا دئے

انگریزوں کی فوج منظم تھی۔ ماہر جنگ تھی۔ انگریزوں کے پاس وسائل و ذرائع کی کمی نہ تھی، دولت تھی، روپیہ تھا۔ باغیوں اور جاسوسوں کی کمک تھی۔ راجواڑوں اور ریاستوں۔ زمینداروں اور تعلقہ داروں کی مدد تھی۔ سکھوں اور دوسرے علاقوں کے سپاہیوں کی موج در موج فوج تھی، اودھ کے باغیوں کے پاس نہ دولت تھی نہ ذرائع نہ تنظیم، ہاں حوصلہ تھا، ہمت تھی۔ مر مٹنے کا جذبہ تھا۔ جان دے دینے کا ولولہ تھا۔ انہی ہتھیاروں سے وہ لڑتے تھے اور دشمن کے چھکے چھڑا دیتے تھے۔ ذرا یہ منظر دیکھئے:۔

۲۹ر جون کو سر ہنری لارنس کو خبر ہوئی کہ کان پور کے فتح ہو جانے سے باغیوں کی ہمتیں بڑی بڑھ گئی ہیں۔ اس کا لشکر چنہٹ پر اس لئے جمع ہوا ہے۔ کہ لکھنؤ کا محاصرہ کرے۔ سر ہنری لارنس تو یہ چاہتے ہیں کہ کوئی موقع ہاتھ آئے۔ باغیوں پر کوئی صدمۂ عظیم پہنچایا جائے سو ان کو موقعہ مل گیا۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ کل صبح کو ککریل ندی پر جو لکھنؤ سے چار میل کے

---

[1] داستان غدر (راقم الدولہ ظہیر دہلوی)

فاصلہ پر ہے سپاہ کو ساتھ لے کر جائیں - اگر دشمن وہاں نہ ملے تو واپس چلے آئیں - اگر دوسری صورت ہو تو دشمنوں پر ایسا صدمہ پہنچائیں کہ چند روز تک ان کو یہ حوصلہ نہ ہو کہ وہ لکھنؤ کے محاصرہ پر مباورت کریں۔ وہ جو سپاہ انتخاب کرکے لے گئے مقدار میں سات سَو سے کچھ زائد تھی - نصف کے قریب یورپین تھے - دس توپیں ان کے ساتھ تھیں جن میں چار سو گولہ انداز گورے تھے - اور باقی کے گولہ انداز ہندوستانی تھے۔ ہنری لارنس یہ چاہتے تھے کہ صبح کے ہوتے ہی سفر ہو لیکن دن چڑھ گیا تو سپاہ کی تیاری پوری ہوئی - سپاہ پہلے چند روز سابقہ کی رات دن کی محنت شاقہ سے ہاری تھکی ہوئی تھی جو اس کو اپنی خدمات کی بجاآوری میں کرنی پڑتی تھی - اور پھر اس کو ہنری لارنس کے حکم کے موافق خورد ونوش نہ ملا جو اس کے ہمراہ تھا تو اس کی صورت ایسی نظر آتی تھی کہ وہ سارے دن سخت محنت کرکے آئی ہے نہ یہ کہ وہ کام شروع کرنے جاتی ہے۔ وہ تین میل سفر کرکے گگریل کے پُل پر پہنچی - تو اس نے یہاں قیام کیا کوئی دشمن نظر کے سامنے نہیں آیا تو سپاہ کے واپس جانے کا حکم ہوا - وہ واپس چلی تو پھر سب کو یہ حیرت ہوئی کہ واپس جانے کا حکم منسوخ ہوا اور پھر اس کو حکم ہوا کہ وہ چنہٹ کی طرف سفر کرے سڑک بڑی خراب اور ناہموار تھی - اس پر سپاہ گرتی پڑتی چل کر موضع اسماعیل گنج میں آئی کہ دفعتہً ان کے درمیان دشمنوں کی توپوں کے گولے آن کر پڑے اور انہوں نے ان دشمنوں کو دیکھا کہ جنہوں نے اب تک موضع چنہٹ کے محاذی گھنے درختوں کی قطاروں کی آڑ میں اپنے تئیں چھپا رکھا تھا۔ سر ہنری نے اسماعیل گنج اور سڑک کے درمیان صف بندی کی اور حکم دیا کہ

لیٹ جائیں، اور توپوں سے باغیوں پر گولہ زنی شروع کی۔ تھوڑی دیر تک طرفین سے توپ زنی ایک دوسرے پر ہوتی رہی۔ دشمن نے اپنی توپوں کو تھما دیا۔ جس سے سرہتری کو دھوکا ہوا کہ وہ یہ سمجھے کہ دشمنوں میں اب لڑائی کا حوصلہ نہ رہا۔

مگر پھر ان کو یہ دھوکا نہیں رہا۔ دشمنوں نے استقلال کے ساتھ ایسی پیشقدمی کی جس کی تعریف انگریزی افسروں نے بھی کی اور انہوں نے ۳۲ رجمنٹ پر بڑی آتشباری کی۔ ہندوستانی توپ خانہ کے کام میں لانے کے لئے ہر چند کوشش کی وہ کارگر نہ ہوئی۔ توپچی دغاباز باغیوں سے ملے ہوئے تھے انہوں نے دو توپوں کو خندق میں اوندھا کیا۔ چند لمحوں میں دشمنوں نے اسماعیل گنج لے لیا گوروں نے پھر اسکو لے لینے کا قصد کیا مگر وہ بہت تھک گئے تھے۔ اور کرنیل کیس کے زخم مہلک لگنے سے دل شکستہ ہو گئے تھے۔ اس لئے کامیاب نہیں ہوئے اور منتشر ہو کر الٹے سڑک پر آئے تو سرہتری نے یہ دیکھ کر کہ میں کہیں محصور نہ ہو جاؤں سپاہ کو مراجعت کا حکم دیا۔ بس یہ مراجعت ہی ہزیمت ہو گئی جس میں ۳۲ رجمنٹ کے ایک سو پندرہ سپاہی مارے گئے اور ۳۹ مجروح ہوئے۔ یہ مقتولین و مجروحین میں نسبت عجیب و غریب تھی۔ دشمن کا توپ خانہ لپک کر سپاہ کے گارڈ پر حملہ آور ہوا اور متواتر گولیوں کے مارنے سے ان کو بہت دق کیا۔ ۳۲ رجمنٹ کے سپاہی ایسے مضمحل ہو گئے تھے کہ وہ سڑک پر مرنے کے لئے گر گئے۔ وہ بڑے خوش نصیب تھے جو توپوں کی گاڑیوں پر سوار ہو گئے یا کوئی دست سوار ان کو ایسا مل گیا جس نے ان کو اپنی رکاب سے چمٹا لیا۔[1]

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۸۲۵

سرہنری لارنس کی ہلاکت

بیلی گارد یعنی ریذیڈنسی کا باغیوں نے محاصرہ کر رکھا تھا۔ وسائل کی کمی، روپے کی قلت اور ہمرہان کار کی گریز پائی کے باوجود وہ جی توڑ کر حملے کر رہے تھے۔ کبھی پسپا ہوتے تھے، کبھی آگے بڑھتے تھے اپنے مقتولین و مجروحین کی کثرت تعداد سے بے پروا وہ اسی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ کہ جس طرح ہو سکے ریزیڈنسی پر قبضہ کر لیں۔ انگریز گو یہاں محصور تھے لیکن پھر بھی وہ ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔ کمک کے انتظار میں تھے کہ وہ آجائے تو باہر نکلیں۔ اس اثنا میں سرہنری لارنس ہلاک ہو گئے اور ان کی ہلاکت کی تفصیل یہ ہے :-

چنہٹ کی ہزیمت کی مصیبت سے زیادہ محصورین پر یہ آفت آئی کہ سر ہنری لارنس کا واقعہ ناگزیر پیش آیا جسکا حال کپتان ولسن نے یہ تحریر کیا ہے کہ پہلے روز دشمن نے آٹھ بجے دن کے آٹھ انچی گولہ اس ہوٹ زر کا جو اس نے ہم سے چھینا تھا اس کمرہ میں پھینکا جس میں سر ہنری اور ان کے سیکرٹری کوپر صاحب کام کر رہے تھے۔ وہ ان دونوں کے قریب آکر پھٹا مگر کسی کو ضرر نہیں پہنچا تو ہم نے سر ہنری سے عرض کیا کہ آپ ریذیڈنسی کو چھوڑ کر کہیں اور جا رہیے یا اس مکان کے نیچے کی منزل میں چلے جائیے لیکن انہوں نے اس سے انکار کیا اور ہنس کر کہا کہ مجھے یہ یقین نہیں کہ دشمن کے پاس ایسے قدر انداز گولہ انداز ہیں کہ وہ دوسرا گولہ اس چھوٹے کمرہ میں پھر ماریں۔ اس دن سہ پہر کو ریذیڈنسی کی سب سے اوپر کی چھت پر بعض گولے آئے شام کو میں نے اور کوپر صاحب نے ان پر زور ڈالا کہ وہ نیچے کے مکان میں جا کر رہیں اور کاغذات اور لکھنے کا سامان وہاں بھیج دیں تو انہوں نے اقرار کیا کہ کل صبح میں یہ کام کرونگا۔

دوسری جولائی کو آٹھ بجے صبح وہ بڑے مضمحل ہو کر اپنے گشت سے واپس

آئے (گرمی بلا کی پڑ رہی تھی) اور بچھونے پر کپڑے پہنے ہوئے لیٹ گئے۔
اور مجھ سے کہا کہ ایک یادداشت لکھو کہ کس طرح سپاہ میں خوراک کی تقسیم
کی جائے۔ میں دوسرے کمرہ میں یہ یادداشت لکھنے گیا مگر اس سے پہلے میں
نے ان کو کل کا وعدہ نیچے جانے کا یاد دلایا تو انہوں نے فرمایا کہ میں
بہت تھکا ہوا ہوں۔ دو گھنٹے آرام کرکے اپنی ساری چیزیں بھیج دوں گا
نصف گھنٹہ میں مجھے جو کچھ لکھنا تھا وہ لکھ کر پھر ان کے کمرہ میں آیا۔ ان
کا بھتیجا جان لارنس ایک چھوٹے سے بچھونے پر لیٹا ہوا تھا جو متوازی
اسکے چچا کے بچھونے سے چند فٹ کے فاصلہ پر تھا۔ میں سر ہنری کے داہنے
طرف ان کے بچھونے پر گھٹنا ٹیک کر کھڑا ہوا۔ ایک ہندوستانی ملازم
فرش پر بیٹھا ہوا پنکھا کھینچ رہا تھا۔ میں نے جو لکھا تھا وہ پڑھا۔ میرا
لکھا ان کی خاطر میں نہ آیا۔ وہ بتلانے لگے کہ یہ تبدیلیاں اس تحریر میں
کرو کہ میں نے دیکھا کہ ایک گولہ آیا۔ شعلہ چمکا۔ خوفناک آواز ہوئی۔ اندھیر
گھپ ہو گیا۔ میں فرش پر گر پڑا۔ اور چند سیکنڈ تک بے دم پڑا رہا۔ پھر
میں کھڑا ہوا مگر کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کمرہ دھوئیں اور گرد سے بھرا
ہوا تھا۔ نہ سر ہنری نے، نہ ان کے بھتیجے نے کوئی آواز نکالی۔ میں نے
چونک کر یہ پوچھا کہ سر ہنری آپ کے ضرب لگی ہے؟ میں نے دو دفعہ یہ کہا
اسکا جواب کچھ نہیں ملا۔ تیسری دفعہ جب میں نے یہ کہا تو انہوں نے یہ
جواب دیا کہ میں مارا گیا۔ پنکھا جھٹکے کے ساتھ فرش پر گرا اور بہت سا چونا
گرا۔ جب بتدریج گرد اور چونا کم ہوا تو میں نے چند منٹ بعد دیکھا کہ بستر
پر سر ہنری کا بالاپوش ان کے خون میں سرخ ہو رہا ہے۔

۳۲ رجمنٹ کے کچھ گورے کمرہ میں آئے اور سر ہنری کو کرسی پر بٹھایا۔

تو میں نے دیکھا کہ میرے کپڑے اُتر گئے ہیں اور گولے کے ایک ٹکڑے سے میں خفیف سا زخمی ہوا ہوں اور ہنری کے مہلک زخم لگا ہے اور ٹھیک ان کی ٹانگ کا ایک پاؤں گولہ کے دوسرے ٹکڑے سے کٹ گیا ہے۔ سارا دن اور دوسرے دن کے ایک حصہ میں سر ہنری کے ہوش و حواس قائم رہے۔ بار بار ان کو خواب آور دوائیں دی جاتی تھیں۔ اُن کی تکلیف بڑھتی جاتی تھی اور جس مکان میں وہ تھے اس میں متواتر گولے اور گولیاں دیواروں پر آآن کے لگتے تھے مگر کوئی اُن کی روحِ مقدس کو بھینچی نہ ہوتی تھی۔ جب تک اُن میں حواس باقی رہے ان کا خیال سرکار کی طرف لگا رہا جس کی وہ خدمت چالیس سال سے کر رہے تھے جس کی خدمت گزاری میں انہوں نے یہ مہلک زخم کھایا تھا پھر انھوں نے اپنے خاص معتمد افسروں کو بلایا میجر بینکس صاحب کو چیف کمشنری کا کام اور کرنل انگلس کو سپاہ کے میر لشکر ہونے کا کام سپرد کیا اور اُن کو ہدایتیں کیں کہ محافظت کس کس طرح کی جائے اور بڑے جذبے اور زور سے یہ کہا کہ کبھی اپنے تئیں دشمنوں کے حوالہ نہ کرنا۔ ۲ تاریخ شام کو انھوں نے سیکرامنٹ اپنے دوستوں کے ساتھ کھایا پھر اُن میں باتیں کرنے کی قوت نہ رہی۔ وہ بہت کم بولے اور ۴ جولائی ۱۸۵۷ء کی صبح کو اس جہان سے رخصت ہوئے۔ چند سپاہی قبر پر اُن کی لاش لے جانے کے لئے بلائے گئے۔[۱]

انگریزوں کی سفاکی

بیلی گارد میں محصور ہونے سے پہلے جب انگریزوں کی ہوا اکھڑ رہی تھی، لیکن ابھی وہ لکھنؤ پر قابض تھے انہوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا تھا۔ انگریزوں کا ایک ثناخواں مورخ لکھتا ہے

---

[۱] تاریخ عروج عہدِ انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۸۳۳

اگرچہ اضلاع سے انگریزی حکومت برخاست ہوگئی تھی مگر لکھنؤ میں اب تک وہ چلی جاتی تھی۔ مچھی بھون پر ایک پھانسی کھڑی ہوئی تھی جس پر ہر روز باغیوں کے گروہ کے گروہ سرسری تحقیقات کے بعد چڑھائے جاتے تھے یہ سچ ہے کہ سازشیں کبھی کبھی ظاہر ہوتی تھیں مگر ان کے سرغنوں کا پکڑا جانا۔ ان کے شریکوں کو دہشت زدہ بنا دیتا تھا۔ ملٹری پولیس کے افسر کپتان کارنیگی صاحب بڑے جید اور مستعد افسر تھے۔ وہ بدمعاشوں کو دم نہیں مارنے دیتے تھے۔ عدالت کی کچہریوں میں بدستور کام ہوتا تھا۔ ہاں تجارت کی بڑی کم بختی آ رہی تھی۔ ساہوکارہ اور بنک اور بیوپار کی بڑی کساد بازی تھی سرکاری نوٹوں پر پچیس[۲۵] روپیہ سینکڑہ سے پچھتر روپیہ سینکڑہ تک بٹہ لگ گیا تھا مہاجنوں اور ساہوکاروں اور دولتمندوں کو سرکار انگریزی کی عملداری برقرار رہنے پر اعتبار نہیں رہا تھا مگر وہ حتیٰ الوسع اس کے سلامت رکھنے میں ساعی تھے لیڈیاں تو بہت کم حوالی ریزیڈنسی سے باہر جاتیں مگر چیلین بدستور اپنی نمازیں پڑھاتے، ڈنر ہوتے تھے۔ ان میں مہمان آتے جاتے تھے۔ [۱]

انگریزوں کی سرتوڑ کوشش

انگریز محصورین کی امداد و اعانت اور لکھنؤ کو فتح لینے کے لیے انگریز ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے، ہر طرف سے اپنی قوتیں مجتمع کر کے وہ لکھنؤ پر ٹوٹ پڑنا چاہتے تھے، ان کا خیال تھا اور بجا خیال تھا کہ اگر لکھنؤ فتح ہو جائے، تو پھر بریلی، مرادآباد، بدایوں، آگرہ، الہ آباد وغیرہ کی باغیانہ سرگرمیوں پر آسانی کے ساتھ قابو پالیا جائے گا، چنانچہ:۔

سر کولن فتح گڈھ سے یکم فروری کو روانہ ہوئے اور چوتھی کو کان پور پہنچے جس میں پھروالی اول برگیڈ و دوپ برگیڈ دبیٹن برگیڈ شامل ہوگئے تھے یہ سب

---

[۱] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۸۱۹

اودھ میں گنگا پار ہو کر داخل ہوئے۔ ایسی یورپین فوج کبھی ہندوستان میں جمع نہیں ہوئی تھی اس میں، ۷ اپلٹنیں پیدل تھیں جن میں پندرہ یورپین تھیں اور ۲۰ سکوڈرین سواروں کے تھے جن میں چار گوروں کے تھے اور چار جمنٹیں تھیں اور چون ہلکی اور اسّی بھاری توپیں اور موٹار تھیں [1]

نیز اس کے علاوہ:۔

ہیولاک صاحب کے پاس سب قسم کی سپاہ تین ہزار ایک سو نواسی تھی جس کی تفصیل یہ ہے کہ یورپین پیدل ۲۳۵۰ اور یورپین والنٹیر سوار ۱۰۹ اور یورپین آرٹلوں ۲۸۲ سکھ پیادے ۳۴۱ ہندوستانی غیر آئینی سوار ۵۹ کل ۳۱۰۹ یہ سپاہ تین برگیڈ میں تقسیم ہوئی۔ اول بریگیڈ کے افسر اعلیٰ ڈل صاحب دوسرے برگیڈ کے افسر اعلیٰ بریگیڈیر ہملٹن صاحب اور تیسرے برگیڈ کے افسر اعلیٰ میجر کوپر صاحب تھے۔ علاوہ ان کے ایک سو نو والنٹیر تھے جن میں سر ولیم اور ٹرم صاحب بھی تھے اور ۵۹ غیر آئینی بارہویں رجمنٹ کے سوار جن پر کپتان ایل بیرد کو پورا اعتبار تھا [2]

دہلی فتح ہونے کے بعد بھی ایک سال تک لکھنؤ لڑتا رہا، لیکن دلی کی فتح نے انگریزوں کی قوت وطاقت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا تھا۔ دلی فتح کرنے کے بعد وہاں کے باشندوں پر جو ہیبت ناک اور لرزہ خیز مظالم روا رکھے گئے تھے، انہوں نے عام طور پر دہشت اور سراسیمگی کی کیفیت بھی پیدا کر دی تھی۔ سکھوں نے مہاراجہ کپورتھلہ اور پٹیالہ وغیرہ کی قیادت میں دل وجان سے ہر مورچہ پر (حتّٰی کہ خود اپنے خلاف بھی) انگریزوں کا ساتھ دیا تھا، اور

---

[1] تاریخ ہندوستان (بغاوتِ ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۴۵

[2] تاریخ عروج عہدِ انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۸۲۳

اب حالات کا رُخ دیکھ کر اودھ کی ہمسایہ ریاست نیپال نے بھی اودھ سے بغیر کسی سابقہ دشمنی اور عناد کے اپنے سارے وسائل و ذرائع، اپنی سپاہ فوج اور قوت انگریزوں کے پلڑے میں ڈال دی تھی، اودھ کے جانباز بے سرو سامانی کے باوجود کب تک اور کہاں تک مقابلہ کرتے؟ آخر رفتہ رفتہ وہ خستہ اور درماندہ ہونے لگے، ہمت جواب دینے لگی، ساتھی ساتھ چھوڑنے لگے، دوستوں نے آنکھیں پھیر لیں، غداروں اور جاسوسوں نے زندہ رہنا دوبھر کر دیا، لکھنؤ کی فتح سے پہلے۔

رانا جنگ بہادر کی پیش کش

نیپال کے وزیر اعظم رانا جنگ بہادر نے جو نیپال میں حقیقت میں حکمرانی کرتا تھا مئی کے مہینے میں اپنی ساری سپاہ برٹش گورنمنٹ کے سپرد کرنے کی درخواست کی۔

لارڈ کیننگ نے جنگ بہادر کا شکریہ ادا کیا اور جون کے مہینے میں اس کی درخواست منظور فرمائی۔ جنگ بہادر نے تین ہزار سپاہی کھٹمنڈو سے جولائی کے مہینے میں بھیجے جو اس مہینے کے آخر میں گورکھپور کے شمال میں انگریزی عملداری میں داخل ہوئے۔[1]

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

نیپالیوں کے پاس سب کچھ تھا، باغیوں کے پاس حوصلے کے سوا کچھ نہ تھا، پھر بھی شمع حریت کے پروانوں نے جان دینے میں کسر نہ اُٹھا رکھی:۔

> جنگ بہادر گھاگرا سے پار اتر کر ۲۵ فروری کو اودھ میں داخل ہوا راستہ میں ایک قلعہ نہایت استوار آیا جس کا فتح کرنا ضرور تھا۔ اس کے اندر چونتیس باغی تھے۔ نیپالی سپاہ نے حملہ کیا جس کی تسخیر میں نیپالی سات مقتول اور بیتالیس مجروح ہوئے اہل قلعہ جو تعداد میں چونتیس تھے سب اس قلعہ میں مارے گئے۔[2]

---

[1] نادر تاریخ ہندوستان، جلد سوم (بغاوت ہند) صفحہ ۴۶

[2] " " " " " ۴۸

بال کرشن کی غدّاری

مہاراجہ بال کرشن جو بظاہر حضرت محل کے سامنے بہت خیر خواہی کا اظہار کرتا تھا انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ اس نے کسی تدبیر سے تمام تعلقداروں کو اپنے علاقوں میں واپس جانے پر آمادہ کر لیا۔ چونکہ اس وقت روپے کی سخت قلت ہو رہی تھی حضرت محل بھی اس کے دام میں آگئیں۔ بال کرشن نے تاویل یہ پیش کی کہ اگر یہ لوگ اپنے علاقوں میں واپس نہ جائیں گے تو رعایا سے تحصیل زر کس طرح ہوگا۔ تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھ چکا تھا۔ تعلقہ داروں کا مع افواج چلے جانے سے تحریک میں اضمحلال پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ لیکن پھر بھی حضرت محل کی ہمت مردانہ میں ثمہ بھر بھی فرق نہیں آیا اور پورے زور و شور کے ساتھ معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں۔

کالن کیمبل اور جنرل اوٹرم بغاوت کو فرو کرنے میں مسلسل کوششوں کے باوجود ناکام رہے تھے اُسے جنگ بہادر اور اس کی فوجوں نے قابو میں کر لیا۔

کیمبل اور اوٹرم نیپالی بندوقوں کے سائے میں اودھ کو فتح کرنے کے لیے اُٹھے۔ وہ اودھ جہاں گورنر لارڈ کیننگ کے الفاظ میں سب سے زیادہ باغی جمع تھے۔

لیکن علماء اسلام اور مجاہدین نے اپنے خون کے دریا بہا کر نیپالی فوجوں کے راستوں کو مسدود کر دیا۔ پھر بھی جنگ بہادر ۱۴ر فروری کو گورکھ پور سے دارالسلطنت جانے کے لئے روانہ ہوا اس کے ساتھی جنرل رد کرافٹ کو معلوم ہوا کہ پھول پور میں باغی بھرے ہوئے ہیں۔ لہٰذا جنگ بہادر نے براہ سلطان پور لکھنؤ کی راہ لی۔ راستہ میں دو خونریز لڑائیاں ہوئیں اور باغیوں نے نیپالیوں کا خوب مقابلہ کیا۔ گورکھ پور سے لے کر سلطان پور تک ۳۳ میل کے فاصلہ میں باغی بھرے ہوئے تھے ان کا سب سے بڑا مقام رام پور اور چاندا تھا۔

میر لشکر بندہ حسین اور مہدی حسین تھے۔ فریکس صاحب اور نیپالیوں کی فوج نے جب ان مقامات پر قبضہ کر لیا، تو ذکاء اللہ لکھتے ہیں:-

مہدی حسن پھر بھی مایوس نہ ہوا اور بادشاہ گنج میں نیپالیوں کا سدِراہ ہونے کے

لہ تاریخ عروج عہد انگلشیہ صفحہ ۴۴

لیے پراگندہ اور شکست یافتہ فوج کو جمع کیا۔ مرزا جعفر بیگ سپہ سالار نے گھر سے نالے کے پیچھے جس پر ایک سڑک لکھنؤ کو جاتی تھی صف آرائی کی سب سے بڑا توپ خانہ سڑک کے کنارے لگایا[1]

باغیوں کی وحشت: فرینکس صاحب امیٹھی میں جو لکھنؤ سے آٹھ میل تھی فروکش تھا اس کے پاس کمانڈر انچیف کا حکم آیا کہ آگے نہ بڑھو۔ قلعہ داؤدی میں باغی بہت بھرے ہوئے ہیں[2]

باغیوں کا مایوسی کے باوجود حوصلہ قائم تھا: ایک وہ وقت تھا کہ انگریز محصور تھے اب وہ وقت آیا کہ جاں بازانِ حریت محاصرہ کی زد میں آجائیں، لیکن اُن کے حوصلہ اور دم خم ہیں، ہر طرف سے مایوس ہو جانے کے باوجود کوئی فرق نہیں آیا۔

"محصورین لکھنؤ کو اس ناامیدی نے کہ نہ کہیں سے کمک آئے گی، یا کوئی اور دستگیری ذنایدہ ہوگی، ان کی ذہانت کو تیز کر دیا تھا، وہ اپنی محافظت کے لئے نئی نئی تدابیر اپنی فکر دقیق سے ایجاد کرتے تھے وہ بھری ہوئی بندوقیں اپنے پاس رکھتے تھے۔ وہ کبھی بے ضرورت ایسی جگہ نہیں آتے تھے کہ وہاں اُن پر دشمنوں کی زد لگ سکے۔ جب انہوں نے کمین گاہیں بنائیں تو ان کے بنانے کی کیفیت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے۔ محصورین اور محاصرین میں بہت سے مقامات میں فاصلہ ایسا کم تھا کہ طرفین میں سے کسی کی یہ جرأت و ہمت نہیں ہوتی تھی کہ آمنے سامنے ہو کر ایک دوسرے پر بندوق چلائیں۔ جب عام حملہ ہوتا تھا تو دیواروں کی اوٹ میں سے بندوق زنی ہوتی تھی۔ جب فریقین ایسے

---

[1] غدر کے ہیرو۔

[2] عروج عہد انگلشیہ

پاس پاس ہوں تو وہ جان سکتے ہیں کہ ان میں سے گولیاں کس طرف جائیں گی؟ اس لئے اس زد سے بچ سکتے ہیں۔ غرض یہ اوٹیں طرفین کو ایک دوسرے کی زد سے بچاتی تھیں اور زیادہ خونریزی نہیں ہونے دیتی تھیں۔ باوجودیکہ طرفین سے رات دن برابر گولیاں چلتی تھیں حملہ کا کوئی مقام متعین نہیں ہو سکتا تھا۔ دشمنوں کے قریب ہونے کے سبب سے محصورین کو رات دن جنگ کے لیے آمادہ رہنا پڑتا تھا۔[1]

لکھنؤ کا پرچم آزادی سرنگوں ہوتا ہے

دلِ ناتواں نے مقابلہ کیا اور خوب کیا، لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، ایک انتہا ہوتی ہے، آخر اس کی طاقت جواب دے گئی اور وہ سرنگوں ہو گیا۔

"۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء کی صبح کو اوٹرم صاحب کی سپاہ نے حرکت کرنی شروع کی۔ کمانڈر انچیف نے اپنے معتمد لفٹنٹ کو بھیجا کہ وہ گومتی کے بائیں کنارہ پر باغیوں کو شہر کے اُس طرف سے بھاگنے نہ دے اور اپنی بھاری توپوں سے دشمنوں کے مشرقی اور شمالی مورچوں پر حملہ کرے یا ان کو خراب کرے۔ اس سپاہِ عظیم کو جو کام کرنا تھا وہ آسان نہیں تھا۔ ستر اسی ہزار آدمی اپنی بہادری، استقلال اور ہوشیاری سے اپنے مستحکم مقام کو استوار کر رہے تھے ان میں سپاہی اور والنٹیر اور مسلح ملازمین جن کو قومی حرمت نے مذہبی دیوانگی تک پہنچا دیا تھا۔ ایک جوانمرد عورت حضرت بیگم نائب السلطنت کے علم کے سایہ کے نیچے اور اس کے مشتبہ رقیب مولوی فیض آبادی احمد اللہ شاہ کے سبز جھنڈے کے نیچے ایسے بڑے شہر میں جمع کیا جس کے اندر تنگ گلیاں اور بازار تھے اور بڑی بڑی حویلیاں اور چوک تھے جو بجائے خود ایک حصن حصین تھے۔ پھر ان کے استوار کرنے کے لئے

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۸۵۰۔

باغیوں کو بہت وقت مل گیا تھا جو مقام استوار تھے ان کو اور زیادہ استوار بنا لیا تھا۔ پھر بھی ایک بڑی خندق عمارات اور قیصر باغ کے لیے بن گئی تھی ۶ مارچ کو اوٹرم صاحب وال پول کے پیدلوں اور ہوپ گرینٹ کے چیدہ سواروں کو اور توپوں کی پانچ بیٹریوں کو پلوں کے پار لے گئے جو ندی پر تھے۔ نیپیر صاحب نے بُبر کے پیپوں کو رسّوں سے جوڑ کر دو تین دن میں تختے لگا کے بنائے تھے رات کو ندی کے بائیں کنارہ پر آرام کیا۔ دوسرا دن اس میں خرچ ہوا کہ اوٹرم کے بکتوں پر دشمنوں نے جو حملے کئے ان کو رفع کیا۔ آٹھویں تاریخ کا دن بھاری کے مورچوں کے بنانے میں صرف ہوا۔

نویں تاریخ کو چکر کوٹھی کے مورچوں پر آٹھ توپوں نے گولوں کا مینھ برسایا وال پول کے پیادوں اور توپوں نے اس کوٹھی کو یورش کر کے لے لیا اور مفرور باغیوں کے پیچھے جا کر اوٹرم صاحب نے آسانی سے بادشاہ باغ کو بھی لے لیا۔ مارٹی نیز کوٹھی پر قبضہ کر لیا۔ اس میں لفٹنٹ ٹیلر نے بڑا کام یہ کیا کہ وہ ندی کے پار تیر گئے کہ ہوپ صاحب کو اوٹرم صاحب کی فتح سے مطلع کریں۔

دوسرے دن لیوگارڈ صاحب نے بنکس ہوس کو فتح کیا۔ قیصر باغ پر گولہ اندازی شروع ہوئی پھر سکندر باغ آسانی سے فتح ہو گیا اس میں پہلی دفعہ ماہِ نومبر میں بڑا قتل ہوا تھا۔ غرض بہت سی عمارات حملہ کرنے سے یا توپوں کے مارنے سے فتح ہو گئیں۔ بیگم کی کوٹھی چند گھنٹے تک گولہ مارنے سے فتح ہو گئی جس وقت یہ فتوح ہو رہی تھیں سر کولن جنگ بہادر سے ملاقات کر رہے تھے جو میدانِ جنگ میں اپنے ساتھ گورکھوں کو لایا تھا۔ یہ ملاقات بڑی کر و فر و شان و شوکت سے ہوئی۔ دونوں دوست مل کر بہت خوش ہوئے۔ پھر جنگ بہادر اسی جگہ گیا

جو اس کی خیمہ زنی کے لئے تجویز ہوئی تھی۔

علی نقی خاں کی غداری کا صلہ

علی نقی واجد علی شاہ کا وزیر اعظم تھا، اس شخص پر بادشاہ آخر وقت تک اعتماد کرتے رہے، لیکن عوام کی نظر میں، وہ غدار اور نمک حرام تھا، اس نے ملک اودھ کی بربادی، بادشاہ سلامت کی تباہی، اور ملت اسلامیہ کی رسوائی کا کوئی خیال نہ کیا، یہ صرف اپنی سربلندی و سرفرازی کے لئے سرگرداں رہا۔ نجم الغنی اس کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

اس طرح جیسا کہ بیان ہوا ملک اودھ بلا تعرض قلم و سرکار انگاشیہ میں ملحق کر لیا گیا مگر لارڈ ڈلہوزی کے عہد کا یہ فعل جس کی راستی پر وہ ہمیشہ نازاں رہے رعایا کو بہت شاق گذرا اور علی نقی خاں وزیر کے سر پر یہ بدنامی عام مشہور رہی کہ اس نے انگریزوں سے سازش کر کے اپنی ذاتی فائدہ کے لئے ملک اودھ بے ڈھنگی ہلائے چھنوا دیا اور خود بھی اس نمک حرامی کا مفید صلہ نہ پایا اور آج تک اس کا نام نمک حرام کا مرادف سمجھا جاتا ہے اور اس کے نام کے ساتھ حقارت پیش نظر ہو جاتی ہے۔

بادشاہ کے اوصاف کا اعتراف

مولوی نجم الغنی بادشاہ سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں لیکن اعتراف کرتے ہیں:۔

(۱) یہ بادشاہ اس قدر رحمدل اور رقیق القلب تھا کہ باوجود اس قدر سلطنت اور زور و زر کے اس سن شباب میں کسی پر طیش اور بے رحمی نہیں کی بلکہ گالی تک بھی زبان پر نہیں آئی، نہ کسی موافق و مخالف کو ظلم سے ستایا، نہ کسی کی جان لی۔

(۲) باوجود اس قدر سلطنت اور جاہ و حشمت اور شباب کے اس بادشاہ میں غرور و نخوت نام کو نہ تھا۔

(۳) یہ بادشاہ اپنی ذات سے عادل تھا، کسی موافق و مخالف یا امیر یا بیگانے کی عدل میں رعایت نہیں کی[۱]

---

[۱] تاریخ ہندوستان اسوم (الخادت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۵۸۰ و [۲] تاریخ اودھ جلد ۵ صفحہ ۱۳۹

واجد علی شاہ قیدِ فرنگ میں

ہندوستان میں غدر شروع ہوا تو واجد علی شاہ پر بھی آفت آئی، وہ اپنے گوشۂ عافیت میں، انتزاعِ سلطنت کے بعد، صبر و شکر کی زندگی بسر کر رہے تھے، حکومت سے مایوس ہو چکے تھے اب ان کے دل میں، یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ لکھنؤ واپس جائیں گے اور تختِ حکومت پر متمکن ہوں گے، اور اگر یہ خیال تھا بھی تو کلکتہ میں رہ کر وہ کیا کر سکتے تھے؟ نہ ان کے پاس فوج تھی، نہ سپاہی، نہ دولت، نہ ثروت، خود مٹیا برج بھی تو ایک قسم کا قید خانہ ہی تھا، لیکن انگریزوں پر دہشت طاری تھی، وہ واجد علی شاہ سے کھٹک رہے تھے، چنانچہ انہوں نے فورٹ ولیم میں بے قصور، اور بے گناہ واجد علی شاہ کو قید کر دیا، ابتلا کا یہ دور، واجد علی شاہ نے بڑی استقامت کے ساتھ گزارا، واپس آئے، تو ایک ادبی تحفہ مثنوی حزن اختر بھی ساتھ لائے، اس مثنوی میں انہوں نے اپنی حیاتِ زنداں کا نقشہ کھینچا ہے، قلم مصوّر کا تو قلم معلوم ہوتا ہے، مولانا شرر اس مثنوی کا تعارف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

بادشاہ کی علمی استعداد بہت بڑھی ہوئی تھی۔ عربی کے تو عالم نہ تھے مگر فارسی میں ان کا درجہ شاید ابوالفضل سے کچھ کم ہی ہو گا میز پر بیٹھنے کی عادت نہ تھی اور نہ لکھنے کی قدیم نشست کی قید کو برداشت کر سکتے تھے لیٹ جاتے اور لکھنا شروع کر دیتے تو دم بھر میں دو دو چار بند کی نظمیں لکھ ڈالتے جو مشہور و نامور شاعرانِ فارسی کے کمال کو یاد دلا دیتیں۔

طبیعت اس قدر موزوں پائی تھی کہ شاید ایسا موزوں طبع نہ دیکھا گیا ہو گا میں نے اپنی آنکھ

سے دیکھا کہ اپنے دردولت سلطان خلنے سے بوچے پر سوار ہو کر امام باڑہ سبطین آباد کی مجلس میں شریک ہونے کے لئے روانہ ہوئے اور جو مرثیہ و سلام وہاں پڑھیں گے انھیں راستے میں تصنیف کر رہے ہیں ۔ دو کاتب ساتھ ساتھ چل رہے ہیں ایک کو مرثیہ کے بند تصنیف کر کے لکھواتے ہیں اور دوسرے کو سلام کے اشعار مرثیہ لکھنے والا جب تک مرثیے کا بتایا ہوا بند لکھے سلام لکھنے والے کو سلام کا شعر بتلاتے ہیں اور دونوں کو اس قدر جلد بتاتے جاتے ہیں کہ ایک کا بھی قلم رکنے نہیں پاتا ۔ امام باڑہ دو فرلانگ بھی نہ ہوگا مگر وہاں تک پہنچتے پہنچتے پورا سلام اور مرثیہ کے چھ بند لکھوا دیئے دو مختلف بحروں پر ایک ساتھ طبع آزمائی کرنا جس قدر دشوار امر ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو شعر کہنے کی مشکلوں سے واقف ہیں ۔

بادشاہ کبھی کسی سے اصلاح یا مشورہ نہ لیتے تعلیم و اصلاح کا زمانہ لکھنؤ ہی میں ختم ہو گیا تھا مٹیا برج میں وہ استاد الکل تھے ذہن میں یہ بات جمی ہوئی تھی کہ کلام الملوک ملوک الکلام جتنے شعرا ملازم تھے سب شاگرد سمجھے جاتے وہ شرف شاگردی حاصل کرنے کی درخواست کرتے بہ عنایت شاہی یہ عزت ان کو دی جاتی اور ایک مہر عطا ہوتی جس میں نام و خطاب کے ساتھ تلمیذ السلطان بھی کندہ ہوتے ۔

یہی استادی کلام میں لغزشوں کے رہ جانے کا باعث ہوتی اور قیامت یہ تھی کہ دربار والے چاہے کتنے ہی صاحب کمال شاعر ہوں بجائے تنبیہ کرنے کے لغزشوں پر بے حد داد دیتے لیکن اور جس قسم کی لغزش چاہے ہو جائے یہ ممکن نہ تھا کہ کبھی کوئی مصرعہ غیر موزوں رہ جائے یا بحر سے الگ ہو اور یہ ان کی کمال موزونی طبع کی دلیل ہے (۱)

مولانا شرر کے بیان کی روشنی میں، مثنوی کا پورا پس منظر واضح ہو جاتا ہے، یہ مثنوی

---

(۱) جان عالم ص۸۰-۱۸

اپنے درد و سوز کے اعتبار سے خلاصے کی چیز ہے، اس میں رفیقانِ گریز پا کا شکوہ ہے، ممنونِ کرم اور دیر بارِ احسان لوگوں کی شکایت ہے، عزیزوں، قرابت مندوں، جاں نثاروں، فداکاروں اور دعوائے محبت جتانے والوں کی بے وفائی، کورچشمی، نمک حرامی، غداری اور خود غرضی کی داستان ہے۔

واجد علی شاہ کو اپنی اولاد سے محبت تھی، اپنی محلات، یعنی بیگمات سے شیفتگی تھی، ان میں سے بعض وفادار ثابت ہوئیں، بعض بے وفا، اس مثنوی میں بے وفائی کا گلہ ہے اور وفاداری کی داد ہے۔ بعض بیگمات سے واجد علی شاہ کی شیفتگی عشق کے درجہ سے بھی آگے بڑھ گئی تھی، ان کا جب ذکر کرتے ہیں، تو قلم سے پھول جھڑنے لگتے ہیں، سادہ الفاظ میں وہ اثر وہ کیفیت وہ سحر پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے فصیح اللسان شعرا کے ہاں نہیں ملتا اس مثنوی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کہیں بناوٹ نہیں، تصنع نہیں نقالی نہیں، دل کی کیفیت بے کم و کاست بیان کر دی ہے، جی چاہے پسند کیجیے "جی چاہے ناپسند،

پہنچا تو ہوگا سمع مبارک میں حالِ مہر
اس پر بھی جی میں آئے تو دل کو لگائیے

مثنوی، تقریباً پندرہ سو اشعار پر مشتمل ہے، میں نے بے دردی سے انتخاب کر کے صرف تین سو اشعار لکھے ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد

خدائے زماں کارسازِ جہاں
عیاں مثلِ گل مثلِ بو ہے نہاں

نعت

ہے اعجاز اس شہ کا شق القمر
پڑا اس کا سکہ مہ و مہر پر
وہ ہے خاتم الانبیا نیک نام
علیہ الصلوٰۃ علیہ السلام

منقبت

سزا وار تاجِ نبیؐ ہے علیؑ
علیؑ ہے علیؑ ہے علیؑ ہے علیؑ
وہ ہے وارثِ علمِ خیر البشر
وہ ہے بادشاہ قضا و قدر
شجاع و دلیر و جری صف شکن
سخی و حلیم و غنی خوش سخن

ساقی نامہ و احوالِ ضعف در قید خانہ

پلا ساقیا وہ مے سرخ رنگ
کہ ہو نشہ سے جس کے دل کو اُمنگ
اکیلا ہے زنداں میں اک مے پرست
شب و روز ہے خوف روزِ الست
ہوا بھی جو آتی ہے تو سہم گین
نہ یاور نہ مونس نہ کوئی قرین
عیال اور اطفال تو سے گئے
جہاں میں مرے لال ٹوٹے گئے

در صفت کرنیل کونیا صاحب بہادر

وہ کرنیل صاحب پیہر ہنر
کہ ہن ٹون میجر وہ عالی گہر
ہوئیں ٹٹیاں خس کی مجھ کو نصیب
الٰہی جلیں غم سے اُس کے رقیب
ملا کرتی ہے برف بھی آٹھ سیر
یہ کیا جان جو ہووے ذرا اس میں دیر

صفت ضعف خود در قید خانہ

یہ احوالِ اعضا ہے جیسے کباب
نہ زلفوں میں بل ہے نہ وہ پیچ و تاب
نہ چہرہ کا وہ ڈھب نہ وہ دل کا حال
ہر ایک بال ہے جان و تن کو وبال
وہ پنجہ جو تھا پنجۂ شاہباز
شفیعہ کے خط کی طرح ہے دراز
بھرے بازو تھے جو مرے گول گول
بکیں تو نہیں اب وہ کوڑی کے مول
وہ شانے جو تھے آشیانِ ہما
نقاہت سے طوطوں کا ہے گھونسلا
لویں کانوں کی دونو مرجھا گئیں
گُلِ تر کی کلیاں تھیں کمہلا گئیں

وہ زانو جو رشکِ بدرِ منیر
تو وہ مر گئے غم سے نانِ شیر

در صفت بیت الخلاہائے قید خانہ

پھر اُس پر غضب چار سنڈاس ہیں
کہ مجھ دل جلے کے وہ سب پاس ہیں
طپش یہ جو ہوتی ہے برسات کی
یہ گھٹس جو ہوتی ہے ہر رات کی

در صفت حشرات الارض

وہ مچھر وہ مچھر غضب الامان
ہر ایک رونگٹے میں ہے جن کی زبان
اُٹھا ہاتھ مچھر ہلانے کو گر
چبھویا وہیں پہلے ہی نیشتر

تمہید

دلا ترک کر اپنے دل کا بیان
سُنا اپنی اوّل سے تو داستان
وہ قصّہ سُنا جو بہت ٹھیک ہو
ذرا بھی نہ پھر اس میں تشکیک ہو

شروع داستان و انتزاع سلطنت و ہجرت

یہ واجد علیؑ ابن امجد علیؑ
سُنانا ہے اب داستاں ہیچ کی

کہ جب دس برس سلطنت کو ہوئے
جو طبائع تھے بیدار سونے لگے
ہوا حکم جنرل گورنر بہ یار
کرو سلطنت کو خلا ایک بار
خجالت کا شاہ اودھ نام ہے
حکومت کا آخر یہ انجام ہے
جو وہ لارڈ ڈلہوزی اس وقت تھے
مضامین انھوں نے یہ خط میں لکھے
رعایا بہت تم سے ناراض ہے
تمھاری ریاست ہے بدنام سے
رزیڈنٹ جنرل اوٹرم جو تھے
گورنر کا خط مجھ کو وہ دے گئے
وہ لائے تھے اس طرح کی ساتھ فوج
کہ جس طرح آتی ہے دریا کی موج
یہ بندہ بہت ان دنوں تھا علیل
کہا دل نے کیا سوچوں اس کی سبیل
رعایا یہ سب کہتی تھی واہ واہ
گیا ہم کو اس بادشاہ نے تباہ
یہ جائے جو فریاد کو خوب ہے
یہ ناحق جو راضی ہو معیوب ہے

سبھوں کی بس آخر یہ ٹھہری صلاح
کرو چل کے فریاد ہے یہ فلاح
یہ جب سن لیں اوڑ رم سے میں نے کہا
میں جاؤں گا فریاد کو ہے خدا
انہوں نے کہا اس میں مختار ہو
عجب کیا ہے جو لطفِ سرکار ہو
لیا ساتھ ماں کو اور اک بھائی کو
نہ کچھ کام فرمایا خود رائی کو
ولی عہد کو بھی لیا ہاتھوں ہاتھ
ہوئی پانچ چھ بیبیاں میرے ساتھ
کیا بندے نے لکھنؤ سے سفر
لیا ساتھ تھوڑا سا کچھ ماحضر
دکھائی دیا ماہ شعباں کا جب
روانہ ہوئے واں سے با صد تعب
بنارس میں آ کر رہے چودہ روز
وہ راجہ کی کوٹھی میں ہم سینہ سوز
بہت پیش آیا اطاعت کے ساتھ
اتارا مجھے کوٹھی میں ہاتھوں ہاتھ
وہ مصروفِ خاطر ہوا اس قدر
فرشتہ بنا کہنے کو تھا بشر

دہاں پر دُخانی کیا اک جہاز
چڑھے اُس پہ جس دم ہوئے سرفراز
دکھائی دیا جب کہ ماہِ صیام
تو کلکتہ میں آئے اے نیک نام
طبیعت ہوئی یاں زیادہ علیل
نہ لنڈن میں جانے کی نکلی سبیل
غرض ماہ شوال جب آگیا
یہ بندہ علالت سے گھبرا گیا
جو تاریخ اس کی ہوئی چودھویں
کیا بیٹا ماں بھائی رخصت وہیں
کہ تم میری جانب سے لندن کو جاؤ
جو گذری ہے مجھ پر ملک کو سناؤ
برس گذرا ہم پر جو اے خوش سیر
یکایک جہاں میں اُڑی یہ خبر
ہوئی خوب برگشتہ انگریزی فوج
اُمنڈتی ہے جس طرح دریا کی موج
وہ صدا دی تب مجھ کو تھی الامان
سُلگتی تھی تالو کے اندر زبان
میں سوتا تھا غفلت کا جب جاگا ہوا
مقدر ادھر مجھ سے بھاگا ہوا

یکایک یہ غُل کان میں آگیا
غضب ہو گیا ہے ستم چھا گیا

آمدن فوج انگریزی بنا بر گرفتاری

اے دوستو! للّٰہ لوگو چلو
اُٹھاؤ اُٹھاؤ اُٹھاؤ چلو
کوئی کہتا ہے اب اُڑا دیں گے یہ
کہ سب سوچی کھولا گرا دیں گے یہ
کہا میں نے کیا شور و غوغا یہ ہے
یہ کون آیا ہے کیسا چرچا یہ ہے
سکتّر جو تھے لاٹ کے پیش کار
وہ کہنے لگے مجھ سے اے شہریار
کہ چلیئے مرے ساتھ یہ حکم ہے
نہ کیجئے سوا اس کے اب کوئی شے
کہا میں نے کیا وجہ فرمایئے؟
قصور آپ بندے کا بتلایئے؟
کہا حکم سرکار یہ ہے ہوا
کہ کچھ شبہ سرکار کو آ گیا
چلیں گے جو ہمراہ فرمایئے
جنھیں ساتھ لینا ہو بتلایئے
سوا آٹھ لوگوں کے ہو وے نہ اور
انھیں ناموں میں کیجئے آپ غور

میں ہر اک کے ظاہر کروں تجھ سے نام
مرے قید خانہ میں آئے جو کام

احوال طبیب الدّ و گریختنش از زنداں

مری نبض رکھتا تھا وہ ہاتھ میں
پھنسا وہ جواں بھی مرے ساتھ میں
عجب حال ہو ہو گیا اس کا ہائے
یہ اک دن وہ بولا خدا اب چھڑائے
بہت میں نے منت بھی کی اور کہا
مرے ساتھ سے ہو گا راضی خدا
برس بیس سے تجھ کو پالا ہے یار
نہ چھوڑ اب مرا ساتھ تو زینہار
نہ مانا مرا کوئی اُس نے کلام
روانہ ہُوا گھر کو وہ نیک نام

ذکر جمال الدین چپراسی

یہ چپراسی تھا اب ہوا جاں نثار
عجب ہے دورِ نگی لیل و نہار

شیخ امام علی حقّہ بردار

یہ ہے حُقّہ بردار میرا قدیم
ہوا جاں نثار اب بہ لطفِ کریم

حال ولی محمد بولدان بردار

اُٹھاتا تھا وہ بولداں لا کلام
ہوا ساتھ دے کر بہت نیک نام
وہ تھا توپ خانے میں میرے جواں
وہ تھا گولہ اندازوں میں خوش بیاں
ہوا میرے ہمراہ وہ بھی اسیر
بنا قید خانے میں وہ دستگیر

ذکر کریم بخش آب کش

دیا ساتھ سقّے نے تھا نیک کام
کرے گا جہاں اُس پہ تحسیں مدام

ذکر حاجی قادر بخش کمہار انگشت بردار

اک حاجی بھی قوم کا تھا کمہار
رہا ساتھ بندے کے لیل و نہار

ذکر امامی گاڑی پونچھ قدیم

وہ تھا گاڑی پونچھوں میں نوکر مرا
مرا ساتھ اِس قید میں بھی دیا

ذکر داروغہ راحت السلطان زن خاصہ بردار

وہ کھانا پکانے کو ہمراہ ہوئی
میرے ساتھ زنداں میں بھی وہ رہی

ذکر کربلائی آغا صاحب بردار ترکہ

گزری وہ مجھ کو کھلاتی تھی روز
یہ دل مجھ پہ رہتی ہے وہ سینہ سوز

ذکر محمدی خانم پوشاک دوز

دیا ساتھ اس مہ لقا نے مرا
یہ پوشاک دوزی میں ہے خوش نما

نقل محبت نامہ فرستادہ لاٹ کننگ

یہ مضموں تھا اُس میں سراسر لکھا
محل اب نہایت ہے افسوس کا
یہ مخلص بہت اس میں مجبور ہے
یہ سارے زمانے میں مشہور ہے
وہ مفسد جو پھرتے ہیں بے انصرام
وہ لیتے ہیں اس پاک طینت کا نام
یہ کونسل کی تجویز میں آگیا
کہ ممکن ہو چندے یہاں آپ کا
کریں آپ تبدیل چندے مکاں
کہ ہو بند یہ باب فتنہ یہاں
نہ آئے گا عزت میں حضرت کے فرق
رہے گی چمک بات میں مثلِ برق
جو کچھ حدِ امکان میں آئے گا
بحکم گورنر وہ مل جائے گا

احوال تبدیل شدن زندان

جو کوٹھی ہے اک قلعہ کے بیچ میں
یہ تجویز ٹھہری وہاں پر رہیں
غرض ہم کو لائے اٹھا کر یہاں
فلک الاماں الاماں الاماں -!
کوئی آنکھ ہم سے ملاتا نہیں
پرِ جانور تک بھی آتا نہیں

در صفت مجاہد الدولہ مرزا زین العابدین

پھپا میرے نواب والا حشم
نہایت ہیں محسن بڑے ذی کرم
یہ کہتے تھے وہ ہاتھ میں لے کے تیغ
نہیں تم سے جاں اپنی مجھ کو دریغ
اگر حکم ہو لالہ گوں رنگ ہو
کہا میں نے موقوف یہ ڈھنگ ہو

محمد معتمد علی خان بہادر امانت جنگ

دیانت بھی اس طرح سے تھا پہر
کہ جس طرح پروانہ ہو شمع پر

ذکر فتح الدولہ بہادر مرحوم بخشی الملک

ضعیفی میں تھا فتح دولہ کا حال
چراغِ سحر کی طرح تھے نڈھال

کہا میں نے ہر چند تم ہو ضعیف
نہ اُٹھے گا تم سے یہ بار عنیف
انھوں نے کہا میں تو ہوں جاں نثار
فدا تم پہ ہم ایسے ستّر ہزار

گفتار در انتقال نمودن فتح الدولہ بہادر

صفر کے مہینے میں وہ مر گئے
جو کہتے تھے منھ سے وہی کر گئے

ذکر مہتم الدولہ بہادر مصاحب راقم الحروف

وہ پروانہ آسا فدا مجھ پہ تھا
فدا دل سے وہ باوفا مجھ پہ تھا
یہی قول تھا جب تلک جان ہے
یہ بندہ فدا شہ پہ ہر آن ہے

گفتار در ذکر ذوالفقار الدولہ

وہ سالے ہیں میرے نہیں اس میں شک
مرے ساتھ ہیں قید خانہ تلک
فدا رہتے ہیں مجھ پہ پروانہ دار
نہ آیا کبھی اُن کے دل پہ غبار
مرے نام پر ہیں فدا جان سے
مجھے رکھتے ہیں وہ سوا جان سے

اجازت طلبیدن دیانت الدولہ برائے زیارت عتبات عالیات

دیانت کا دل جب کہ گھبرا گیا
تو قصدِ زیارت وہیں آ گیا
بہت رویا میں، میں نے رخصت کیا
مگر حکم کونسل نہ حاصل ہوا
نکلنے پہ ایسا تھا وہ لوٹ پوٹ
لکھے دیتا تھا مال و اسباب، دوٹ
نہ انگریزی میں وہ ہوا پر قبول
نکالا گیا مجھ کو کر کے ملول

ذکر دیوانہ ساختن مہتم الدولہ خود را

لگا کرنے بے فائدہ مار پیٹ
بنا ہا تھا پائی سے وہ خوب ڈھیٹ
بمجبوری اُس کو بھی رخصت کیا
رہے دونوں، اب موچی کھولے میں جا

حال جدا شدن کربلائی از زنداں

تھی اک کربلائی جوان چیار میں
وہ یہ جس طرح زہر ہو مار میں
لڑاکا غضب کی غضب تند خو
لڑا کرتی تھی سب سے ہر ایک سُو
خصوصاً سناتی تھیں باتیں مجھے
نہ کٹتی تھیں اِس غم سے راتیں مجھے

نکالو مجھے کہتی تھی بدتمیز
نہیں زن کسی کی نہ ہوں میں عزیز
یہاں تک ستایا نکالا اُسے
بلا تھی بلا میں نے ٹالا اُسے

آمدن یک سارجن میجر بدمست

یہ قیدی ہوا بند جب بے گناہ
تو کی پہرے والوں نے حالت تباہ
کہ اک صاحب آ کر زباں پہ یہ لائے
خداوند کلیے نہ وہ پھیر سکائے
جو کچھ جی میں آیا مجھے بک گئے
یہاں تک بکے آخرش تھک گئے
کبھی کہتے تھے یہ ہی راجہ ہے واہ
ارے یل کے اس کو کرو سب تباہ
مرے بابا اور میم مارے گئے
عزیز اس جگہ سے ہمارے گئے
کرو ایسے راجہ کی گردن حلال
بکھیڑا ہی جائے مٹے یہ وبال!
یہ بندہ تو سوتا رہا صبح تک
کلیجہ کیا اس کی باتوں سے یک

جو کچھ حادثے مجھ پر ہو ہو گئے
قلم کس زباں سے سنائے اُسے
جو یُیں پڑ گئیں ریش بھی ہے دراز
جفاؤں سے آتا نہیں چرخ باز

ذکر انتقال والدۂ مصنّف

کہ اک دفعتاً آیا لندن سے خط
لکھا غم کا مضمون تھا اس نمط
مری والدہ تھیں جو عفت مآب
وہ جنّت کو راہی ہوئی ہیں شتاب
لکھا تھا کہ بھائی نے بھی کی قضا
دہم اُس مہینے کی تھی بد بلا
یہ بیٹا، یہ بیٹا کہ غش کر گیا
یہ سمجھا کہ میں جیتے جی مر گیا
نویں کو یہ شعبان کی آیا خط
بھتیجی کا احوال تھا اس نمط
کہ وہ رافت آرا بھتیجی جو تھی
گئی سوئے دار البقا دل جلی
برس دن کا سن اس بھتیجی کا تھا
جو اُس دل جلی کا جنازہ اٹھا

تولّد شدن پسر مصنف

پھر اس قید خانہ میں پہنچی خبر
کہ اختر محل سے ہوا ہے پسر
اودھ کی وہ ہے ملکۂ نیک نام
وہ گل مثل طاؤس ہے خوش خرام
غضب کی ہے چتون غضب کی ہے چال
کہ ٹھوکر سے ہو کبک تک پائمال
گلِ گوشش خوشبو ہیں مثلِ چمن
نزاکت کا پُتلا ہے گل پیرہن
فدا لالۂ سرخ اُس لال پر
نضارت تصدّق ہر اک گال پر
سمن بر فدا عشوہ و ناز پر
پری کو ہے رشک اس کے انداز پر
دُر و لعل و گوہر ہیں دنداں نہیں
عجب تر یہی ہے زنخداں نہیں
جو شانے کہوں قمقمے نور کے
تو الماس سے ہاتھ ہیں حور کے
کمر ہے سرابِ رہِ کائنات
ہر اک بات ہے جس طرح ہو نبات
کرن مہرِ تاباں کی ہر گال ہے
ہر اک کہوں نہیں رستمِ زال ہے

جفا جو نہیں تند خو وہ نہیں
دہن اس طرح جس طرح انگبین
سرافراز ہے سرو قد سے نہال
وہ الھڑ پنے کی غضب بول چال
مگر جب سے وارد ہوئی قید آہ
مہینوں سے زنداں میں ہوں میں تباہ
نہیں حال معلوم کیا رنگ ہے
وہ ہیرے کا ٹکڑا ہے یا سنگ ہے
اسی مہ سے طالع ہوا یہ قمر
نہیں ہم کو صورت سے اس کی خبر
کہ گورا ہے یا سانولا رنگ ہے
وہ ماں پر ہے یا باپ کا ڈھنگ ہے

حال دیگر صاحبات محل مصنف وغیرہ

اسامی ہمراہیاں گمدقسم
جو لائے ہیں کلکتہ میں ساتھ ہم
زن و مرد اہلِ قلم اہلِ فوج
کہ ہو ایک چشمے کی جس طرح موج
کسی طرح تھے پانچ سو سے نہ کم
ملازم رفیق اور محل ذی حشم
ولی عہد کی ماں محل خاص ہیں
بلطف و مروت خوش اخلاص ہیں

دوم ملکۂ ملک عالی جناب
وہ جرنیل کی والدہ خوش خطاب
محل میں وہ معشوق اور رازدار
وہ سب محلوں میں ہیں بہت جانثار
کہ تاج النسا بھی ہے اس مہ کا نام
سلامت رہے وہ جہاں میں مدام
محل تیرا وہ میرا دلدار ہے
رفاقت کا بالکل سزادار ہے
ہے محبوبۂ خاص بھی اس کا نام
پری زاد ہے خندہ رو خوش کلام

جعفری بیگم

وہ ہے جعفری بیگم مہ لقا
خوش انداز نازک ادا خوش نما
لبِ سُرخ برگِ گلِ گلستان
صدف گوہرِ صاف کا ہے وہاں
وہ دندان تبسم میں دُرِّ عدن
وہ روئے گلِ تر ہے رشکِ چمن
شگوفہ کھلا ہے لبِ لعل کا
کہو گیسو مشک ختن ہے خطا
کریں نسر طائر کو آنکھیں شکار
کروں نظمِ فردوسی، رُخ پہ نثار

کمچیں اس طرح ابروؤں کی کماں
کہ کشتی کو حاضر ہیں دو پہلواں
حباب لب نہر ہیں چھاتیاں
بہم وصل میں لمسہ ہیں چھاتیاں
سخن کش ہے نازک ادا ماہرو
بڑی جنگ جو ہے غضب تند خو
قیامت ستم قہر ہر بات ہے
وہ شیریں دہن زہر ہر بات ہے
کھلنڈرا اپنا ہر سخن میں عیاں
وہ اچپل ہے چنچل ہے بانکی جواں
ذرا بھی نہیں ہے متانت کا نام
زباں ایسی جیسے کھنچی ہو حسام
سخن میں درشتی زباں سخت ہے
پئے عاشقِ نیم جاں سخت ہے
پھپھولا بنا ہے جگر ہجر میں
اُسے کچھ نہیں ہے خبر ہجر میں
گذری مقسّرہ جو زنداں میں کی
کئی مرتبہ آکے وہ رک گئی
کبھی کہتی ہے ہاتھ میں درد ہے
غرض مکر و حیلہ میں وہ فرد ہے

کبھی خوش ہے ہم سے کبھی بر خلاف
کبھی گرد آئینہ پر گاہ صاف
کبھی لکھنؤ کا وہ کرتی ہے قصد
کبھی کہتی ہے، ہے جنوں کھولو فصد
کبھی کہتی ہے کربلا جاؤں گی
بچھیوں گی نہ میں بر ملا جاؤں گی
کرائے کا وہ ڈھونڈتی ہے مکاں
کبھی کہتی ہے مجھکو بلوا دُیاں
ہزاروں پہ جب ہوتا ہے فیصلہ
تو پھر راضی ہوتی ہے وہ باوفا
کبھی چھ ہزار اور کبھی اک ہزار
وہ لیتی ہے مجھ سے ہر اک طرح یار
عجب مخمصے میں ہوں اس زن سے میں
ڈرا قید خانے میں رہزن سے میں
ملال اس کا آتا ہے ہر دم مجھے
نہ مجھ کو وہ اِس قید میں چھوڑ دے
تڑپ کر غم میں جاں جائے گی
وہ پچھتائے گی، سخت پچھتائے گی

حالِ خود

کبھی سر پہ رکھتا تھا میں کجکلاہ
اودھ کا کبھی میں ہی تھا بادشاہ!

ملازم مرے تھے کبھی سو ہزار
مرے حکم میں تھے پیادہ سوار
فقط سترہ سو تھے اہلِ قلم
طبیبوں کو کر پانچ سو تو رقم
فقط پندرہ سو تو تھے چوبدار
رعایا وغیرہ کا کیا ہے شمار
کروں ساٹھ ستر محل گر شمار
تو ہو جائے پھر یک قلم آشکار
اب اُن میں یہ ہیں پانچ چھ بیبیاں
جو کلکتہ میں ساتھ آئیں یہاں
ہوئے قید اِس طرح ہم بے گنہ
اسیروں میں ہوں نام ہے بادشہ
زن و مرد اٹھارہ اور اک یہ حال
شب و روز زنداں میں ہیں دل طپاں
ہر اک اپنے جینے سے بیزار ہے
ہر اک قیدِ غم میں گرفتار ہے
بہشتی جو آتا ہے اور خاکروب
وہ پہرے کی شدت سے ہے سینہ کوب
جو جاروب دیتا ہے وہ سینہ سوز
تو گورا بھی ہمراہ آتا ہے روز

بہشتی کا یہ حال تحریر ہے
وہ جس طرح بے نقش تصویر ہے
کبھی روشنی نا لالا ئے جو نیل
تو دیتا ہے گورا اُسے بھی دھکیل
اور اک ہربرٹ صاحب خوش بیاں
سحر شام ہوتے ہیں جلوہ کناں
وہ میجر ہیں کرتیں کے پیش دست
وہ کرتے ہیں زنداں کا خود بند و بست
وہ گنتے ہیں خود آ کے شام و سحر
جو بیمار ہو، لیتے ہیں وہ خبر
ہے اک اور دار و غہ زندان کا
کہ کاگن ہے نام اس نگہبان کا
کئی خط گئے لاٹ کو بھی رقم
ہوئے سرفراز ایک سے بھی نہ ہم
کسی خط کا لکھا نہ ہم کو جواب
خدا جانے کس امر پہ ہے عتاب
منگائی نوشتہ جو منشی کے ہاتھ
تو آتا ہے کرتیں صاحب کے ہاتھ
بلائے خدا مجھ کو اولاد سے
چھڑائے مجھے قید بیداد سے

صبیہ پسر میرے نیرہ تھے سب
جنھیں چھوڑ کر قید میں ہوں میں اب
پسر آٹھ تھے پانچ تھیں بیٹیاں
کروں اب میں تفصیل اُن کی بیاں
پسر تھا بڑا سب سے نوشیرواں
کہ وہ لکھنؤ میں رہا تھا وہاں
مگر حکم اللہ جو ہو گیا
وہ مجنوں صفت تھا نہیں شک ذرا

ولی عہد کیواں قدر مرزا محمد حامد علی

وہ ذی علم صاحب ہنر ماہ ہے
وہ الیق ہے بارتبہ وجاہ ہے
صبیہ جو ہے میری ہمشیر کی
ہوا اُس سے عقد مہ و مشتری
مؤخر کرو بادشہ سے بہ
تو ہو نام اس ماہ کا ہو بہو

فریدوں قدر جرنیل صاحب مرزا ہزبر علی

کروں تیسرے اب پسر کا بیاں
وہ ہے شاہزادہ مرے ساتھ یاں
وہ ہے سترہ سال کا مہ لقا
خدا نے اُسے حسن ذاتی دیا

برجیس قدر

جو وہ چوتھا شہزادہ ہے رشک بدر
اسے لوگ کہتے ہیں برجیس قدر
وہ چودہ برس کا ہے کچھ شک نہیں
کہوں کیا کہ وہ ہے کہیں کا کہیں
ملاؤں جو حضرت سے لفظ محل
تو نام اُس کی ماں کا کھلے برمحل
جو بگڑی تھی آگے سے انگریزی فوج
اُسے لے گئی جیسے دریا کی موج
وہ مہ قبضۂ مفسداں میں ہے آہ
بنایا ہے اپنا اُسے بادشاہ

مرزا قمر قدر محمد عابد علی

قمر قدر مرزا ہے اب پانچواں
قمر پر مقدم ہے مرزا یہاں
برس سات کا سِن ہے اُس کا عزیز
وہ ہے لکھنؤ میں سراپا تمیز

مرزا آسمان جاہ بہادر

پسر اب چھٹا آسماں جاہ ہے
نہ بن ماں کا ہے اب مرے ساتھ ہے
پسر کو بھی چھوڑا روانہ ہوئی
جو بھاگی رواں سوئے خانہ ہوئی

نہ میں نے بلایا نہ پھر آئی وہ
نکل کر مرے گھر سے پچھتائی وہ

قمر احسن مرزا طال عمرہ

بعصمت رکھے اُس کو پروردگار
میں آنکھوں سے دیکھوں ولد کی بہار
برس چار کا ہے وہ مہ شک نہیں
قمر چہر مہتاب خور مہ جبیں

چھوٹے مرزا

لکھ اب آٹھویں شاہزادے کا حال
وہ ہے چھوٹے مرزا حسیں نونہال
وہ اختر محل سے ہے پیدا ہوا
وہ کلکتے میں ہے ہویدا ہوا
بیاں شاہزادوں کا اب ہے تمام
صبیتوں کا لکھ حال اے نیک نام

ذکر شہزادی کلاں مسمات بہ سپہر آرا

سُن اب اُس کا سن بھی تو اے خوشخصال
کہ گذرے ہیں اب سن کے اٹھارہ سال
سلیماں محل والدہ خوش خرام
تو ہے عظمۃ الدولہ شوہر کا نام
سپہر آرا ہے نام اس ماہ کا
تو ہے کبریٰ بیگم بھی وہ مہ لقا

ذکر شہزادی مسمات سپہر آرا

وہ خاقاں محل کی ہے دختر پری
وہ مہ پارہ ہے چار سالہ ابھی
خدایا سلامت رہے شہر میں
مع والدہ ہو وہ اس دہر میں

نواب شہر بانو بیگم صاحبہ

سوم تخت آرا تھی ماہ تمام
لکھوں شہر بانو تو ہو اس کا نام
وہ تھی لکھنؤ میں مع والدہ
سنا اب گئی سوئے ملک بقا

نواب رقیہ بیگم صاحبہ

برس تین کی یہ بھی تھی نیک ذات
ابھی منھ سے کرتی نہ تھی ایک بات
سنا یہ عدم کو گئی رشک ماہ
خبر یہ ملی ہے مجھے آہ آہ

ویہیم آرا

لکھ اب پانچویں شاہ زادی کا نام
سنا ذکر اس کا تو کر اب کلام
جو ویہیم آرا لکھوں اے جواں
تو ہو بنت سلطاں لقب پھر عیاں

ہوا والدہ کا مسگر انتقال
اُسے پرورش کرتے ہیں عم و خال
ملا مجھ کو یارب تو اولاد سے
چھڑا پھر مجھے قید بیداد سے
میں ہوں بے گنہ اِس جگہ قید و بند
مجھے قلعہ میں خوب پہنچی گزند
نہ غمخوار کوئی نہ ہے رازدار
اُڑے جاتے ہیں ہوش و صبر و قرار

آمدن عرضداشت داروغہ واجد علی داروغہ ڈیوڑھی

یہ اِک دن کا ذکر سُن رکھ ذرا
کہ کرنیل صاحب نے اِک خط دیا
وہ تھا بند اُس پر لفافہ تھا بند
نہ پہنچی تھی کھلنے سے اُس پر گزند
مرا ایک ہمنام داروغہ تھا
وطن سے یہ خط اُس نے مجھ کو لکھا

مضمون عرضداشت واجد علی

یہ مضموں تھا سلطاں سلامت رہے
جہاں میں یہ رشتہ باکرامت رہے
ہر اک شاہزادہ ہے در در تباہ
نہ ہے تن پہ کپڑا نہ کھانا ہے آہ

وہ پھرتی ہیں دَر دَر ہر اک شہر میں
وہ بہہ بہہ گئیں فوج کی لہر میں
کمشنر کے یاں گر لکھیں آپ خط
تو میں جمع کر دوں گا سب ہر نمط
یہ ذمّہ مرا ہے کہ ہوں جمع سب
کہ پھرتی ہیں فاقہ سے وہ ہے غضب
لکھیں آپ ہیں سب محل بے گناہ
نہ ناحق ہوئے اس کشش میں تباہ
مگر کل کے دن ان کا اسباب سب
گیا کوتوالی میں ہے بے سبب

حالِ بے وفائی نواب خجستہ محل

عجب ہے یہ نیرنگ دنیائے دول
زبوں ہے زبوں ہے زبوں ہے زبوں
خجستہ محل تھی جو زوجہ مری
وہ ذیقعدہ کی بارہویں کو گئی
روانہ ہوئی موچی کھولے سے وہ
سُبک نکلی الفت کے تولے سے وہ
وہ تھی پندرہ سال سے میرے پاس
مری قید سے وہ ہو گئی ہے اُداس
نہیں بلکہ لڑ کر وہ راہی ہوئی
مری جان و دل کو تباہی ہوئی

یہاں سو روپے کی تھی تنخواہ دار
نہ آیا مگر میرے گھر میں قرار
مہینہ ریاست میں ڈھائی ہزار
مِلا کرتا تھا شک نہیں زینہار
سماجت بھی کی میں نے منت بھی کی
محبت بھی کی اور اطاعت بھی کی
مگر کچھ نہ سمجھی ہمارا پیام
نکل کر کیا ہم کو کیا نیک نام
یہ دُنیا کی ہے بے وفائی کا طور
ذرا کیجیے خود تماشائی پہ غور
بُرے وقت میں کام آتی نہیں
مصیبت میں صورت دکھاتی نہیں

بیوفائی چند صاحبانِ محفل و رقیب

سرِ نوکِ خامہ چٹک رنج سے
نکل مار قارون ذرا گنج سے
مہک اے گُلِ خامۂ وصفِ یار
دکھا طبعِ رنگیں کی جلدی بہار
بجا سازِ غم ہجرِ دلدار میں
سُنا نغمہ حزن افکار میں
چمک برقِ دل مثلِ تیغ الم
اُبل بحرِ مستی نہ کر رنج و غم

ذرا تو محبت سے سنبھلے یہ دل
ہوا قیدخانہ میں تن مضمحل
یہ وہ جا ہے جس جا سے بھاگے شعور
یہ وہ جا ہے بھاگے ہنر دُور دُور
یہ وہ جا ہے عاقل کو ناداں کرے
یہ عالم کو طفلِ دبستاں کرے
نہ دینا ہے گر دل میں رنج و محن
سُنا قصۂ بے وفائیٔ زن
وہ معشوق و دلدار اختر محل
وہ جعفر وہ قیصر سُن اے خوش عمل
یہ سب میری ہیں زوجہ ہائے حسیں
نہیں شک نہیں شک نہیں شک نہیں
طبیعت بہت مری گھبرائی جب
کیا پائے قیصر کا چھلّا طلب
منگائی پھر اک شئے یہ اِک یار سے
مئیِ شب آلو وہ دلدار سے
یہ اختر محل سے کہا اے قمر
ذرا بھیجدے اپنے کچھ موئے سر
کسی کی نہ مجھ پہ عنایت ہوئی
کسی کی نہ زنداں میں چاہت ہوئی

نہ بھیجی کسی نے مجھے کوئی چیز
کسی نے نہ کی دوستی کی تمیز
مگر ہاں اک اختر محل ہے لئیق
وہ زنداں میں میری ہوئی ہے رفیق
وہیں موسے سر مجھ کو بھجوا دئے
بنا جس طرح مجھ کو پہنچا دیئے

گفتار در صرف زر خود بہ زنداں

یہ اختر جو ہے خاکپائے جہاں
یہ شاہِ اودھ تھا کبھی اے جواں
مگر اب ہے محبوس اہلِ فرنگ
طبیعت سے جاتی رہی ہے اُمنگ
کہ برسوں مجھے قید میں ہو گئے
مرے بخت بیدار سو سو گئے
ابھی تک رہائی کی صورت نہیں
وہ دولت نہیں ہے وہ ثروت نہیں
نہیں پوچھی جاتی خطا بے خطا
بہت تنگ اس جا یہ ہے دل مرا
جو تاریخ تک آج کی اُٹھ چکا
وہ سب مثلِ اخبار میں نے لکھا
یہ بخشش نہیں ہے، عنایت نہیں
بھلا اُٹھتا ہے بار بخشش کہیں

"فعلِ محمود"

تاریخ انقلاب کا ایک گُم شدہ ورق

اس میں کوئی شبہ نہیں، سرسیّد اپنی قوم کے دوست تھے۔ اپنے ملک کے بہی خواہ تھے۔ اپنے مذہب کے معتقد تھے۔ ان میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک زعیم اور قائد میں ہونی چاہئیں۔ ان میں وہ تمام جوہر تھے، جو ایک سیاست داں کے لئے ضروری اور لازمی ہیں۔ ان کی زندگی بے داغ ہے۔ زندگی کی آخری سانس تک وہ اپنی ملّت کی بے لوث خدمت کرتے رہے۔ اگر سرسیّد نہ ہوتے تو غدر کے بعد مسلمان برباد ہو جاتے، مٹ جاتے، اُن کا کہیں نشان نہ ملتا وہ سرسیّد ہی تھے جنھوں نے اپنے اثر، رسوخ اور خدماتِ جلیلہ کے باعث مسلمانوں کو ذلّت و رسوائی اور تباہی و بربادی سے بچایا۔

لیکن اِن خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی تسلیم کرنا پڑے گی کہ سرسیّد انگریزوں سے، اُن کی سیاست سے، ان کی حاکمیت سے اور اُن کے جاہ و جلال سے بُری طرح مرعوب و متاثر تھے۔ وہ اس کا تصوّر

بھی نہیں کر سکتے تھے کہ جن لوگوں نے انگریزی اثر و اقتدار ختم کرنے کے لئے جان کی بازی لگائی، گردنیں کٹائیں۔ مال و اسباب نیلام کرایا، املاک و جاگیر ضبط کرائی۔ قید و بند کی سختیاں سہیں، دار و رسن کا افسانہ پارینہ تازہ کیا۔ وہ کسی درجے میں بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ انھیں اپنے نقطۂ نظر کی حیثیت پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ عقیدہ، اور مذہب بن گیا تھا۔ مجاہدوں اور سرفروشوں کے نقطۂ نظر سے اتنا شدید اختلاف تھا کہ وہ اُن کی نگاہ میں کفرِ جلی کی حیثیت رکھتا تھا اور اس جرم کو وہ کسی قیمت پر معاف کرنے کو تیار نہیں تھے۔

نواب محمود خاں نے برطانوی سامراج سے بڑی شاندار ٹکر لی۔ تمام انگریز اور غیر مسلم مؤرخ اُن کی شجاعت، دلیری اور جذبہ کار کے اختلافِ خیال کے باوجود معترف ہیں۔ لیکن سرسید اُن سے اتنے خفا ہیں کہ شائستہ اور مہذب الفاظ میں اُن کا ذکر تک گوارا نہیں کرتے۔ انہوں نے "تاریخ سرکشی بجنور" میں واقعات کی جو تصویر اپنے مشاہدہ کی بنا پر درج کی ہے اس کے کچھ اجزا ہم پیش کرتے ہیں۔ یہ کتاب اب بالکل نایاب ہے۔ سرسید کی اس تحریر سے اندازہ ہوگا کہ مجاہدینِ ملت کی کیا وقعت برطانوی سامراج کے مددگاروں کی نظر میں تھی؟

خدا سے دعا | اپنی تاریخ لکھنے سے پہلے سر سید خدائے بزرگ و برتر سے دعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

الٰہی تو مجھ کو توفیق دے کہ یہ تاریخ میری پوری ہو اور صحیح بات اس میں لکھنے کی ہدایت کر کیونکہ طرفداری کی تاریخ لکھنی ایسی بے ایمانی ہے کہ اس کا اثر ہمیشہ رہتا ہے اور اس کا وبال قیامت تک مصنف کی گردن پر رہتا ہے۔ اس تاریخ میں جو کچھ لکھا ہے بہت سا اس میں میری آنکھ کا دیکھا ہے اور بہت سا اپنے ہاتھ کا کیا ہوا اور اس کے سوا جو کچھ لکھا ہے۔ وہ نہایت تحقیقات سے اور بہت صحیح اور نہایت صحیح لکھا ہے۔

عمال سرکار کی کیفیت | پھر آگے چل کر سر سید بجنور، دھام پور، نگینہ اور نجیب آباد وغیرہ کے سرکاری عمال کی کیفیت لکھتے ہیں کہ ان کا نامۂ اعمال کیسا رہا۔

تحصیلداران

میر سید تراب علی تحصیلدار بجنور	بہ نیک نامی اپنے کام پر بحال ہوئے
سید قاسم علی تحصیلدار چاند پور	" " " "
صادق علی خاں تحصیلدار دھام پور	غیر حاضر
سید قادر علی تحصیلدار نگینہ	بدستور بحال ہوئے
احمد اللہ خاں بھانجہ محمود خاں تحصیلدار نجیب آباد	باغی

پیشکاران

میر مراد علی پیشکار بجنور	باغی
سعد اللہ خاں پٹھان پیشکار چاند پور	باغی
میر شہادت علی پیشکار نگینہ	بہ سبب غیر حاضری برخاست
کریم اللہ خان پیشکار رشتہ مند محمود خاں دھام پور	باغی

مادھو لعل پیشکار نجیب آباد		بحال

عملہ خزانہ

بانکے لال پسر لالہ متھرا داس خزانچی صدر		بحال
بشن لعل	گماشتہ	"
سدا سکھ	"	"
بہاری لعل	"	"
بخشی رام تحویلدار تحصیل بجنور		خیر خواہ رہا اور بحال ہوا
گرداری مل تحویلدار تحصیل چاند پور		بحال
سیدہو مل تحویلدار تحصیل نگینہ		"
منگل سین تحویلدار تحصیل دھام پور		"
شب لعل تحویلدار نجیب آباد		"

محکمہ کلکٹری

میر امام بخش	سر رشتہ دار	دائم الحبس
مظہر اللہ	نائب سر رشتہ دار	روبکار نویسی پر بحال ہوا
درگا پرشاد	محافظ دربار	سر رشتہ کلکٹری ہوا
بہاری لعل	ناظر	بحال
محمد علی پیشکار شیرکوٹ		"

عملہ فوجداری

منشی امر سنگھ	سر رشتہ دار	بحال
لالہ ہر سہائے نائب	"	"
منشی دوعر	محافظ دفتر	"

پنڈت شمبھوناتھ ناظر		بحال

تھانہ داران

حسن رضا خاں تھانہ دار بجنور		غیر حاضر
گلاب سنگھ	تھانہ دار چاندپور	بحال
بدھ سنگھ	" دھام پور	"
سردار سنگھ	کوتوال نجیب آباد	"
لطافت علی	تھانہ دار منڈاور	"
رتن سنگھ	قائمقام تھانہ دار ناگل	غیر حاضر
گنگا پرشاد	تھانیدار بڈھ پورہ	تھانہ سیوہارہ میں بحال
محمد حسین خاں	" افضل گڈھ	تھانہ نگینہ میں بحال
پربھولال	" سیوہارہ	تھانہ افضل گڈھ میں بحال
منیر الدین قائمقام تھانہ دار نگینہ		برخاست

جمعدار نمبر اول

بھولاناتھ	جمعدار نورپور	بحال
لطف علی	" کوٹ قادر	غیر حاضر
چھیدالال	" کیرت پور	برخاست
عبداللہ خان	"	پھانسی پایا
راحت تقی	" ہلدور	ماخوذ

فیل خانہ

سوہن لعل	داروغہ	بحال
رام سروپ	جمعدار	باغی

سررشتہ تعلیم

پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر	تحصیلدار دھام پور ہو
احسان علی سب ڈپٹی انسپکٹر تحصیل بجنور چاند پور	بحال
رحیم اللہ سب ڈپٹی انسپکٹر تحصیل نگینہ و دھام پور	تحقیقات طلب

سرسید کی اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو ملازمین سرکار ۹۹ فیصد "وفادار" رہے اور غدر کے بعد اپنی خدمات پر بحال کیے گئے، مسلمان عمال سرکار میں ۹۹ فیصد لوگ باغی یا مشکوک قرار پائے، لہٰذا یا انہوں نے پھانسی پائی، یا ماخوذ ہوئے، یا کم از کم برخاست کر دیئے گئے۔ وہ مزید لکھتے ہیں:۔

نگینہ لوٹا گیا

"۲۰ مئی کو نگینہ میں مرادآباد کا فیل خانہ ٹوٹنے کی خبر پہنچی اور نگینہ میں بدمعاشوں کی نیت بد ہوئی اور بازار نگینہ کا بند ہونا شروع ہوا۔ مولوی قادر علی تحصیلدار نگینہ نے اپنے چپراسیوں اور منیر الدین قائم مقام تھانہ دار کو لے کر بازار کا گشت کیا اور دوکانیں کھلوا دیں اور سب کی تسلی و تشفی کی اور سب ہندو مسلمان رئیسوں کو بلا کر ہوشیار رہنا اور اپنے اپنے محلہ کا بندوبست رکھنے کی فہمائش کی۔ نہایت تعجب ہے کہ اکیسویں تاریخ مئی کو گیارہ بجے منیر الدین قائم مقام تھانیدار نے مولوی قادر علی تحصیلدار کو بجنور کی خبر سنائی، اس خبر سے مولوی قادر علی کو زیادہ تردد ہوا کہ کل مرادآباد کے فیل خانہ ٹوٹنے کی خبر پر نگینہ میں جب یہ فساد برپا ہوا تھا تو اب بجنور کی خبر پہنچنے پر دیکھیے کیا فساد ہوتا ہے اس لئے چپراسیان تحصیل کو کہا کہ کمر باندھ کر مستعد رہو اور دروازہ تحصیل بند تھا اور کھڑکی کھلی ہوئی تھی مگر تحصیلدار صاحب کو تلنگوں کی کچھ خبر نہ تھی۔ سنا گیا کہ بعد گفتگو نواب کے تلنگوں نے آپس میں مشورہ کیا کو بغیر نگینہ کے جلے آنا ٹھیک فساد کرنا مناسب نہیں اس لئے انہوں نے ارادہ مرادآباد جانے کا کیا اور نجیب آباد سے روانہ ہو چکے تھے کہ دفعتاً تین تلنگے براہ کھڑکی تحصیل میں چلے آئے اور تحصیلدار صاحب سے کہا کہ روپیہ تیار رکھو اس عرصہ میں بہت سے تلنگے اندر گھس گئے اور تحصیلدار صاحب کو گھیر لیا اور سنگین چڑھا کر بندوقوں کو پایوں پر چڑھایا اور بجبر ان کو کچہری کے مکان میں لے گئے اور خزانہ کے صندوقوں کو کندوں سے توڑ ڈالا اور پھر خزانہ کے قفل کو توڑ کر خزانہ لوٹنے لگے اس وقت تحصیلدار

صاحب کو فرصت ملی اور وہاں سے مع تھانہ دار بھاگ کر ایک مکان میں جا چھپے جب تلنگے تلاش میں پڑے تو وہ شہر میں جاکر اور رستے سے شہر میں آئے ایک جگہ پوشیدہ ہو گئے اور عرضی اطلاعی بہ حضور جناب صاحب کلکٹر بہادر روانہ کی، شہر کے بہت سے بدمعاش ان تلنگوں کے ساتھ ہو گئے اور تحصیلدار صاحب کا اسباب لوٹ لیا اور بازار نگینہ کو لوٹتے ہوئے چلے گئے اور بدمعاشوں نے بجاگیرتہ ملّاں کو بھی جو بہت مالدار آدمی تھا لوٹ لیا جب سب تلنگے شہر سے چلے گئے تو تحصیلدار صاحب نے نگینہ کے ہندو مسلمان رئیسوں کو جمع کیا اور جو بدمعاش شہر میں غدر مچا رہے تھے ان کا بندوبست فہمائش متوسط رئیسان نگینہ کر دیا!"

لیکن اب غدر کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا، اور فہمائش و افہام و تفہیم کے حدود سے معاملہ گزر چکا تھا، ایک مصیبت ختم ہوتی تھی کہ دوسری نمودار ہو جاتی تھی:۔

بجنور کا جیل خانہ ٹوٹنا

"نگینہ میں تو یہ آفت ہو رہی تھی اور ہم تینوں افسر بجنور میں بحضور جناب صاحب کلکٹر بہادر حاضر تھے اور درباب حفاظت خزانہ گفتگو ہو رہی تھی کیونکہ خبر یورش گنواران اور آمد آمد پلٹن گرم تھی یہ رائے قرار پائی تھی کہ کل خزانہ کنوئیں میں ڈال دیا جائے۔ ہم اس تجویز میں تھے کہ ایک بجے سے کچھ قبل دفعتاً جیلخانہ پر بندوق فیر ہونے کی آواز ہوئی اور معلوم ہوا کہ جیل خانہ ٹوٹ گیا جناب صاحب کلکٹر بہادر اور میں صدر امین اور ڈپٹی کلکٹر صاحب اور سید تراب علی تحصیلدار صاحب بندوقیں اور تلواریں لے کر جیل خانہ پر چلے اور جس طرف قیدیوں کے غول جانے کا احتمال تھا اس طرف دوڑے۔ قریب آدھے میل دوڑے ہوں گے کہ اس وقت یہ خیال گزرا کہ خزانہ نہ لٹ جاوے اس لئے جناب صاحب کلکٹر بہادر نے مجھ صدر امین کو اور ڈپٹی کلکٹر صاحب کو حکم دیا کہ خزانہ پر جا کر وہاں کا انتظام کرو چنانچہ ہم دونوں خزانہ پر واپس آئے اور فی الفور پہرہ اور پکٹ قائم کئے اور جناب صاحب کلکٹر بہادر اور سید تراب علی تحصیلدار جیل خانہ پر تشریف لے گئے اتنے میں جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر مسلح گھوڑے پر تشریف لائے اور کنجی خزانہ کی مجھ صدر امین کو سپرد کر کے خود مع چند سواران تعاقب قیدیان فرمایا۔ ہم کو یقین تھا کہ جیلخانہ صرف اس غرض سے ٹوٹا ہے کہ قیدی اور شہر کے بدمعاش جمع ہو کر خزانہ پر حملہ کریں گے مگر

قیدیوں نے جیلخانہ سے نکل کر دریا کی طرف بھاگنا شروع کیا سب کے منھ دریا کی طرف تھے اور بھاگے جاتے تھے اس سبب سے قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ ہمارا خیال غلط تھا پایہ کہ جب قیدیوں نے جناب کلکٹر بہادر کو اور جناب جارج پامر صاحب بہادر کو مستعد تعاقب تیار ہوا دیکھا تو ان کو اس فاسد ارادہ کا پتہ نہ ملا غرض کہ سپاہیوں کی بندوق سے چند قیدی مارے گئے اور جناب صاحب کلکٹر بہادر خزانہ پر تشریف لائے اور فی الفور خزانہ نکالا گیا اور محمد صدر امین نے اپنے ہاتھ سے ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ کنوئیں میں ڈال دیا اور جناب مسٹر پامر صاحب بہادر نے گنگا تک قیدیوں کا تعاقب کیا۔"

نامحمود خاں کی آمد

سرسید نے محمود خاں کا نام "نامحمود خاں" رکھا تھا اب ذرا اس کی ایک جھلک بھی دیکھ لیجیے۔

"اس واقعہ سے پہلے جناب صاحب کلکٹر بہادر نے جملہ رئیسان ضلع کو بجنور میں طلب کیا تھا کہ مدد کمک کے واسطے انتظام ضلع حاضر ہوں زیادہ تعجب کی یہ بات ہے کہ اسی روز شام کے قریب نامحمود خاں نجیب آباد سے معہ ساٹھ ستر آدمی پٹھان بندوقچی کے بجنور میں پہنچا ظاہر میں تو یہ شبہ یہ بات بھی کہ حسب الطلب آیا ہے۔ مگر تعجب یہ کہ اپنے ساتھ خالی گاڑیاں واسطے لیجانے خزانے کے نجیب آباد کو لایا تھا اور جب ڈپٹی صاحب کو ملا تو نہایت افسوس سے ہاتھ مل کر کہا کہ کیا غضب کیا جو خزانہ کنوئیں میں ڈال دیا۔ میں تو گاڑیاں واسطے لیجانے نجیب آباد کے لایا تھا۔"

ہندو رؤسا متذبذب تھے

وہاں کے ہندوؤں نے اگرچہ اس جنگ آزادی میں مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیا لیکن انگریزوں کی مدد سے بھی کتراتے رہے وہ چاہتے تھے جب کوئی متعین صورت پیدا ہو جائے تب میدان میں آئیں۔

"رئیسان جو کمک کو بلائے گئے تھے ان میں سے بدنصیب نامحمود خاں تو پہلے آچکا تھا اس کے دوسرے دن چودھری رندھیر سنگھ صاحب رئیس ہلدور آیا اور اس کے بعد چودھری پرتاپ سنگھ صاحب رئیس تاجپور تشریف لائے تھے اور صرف پانچ پانچ سوار کمک کو دیتے اور کچھ پیادے بھی ان کے ساتھ تھے اور

احاطہ کوٹھی جناب صاحب کلکٹر بہادر میں مقیم ہوئے تھے مگر یہ قلیل کمک اس بڑے فساد کو رفع نہیں کرسکتی تھی افسوس ہے کہ ان رئیسوں میں سے کسی نے توپ کے موجود ہونے سے انکار نہ کیا۔ اگر اس وقت دونوں توپیں ہمارے ہاتھ آجاتیں جیسا کہ ہمارے بعد ضلع میں نکلیں اور اچھی طرح ہماری ہوتیں تو کیا عجب ہے کہ برخلاف ان حالات کے جو اب پیش آئے اور کوئی صورت ضلع میں پیدا ہو جاتی بھوپ سنگھ تعلقہ دار بڈہ پور باوصف طلب کے بحضور جناب صاحب کلکٹر بہادر حاضر نہیں ہوا اور نہ کچھ مدد دی، نا محمود خاں جو حاضر تھا اپنے آنے کے بارہ گھنٹے کے بعد بہت بے قرار تھا وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح میں نجیب آباد چلا جاؤں اور طرح طرح کے عذر بجنور کے رہنے میں پیش کرتا تھا مگر ہم کو اس وقت تک چنداں شبہ اس پر نہ تھا ہم اس کے جھوٹے عذروں کو سچا سمجھتے تھے اور ہر طرح سے اس کی خاطر کرتے تھے کہ بجنور میں مقیم رہے کیونکہ ہم کو اس سے بڑی توقع کمک کی تھی۔ مگر ہم خیال کرسکتے ہیں کہ یہ بے قراری اس کی صرف اس سبب سے ہوگی کہ بجنور میں اس کا منصوبہ پورا نہ ہوا تھا۔ یعنی تلنگے آئے تھے اور نہ خزانہ لے جانے کا اس کو قابو ملا تھا اس لئے وہ گھبراتا تھا اور چاہتا تھا کہ بجنور سے نجیب آباد جاکر اور کوئی نیا منصوبہ کرے غرضیکہ دو روز بہ مشکل ٹھہرا اور پھر نجیب آباد چلا گیا۔"

محمود خاں کی بجنور میں دوبارہ آمد

محمود خاں کچھ عرصہ کے بعد پھر بجنور آتا ہے۔

"نا محمود خاں باوجودیکہ پہلی دفعہ ہرگز بجنور میں رہنا نہ چاہتا تھا اب کی دفعہ بلا طلب جناب صاحب کلکٹر بہادر کے نجیب آباد سے بجنور کو آنا خالی شبہ سے نہ تھا۔ چنانچہ یکم جون کو وہ بجنور میں پہنچا اور احاطہ کوٹھی جناب صاحب کلکٹر بہادر میں اس نے ڈیرہ کیا۔ اب کی دفعہ علامتیں بغاوت کی اس کے چہرہ سے ظاہر تھیں اور وہ اپنے دل کو اپنی حکومت کے خیال سے خوش کرتا تھا اور اس کے عشق میں چور تھا۔ ڈپٹی صاحب کے سامنے ایسی باتیں کیں جس سے صاف ارادہ فاسد اس کا ظاہر ہوتا تھا۔ ڈپٹی صاحب نے مجھ کو بلا کر نا محمود خاں کی خاصد نیت سے مطلع کیا میں نے کہا کہ فی الفور جملہ حال جناب صاحب کلکٹر بہادر سے عرض کرنا چاہیئے۔

چنانچہ اس کی باتوں سے جو فساد اس کی نیت کا ہم کو معلوم ہوا تھا ہم نے جناب صاحب کلکٹر بہادر سے عرض کیا اور یہ تجویز ہوئی کہ تا محمود خاں کو بجنور سے رخصت کیا جاوے اب اس کا جانا مشکل معلوم ہوتا تھا بہ حکمت اس کو بہ بہانہ دورہ پرگنہ چاند پور روانہ کیا مگر وہ مچلیتا ہوا دارانگر کو چلا گیا۔

انگریزوں نے گاؤں اور دیہات جلا دیئے

"یکم جون کو خبر ملی کہ موضع فضل پور میں گنواروں نے لام باندھا ہے۔ جناب صاحب ممدوح نے بیس تیس تلنگے اور بیس سوار اور میر سید تراب علی تحصیلدار بجنور اور میر لطافت علی تھانہ دار منڈاور کو ساتھ لیا اور میر محمود علی پیش کار اور تخمیناً ایک ہزار آدمی ساکنان منڈاور بھی ساتھ ہوئے اور رسمی صیاد ون پردھان شیخو پورہ کو معہ اس کے دونوں بیٹوں کے ساتھ لیا۔ قریب موضع فضل پور کے باغ میں بہت سے آدمی تخمیناً چار ہزار کے قریب موجود معلوم ہوئے جناب مسٹر جارج پاسٹر صاحب نے سب سے پہلے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا اور سواروں کو ساتھ لے کر دائیں طرف سے ان پر حملہ کیا اور میر تراب علی تحصیلدار اور لطافت علی تھانہ دار اور میر محمد علی پیش کار تلنگوں کے ساتھ ہو کر آگے بڑھے، گنواروں نے ہلہ دیکھ کر بندوقوں کا فیر کیا اور تلواریں کھینچ کر بمقابلہ پیش آئے۔ جب اس طرف سے بندوق کی باڑ چلی تو وہ بھاگ نکلے مگر ان پر حملہ کر کے بہت سے آدمیوں کو گھیر لیا اور موضع فضل پور میں آگ لگا دی اور لوٹ لیا پندرہ بیس آدمی جان سے مارے گئے اور بہت سے آدمی زخمی ہوئے اور تیس آدمی ہتھیار بند گرفتار ہوئے اور بہت سے آدمی لہپی ندی اور گنگا میں ڈوب کر مر گئے اور فضل پور کے سوا جہانگیر پور اور بھر جیدر۔ اور شیخو پورہ اور حسین پور، نرائن پور اور امین پور بھی جلائے گئے۔ ان میں گاؤں کے لوگ بھی شریک تھے۔ اس اثنا میں دوسری جون کو جناب کپتان گت صاحب بہادر معہ چند سواروں کے میرٹھ سے خزانہ لینے کو بجنور تشریف لائے اور پچاس ہزار روپے کنوئیں سے نکال کر صاحب ممدوح کے سپرد کئے گئے۔ باوجودیکہ صاحب کے پاس سوار بہت

کم تھے اور ڈاکہ والوں کے ہر طرف غول کے غول جمع تھے مگر صاحب موصوف نے بہ کمال دلاوری خزانہ ہاتھیوں پر لدوا کر چوتھی جون کو براہ گھاٹ دارانگر میرٹھ کے بے چلے گئے (جس دلیری سے صاحب خزانے لے گئے ہیں، ہر شخص اس کو دیکھ کر آفرین آفرین کرتا تھا، دوسری تاریخ کو جناب مسٹر جارج پاسٹر صاحب بہادر نے قیدیوں کو جو پرگنہ منڈاور میں گرفتار ہوئے تھے، بجنور روانہ کیا اور گرد و نواح کے گوجر طلب کئے اور تیسری تاریخ کو بہت سے گوجر حاضر آئے اور اس نے مچلکہ فساد نہ کرنے اور ہتھیار لاکر دینے اور لوٹ کا مال واپس کر دینے کا لکھوایا اور اس تنبیہہ سے نہایت ڈر اور انتظام ضلع میں ہوگیا اور ایسا خیال کیا جاتا تھا کہ شاید تمام ضلع میں شورش جاتی رہے۔"

لیکن عوام محمود خان کے ساتھ تھے

سر سید نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ:۔

"نامحمود خان جو دارانگر کی جانب گیا ہوا تھا اس کو کسی نے خبر بھیجی کہ جناب صاحب کلکٹر بہادر خزانہ ہلدور کو روانہ کرتے ہیں، ہلدور والوں کا خاندان ضلع میں ایک بڑی دہشت والا مشہور تھا اور نامحمود خان کو اگر کچھ اندیشہ تھا تو اسی خاندان سے تھا، اس نے یہ خیال کیا کہ اگر یہ معاملہ اس طرح پر ہوا تو شاید اس کے دلی ارادوں میں زیادہ وقت پیش آوے، یہ خبر سنتے ہی اس نے اپنی بدلی ہوئی نیت کا ظاہر کرنا اور اس کا اثر دکھانا اپنے دل میں ٹھان کر دفعتاً ۷ جون ۱۸۵۷ء کو مع اپنے ساتھی پٹھانوں کے بجنور میں چلا آیا اور شام تک کچھ پٹھان نجیب آباد سے بھی آگئے تھے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اس رات نامحمود کے پاس تخمیناً دو ڈھائی سو پٹھان اچھے بندوقچی مع ساز و سامان موجود ہوں گے، ہم نے جو پٹھان اور اور لوگ نیے نوکر رکھے تھے، ان کا بلکہ پرانے نوکروں کا بھی خیال نامحمود خاں کی طرف پاتے تھے اور کچھ شبہ نہیں ہے کہ یہ سب لوگ نامحمود خان سے ملتے تھے۔ اور میٹھی میٹھی باتیں اس سے کرتے تھے اور کیا تعجب ہے کہ کسی راز میں بھی شریک ہوں اس زمانہ میں بجنور میں یہ رفت ہوگئی تھی کہ ہر شخص کے دل میں جم گیا تھا کہ سرکار کی عملداری اٹھ جائے گی

اور بے شبہ نامحمود خان مسندِ حکومت پر بیٹھے گا۔ اس لئے ہر ایک شخص اس ضلع کا رہنے والا اس سے راہ و رسم رکھنی ضروری سمجھا تھا۔ اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب ہمارے نوکر بھی نامحمود خاں کے ساتھیوں میں سے تھے اور ہم کو ہرگز توقع نہ تھی کہ بُرے وقت پر یہ لوگ ہمارا ساتھ دیویں گے بلکہ ہم یقین جانتے تھے کہ یہ سب نامحمود خاں کے ساتھ ہو جائیں گے۔

انگریز بھاگتے ہیں

محمود خان کی آمد نے، حالات ابتر کر دیئے، انگریزوں کی ساری دلاوری رخصت ہوگئی۔ وہ راہِ فرار اختیار کرنے کی تدبیر پہ سوچنے لگے، اور ان کے بار وفاداران کی جان بچانے کے لیے، اور انھیں امن وامان کے مقام پہ پہنچانے کے لئے جملہ وسائل و ذرائع سے کام لینے پر مجبور ہو گئے۔

چنانچہ سرسید کہتے ہیں:۔

"بہت سی مصلحت کے بعد یہ رائے قرار پائی کہ آج ہی رات کو جناب میم صاحب اور عیسائی عورتیں اور بچے اور کچھ مرد بہ معیت جناب مسٹر کری صاحب مظفر نگر اور دہلی سے رڑکی روانہ ہو جائیں، اور صرف مسٹر الیگزنڈر صاحب بہادر اور مسٹر جارج پاسٹر صاحب بہادر بجنور تشریف رکھیں، بارہ بجے رات کو یہ صلاح پکی ہوگئی اور میم صاحبہ کی روانگی کی تیاری ہونے لگی اس دن نامحمود خاں کی بدنیتی کے سبب حجاب بخوبی کھل گئیں تھیں یہ رائے ٹھیری کہ بلا اطلاع نامحمود خان میم صاحبہ کے روانہ کرنے میں مبادا کچھ فساد ہو جائے بظاہر اس سے بھی صلاح کر لی جائے۔ چنانچہ جناب صاحب کلکٹر بہادر کے حکم سے اسی وقت رات کو نامحمود خاں کے پاس جو احاطہ کوٹھی میں مقیم تھا، میں گیا اور میں نے اس کو پٹھانوں کے غول میں بیٹھا ہوا پایا۔ میں نے اس سے عرض کیا کہ مجھ کو علیحدہ آپ سے کچھ عرض کرنا ہے اوّل تو اس نے ایک عجیب غرور سے کہا کہ یہاں کون غیر ہے۔ سب پٹھان بھائی ہیں، کہو۔ مگر میرے اصرار پر اٹھ کر آیا میں نے اس سے اوّل یہ بات کہی کہ آپ کو کس نے یہ خبر دی ہے کہ خزانہ جلد در جاتا ہے۔ یہ بات بالکل جھوٹ ہے اور میں ذمہ دار ہوتا ہوں کہ خزانہ نہیں جائے

گا، اس نے جواب دیا کہ میرا منھ کالا ہونے میں اب کچھ باقی نہیں میرے ساتھ پٹھان مجھ کو گالیاں دیتے ہیں اور بہت بُرا بھلا کہتے ہیں کہ خان بہادر خان تو اپنی موروثی گدی پر بیٹھ گیا، اس کمبخت کو کیا ہوا ہے جو چپکا بیٹھا ہے اور میں نے انگریزوں کا نمک کھایا ہے میں نہیں چاہتا کہ کوئی انگریز مارا جائے اور میرا منھ کالا ہو، اگر انگریزوں کو اپنی جانیں بچانی ہیں تو یہاں سے نکل جائیں اگر کوئی پٹھان مار دے گا تو میں کیا کروں گا علاوہ اس گفتگو کے جس طرز اور انداز پر اس نے مجھ سے باتیں کیں جس کو کیفیت بات چیت کرنے میں متکلم اور مخاطب ہی خوب جانتا ہے اور سمجھتا ہے اور بیان میں نہیں آسکتی اُس سے مجھ کو یقین ہو گیا تھا کہ آج حکام انگریزی کی جان کو ضرور نقصان پہونچے گا، میں نے اس سے کہا کہ جو بات بغیر فساد کے حاصل ہو اس میں فساد کرنا اور بدنامی اٹھانی نہیں چاہیئے اگر آپ کی صلاح ہو تو ہم ایسی تدبیر کریں کہ جناب صاحب کلکٹر بہادر سے کہہ کر آج رات کو جناب میم صاحبہ اور صاحبوں کو یہاں سے روانہ کر دیں، دو ایک روز میں جناب صاحب کلکٹر بہادر اور جناب صاحب جنٹ مجسٹریٹ بہادر خود چلے جائیں گے اور تم تو اب بدنام ہو ہی گئے ہو، بغیر فساد و بدنامی کے، تمہارا مطلب حاصل ہو جائے گا اور اسی قسم کی اور باتیں جو مناسب وقت کے تھیں اس سے کہیں جس سے اس کے دل میں یہ بات پڑ[illegible] حکام انگریزی کی جان کو نقصان نہ پہنچے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ کہاں کا بکھیڑا ہے کہ آج جناب میم صاحبہ جائیں اور پھر حکام جائیں۔ اگر جانا ہے تو آج سب چلے جائیں ورنہ میرا منھ کالا ہو گا یعنی کوئی مارا جائے گا اس وقت تک تو میں پٹھانوں کو روک روک کر رکھا ہے پھر میرے قابو سے باہر ہو جائیں گے۔

غرضیکہ جب مجھ کو یقین ہو گیا کہ نامحمود خاں نے فساد کرنا بخوبی اپنے دل میں ٹھان لیا ہے اور کسی طرح باز نہیں آنے کا، اس وقت میں نے کہا کہ چلو ہم اور تم چل کر جناب صاحب کلکٹر بہادر سے عرض کریں گے اب یہاں رہنا مناسب نہیں اس نے کہا کہ میں تو نہیں جاتا اور میں صاحب کلکٹر بہادر سے کہتا ہوں کہ یہاں نہ رہیں اور جو شرط نمک حلالی کی تھی اس سے میں

اور ہُوا اب چاہیں جائیں چاہے نہ جائیں۔ یہ کہہ کر اپنے پچھاؤں میں جا بیٹھا لاچار میں نے اُن یہ سب حال جناب صاحب کلکٹر بہادر سے عرض کیا اور اس وقت درباب سپردگی ضلع اور تشریف بری حکام کی پھر مصلحت ہوئی ایسے حال میں کہ مرادآباد سے فوج باغی کے آنے کی خبر گرم تھی۔ اور کوئی آدمی ملازمان جدید وقدیم میں سے قابلِ اطمینان کے نہیں تھا اور دشمن قوی بغل میں اور ظاہر ہے کہ ہم تین آدمی بجز اس کے کہ اپنی جان دے دیتے اور کیا کر سکتے تھے کچھ چارہ نہ تھا سوائے اس کے کہ حکام انگریزی سردست حفظِ جان کا کریں اور ضلع چھوڑ دیں۔ چنانچہ ہم سب کی یہی رائے قرار پائی اور ہمارے حکام نے بھی اس کو پسند کیا۔ اگرچہ اوّل اوّل ڈپٹی صاحب کو اس میں تامّل تھا مگر پھر بھی رائے ان کے نزدیک بھی مستحسن ٹھیری۔ اگرچہ اس وقت کوئی اور مصلحت نہ تھی، بہ نظر دور اندیشی اور اس خیال سے کہ شاید اور کوئی کام کی بات نکل آئے چودھری رندھیر سنگھ رئیس ہلدور اور چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاجپور سے پوچھا کہ تم ضلع کا انتظام کر سکتے ہو۔ انہوں نے مجبوری اور اس کام کا نہ کر سکنے کا بیان کیا اور درحقیقت ممکن نہ تھا کہ ضلع کے آدمی نامحمود خان کو چھوڑ کر اور کسی کی حکومت قبول کرتے، میں نے صاحب کلکٹر بہادر کے رُوبرو چودھری رندھیر سنگھ سے یہ بات بھی کہی تھی کہ ایسی تدبیر ہو سکتی ہے کہ بروقت آجانے پلٹن باغی کے جب تک وہ ضلع سے چلی جائے حکام انگریزی کی حفاظت رہے۔ چودھری صاحب نے اس امر کا ہونا بھی غیر ممکن بتایا، غرض کہ سب باتیں رات کو دو بجے طے پائیں اور جناب صاحب کلکٹر بہادر اور جناب مسٹر جارج پالمر صاحب بہادر صاحب نے بھی روانگی کی تیاری کی۔"

آقا کی تعریف

سر سید مزید فرماتے ہیں :-

میں تعریف نہیں کر سکتا، اپنے صاحب کلکٹر کی مروت اور اخلاق اور ہر ایک اپنے متوسل کی پرورش کے خیال کا کہ ایسے نازک وقت میں جناب ممدوح نے

سب عیسائی مرد عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ لیا اور ہم سے پوچھا کہ تم کیا کرو گے ؟ ہم بھی بھاگیں گے ۔ "ڈپٹی صاحب کے اہل و عیال سب بلدور جا چکے تھے ، سید تراب علی تحصیلدار کے اہل و عیال اور چھوٹے چھوٹے بچے اور لڑکیاں سب بجنور میں تھیں ، صاحب نے سید تراب علی سے فرمایا کہ ہم سب کو مثل اپنے سمجھتے ہیں اور سب کی حفاظت جان اپنے ساتھ چاہتے ہیں اگر تمہاری عورتوں اور بچوں کو ہمارے ساتھ چلنا ہو تو ہم سب کو لے چلیں گے ۔ بگر یہ امر بہت مشکل تھا ۔"

سر سید اور انگریزوں نے محمود خان سے فریب کیا

آگے چل کر سرسید اور ان کے ممدوح حکام فرنگ کے سیاسی کردار کا ایک افسوسناک پہلو منظر کے سامنے آتا ہے ، فرماتے ہیں :۔

"ہم نے عرض کیا کہ بالفعل کوٹلہ جائیں گے اور وہاں سے جہاں امن ملے پھر جو الطاف ہماری دلجوئی اور پرورش اور مہربانی کے ہم پر فرمائے ان کا ہم شکر یہ ادا نہیں کر سکتے ۔ غرضیکہ اس وقت میں اور سید تراب علی اجازت لے کر عورتوں اور بچوں کی روانگی کے مع سامان کوٹھی سے باہر نکلے اور نا محمود خان سے میں نے کہا اب سب جاتے ہیں تم ان صاحبوں کی حفاظت میں بہت کوشش کرو ۔ کیونکہ جناب صاحب کلکٹر بہادر کا ارادہ ہے کہ پار پہنچ کر گورنمنٹ کو رپورٹ کریں کہ یہ تمام ضلع تم کو مل جاوے اور اسی قسم کی مصلحت آمیز باتوں سے اس کو خوش کیا اور بخوبی اپنی خاطر جمع کرلی کہ کچھ اب فساد نہیں ہونے کا ۔ اس وقت میں اور سید تراب علی تحصیلدار مکان پر آئے اور فی الفور عورتوں کو سوار کر کے تین بجے رات کے جناب صاحب کلکٹر بہادر کی کوٹھی کے احاطہ کے پاس لاکر ٹھیرایا اور خود ہم دونوں جناب ممدوح کے پاس حاضر ہوئے اور سواروں کے افسران سے کہا کہ کچھ سوار ہمراہی کو چلیں ہماری بات کو سن کر سب چپکے ہو رہے مگر قطب الدین رسالہ دار اور

جو نئے سوار بریلی سے آئے تھے اور ان کا میل جول نامحمود خان سے نہ ہوا تھا ہمراہی کو مستعد ہوئے اور بہادر علی جمعدار اور تین چار سو پڑانے آمادہ ہوئے ہاتھی سب تیار تھے اور سوار بھی تیار ہو کر کوٹھی پر حاضر ہوئے اس وقت سید تراب علی تحصیلدار کو بھیجکر نامحمود خان کو بلایا گیا اور جناب صاحب کلکٹر بہادر نے فرمایا کہ ہم جاتے ہیں اور ضلع تمھارے پاس چھوڑتے ہیں تم بخوبی انتظام رکھو اور ہمارے اہلکاروں سے کام لو اور آرام سے رکھو نامحمود خان نے کہا کہ لکھ دو میں نے اس وقت خط لکھا اگرچہ نقل اس خط کی نہیں ہے مگر جو مضمون مجھ کو یاد ہے لکھتا ہوں، امید ہے کہ لفظوں میں بھی فرق نہ ہو گا۔

محمود خاں کے نام کلکٹر بہادر کا خط

مضمون خط موسومہ نامحمود خان از طرف جناب صاحب کلکٹر بہادر مرقومہ شب مابین ہفتم و ہشتم جون جو کہ بالفعل انتظام ضلع بجنور کا جب تک کہ سرکار کی مرضی ہو آپ کے سپرد ہوتا ہے آپ کو چاہیے کہ ضلع کا بخوبی انتظام کرو اور جس قدر اسباب جناب صاحب کلکٹر بہادر اور جناب جنٹ مجسٹریٹ بہادر کا کوٹھی میں ہے اور جس قدر مال و اسباب دفتر سرکاری ہے اس کی بخوبی حفاظت رکھو مرقوم ساتویں جون ۱۸۵۷ء

جس وقت یہ کاغذ تحریر ہوا اس وقت حسب تفصیل ذیل روپیہ خزانہ میں اور کنوئیں موجود تھا۔

(تفصیل نقشہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

تفصیل	پائی	آنہ	روپیہ
باقیات خزانہ لغایت ۱۰ جون ۱۸۵۷ء	۴	۲	۹۶۰۹۹
بابت شفاخانہ نگینہ ونجیب آباد	-	-	۲۲۰۰
بابت تنخواہ اہلکاران مفصل	-	-	۳۵۰۰
آمدنی کارخانہ جیل خانہ	۱	۵	۵۹۳
میزان ناظر	-	-	۱۵۰
بابت حساب خزانچی	۱۱	۱	۶۷۹۷
	۴	۹	۱۰۹۴۳۹
استامپ وافیون			
کاغذ اسٹامپ	-	-	۳۸۰۰۰
ٹکٹ ڈاک	-	-	۲۵۰
افیون بحساب خرید سرکار	-	-	۳۹۶۰
بابت اضافہ قیمت نرخ فروخت افیون	-	-	۳۹۶۰
	-	-	۴۶۲۷۰

نواب محمود خان

سرسید بڑے افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں

"یہ خط بعد دستخط نامحمود خان کو دیا گیا اور وہ بدنصیب اُس کو لے کر باہر آیا جناب کلکٹر بہادر نے کلماتِ رخصت ہم سے فرمائے اور رنج اور درد جُدائی کا ہمارے دل پر تھا وہ ہم نے ظاہر کیا۔ تھوڑی دیر بعد سب سوار ہوتے کو کوٹھی کے برآمدہ میں آئے اور جناب صاحب کلکٹر بہادر اور جناب صاحب جنٹ مجسٹریٹ بہادر نے بہ کمال عنایت مجھ کو اور سید تراب علی تحصیلدار کو رخصت کیا کہ اپنی عورتوں کو ساتھ لے کر چلے جاویں، ہم رخصت ہوئے اور جناب صاحب کلکٹر بہادر اور صاحب سوار ہو کر تشریف فرما ہوئے، ڈپٹی صاحب

مع چودھری رندھیر سنگھ بلدور چلے گئے، وہ سب نمک حرام پرانے سوار مع بہادر علی جمعدار کے گنگا کے کنارہ پر سے نا محمود خاں کے پاس بھاگ آئے مگر نئے سوار ٹڑکی تک ساتھ رہے اور وہاں پہنچکر بگڑ گئے ان کا کوٹ ہوا جناب صاحب کلکٹر بہادر کی عنایت سے ان کی جان بخشی ہو گئی محمود خاں نے سورج کو بھی اچھی طرح نہ نکلنے دیا کہ بجنور میں اپنے نام کی منادی ان الفاظ سے کی خلق خدا کی ملک بادشاہ کا حکم نواب محمود خان بہادر کا اور نواب بن بیٹھا۔

محمود خاں کا خاندان

مناسب یہ ہے کہ اس مقام پر تھوڑا سا حال نا محمود خان کے خاندان کا بیان کروں نا محمود خان پوتا ہے نجیب خان کا جو احمد شاہ کے وقت میں یعنی ۱۷۴۸ء میں دوندے خان کا نوکر تھا اور اس کی طرف سے پرگنہ دارا کی تحصیل کرتا تھا اس نے بہت سے لوگ اپنے ساتھ جمع کئے اور ان پرگنہ جات پر جو اب ضلع بجنور میں ہیں قبضہ کر لیا۔ پھر دوندے خان کی بیٹی سے اس کی شادی ہوئی۔ اس سبب سے مستقل مالک اس ملک کا ہو گیا اور بادشاہ کے دربار تک بھی رسائی کرلی۔

جب عالمگیر ثانی تخت پر بیٹھا یعنی ۱۷۵۳ء میں تو نجیب خاں نے جیت سنگھ ڈکیت کو مار کر کچھ گنگا پار کا علاقہ بھی جو اب سہارن پور میں شامل ہے اپنے ملک میں ملا لیا اور بادشاہ کے دربار سے اس کو نجیب الدولہ امیر الامرا کا خطاب ملا اور ۱۷۵۵ء میں اس نے قلعہ پتھر گڈھ بنایا اور نجیب آباد آبسایا۔ جب نجیب الدولہ ۱۷۷۰ء میں مر گیا اس کا بیٹا ضابطہ خان اس کی جگہ بیٹھا نواب شجاع الدولہ لکھنؤ والے نے بسبب نہ ہونے روپیہ معاملہ مرہٹوں کے جس کا ضامن شجاع الدولہ ہو گیا تھا ضابطہ خان کو ۱۷۷۴ء میں اس ملک سے خارج کر دیا، ضابطہ خان نے نواب عبدالاحد کی سفارش سے ۱۷۷۶ء میں بادشاہ سے سہارن پور کی سند حاصل کی اور غوث گڈھ میں رہنا اختیار کیا۔

اس کے مرنے کے بعد غلام قادر خان اس کا بیٹا اس کی جگہ بیٹھا اور اس نے شاہ عالم کو اندھا کیا۔ مہاراجہ سندھیا نے اس جرم میں اس کو بعد مقابلہ گرفتار کیا اور لوہے کے پنجرے میں قید

کر کے اور ایک ایک عضو جدا جدا کر کے مار ڈالا معین الدین خان عرف نتھو غلام قادر کا بھائی بھاگ کر پنجاب چلا گیا۔

جب سرکار دولت مدار انگریزی نے اضلاع دہلی کو فتح کیا تب نتھو خان کو بلا کر بہت خاطر کی اور پانچ ہزار روپے مہینے کی پنشن مقرر کر کے بریلی میں رہنے کی حکم دیا اور پھر مسٹر کولبرک صاحب بہادر کی رپورٹ سے ۱۸۱۲ء میں نجیب آباد دیا ہوا اس کے مرنے کے بعد سرکار دولتمدار انگریزی نے بنظر رحم محمود خان اور جلال الدین خان اس کے بیٹے اور بیٹیوں کے لئے ہزار روپیہ ماہواری پنشن مقرر کی اور ہر ایک شخص کو اس خاندان میں سے بہت بڑے بڑے معزز عہدے عطا فرمائے کہ تمام خاندان بہ کمال عزت اپنی زندگی بسر کرتا تھا، نتھو خان نے اس زمانہ میں جب کہ ایک جعلی غلام قادر خان دہلی میں اکبر شاہ کے دربار میں آیا تھا، بادشاہ کے یہاں رسائی پیدا کی اور اپنے بیٹوں کے نام خطاب حاصل کیا۔ اب اس غدر میں اس خاندان نے سرکار دولت مدار انگریزی سے نمک حرامی کی، اس مقام پر کرسی نامہ اس نمک حرام خاندان کا لکھا جاتا ہے۔

محمود خاں کی حکومت

جب کہ ہم رخصت ہو کر کوٹلہ کی طرف روانہ ہوئے راہ میں ہم کو بہت سے غول سپاہیوں کے نجیب آباد سے بجنور آتے ہوئے ملے اور کوٹلہ میں شفیع اللہ خان بھانجا محمود خان کا ملا جو نجیب آباد کو آتا تھا، ہم نے دو تین روز کوٹلہ میں قیام کیا اور ہم اس فکر میں تھے کہ یہاں سے کدھر جاویں اور کیونکر جاویں کہ اس درمیان میں متواتر احکام نا محمود خاں کے ہماری طلب میں پہنچے آخر سوار آن کر ہم کو بجنور لے گئے اور سید تراب علی تحصیلدار کے قبائل نگینہ روانہ ہو گئے اور ڈپٹی صاحب بھی ہلدور سے حسب الطلب بجنور میں آئے ہم سب نے نا محمود خاں سے ملاقات کی مگر جیسا کہ وہ چاہتا تھا اس کو نذر نہیں دی تھوڑی دیر بعد اس نے ہم کو رخصت کیا اور یہ بات کہی کہ بدستور اپنا کام کرو۔ ہم نے بجنور میں دیکھا کہ رام سروپ کا بہت عروج ہے اور اس کی معرفت بائی ٹلنگے نواب کے پاس نوکر ہوتے جاتے ہیں۔ اس کے دوسرے دن سے نا محمود خاں

نے بنا بندوبست کرنا شروع کیا، عظمت اللہ خاں ٹھاکر دوارہ کو اپنا نائب اور احمد اللہ تحصیلدار نجیب آباد کو ڈپٹی کلکٹر معتمد اور جنٹ مجسٹریٹ مقرر کیا مگر احمد اللہ خاں نے ایسی مداخلت بہم پہنچائی اور نواب کو بالکل ایسا اپنے قابو میں کر لیا کہ تمام انتظام فوج اور ملکی اور مالی اور عدالت کا اس کو اختیار تھا اور درحقیقت نواب صرف برائے نقش رہ گیا تھا فوج سوار اور پیادہ کے رکھنے کو جاری کر دیا اور جو جو لوگ پرانے عہدہ دار نواب کے خاندان کے تھے وہ پرانے عہدوں پر مامور ہونے کو طلب ہوئے اور احمد یار خان عرف کلن خان سپہ سالار اور حبیب اللہ خاں بخشی فوج مقرر ہوا ہم اس حال کو دیکھ دیکھ کر بہت گھبراتے تھے علی الخصوص اس بات سے کہ جو کوئی نواب کے سامنے حکام انگریزی کا نام لیتا تھا تو وہ بہت ناراض ہوتا تھا۔ جبکہ نواب نے ہم کو کہا کہ تم سب اپنا اپنا کام کرو اور اس وقت میں نے اور سید تراب علی تحصیلدار نے اور پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر نے باہم مشورہ کیا اور آپس کی ایک کمیٹی بنائی اور یہ تجویز کی کہ ہم میں سے کوئی شخص کوئی کام نہ کرے جب تک باہم کمیٹی کے اُس کی جو صلاح ٹھیرے، چنانچہ اُسی وقت کام کرنے کے باب میں یہ رائے ٹھیری کہ میر سید تراب علی تحصیلدار بجنور جو ضروری حکم نواب کا پہنچے اس کی لاچار تعمیل کریں اور باقی احکام سب ملتوی پڑے رہنے دیں اور باقی مالگزاری بجز اس قدر روپے کے جس سے تنخواہ عملہ تحصیل و تھانہ تقسیم ہو جاوے اور کچھ وصول نہ کریں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور تحویلدار کی معرفت کہ وہ بھی خیر خواہ سرکار اور ہمارا ہمراز تھا مالگزار آیا اس کو فہمائش کی گئی کہ روپیہ مت دے اس قابلِ تحصیل سے نواب ناراض ہوا اور احکام سخت بھیجنے لگا اور کلمات نا ملایم پروانجات میں تحریر ہونے لگے اور نسبت اجرے کار دیوانی یہ رائے ٹھیری کہ جب تک ہو سکے میں صدر امین بموجب آئینِ سرکار دولت مند انگریزی کام کرتا رہوں اور کسی طرح کا تعلق نواب سے اس کام کا نہ رکھوں۔ چنانچہ مجھ صدر امین نے ایسا ہی کیا اور جو روبکاریاں اور رپورٹیں قابلِ ارسال بحضور جناب صاحب جج بہادر بخشیں ان میں علی الاعلان میں یہی حکم تحریر ہوتا رہا کہ بحضور جناب صاحب جج بہادر بھیجی جاویں اس میں فائدہ یہ تھا کہ عوام یہ سمجھتے تھے کہ حکام انگریزی کا تسلط بدستور ہے البتہ نواب کو یہ امر بہت

ناگوار تھا اور ایسی باتوں سے اس کی دشمنی ہمارے ساتھ زیادہ ہوتی جاتی تھی مگر ہم کو توقع تھی کہ ہمارے حکام بہت جلد پھر ضلع میں تشریف لاتے ہیں۔"

محمود خاں کے عزائم

"فوج نمک حرام باغی جو مرادآباد میں مقیم تھی اس کے ساتھ سازش کرنے کی نامحمود خان کو بہت فکر تھی اور خبر آمد آمد فوج مرادآباد کی بجنور میں بہت گرم تھی اور خطوط بھی مرادآباد سے درباب قصد روانگی فوج کی جانب بجنور کو آئے تھے۔ اس لئے نامحمود نے رام سروپ جمعدار جیلخانہ اور صاحب علی دفعدار سواروں کو معہ چند اپنے معتمدوں کے دھام پور روانہ کیا اور مرادآباد میں خطوط بھیجے کہ فوج کو سمجھا دیں کہ صاحبان انگریزی مال سے مع کل خزانہ کے چلے گئے، اب یہاں نہ خزانہ ہے نہ حکام انگریزی پھر یہاں آنا بے فائدہ ہے اور اگر بہ ارادۂ ملازمت میرے پاس آویں تو ان کا گھر ہے جب یہ خبر فوج والوں کو ہوئی تو انہوں نے آنا بجنور کا ملتوی کر دیا اور رام سروپ وغیرہ دھام پور واپس آئے۔ چند روز بعد نواب کو کسی طرح معلوم ہوا کہ فوجِ باغی کا ارادہ ہے کہ گھاٹ دارانگر سے گنگا پار اتریں اس لیے اس نے درباب فراہمی رسد احکام بنام تحصیلداران جاری کئے اور تعلقہ داران کے نام بھی پروانے رسد رسانی کے لکھے چنانچہ جو پروانہ بنام چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاجپور لکھا تھا اس کی نقل یہاں لکھتا ہوں۔

نقل پروانہ دستخطی نواب محمود خان

"نعمت و عوالی مرتبت عزیز القدر چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاجپور بخیریت رہو جو یہ اطلاع اور رپورٹ مرادآباد کے پروانہ جات بنام تحصیلدار چاندپور دھام پور وغیرہ درباب انتظام فراہمی رسد وغیرہ مقام فرودگاہ لشکر یہ جاری ہوئے ہیں لہٰذا تم کو لکھا جاتا ہے کہ تم بھی جس قدر حد کے درباره انتظام دے دینے رسد وغیرہ کے ممد و معاون انکے رہو تاکید جانو مرقوم ۱۷ ر جون ۱۸۵۷ء"

اس عرصہ میں نواب کے پاس بہت سے رشتہ مند اس کے جمع ہوگئے اور اس نے اپنے رشتہ داروں کی پرورش منظور ہوئی اور یہ بھی اس کو خیال تھا کہ یہ معزز عہدہ دار بسبب خیر خواہی کے

سرکار کے میری مرضی کے موافق کام نہیں کرنے لگے اس لئے ۱۷ رجون ۱۸۵۷ء کو پہلی بار انہوں نے مولوی قادر علی تحصیلدار نگینہ کو برخاست کیا اور عبداللہ خاں اپنے رشتہ مند کو جو پیشکار تحصیل کاشی پور ضلع مراد آباد تھا تحصیلدار نگینہ مقرر کیا جب مولوی قادر علی برخاست ہو کر بجنور آئے، نواب کچھ متوجہ نہ ہوا انہوں نے اس اپنی برخاستگی کو غنیمت سمجھا ان آفت سے علیحدہ ہو جانا بہت اچھا جانا اب ہم راست مقام پر پروانہ برخاستگی مولوی قادر علی کو بعینہ نقل کرتے ہیں۔

نقل پروانہ برخاستگی محمود خاں

مرقعت دعوالی مرتبت عزیزالقدر مولوی قادر علی تحصیلدار نگینہ بعافیت باشد چونکہ بنظر انتظام حاضر ہونا تمہارا حضور میں ضرور ہے۔ لہذا حسب الحکم روبکار امیروزہ تم کو لکھا جاتا ہے کہ تم کار مفوضہ اپنا سپرد برادر عزیز القدر گرامی شان محمد عبداللہ خان کر کے حاضر ہو اور تم اپنے دل میں کچھ فکر اس کا نہ کرو کہ تم سے حضور میں کار سرکار نہ لیا جاوے گا۔ المرقوم ۱۷ رجون ۱۸۵۷ء

سرسید اور احمد خاں

"اسی تاریخ نا محمود خان نے رات کے وقت مجھ صدر امین کو اپنے پاس بلایا اور محمود خان اور احمد اللہ خان نے تخلیہ میں مجھ سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ اور تم ہم سے ہمارے ساتھ شریک ہونے پر حلف کرو اور جو جاگیر چاہو نسلاً بعد نسل ہم سے ٹھیرا لو اور ہم سے حلف لو کہ ہم ہمیشہ وہ جاگیر بحال رکھیں گے اول تو مجھ کو بڑا ڈر ہوا کہ کیا جواب دوں پھر میں نے اپنے دل کو اس بات پر تسلیم کیا کہ سچی اور سیدھی بات کہنی ہر وقت اچھی ہوتی ہے میں نے عرض کیا کہ نواب صاحب میں اس بات پر حلف کر سکتا ہوں کہ میں ہر حال میں تمہارا خیر خواہ ہوں گا اور کسی وقت تمہاری بدخواہی نہ کروں گا۔ اگر تمہارا ارادہ ملک گیری اور انگریزوں سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کا ہے تو میں تمہارے شریک نہیں ہوں اور میں نے کہا خدا کی قسم میں یہی صرف تمہاری خیر خواہی سے کہتا ہوں کہ تم اس ارادہ کو دل سے نکال دو حکام انگریزی کی عملداری کبھی نہیں

جائے گی اگر فرض کرو کہ تمام ہندوستان سے انگریز چلے گئے تو حکام انگریزی کے سوا کوئی عملداری
ہندوستان میں نہ کر سکے گا ۔ اور میں نے کہا، کہ تم اطاعت سرکار اپنے ہاتھ سے مت دو اگر بالفرض انگریز
جاتے رہے جیسا کہ تمہارا خیال ہے تو تم نواب بنے بنائے ہو تمہاری نوابی کوئی نہیں چھینتا ۔ اگر
میرا خیال صحیح نکلا تو تم خیر خواہ سرکار ہو گے اور سرکار کی طرف سے تمہاری ترقی اور قدر ہو گی ۔
اگر تم مجھ کو انتظام ملک میں شریک کیا چاہتے ہو تو جناب صاحب کلکٹر بہادر سے اجازت منگالو اور
یہ اقرار کر لو کہ کوئی کام نہیں کرنے کے جب تک کہ پہلے اس کی منظوری جناب صاحب کلکٹر
بہادر سے حاصل کر لیں ۔ اگر نا محمود خاں میں عقل ہوتی تو سمجھتا کہ یہ سب باتیں اس کی بھلائی
کی تھیں ۔ مگر چونکہ جبلت اس کی بدی پر تھی ۔ وہ ان باتوں سے ناراض ہوا اور چیں بجبیں ہو کر
مجھ کو رخصت کر دیا اور ہر طرح ہماری دشمنی کے درپے ہو گیا اور جان لیا کہ یہ لوگ رفاقت سرکار
انگریزی سے باز آئیں گے تو پھر ہم پر زیادہ تر زیادتی شروع کی میرے خاص رہنے کے مکان کو جبر
مجھ سے چھین لیا اور اپنی فوج کے افسروں کو دے دیا ۔ جو اسباب اس میں بند تھا وہ سب فوج
والوں نے لے لیا سید تراب علی تحصیلدار کا گھوڑا بہ تعینانی ۲۰ سپاہیوں کے چھین لیا اور ہر طرح
سے درپے ہلاک و آزار کے ہو گیا ۔ ہم دن رات اسی فکر میں تھے کہ کس طرح نواب کے پنجہ سے
نکل جاویں مگر ممکن نہ تھا ۔

بجنور میں جہادیوں کا ورود

یہ ہنگامہ ہنوز برپا تھا کہ دفعتاً امیر خاں نامی ساکن کنج پورہ
نگینہ سے جہادی بن کر معہ جمعیت چار سو آدمی کے بجنور
میں داخل ہوا اور احمد اللہ خاں جو نجیب آباد گیا ہوا تھا اس فساد کی خبر پا کر بجنور میں آیا اور احمد یار
خاں عرف للن خاں سپہ سالار اور نادر شاہ رسالہ دار رحصتی رجمنٹ ملتان جو بجنور میں آ گیا تھا
درمیان میں پڑے اور آپس میں نواب کے اور چودھریوں کے صلح ٹھہری احمد اللہ خاں اور دونوں
چودھری صاحب ۲۰ جون ۱۸۵۷ء کو کچہری تحصیل میں آئے اور بہت سی گفتگو کے بعد صلح
ٹھہری احمد اللہ خاں چودھری صاحبوں نے گنگا جل اٹھایا کہ ہم نواب کے تابعدار

اور مطیع رہیں گے اور احمد اللہ خاں نے اسی جلسہ میں کلام اللہ پر مہر کی کہ ہم چودھریوں کے ساتھ برائی نہیں کریں گے اور محمود خاں اور عظمت اللہ خاں نے بھی پردے کلام اللہ پر مہر کر کے بھیج دی اور آپس میں صلح ہو گئی۔ ۲۴؍ جون ۱۸۵۷ء کو رات کے خزانچی سے ۴ ہزار روپے لینے ٹھہرے اور وہ بکس جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر کلکٹر کا بھی جو خزانے میں تھا لے لیا اور خزانچی کے مکان پر سے پہرہ اٹھ گیا۔ منیر خاں جہادی نے بجنور میں بہت غلغلہ مچایا اور مجھ صدر امین اور رحمت خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر اور سید تراب علی تحصیلدار بجنور پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے انگریزوں کی حفاظت کی ہے اور ان کو زندہ بجنور سے جانے دیا ہے اور اب بھی انگریزوں سے سازش اور خط و کتابت رکھتے ہیں اس لئے ان کا قتل واجب ہے اور درحقیقت خفیہ خط و کتابت جناب مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر سے جاری تھی اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ جہاد کے ساتھ فساد کرنے میں نواب کا اشارہ بھی تھا۔ کیونکہ اس میں بڑی حکمت یہ تھی کہ جہادیوں کے ہاتھ سے ہم لوگوں کے مارے جانے میں نواب کی کچھ بدنامی نہ ہوتی تھی اور کام نکلتا تھا اور پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر کی نسبت علاوہ اس الزام کے یہ بھی جرم لگایا گیا تھا کہ عیسائی مکتب ہر جگہ جاتا پھرتا ہے غرض کہ منیر خاں نے ہم پر زیادتی کی اور بہ جبر حکومت ہم کو طلب کیا اور کہلا بھیجا کہ اگر حاضر نہ ہو سکے تو بہتر نہ ہوگا اور بڑی مشکل یہ ہوئی کہ چند چپراسیانِ تحصیل ہم سے مخالف اور جہادیوں سے مل گئے تھے۔ اس لئے لاچار میں اور سید تراب علی تحصیلدار اس کے پاس گئے۔ منیر خاں نے مجھ سے در باب مسئلہ جہاد گفتگو کی میں نے اس سے کہا کہ ازروئے مذہب جب جہاد نہیں ہے اور اسی قسم کی گفتگو کے بعد ہم وہاں سے چلے آئے اس کے دوسرے دن منیر خاں مذکور مولوی علیم اللہ رئیس بجنور کے پاس گیا اور در باب مسئلہ جہاد ان سے گفتگو کی اور بہت دلیلوں سے اس کو قائل کیا کہ مذہب کی [illegible] نہیں ہے مگر اس گفتگو پر بہت جنگ ہوا اور منیر خاں کے ساتھیوں نے مولوی علیم اللہ کے قتل کو تلوار نکالی مگر لوگوں

نے بیچ میں پڑ کر بچا دیا۔ اس کے دوسرے دن منیر خاں مع اپنے ساتھیوں کے بجز ان چند آدمیوں کے جنھوں نے اس گفتگو کے بعد ساتھ چھوڑ دیا تھا دہلی چلا گیا اور وہاں جا کر لڑائی میں مارا گیا۔

بہادر شاہ کا فرمان محمود خاں کے نام

"۲۸ جون ۱۸۵۷ء کو عمدہ خاں جو نامحمود خاں کی عرضی لے کر بادشاہ کے پاس دہلی گیا تھا فرمان بادشاہی موسومہ نام محمود خاں بجنور لے آیا اور اس کے ساتھ لالہ متھرا داس پسر لالہ بانکے رائے خزانچی بھی دہلی سے بجنور آئے اور عمدہ خاں نے وہ فرمان نام محمود خاں کو دیا چنانچہ اُس کی نقل اس مقام پر لکھتے ہیں:-

نقل فرمان بادشاہی مورخہ ۲۰ ذیقعدہ سنہ ۱۲ جلوس مطابق ۲۱ جولائی ۱۸۵۶ء

۱۲ ۵۳
محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی
ابو ظفر سراج الدین

فدوی خاص لایق العنایت والاحسان امیر الدولہ ضیاء الملک محمد محمود خاں بہادر مظفر جنگ مورد تفضیلات بودہ بداند عرضداشت ارادت سمات آں فدوی خاص مشعر ظہور ابتری و بے نظمی در کل پرگنات و دیہات آں ضلع از شورش و فسادات غارت گران و مفسدان و تدبیر انتظام آں به فراہمی جمعیت سوار و پیادہ بقدر تاب و توان و عرض احوال رسوخ عقیدت و ثوق ارادت موروثی در بارگاہ خسروی به استدعا بذل توجہات شاہی در خصوص انتظام آن ملک بدستور سلف بملاحظہ قدسی گذشت و کاشف معروضات گشت فی الواقع آبا و اجداد آں فدوی خاص ہمہ مورد نوازشات سلاطین پیشین انار اللہ برہانہم بودہ اند مخصوص آں لایق العنایت والاحسان

درضاجوئی وخدمت گذاری فرہ باصرہ خلافت مرزا شاہرخ بہادر مرحوم وقیقہ فروگذاشت نکردہ باعث رضامندی خاطر گردیدہ بود نظر براں مستحق رعایت وعنایت است ولیکن درا سے خدمت سابقہ اگر فی الحال مصدر حسن خدمتی خواہد گشت مورد مزید الطاف بادشاہی خواہد گردید درخواست آں فدوی خاص کہ عبارت از اجازت انتظام کل آں ضلع است بر بنہ پذیرائی خواہد رسید پس تا وقتیکہ از پیش گاہ قدسی سند متضمن شرف اجرا نیابد محمد محاصل ملکی را بعد وضع مصارف وتعاہد تحصیل بطریق امانت تصور باید کرد و بار سال آں در حضور فیض گنجور باید پرداخت و نیز زر خلیسہ خزانہ کلکٹری واسباب داسپاں کہ بعد فرار انگریزاں بقبضہ خود در آوردہ بہ مع فرد محل باقی آں بہ جمیعت منتصر اداس و دوسو ملازم بادشاہی کہ د انجا میرسند زود تر روانہ نمایند کہ نقد فدویت وارادت آں فدویہ خاص بہ محک امتحان کامل عیار آید دظہور ایں گونہ دولت خواہی وخیر اندیشی وسیلہ ترقی مدارج مراتب گردد۔ فقط

المرقوم ۲۸ ذیقعدہ سنہ ۲۱ جلوس

رئیسانِ چاندپور

چاندپور میں میر رستم اور صادق علی رئیسانِ چاندپور کی بہو تو قع نے گل کھلایا۔ یعنی جو عرضی انہوں نے بادشاہِ دہلی کے پاس روانہ کی تھی اس کے جواب میں فرمانِ بادشاہی پہلی اگست ۱۸۵۷ء کو چاندپور میں پہنچا اور انہوں نے بہت خوشی کی۔ چنانچہ اس فرمان کی نقل اس مقام پر لکھتے ہیں:۔

نقل فرمان بادشاہی مورخہ پنجم ذیقعدہ سنہ ۲۱ جلوس مطابق ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء

سیادت نجابت دستگاہ میر رستم علی و میر صادق علی مورد تفضیلات بودہ بدانند عرضی آں فدویان مشعر بر حال حدلال و تباہی و بربادی دیہات و قریات قصبہ چاندپور از تعدی وظلم و غارت گری واستدعائے اعانت عامدسرکار دولت مدار واجازت نوملازم داشتن سپاہ سوار و پیادہ بنابراجرائے تحصیل ومجرا یافتن تنخواہ آنہا از آمدنی علاقہ مذکور دار ارسال فرد باقیات مع کاغذ جمع خرچ در حضور پرنور بملاحظہ قدسی گذشت کاشف معروضات گردید چوں انداد

فتنہ و فساد بنا بر آسائش رعایا و برایا منظور خاطر است لہٰذا بحکم شرف اصدار می یابد کہ کو
مندیان چند سوار و پیادہ بقدر ضرورت ملازم داشتہ خبرداران رقانون گویان و چودھریان
و دیگر عزت مندان و ساکنان اکنجا را باد خود متفق ساختہ دقیقہ در مراتب بنا بست فرو گذاشت
سازندہ و اینجانب انتظام نمایند کہ احدے زبردست قوی پنجہ بر ہیچ کس زیردست و غریب نوے
تشدد و تعدی نمودن نتواند و سر چشمہ تحصیل جاری گردد و زر واجب الطلب بسہولیت وصول
گردد و کاشتکار زراعت افزونی پذیرد و بعد ایں مال زر مصارف تنخواہ ملازمان و سپاہ عملہ تحصیل
وضع کردہ زر باقیات مع کاغذ جمع و خرچ بحضور فیض گنجور رسانند۔

مرقومہ پنجم ذی الحجہ سنہ ۲ جلوس

محمود خاں کے سپاہی

"نواب کی سپاہ میں سب لوگ ملازم تنخواہ دار تھے اور اکثر علی کے
پاس بندوقیں تھیں اور وہ لوگ بندوق لگانی بھی جانتے تھے
بلکہ بہت سے پٹھان بہت اچھے بندوقچی تھے اور تخمیناً چالیس تلنگے تک تمام فوج کے جس کا افسر
رام سہرو دیپ جمعدار حلیل خانہ تھا۔ پرنت عمدہ سپاہی فوج احدداں تھے اور باقی ذات جولاہے تھے
جنھوں نے کبھی کاہے کو کبھی تلوار نہ پکڑی تھی۔ سوار بھی نواب کے بہت اچھے تھے علی الخصوص
چند سپاہی سرکاری رجمنٹوں کے جو وہاں موجود تھے وہ ہر طرح کی لڑائی جانتے تھے اور انھوں
نے بہت سے سواروں کو اگر قواعد داں نہ بنایا تھا تو سپاہی ضرور کر لیا تھا۔

ہندو مسلم نفراق

انگریزوں کی دوران کے وفادار جاں نثاروں کی کوشش یہ تھی
کہ محمود خاں اور ہندو رؤسا میں جو اتحاد ہو گیا ہے وہ ٹوٹ جائے
بالآخر یہ رخنہ اندازیاں کامیاب ہوئیں۔ یہ ہندو رؤسا لڑے۔ ہندوؤں نے جو نظام قائم
کیا تھا اسے درہم برہم کر دیا۔ پھر انگریزوں کو اطلاع دی۔ وہاں سے یہ عنایت نامہ آیا۔
"برحمت دعوائی مرتبت گرامی قدر چودھری امراؤ سنگھ صاحب سلمہ الرحمن عرضی آپ کی
مشعر حالات ظلم اور بدعت غوغائے محمود خاں کے سب پہنچی سب حال معلوم ہوا کمال افسوس د

رنج ہے کہ آپ کا اس قدر نقصان عظیم ہوا اور شیو راج سنگھ اور قبیلہ اس کا قتل ہوئے اللہ تعالےٰ کوئی آفت کسی شخص پر نازل نہیں کرتا کہ جس کے بعد کچھ تسلی نہ ہو اگر اس قدر ظلم یعنی غارتگری مال و قتل عزیزان تمہارا پٹھان لوگ نہ کرتے تو تم سب روسائے ہندو یک دل ہو کر کیونکر اس کو نکالتے اب تم سب ہندوؤں نے اتفاق کر کر اس ظالم نواب کو نکال دیا اگر سابق سے بھی تمہارے باہم ایسا اتفاق ہوتا تو جس قدر فوج باغی اس نواح میں تھی اس کا مارا جانا کیا مشکل ہوتا اور پھر کیا ضرورت پہلے آنے کی ہم لوگوں کو وہاں سے ہوتی اور ایسے آفات تم لوگوں پر کیوں آتے خیر سب امور اپنے وقت معینہ پر منحصر ہیں اب بفضل خدا سب تکالیف تمہاری جلد رفع ہو جاتی ہیں بطلب ہماری جو آپ لکھتے ہیں سو ہم نے خاص واسطے جانے بجنور کے گورنمنٹ کو لکھا ہے اور شکسپیر صاحب بھی پہاڑ سے بلائے گئے ہیں۔ اب عنقریب بندوبست فوج کا ہو جاتا ہے ہم تھوڑی سی فوج معتبر لے کر عنقریب آئیں گے اور سید احمد خاں صدر امین اور رحمت خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر کو لکھا گیا ہے کہ تا پہنچنے ہمارے وہ انتظام وہاں کا اچھی طرح کریں گے اور مسٹر پالمر صاحب جنٹ مجسٹریٹ بجنور کا جو حال آپ نے دریافت کیا تھا سو وہ مظفر نگر میں ہیں میرٹھ میں آئے تھے سو آج رات کو میرانپور میں ہوں گے بطلب خط بنام والی رام پور جو آپ نے لکھا تھا وہ ہم نے کل کی تاریخ انگریزی نواب صاحب رام پور کو لکھ بھیجا ہے اور ایک خط انگریزی مکرر آج بھی حسب الدرخواست آپ کو لکھ کر ان کے پاس بھیج دیں گے۔"

سرسید اپنے "آقا" کا ذکر کرتے ہیں

"میں نہایت متامل ہوں اس اگلی بات بیان کرنے سے کہ میں اپنی نسبت آپ لکھتا ہوں اور پھر مجھ کو بھی لکھنے پر اس لئے دلیری ہوتی ہے کہ درحقیقت میں خود نہیں لکھتا بلکہ اپنے آقا کی بات بیان کرتا ہوں اور پھر مجھ کو نہایت خوشی ہوئی ہے کہ گو میرے آقا نے میری نسبت بات کہی ہو میں کیوں نہ اس کو لکھوں کہ اپنے آقا کی بات سے خوش ہونا اور اس کو بیان کر کر اپنا فخر کرنا نوکر کا کام ہے یعنی جب میں میرٹھ آیا اور بیماری نے مجھ کو کمال ستایا تو میرے آقا

مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر دام اقبالہ صاحب جج اور اسپیشل کمشنر میری عزت بڑھانے کو مجھے دیکھنے آئے اور مجھ سے یہ بات کہی کہ تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ تم نے اس نازک وقت میں بھی سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا اور باوجودیکہ بجنور کے ضلع میں ہندو اور مسلمان میں کمال عداوت تھی، اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکومت کا مقابلہ کر کے نقصان اٹھایا تھا اور جب ہم نے تم کو اور محمد رحمت خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصلت اور اچھے چلن اور نہایت طرفداری سرکار کے سبب تمام ہندوؤں نے جو بڑے رئیس اور ضلع میں نامی چودھری تھے سب نے کمال خوشی اور نہایت آرزو سے تم مسلمانوں کا اپنے پر حاکم بننا قبول کیا بلکہ درخواست کی کہ تم ہی سب ہندوؤں پر ضلع میں حاکم بنائے جاؤ اور سرکار نے بھی ایسے نازک وقت میں تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد سے سارے ضلع کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اسی طرح وفادار اور نمک حلال نوکر سرکار کے رہے۔ اس کے صلے میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر پشت ہا پشت کی یادگاری اور تمہاری اولاد کی عزت اور فخر کو رکھی جاوے تو بہت کم ہے میں اپنے آقا کا ہزار ہا شکر ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھ پر ایسی مہربانی کی اور میری قدر دانی کی۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ آمین۔"

وفادار نوکر، قدر شناس آقا

"جب ضلع ہمارے سپرد ہوا تو ہماری رائے تھی کہ پرانے لفظ منادی کے یعنی خلق خدا کی ملک بادشاہ کا حکم کمپنی صاحب بہادر کا بدلے جاویں اور بجائے ملک بادشاہ کا پکارا جاوے ملک ملکہ معظمہ وکٹوریہ شاہ لندن کا کیونکہ منادی میں ایسے الفاظ چاہئیں کہ جن سے عوام الناس بغیر شک کے یہ بات سمجھ لیں کہ درحقیقت ملک کس کا ہے اور ہمارا بادشاہ کون ہے اور ہم کس کی رعیت ہیں لیکن بلا اجازت حکام صرف اپنی رائے سے اس دستور قدیم کو بدلنا مناسب نہ جانا اور اس باب میں ایک خاص رائے دینی دوسرے وقت پر موقوف رکھی۔"

لیکن یہ چودھری محمود خاں سے کتنے خائف تھے، یہ پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر

انسپکٹر نے یہ تجویز کی کہ خود میران پور میں جناب مسٹر جارج پالمر صاحب بہادر کے پاس جاویں اور
تمام حالات ضلع کے زبانی عرض کریں اگر ممکن ہو تو چودھریوں کی صاحب ممدوح سے بھی ملاقات
کروائیں کہ اس میں صاحب ممدوح کو بھی بخوبی حالاتِ ضلع سے اطلاع ہوگی اور چودھریوں
کو بھی اور نیز سب لوگوں کو زیادہ تر طمانیت ہوگی۔ چنانچہ ۱۰ جون کو پنڈت رادھا کشن
ڈپٹی انسپکٹر ایک آدمی اپنا اور ایک سوار چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاجپور کا لے کر
روانہ ہوئے اور میران پور میں صاحب ممدوح کی ملازمت حاصل کی اور تمام حالات ضلع
زبانی عرض کیے اور بمقام دھرم پورہ جو کنارہ گنگ پر ہے چودھریوں کی ملازمت بخیالی
اور چودھریوں کو بلایا چنانچہ چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاجپور اور چودھری امراؤ سنگھ رئیس
ہلدور اور چودھری نین سنگھ رئیس بجنور دھرم پور میں گئے اور چودھری جودھ سنگھ جو پہلے
سے پار ہو گئے تھے وہ بھی آ شامل ہوئے اور ۲ اگست ۱۸۵۷ء کو صاحب ممدوح کی
ملازمت کی۔ صاحب ممدوح نے سب کی تسلی اور تشفی فرمائی اتنے میں غلغلہ پڑا کہ نواب
بجنور پر چڑھ آیا اور یہ غلط خبر دھرم پور میں پہنچی۔ چودھری صاحبوں کا اس خبر کے سننے سے
رنگ فق ہو گیا اور نہایت اضطرار کی حرکتیں کرنے لگے اور ہوش جاتے رہے۔"

انگریز ہندو کو کھٹکا ہے

نقل خط جناب جارج پالمر صاحب بہادر بنام رائے
ہمت سنگھ رئیس سہارن پور رائے صاحب مہربان
دوستان سلامت بعد اشتیاق ملاقات فرحت آیات واضح باد چونکہ صاحب کلکٹر بہادر ضلع
بجنور سے تشریف فرما ہوئے خزانہ سرکاری اور انتظام ضلع سپرد نواب محمود خاں کے کیا چند روز
کا عرصہ ہوا کہ دریافت ہوا کہ مابین نواب صاحب اور چودھریان کے فساد ہو کر نوبت مقابلے
کی پہنچی اور نواب صاحب بجنور سے نجیب آباد کو چلے گئے آپ کو واضح ہو کہ اس حالت میں
صاحب کمشنر بہادر میرٹھ نے محمد رحمت خاں ڈپٹی کلکٹر اور سید احمد خاں صدر امین کو ارشاد
فرمایا کہ باعانت رئیسان ضلع انتظام ضلع کا تا تشریف آوری صاحبان ضلع کے کریں اور

واسطے لازم ہے کہ آپ ہر طرح اُن کو مدد دیویں اور حکم ان کا مثل حکم سرکاری کے تصور کریں اور چونکہ بعض لوگوں سے دریافت ہوا کہ نواب صاحب ارادہ چڑھ آنے بجنور کا رکھتے ہیں۔ تم ایسی تدبیر کرو کہ یہ مقابلہ نہ ہونے پاوے ورنہ پھر بے انتظامی اور بربادی رعایا ہو جاوے گی اور ہمیشہ اپنے حال سے مطلع کرتے رہو۔ تحریر بتاریخ ۱۹ اگست ۱۸۵۷ء

محمود خاں کا طرزِ عمل

خود سید احمد خاں بتاتے ہیں کہ "نا محمود خاں" کا رویہ کتنا محمود اور مسعود تھا۔

نقل خط محمود خاں :-

"خان صاحب مشفق مہربان مجمع بہائے بیکراں محمد رحمت اللہ خاں صاحب ڈپٹی و سید احمد صاحب صدر امین ضلع بجنور سلمہ اللہ تعالیٰ بعد سلام شوق کے واضح ہو چوکہ نقول خط صاحب کمشنر بہادر ضلع میرٹھ و مسٹر پالر صاحب ڈپٹی کلکٹر و جنٹ مجسٹریٹ بہادر ضلع بجنور پاس تمہارے پہنچی ہے کہ ان کو بخوبی معائنہ کر کے چودھری صاحبوں کو بخوبی مضمون ان سے سے فہمائش کریں کہ یہ لوگ اپنے اپنے مکانوں میں رہیں اور اجتماع نہ ہو اور شر و فساد نہ کریں اور ہم کو کسی سے کسی طرح کا فساد کرنا بموجب حکم خطوط منظور نہیں ہے اور جو اشتہارات واسطے منادی کے بھیجا تھا۔ وہ بھی مخبر اس امر کا ہے کہ کوئی شر و فساد کریں گے تو مجرم سرکار انگریز بہادر کے ہوں گے اور چوکہ بموجب حکم صاحبان عالیشان انگریز بہادر کے اب آپ منتظم اِس ضلع کے ہیں اگر کسی سے شر و فساد ہوگا تو جوابدہی اس کی ذمہ آن مہربان ہوگی اِس صورت میں آپ کو چاہیئے کہ اس معاملے میں متوجہ ہو کر جس طرح رفع فساد کا مناسب سمجھیں ویسے کاربند ہوں اور گھاٹوں کا انتظام بھی ضرور ہے کہ اس پار سے اکثر مفسد بھی اترتے ہیں اور ہم بموجب احکام خطوط ہذا کے کاربند ہیں۔ باقی خیریت ہے۔

مُہر

محمد محمود خاں

نقل جواب جو کہ ہماری طرف سے لکھا گیا ہے

جناب نواب صاحب والا مناقب عالی مناصب عنایت فرمائے عالی نیاز مندان زاد عنایتکم۔ بعد ادائے سلام مسنون الالتماس یہ ہے عنایت نامہ آپ کا جس کے لفافے پر بکم تاریخ ۲۱ اگست لکھی تھی مع نقل خط جناب صاحب کمشنر بہادر ضلع میرٹھ اور جناب صاحب جنٹ مجسٹریٹ بہادر ضلع بجنور جو کہ صاحبان ممدوح نے آپ کے نام پر لکھے تھے آج ۲۲ اگست کو ۱۱ بجے ہمارے پاس پہنچا آپ ارقام فرماتے ہیں کہ چودھری صاحبوں کو فہمائش کرو کہ یہ لوگ اپنے اپنے مکانوں پر رہیں اور اجتماع نہ ہو اور شر و فساد نہ کریں اور ہم کو کسی سے کسی طرح کا شر و فساد کرنا منظور نہیں ہے اور جو لوگ بمقام پورینی اور ہرگن پور اور رسوا ہیڑی اور ناگل بجنور جمع ہیں وہ لوگ اپنے اپنے مکانوں پر بیٹھے جاویں چنانچہ ہم نے آپ کے ارشاد بموجب مضمون خطوط کا چودھری صاحبان کو سمجھا دیا وہ لوگ بھی بیان کرتے ہیں کہ ہم کو کسی طرح کا شر و فساد کرنا نواب صاحب سے یا اور کسی سے منظور نہیں ہے۔

ہندو کو مسلمان کا اور مسلمان کو ہندو کا ڈر

مجبوریہ جو رئیس جمع تھے وہ آپس میں صلاح کر رہے تھے کہ آیا نجیب آباد پر چڑھائی کی جاوے یا نہیں۔ چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاجپور کی یہ رائے تھی کہ [illegible] بڑھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ انجام کیا ہوگا جس طرح ہو سکے بہ صلح و آشتی چندروز ضلع تھامنا چاہیے بلکہ چودھری پرتاپ سنگھ کے نزدیک نگینہ پر بھی چڑھائی کے [illegible] اور وہاں بنیاد فساد کی پڑنی بھی نامناسب ہے۔ چودھری بدھ سنگھ صاحب رئیس ہلدور بسبب اپنی شجاعت و جوانمردی کے یہ رائے دیتے تھے کہ نجیب آباد پر یورش کی جاوے اور سب آدمیوں کو لے کر نجیب آباد پر پڑھ چلیں اور دیگر جو امیر چودھریوں صاحب نے نواب کو شکست دی تھی اس سبب سے ان کا ادب ہمت اور جرأت اور دلیری بستہ ہو گئی تھی ہم کو نجیب آباد جانے میں بہت تامل نظر آتی تھیں اور ہر گز ہماری رائے نہ تھی کہ یہ ہاتھی بلا نجیب آباد پر فتح پاوے گی اور یہ گنوار

شہر کی گلیوں میں گھس کر اور نواب کے پختہ اور مستحکم مکانات پر قابو پاکر فتحیاب ہوں گے اور یہ ہماری رائے بہت سچی اور نہایت صحیح تھی کہ کبھی اس کے برخلاف نہیں ہو سکتا بلکہ ہماری رائے میں نگینہ میں صرف ایک توپ کے سانچے پر جس کا چلنا اور چھوٹنا اور پھر اس گولے سے کسی آدمی کا مرنا صرف ایک وہمی و خیالی نہ ہونے والی بات تھی۔ اس قدر فساد ہونا نہایت نامناسب سمجھا اور میں خوب سمجھتا تھا کہ نگینہ کا فساد اگر زیادہ ہوتا گیا تو انجام کو بھی فساد ضلع کے انتظام میں خلل ڈالے گا۔ چنانچہ ہماری رائے بہت صحیح تھی کہ انجام کو ایسا ہی ہوا اور ہم بہت چاہتے تھے کہ نگینہ پر سے لڑائی موقوف ہو جائے اور جس طرح ہو سکے چند روز ضلع کو تھاما جاوے لیکن ہم یقین سمجھتے تھے کہ تھوڑی سی بھی سرکاری فوج آنے کے بعد بخوبی انتظام ہو جاوے گا اور بلاشبہ کسی مقام پر مقابلہ کی حاجت نہ پڑے گی اور حکام انگریزی کے آنے کے بعد ایک بہت بڑی بنیاد فساد کی جس سے درحقیقت ضلع میں فساد ہوتا تھا یعنی یہ ڈر کہ اگر مسلمان غالب ہوئے تو ہندو مارے اور لوٹے جاویں گے اور ہندو غالب آئے تو مسلمان تباہ اور جان سے ضائع ہوں گے بالکل جڑ سے اکھڑ جاویں گے کہ اتنے میں ہمارے پاس خبر پہنچی کہ فسادِ نگینہ موقوف ہو گیا اور ہم نے کمال خوشی سے اس کی رپورٹ بحضور جناب جارج پالمر صاحب بہادر دام اقبالہ کے روانہ کی اور درباب چڑھائی نجیب آباد کے جو ہماری رائے تھی وہ لکھ کر اس معاملے کی ہدایت چاہی۔"

اندیشہ ہائے دور و دراز

محمود خاں کی قوت و طاقت، شکوہ و تجمل، دبدبہ اور طنطنہ نے ہندو رؤسا کو اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا کر دیا، انگریزوں نے اور شہ دی نوبت جوابی تیاریوں اور کشت و خون تک پہنچی، چنانچہ انگریز اور ان کے وفادار ہمدرد بن کر مداخلت کرتے ہیں اور محمود خاں کو لکھتے ہیں کہ یہ ہندو رؤسا کہتے ہیں کہ:

"ہم نہ کسی سے لڑنا چاہتے ہیں اور نہ کسی سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں اور نہ کسی طرح کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ بعد واقعہ شیر کوٹ اور بجنور کے ہم سب لوگ اپنے اپنے گھر کو چلے گئے اور جس قدر جمعیت کہ جمع ہوئی تھی وہ سب بعد اس کے متفرق کر دی اور

چودھری پرتاپ سنگھ بھی اپنے گھر اور چودھریان ہلدور اپنے گھر چلے گئے اور چودھریان بجنور بلا جمعیت اپنے اپنے مکانوں پر مقیم رہے مگر بعد اس کے متواتر یہ خبر چودھری صاحبان نے سنی کہ آپ کا ارادہ بجنور اور تاجپور اور ہلدور پر یورش کا ہے اور آپ فوج اور جمعیت جمع کرتے ہیں اور تیاری توپوں میں مصروف ہیں اور دیہات قرب وجوار نجیب آباد یعنی موضع موسی پور اور شفیع آباد اور موہن پور اور نرائن پور اور کاروالی وغیرہ آپ نے پھونک دیئے اور لوٹ لئے۔ اس سبب کے ان لوگوں کو پھر اندیشہ اس بات کا ہوا کہ اگر ہم جمعیت جمع نہ کریں گے تو انجام کی خرابی ہوگی۔ ان وجوہات سے اُن لوگوں کا بیان ہے کہ ہم جابجا جمعیت واسطے روکنے نواب صاحب کے یورش بجنور اور ہلدور اور تاجپور سے اور برائے حفظ اپنے کے جمع کی ہے، پورینی میں جمعیت جمع ہونے کا یہ سبب بیان کرتے ہیں کہ نتھو خاں اور مینڈھو خاں ملازمان آپ کے نگینہ میں معتقدہ کرتے ہیں ایک توپ کلاں واسطے لے جانے نجیب آباد کے تیار کراتے ہیں اور تھانہ اور تحصیل کی ڈاک بجنور میں آنے نہیں دیتے اور جو احکام سرکاری جاری ہوتے ہیں ان کو رد کرتے ہیں اور اُن کی تعمیل نہیں ہونے دیتے اور ان کو خبر پہنچتی ہے کہ نجیب آباد میں آپ کے پاس قریب ہفت ہشت ہزار آدمی کے جمع ہیں اس سبب سے وہ لوگ کہتے ہیں کہ جب تک نواب صاحب اپنی جمعیت متفرق نہیں کریں گے اس وقت تک ہم کو کسی طرح پر اطمینان نہیں ہوگا اور ان لوگوں نے ہم سے یہ بھی بیان کیا کہ بعد ان دونوں لڑائیوں کے ہم نے ایک خط بنام سعد اللہ خاں صاحب نجیب آباد میں بھیجا کہ ہم سے اور نواب صاحب سے صفائی ہو جاوے اور پھر ہم نے دو خط بنام مفتی محمد اسحٰق رئیس کرتپور اس مضمون سے بھیجے کہ جس طرح پر ہو نواب صاحب سے صفائی ہو جائے۔ اس طرح نواب صاحب کی یورش کا اندیشہ جاتا رہے اور پھر تیسرا خط مفتی صاحب کے نام ان کے بلانے کو بھیجا کہ وہ ہماری طرف سے نجیب آباد کو جائیں اور آپ سے ہر طرح سے صفائی کر لیں۔ پس اس صورت میں بیان چودھری صاحبان کا یہ ہے کہ ہم کو کسی طرح شر و فساد اور مقابلہ کرنا منظور نہیں ہے، اگر نواب صاحب اپنی جمعیت اور فوج کو متفرق کر دیں

اور توپوں کے بنوانے میں مصروف نہ ہوں اور ارادہ لڑائی کا موقوف کردیں تو ہم بھی سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاویں گے اور جوکہ ہم نیاز مند بھی بدل وجان اس بات بھی مصروف و ساعی ہیں کہ کس طرح شر و فساد نہ ہو اس واسطے آپ کی خدمت میں بخیر خواہی آپ کے التماس یہ ہے کہ آپ بھی جمع کرنا فوج کا اور تیاری توپوں کی موقوف فرمادیں اور مارے اور سنبڈھوں خاں وغیرہ مفسدان کا فساد سے باز رکھ کر اپنے قبضے میں رکھیں تو غالب ہے کہ چودھری صاحب بھی سب اپنے اپنے گھر چلے جاویں گے اور سب طرح کا انتظام ضلع ہو جاوے گا اور مخلوق خدا اور رعایا سرکار کی امن وامان میں رہے گی اور پھر اگر کوئی شخص فساد شروع کرے گا تو اس کی اطلاع مفصل بجنور جناب صاحب کمشنر بہادر کے کردی جاوے گی اور اس کا نتیجہ بہت بد اس کے حق میں ہوگا اور یہ بھی آپ کو واضح ہو کہ متواتر احکام حکام والا مقام ہمارے نام پہنچتے ہیں۔ چنانچہ صاحب جنٹ مجسٹریٹ بہادر خود گنگا کنارے پر تشریف لائے تھے اور اب یہ انتظار آنے فوج سرکاری کے میران پور میں مقیم ہیں اور جناب صاحب کلکٹر بہادر بھی کوہ منصوری سے اتر کر میرٹھ میں تشریف لائے ہیں اور احکام جناب کمانڈران چیف صاحب بہادر اور جناب گورنر بہادر واسطے روانگی فوج کے بجنور کو صادر ہو چکے ہیں کہ بہت جلد فوج اور توپوں کے میران پور کے مقام پر پہنچتی ہے اور بعد میں کے جناب صاحب کلکٹر بہادر اور جناب صاحب جنٹ مجسٹریٹ بہادر اور جناب صاحب کمشنر بہادر اور جناب مسٹر ولسن صاحب بہادر بجنور میں تشریف لائے ہمیں ہماری آرزو ہے کہ تا تشریف آوری حکام والا مقام سب لوگ اپنے مکانوں پر بہ آسائش رہیں بعد تشریف لانے حکام کے خود صاحبان ممدوح جس طرح پر مناسب جانیں گے بندوبست ضلع کا فرما دیں گے والسلام :۵

ہندو مسلم فساد برپا کرانے۔ ہندو مسلم افتراق کی خلیج وسیع کرنے اور جنگ آزادی کو فرقہ وارانہ جنگ میں تبدیل کرانے کے بعد یہ مشورہ کتنا دلچسپ ہے کہ فوج منتشر کردو، ہتھیار

گلا دو ۔۵

حضرتِ ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی ہم کو یہ تو بتلا دو کہ سمجھائیں گے کیا؟

صلہ وفا

لیکن ہندوؤں کا ساتھ دینے کا انجام کیا ہوا؟ سید صاحب فرماتے ہیں:۔
ہندوؤں کو مسلمانوں سے اس قدر عداوت ہو گئی کہ چند آدمی جو اتفاقیہ بلدوہ میں دار دتھے۔ وہ بھی مارے گئے گنوار بخوبی پکار پکار کر ہم لوگوں کی نسبت اور ڈپٹی صاحب کی نسبت صاف صاف کہتے تھے کہ یہ لوگ چودھریوں سے ملے ہوئے ہیں مگر مسلمان ہیں ان کو بھی مار ڈالنا چاہیئے مگر چودھری رندھیر سنگھ نے ہماری بہت حفاظت کی اور کہلا بھیجا کہ دروازہ مضبوط بند کر کے اندر بیٹھے رہو اور کسی اپنے نوکر کو بھی باہر نہ نکلنے دو ایسا نہ ہو کوئی مار ڈالے اس سبب سے تین روز تک ہم کو بلدہ میں پانی اور کھانے کی بہت تکلیف رہی۔"

مسلمانوں کا قتلِ عام

اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ:۔
"جس وقت رئیسانِ نگینہ نے مردمان اور سپاہیان نجیب آباد کو نگینہ سے رخصت کر دیا تھا اور سب لوگ نجیب آباد چلے گئے تھے اس وقت رام دیال سنگھ کا رہنا نہایت نامناسب اور بنیاد فساد کی تھا۔ فی الفور رام دیال سنگھ کو واپس آنا چاہیئے تھا۔ ہم نے تھانہ دار نگینہ میں بھیجا تھا اور مولوی قادر علی تحصیلدار کو واسطے بھیجنے نگینہ کے بلایا تھا ہم عزت رئیسوں کی معرفت وہاں کا انتظام کر لیتے مگر ہر چند ہم نے کہا کہ رام دیال سنگھ کو واپس بلانا چاہیئے مگر افسوس ہے کہ ہماری یہ بات وہ تھی جس کا ہمارے مددگاروں کے دل میں پہلے سے کرنا اس کا نہ تھا۔ بتسوئیانِ نگینہ جو قدیمی مفسد اور شورہ پشت ہیں زیادہ تر مفسدہ کے باعث ہو گئے اور نگینہ میں فساد کروا دیا۔ مسلمانوں نے دیکھا کہ بدستور ہندو مالک اور حاکم ہیں اور ہندو جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اور مسلمانوں کو مارتے ہیں جیسا کہ نگینہ میں پیش آیا اکثر آدمی نجیب آباد چلے گئے نواب نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے محمدی جھنڈا کھڑا کر دیا اور دفعتاً ضلع میں فساد برپا ہو گیا اور نئی لڑائی قائم ہو گئی۔ چنانچہ میں جو ہم پر آفت پڑی گو اصلی منشا اس کا یہ تھا کہ ہم سرکار کے خیر خواہ اور طرفدار

تھے اور علانیہ سرکار کی طرفداری کر کر انتظام ضلع کا اٹھا لیا تھا لیکن اس قدر عام بلوے کے برپا ہونے کا یہ سبب تھا اور سب بلوائی پکار پکار کر کہتے تھے کہ چودھریوں سے سازش کر کے نگینہ میں مسلمانوں کو مروایا اور لوگوں کی جورو بیٹے کی بے عزتی کروائی اور بلدور میں اپنے سامنے مسلمانوں کو ذبح کروایا ہے اب ہم زندہ نہ چھوڑیں گے۔ چنانچہ یہ سب باتیں ہم اپنے کان سے سنتے تھے اور بلدور سے حلوائیاں اور چھیپیوں کے زخمی مرد اور عورت اور بچے جو بچ کر بھاگے تھے وہ تھوڑی دیر پہلے ہم سے جا نور پور پہنچ چکے تھے ان کا حال دیکھ کر زیادہ تر لوگ ناراض ہو رہے تھے کہ ہم بے گناہ دفعتاً وہاں جا پہنچے فہمیدہ آدمی تو سمجھ گئے کہ یہ کام انہوں نے نہیں کیا مگر جاہل لوگوں نے نہ مانا۔"

محمود خاں کی حکومت

"اس معرکہ کے بعد تمام ضلع میں نواب کی بے کھٹکے حکومت ہو گئی اور جملہ مشیرانِ نواب انتظامِ ضلع کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ رائے قرار پائی کہ جملہ چودھریوں سے صفائی کی جاوے اور جلال الدین خاں نائب نواب اور مختارِ کل مقرر ہوا۔ جلال الدین خاں کو اس عہدے پر مقرر کرنے کا سبب یہ تھا کہ احمد اللہ خاں سے سب چودھری سخت ناراض تھے اگر وہی مختار رہتا تو چودھریوں سے صفائی ہونے میں وقت پڑتی دوسرا یہ سبب تھا کہ ان دنوں میں روپے کی بہت ضرورت تھی اور احمد اللہ خاں کو روپیہ ملنا دشوار تھا اور جلال الدین خاں کو لوگ معتبر سمجھتے تھے اور اس کی معرفت بیل روپے کی یا سانی متصور تھی چنانچہ مسودہ اقرار نامہ مختاری کل تحریر ہوا اور جملہ چودھریوں میں گفتگو اور پیغام سلام صفائی کے ہونے لگے۔"

محمود خاں کی انتظامی کونسل

"ایک کونسل مقرر ہوئی کہ جو انتظام ضلع کا ہو کونسل سے ہوا کرے چنانچہ جو روبکاری نامحمود خاں نے اس معاملے میں لکھی اُس کی نقل بعینہ اس مقام پر لکھی جاتی ہے۔

"روبکاری محکمہ بہ اجلاس امیر الدولہ مختار الملک ذوی القدر نواب محمد محمود خاں بہادر مظفر جنگ واقع ۱۳ ستمبر ۱۸۵۷ء چونکہ اس جانب نے بسبب بدانتظامی

ضلع بجنور کے محمد احمد اللہ خان بہادر و محمد احمد یار خاں و محمد شفیع اللہ خاں واخوندہ زادہ عبد الرحمن خان و سید احمد خان کو بہ نظر رفاہ خلائق اور واسطے انتظام ملکی و مالی ضلع بجنور کے اپنی طرف سے مختار کار عام مقرر کیا اور کل انتظام ضلع کا سپرد صاحبان مرقومہ بالا کے کیا تو ضرور ہے کہ جو معاملات بیچ انتظام ملک خواہ پرداختجات وچپھیات و رقعہ جات یا اور کوئی امر متعلقہ نظامت و فوجداری اجراء پاوے تو بصلاح مشورہ صاحبان مرقومہ بالا کے تجویز ہو کر روبرو ایں جانب پیش ہووے اور ایک عرضی بھی سب صاحبان کی طرف سے مشعر باطلاع اتفاق رائے کے گزرنی چاہیئے تو اس وقت ہونا حکم منظوری تجویز یا دستخط ایں جانب مناسب ہوگا

لہذا حکم ہوا

جو امر تجویز صاحبان مرقومہ بالا سے اجرا پاوے تو بالاتفاق سب صاحبوں کے تجویز ہو کر مع قطعہ عرضی کے ہمارے روبرو پیش ہو۔ جب دستخط اور حکم ہمارا ہوگا اور درصورت خلاف رائے صاحبوں کے کوئی امر تجویز کیا ہو کسی کا تو قابل پذیرائی کے نہ ہوگا اطلاعاً نقل روبکار ہذا کے پاس ان پانچوں صاحبوں کے بھیجی جاوے اصل روبکار سررشتہ میں رہے!"

کیا اسی طرح کا انتظام کبھی انگریزوں نے کیا تھا؟

محمود خاں کی مہر

اسی زمانے میں نئی مہریں فوجداری اور نظامت کی نام محمود خاں اور احمد اللہ خاں سے بنوائیں اُن مہروں پر الفاظ وللہ ملک السموات والارض بڑھایا اور بجائے سنہ عیسوی کے سنہ ہجری لکھے گئے۔"

محمود خاں ہندوؤں سے صلح رکھنا چاہتا تھا

"چودھری بدھ سنگھ اور چودھری مہاراج سنگھ نے ارادہ کیا کہ

پھر ایک دفعہ نواب سے مقابلہ کیا چاہیئے اور اپنی برادری کو خطوط لکھے اور چودھری پرتاب سنگھ سے بھی کمک چاہی۔ چنانچہ موضع پھینیہ میں لام جمع ہوا اور چودھریان کانٹھ اور ان سب کے مع جرنیل چودھری پرتاپ سنگھ کی طرف سے اور گلاب سنگھ چکارسی ڈالا اور کچھ زمیندار پھینیہ کے اور زمیندار دیہات کے مع چودھری بدھ سنگھ صاحب کے پھینیہ میں جمع ہوئے اور کچھ آدمی ہلدور میں اکٹھے ہوئے اور یہ سارا لام جمع ہو کر بارادہ چڑھائی نجیب آباد روانہ ہوا۔ احمد اللہ خاں نے یہ خبر سن کر کچھ فوج اپنی بمقام نگینہ اور کچھ فوج بمقام کرتپور زیر افسری تفضیع اللہ خاں روانہ کی اور ادھر سے چودھری صاحب اپنا لام لے کر اٹھارہ ستمبر ۱۸۵۷ء کو متصل پٹپراولی کے پہنچے اور جانبین میں مقابلہ شروع ہوا۔ تھوڑی لڑائی کے بعد چودھری صاحب کو شکست ہوئی۔ تمام گنوار جمع ہوئے تھے بھاگ نکلے اور ایک ہوردتی توپ چودھریان ہلدور کی جس کا کڑہ خاں نام تھا مع تین جرنیلوں اور دو گردوں کے نواب کی فوج نے چھین لئے اور چودھری بدھ سنگھ اور مہاراج سنگھ ہلدور ہوتے ہوئے پھر پھینیہ میں پہنچے اس فتح میں تفضیع اللہ خاں کا بہت بڑا نام ہوا اور لقب بہادری اس کو دیا گیا اور جرنل جرار بھی کہلانے لگا۔ چنانچہ اکثر کاغذات میں اس کا یہ لقب دیکھا گیا۔

اس لڑائی کے بعد احمد اللہ خاں اور نواب کے مشیروں نے چاہا کہ یا جمہ چودھریان کی بیخ کنی کر دی جائے ورنہ وہ لوگ مقابلے سے باز نہ آویں گے اور ان کی طرف کا کھٹکا رفع ہو گا یا ان سے بخوبی صلح و صفائی ہو جائے، چودھری صاحبان بھی درصورت طمانیت رفع فساد چاہتے تھے۔ چنانچہ ادھر سے چودھریوں نے بھی پیغام صلح بھیجے اور خطوط بھی لکھے۔ جن کا حاصل یہ تھا کہ بہ سبب خوف بدسلوکی اور اندیشہ جان آبرو کے حاضر نہیں ہو سکتے، ہر چند نواب کی طرف سے چودھریوں کی تشفی ہوتی تھی مگر ان کو طمانیت نہ ہوتی تھی اور اعتبار نہ آتا تھا۔ چنانچہ سعد اللہ خاں کے خط کی نقل جو بنام چودھری پرتاپ سنگھ صاحب کے اس معاملے میں ۲۰ جون ۱۸۵۷ء کو تحریر ہوا بجنسہٖ لکھتے ہیں۔

نقل خط سعد اللہ خاں بنام چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاج پور

"چودھری صاحب مشفق مہربان دوستان سلمہ اللہ تعالیٰ بعد سلام شوق واضح ہو کہ خط تمہارا پہنچا حال دریافت ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے کچھ بُرے دن آ گئے ہیں۔ ورنہ ہرگز تم سے ایسی بات ظہور میں نہ آتی کہ تم مجھ سے اندیشہ کرتے ہو، میں تم کو اپنے فرزند سے کمتر نہیں جانتا جبکہ تم کہنے میرے سے باہر ہو تو پھر کیا علاج کروں، چاہیے کہ بلا اندیشہ تم تگینہ میرے پاس چلے آؤ اور کچھ اندیشہ کسی طرح کا مت کرو، اگر میرے پاس نہ آؤ تو جو کچھ تدبیر تمہارے نزدیک ہو وہ کرو اگر ایسی ہی لیت و لعل میں رہو گے زیر بار ہو جاؤ گے۔ تاکید جانو اور بلا اندیشہ چلے آؤ اور جب تم مجھ کو مربی جانتے ہو تو پھر کیا خوف ہے ہرگز ہرگز خوف نہ کرو زیادہ خیریت ہے اور اسی شب روانہ ہو کر میرے پاس آ جاؤ اور مجھے تمہاری حیرانی کا بڑا اثر دہے واللہ باللہ اگر میں تم کو محمد اسماعیل سے کمتر جانتا ہوں تو خدا اس کا آگاہ ہے اور تم کو بھی معلوم ہے فقط ۲۲ صفر سنہ ۱۲۷۴ھ"

منافقت، حیلہ گری، فریب

"غرض کہ سعد اللہ خاں کی معرفت پیغام صفائی اور حاضر ہو جانے کے چودھری پرتاپ سنگھ صاحب سے ہوئے اور نتھے خاں نے چودھری امراؤ سنگھ صاحب رئیس شیر کوٹ سے گفتگو صفائی کی اور غضنفر علی خاں بڑا بیٹا نا محمود خاں کا مع ازمت خاں اور لشکر کے نہٹور روانہ ہوا اگر چودھریان بلدور حاضر ہو جاویں تو بہتر ورنہ پھر بلدور کو تباہ کیا جاوے گا اور میراج سنگھ پورینی والا اور لیکھراج سنگھ نہٹور والا کی معرفت چودھری رندھیر سنگھ کو پیغام بھیجے گئے بعد گفتگو اور طمانیت کے چودھری رندھیر سنگھ نہٹور میں آنے پر راضی ہوئے اور ۵ ستمبر ۱۸۵۷ء کو چودھری صاحب نہٹور میں آئے اور غضنفر علی خاں نے ایک دوشالہ بطور خلعت ان کو دیا اور یہ بات کہی کہ چودھری بدھ سنگھ اور چودھری مہاراج سنگھ کو بھی حاضر کرو انھوں نے کہا کہ بلا دوں گا بعد ملاقات کے چودھری رندھیر سنگھ صاحب بلدور کو رخصت ہوئے اور یعقوب علی خاں رامپوری ... خاں

اور مان سنگھ بجائے بلکھراج کا واسطے لانے چودھری بدھ سنگھ اور مہاراج سنگھ کے ان کے ساتھ ہو گئے اور وہاں سے موضع پھینہ میں چودھری صاحبوں کے پاس پہنچے مگر چودھری بدھ سنگھ اور مہاراج سنگھ نہ آئے اور بہ لطائف الحیل تانے سے انکار کر دیا اور کئی دن بعد گنگا پار بہ حضور حکام چلے گئے۔

محمود خاں کا حسن سلوک انگریزوں کے جاسوس ہندوروسا سے

"آخرکار بعد نامہ وپیام یہ بات ٹھہری کہ چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاجپور موضع پوبنی میں آویں اور سعد اللہ خاں سے زبانی گفتگو کر کے تاجپور واپس چلے جاویں چنانچہ پرتاپ سنگھ پوبنی میں آئے اور سعد اللہ خاں نگینہ سے پوبنی میں گیا اور چودھری پرتاپ سنگھ کا ہاتھ پکڑ کر ہاتھی پر بٹھا لیا اور نگینہ لے آیا۔ اس کے بعد چودھری امراؤ سنگھ رئیس شیرکوٹ نگینہ میں آئے اور سعد اللہ خاں سے ملاقات ہوئی اور جب نامحمود خاں کو خبر پہنچی کہ دونوں چودھری نگینہ آگئے ہیں اس نے سعادت اللہ خاں کو خط لکھا کہ دونوں چودھریوں کو نجیب آباد لے آؤ۔ سعد اللہ خاں ان لوگوں کو نجیب آباد لے گیا اور ۲۶ ستمبر کو چودھری صاحبوں کی ملاقات نامحمود خاں سے ہوئی دونوں چودھری صاحبوں نے کچھ اشرفیاں نذر دیں اور نامحمود خاں نے ایک ایک دوشالہ بطور خلعت ان کو دیا اور دوسرے دن رخصت کر دیا۔

ہندو روسا محمود خاں کی تباہی چاہتے تھے

"چودھری بدھ سنگھ اور چودھری مہاراج سنگھ جو میرٹھ میں بحضور حکام حاضر تھے انہوں نے بار بار جناب کمشنر بہادر میرٹھ سے عرض کیا کہ اگر تھوڑی سی بھی کمک ہم کو ملے تو ہم پھر نامحمود خاں سے مقابلہ کریں اور اس کو ضلع سے خارج کر دیں اور پھر ہم اپنی برادری کے بہت سے لوگ جمع کر لیں گے اگرچہ جناب صاحب کمشنر بہادر کو اس میں تامل تھا۔ مگر بہ سبب اصرار بار بار عرض کرنے چودھریان جناب کمشنر بہادر نے اس کی کمک تجویز کی اور لالہ گور سہائے ناظم حسن پور کے پاس جس قدر کمک تھی اس کا ساتھ کرنا اور کچھ فوج راؤ گلاب سنگھ رئیس کا کمک کر دینا تجویز کیا اور جملہ رعیان ضلع کے نام حکم نامہ جاری کئے کہ کوئی شخص نامحمود خاں کی اعانت نہ کرے۔ اگر کرے گا تو مجرم کا

۱۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو یہ سب امور تجویز ہوئے اور حکم نامے جات بنام رئیسان ضلع بجنور تحریر ہوئے اور چودھری صاحبان کو میرٹھ سے رخصت کیا "

رندھیر سنگھ کی منافقت کا انجام

"ہلدور میں چودھری رندھیر سنگھ مع قدرے جمعیت کے موجود تھے۔ جب انہوں نے احمد اللہ خاں کے لشکر کے آنے کی خبر سنی حویلی میں محصور ہو گئے۔ لشکر احمد اللہ خاں نے حویلی کو گھیر لیا طرفین کی طرف سے گولیاں چلتی رہیں اور آدمی بھی مارے گئے آخر کار رات کے وقت چودھری رندھیر سنگھ نے اپنے ساتھ کے آدمیوں کو اجازت دی کہ جس طرح چاہیں اپنی جان بچاویں اور حویلی میں سے نکل جاویں۔ چنانچہ اکثر آدمی نکل گئے صبح کو ۳ نومبر ۱۸۵۷ء احمد اللہ خاں کا لشکر حویلی میں داخل ہوا اور چودھری رندھیر سنگھ کو گرفتار کر لیا' رام دیال سنگھ پھوپھی زاد بھائی رندھیر سنگھ کا اور پانچ چھ آدمی رشتہ مندان کے مارے گئے اور چودھری رندھیر سنگھ کو قید کر کے براہ نگینہ نجیب آباد لے گئے اور ایک مکان میں نظر بند کر دیا جس قدر اسباب ہلدور میں تھا سب لٹ گیا اور مکانات چودھریان ہلدور کے جلا دیے گئے اور ہلدور ویران محض ہو گیا۔

بلکہ احمد اللہ خاں اور ماڑے خاں چاندپور سے ہلدور کو روانہ ہوتے تھے یعنی ۲ نومبر ۱۸۵۷ء کو اس وقت ماڑے خاں نے چودھری پرتاپ سنگھ کو خط لکھا کہ میرا لشکر عنقریب تاجپور میں چودھری پرتاپ سنگھ کو پہنچے گا انہوں نے جانا کہ میرا بھی یہی حال ہونے والا ہے اس لئے تدبیر روانگی کی کر کے ۵ نومبر ۱۸۵۷ء کو تاجپور سے روانہ ہوئے اور ۷ تاریخ کو گڈھ مکتیسر میں پہنچے۔

عہد محمود خاں کا امن و امان

"اس ہنگامے کے بعد نواب محمود خاں اور اس کے ہمراہی سب طرف سے بے فکر ہو گئے اور چودھریوں میں سے کسی کا اندیشہ ان کے دل میں نہ رہا اور عیش و عشرت میں مشغول ہو گئے۔ گنگا پار کے جو بائی تھے انہوں نے بھی اپنے لئے بجنور سے زیادہ کوئی امن نہ دیکھا۔ چنانچہ دلیل سنگھ اور قدم سنگھ گوجر اور رضا حسن عرف کپتن اور عنایت علی خاں قاضی تھانہ بھون مع اپنے رفیقوں اور ساتھیوں کے اس

ضلع میں آئے - اس ضلع کے باغیوں نے ان کو امن دیا - ان کے سوا مرزا لطاف اور مرزا حاجی اور مرزا مبارک شاہ زادگان مفرور دہلی اِس ضلع میں آئے اور نا محمود خاں اور مارڈے نے بہت عزت اور توقیر کی ؎

...... اور تلوار ٹوٹ گئی

حالات نامساعد تھے، فضا مخالف تھی، منزل ناپید تھی، لیکن کچھ صاحبانِ عزم وہمت ایسے تھے جو اقبال کی زبان میں نعرہ لگا رہے تھے۔

ترا بحر پرسکوں ہے، یہ سکوں ہے یا کہ خوں ہے؟
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں، نہ خرابیٔ کنارہ،

انھوں نے پرسکون سمندر میں، تلاطم پیدا کر دیا، انہوں نے نہنگوں سے مقابلہ کیا، طوفانوں سے ٹکر لی اور خرابی کنارہ سے ہمت نہ ہاری، ان کے دست و بازو شل ہو چکے تھے تلوار ٹوٹ چکی تھی، رفیقانِ راہ، یا تو جوارِ رحمت میں پہنچ چکے تھے، یا گوشہ عافیت میں یا دشمن کے کیمپ میں، لیکن نہ ان کے تیور میں فرق آیا، نہ حوصلہ اور ہمت میں، یہ

دباتے رہے ۔۔۔ اس وقت تک لڑتے رہے، جب تک خون کا آخری قطرہ بھی اپنے مقصد عظیم و جلیل پر نچھاور نہ کر دیا۔

یہ داستان خاصی طویل ہے، لیکن اسے مختصر کر کے آئندہ صفحات میں پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، یہ وہ داستان ہے جو مختصر ہونے کے باوجود، ناقابلِ فراموش ہے، آج کی قوم کے لئے بھی، اور کل کی آنے والی نسلوں کے لئے بھی،

مولانا احمد اللہ شاہ

مولانا احمد اللہ مدراس کے رہنے والے تھے اونچے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ سنِ تمیز کو پہنچے تو علم سینہ اور علم سفینہ کے ماہر ہو چکے تھے معقول اور منقول پر گہری نظر رکھتے تھے چاہتے تو عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے لیکن قدرت نے انھیں چشمِ حیران اور دلِ بے تاب کی دولت سے نوازا تھا وہ غیور اور حساس طبیعت کے مالک تھے۔ مسلمانوں کے ادبار و زوال نے ان کی روح میں ہلچل برپا کر دی تھی ان کا سینہ محشرستانِ جذبات بنا ہوا تھا مسلمان تباہ ہو چکے تھے مسلمان امراء و جاگیردار خوابِ خرگوش میں مست تھے نہ فکرِ امروز نہ فکرِ فردا۔ اسلامی حکومتیں ایک ایک کرکے مٹ رہی تھیں۔ میسور اور سرنگاپٹم کی اسلامی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ حیدرآباد اپنی غداری کے باعث سلامت تھی لیکن شکنجہ میں جکڑا ہوا دلی میں مغلیہ خاندان کا چراغ بہادر شاہ ظفر کی صورت میں ٹمٹما رہا تھا بادِ تند کے جھونکے اسے بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اودھ میں امجد علی شاہ کا آفتابِ حکومت گہن میں آچکا تھا۔ انگریزوں کا تسلط مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔

ان کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی دوسرے میں انجیل۔ تلوار اس لئے تھی کہ جس آدمی میں خودی، خودداری، سرکشی، بغاوت، آزادی اور حریت کے جراثیم پائے جائیں اس کی گردن تراش دی جائے۔ انجیل اس لئے تھی کہ مرعوب و دہشت زدہ، آشفتہ روزگار، پریشان حال، مفلس اور قلاش لوگوں کو مسیح کے گلہ میں شریک کرلیا جائے۔ مولانا احمد اللہ شاہ کے جذبہ جہاد، جوشِ پیکار اور شوقِ شہادت کا یہ پس منظر تھا۔

مولانا ایک مجذوب صفت قلندر وضع اور درویش منش بزرگ تھے۔ وہ دلی پہنچے، آگرہ آئے۔ گوالیار گئے۔ لکھنؤ میں قیام کیا، فیض آباد پہنچے، جہاں بھی گئے۔ انگریزوں سے نفور، نشۂ جہاد سے مخمور، نہ تن کی پروا، نہ جان کا ہوش، حضرت محراب شاہ گوالیاری کی نظر کیمیا اثر نے رنگ اور چوکھا کردیا۔ آگرے میں محبوبیت اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کی مجلسِ وعظ میں "دس دس ہزار" آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔[1] لکھنؤ میں شروع شروع میں ان کا قیام گھسیاری منڈی میں تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہنومان گڑھی کے سلسلہ میں مولانا سید امیر علی کی شہادت کا حادثہ ابھی تازہ تھا۔ اس حادثہ نے ان کے جوش میں بھی اضافہ کیا اور مقبولیت میں بھی اور شاید یہی چیز تھی جو فیض آباد لے گئی۔ وہاں انگریزوں نے آنکھ دکھائی یہ لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے بالآخر گرفتار کر کے جیل بھیج دیئے گئے۔

غدر شروع ہوا تو فیض آباد کا جیل بھی ٹوٹا اور مولانا لکھنؤ پہنچ گئے۔[2] یہاں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ حضرت محل نے ان کے لئے دیدہ و دل فرشِ راہ کیا۔ لکھنؤ کے عوام نے ان کی خاک پا کو سرمۂ چشم بنایا۔ لکھنؤ میں مولانا نے تارے والی کوٹھی میں سکونت اختیار کی اور اسی میں اپنا دربار قائم کیا۔ باغی فوجوں کے افسر یہیں جمع ہو کر مشورے کیا کرتے تھے۔[3]

---

[1] دلاور جنگ مولانا احمد شاہ (مصنفہ ستمبر ۱۹۴۳ء)

[2] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۰۳

[3] گذشتہ لکھنؤ (عبدالحلیم شرر) صفحہ ۴۴

لکھنؤ آنے کے بعد مولانا نے بڑی حد تک جنگ کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی کچھ مولویت کچھ جوش جہاد کچھ جوش و خروش کچھ انگریز دشمنی اِن سب چیزوں نے مل کر ان کی عظمت و اہمیت دو چند کردی تھی

بیلی گارد پر حملہ

بیلی گارد پر حملہ میں یہ پیش پیش تھے، ان کا جوش اور رفیقانِ راہ کی گریز پائی دیکھیے :-

"غرض چھ دن اور رات تک طرفین سے مینہ گولے اور گولیوں کا برستا رہا۔ جمعہ کے دن وقت عصر احمد اللہ شاہ نے دھاوا کیا۔ بیلی گارد کے زیر دیوار پھاٹک پر جا پہنچا۔ محصورین بیلی گارد کہتے ہیں کہ اس وقت ہم سب کو یقین اپنی ہلاکت کا ہو گیا۔ کس واسطے کہ سپاہی گورے اور ہندوستانی جتنے مورچوں پر تھے کئی دن کے علی الاتصال لڑنے سے تھک گئے تھے ہاتھ پاؤں کی سب کی سکت جاتی رہی تھی خصوصاً میموں کا حال اضطراب و سراسیمگی اس وقت کا بیان سے باہر ہے۔ سب کے سب تہہ خانہ جنرل لو صاحب میں خوف سے جا کر چھپ گئے اور موت ہر ایک کی نظر میں پھر گئی۔ شاہ جی پھاٹک کی آڑ میں اپنے مجاہدین کو پکارا کئے کہ بس اس حملے میں ان سب کا کام تمام ہے مگر کسی کی جرأت قدم آگے بڑھانے کی نہ رہی[1]۔"

شیعہ سنی مفسدہ

بدقسمتی سے مولانا احمد اللہ اور حضرت محل کے معتمد خاص ممّو خان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ یہ اختلاف اقتدار کی کشمکش پر مبنی تھا۔ ممّو خان کی خواہش تھی کہ سب کچھ اُسی کے ہاتھ میں رہے مولانا چاہتے تھے بغیر ان کی مرضی کے کوئی کام نہ ہو مصارف جنگ کے لئے ممّو خاں نے شہر کے دولتمندوں، مہاجنوں اور سرمایہ داروں پر جبری ٹیکس عائد کیا۔ مولانا نے اسے ناپسند کیا۔ دونوں میں باقاعدہ کش مکش کا آغاز ہو گیا اور یہ کشمکش اتنی بڑھی کہ دونوں ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو گئے اگر یہ ذاتی اختلاف تک محدود رہتی تو شاید زیادہ ناگوار صورت

---

[1] تبصر التواریخ ج ۲ صفحہ ۳۲۰

پیدا نہ ہوتی لیکن بدقسمتی سے بہت جلد یہ شیعہ سنی کشمکش میں تبدیل ہوگئی، مولانا شرر فرماتے ہیں۔

"احمد اللہ نام ایک شاہ صاحب جو فیض آباد کے باغیوں کے ساتھ آئے تھے اور کئی معرکوں میں رہ چکے تھے وہ الگ اپنا رعب جما رہے تھے بلکہ خود اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے برجیس قدر کے مقابل لکھنؤ ہی میں ان کا دربار الگ قائم تھا۔ اور دونوں درباروں میں پولیٹکل اختلاف کے ساتھ شیعہ سنی کا جھگڑا اور تعصب بھی نمایاں ہونے لگا۔ غرض بادشاہ اور شاہ صاحب میں رقابت بڑھتی جاتی تھی[1]

دونوں کی ضد نے خاک میں ہم کو ملا دیا

مولانا احمد اللہ اور ممو خاں کی کشمکش لازمی طور پر جنگ کی سرگرمی پر اثر انداز ہوئی۔ سپاہیوں میں بددلی پھیلی، ان کی وفاداری مشتبہ ہوئی ارباب اقتدار اپنی اپنی سوچنے لگے، غداروں، منافقوں اور جاسوسوں کو اپنی کارگزاری دکھلانے کا موقع ملا۔ عالم باغ اور دل کشا کی جنگ اس ٹریجڈی کا عبرت انگیز مرقع ہے

۹، نومبر عیسوی فوج انگریزی عالم باغ سے دلکشا ہو کر بیلی گارد کو رمنہ شاہی سے یا شارع عام سے جا رہی تھی کہ ایک سوار خبر لایا کہ گورے بڑھتے آتے ہیں۔ فوج باغی پیچھے ہٹی آتی ہے راجہ مان سنگھ نے تصدیق خبر کو اپنا ہرکارہ بھیجا وہ بھی خبر لایا گی ہے۔ فوج بہادر بھاگتی چلی آتی ہے۔ یہ سن کر راجہ نے بھی اپنا سامان چلے جانے کا درست کیا۔ در دولت پر اطلاع ہوئی۔ ممو خاں نے ہرچند فوج کو مع افسر روانہ کیا مگر جو گیا خدا کے فضل سے اپنا بھاگ لے کر آیا۔ ایک اور ہرکارہ خبر لایا کہ محمد باغ کو گوروں نے لے لیا۔ وہاں کی فوج سب بھاگ آئی جب گورے اُن کی طرف بڑھے ان کی صورت دیکھ کر بھاگے کوئی سامنے نہ ٹھہر سکا۔ یقین ہے دوپہر تک یہاں اور شہر میں گورے داخل ہو جائیں یہ سن کر

---

[1] گذشتہ لکھنؤ (عبدالحلیم شرر) صفحہ ۵۹

تمو خاں نے مجاہد الدولہ علی خاں عرف چھوٹے میاں کو بلوا کر کہا کہ کمپنی نصیر آباد جو
دلی سے آیا تھا تمھارے سپرد ہے تم اس کے افسر ہو پہلے وہ سات روپے کی تنخواہ
پر راضی نہ تھے اب اونے بارہ روپے کا اقرار کیا ہے چار ہزار واسطے چبینے کے
دے کر جلد روانہ کرو احمد اللہ شاہ سے بھی دھاوے کو کہلا بھیجا۔ انہوں نے
بھی جواب دیا میرے سپاہی بھوکے ہیں۔ دو ہزار انھیں بھی بھجوا دو۔ اسی
عرصہ میں گورے میدان دلکشا آ پہنچے۔ مقابلہ ہوا امجد علی خاں نے پانچ سو آدمیوں
سے دھاوا کیا بڑی بہادری کی جب نوبت تلوار و سنگین تک پہنچی یہ سب مارے
گئے۔ احمد اللہ شاہ اور احمد علی نے بھی دھاوا کیا پیش نہ گیا۔ اس وقت تلنگوں
نے کہا یہاں کے کارتوس میں بھوسی بھری ہے۔ یہ سبب ہے کہ سب اہلکار انگریز
سے ملے ہیں جو توپ ہم مارتے ہیں ان پر کچھ اثر نہیں کرتی ان کی توپ سے
ہمارے سب سپاہی مر جاتے ہیں۔ اس وقت دیر دولت رائے گر داروغہ میر
واجد علی کو گھبرا انہوں نے اپنی حکمت عملی سے ٹالا۔ وہ سپاہی جو دلی
سے آئے تھے پیچھے چلے گئے پھر تمو خاں کو گھیرا بھوسی گرابوں میں کس سے
بھری ہے۔ انھوں نے میر محمد علی کو عہدہ ناظم علی داروغہ میگزین کو بلایا
اور محمد علی جو گراب بناتا تھا اس کا سامنا کر دیا۔ اس نے کہا دستور گراب
بنانے کا یہ ہے کہ اس میں بھوسی پڑتی ہے۔ تلنگوں نے کہا کہ یہ سب جھوٹ ہے
تم سب انگریز سے ملے ہو ہم تم سب اہلکاروں کو مار ڈالیں گے غرض پھر جناب
عالیہ کے حضور سے تمو خاں کو اپنے ساتھ لے گئے اور گالیاں دے کر کہا یہ انگریز
سے ملا ہے۔ اس وقت روبرو سے جناب عالی و نواب روبکاری۔ تمو خاں
کو بچایا اور کہا تمہارا شبہ جس پر ہو اسے مار ڈالو۔ تلنگوں نے میر محمد علی اور
ایک متصدی کو جو گراب بنواتا تھا مشکیں باندھ کر سڑک پر کھینچ کر مار ڈالا۔

اس امر میں تلنگوں کا گمان غلط نہ تھا کار روائی اپنی عاقبت اندیشی سمجھ کر کرتے تھے کہ اگر عمل انگریزی ہو جائے گا ہم اس خیر خواہی کو پیش کریں گے بعد اس کے احمد اللہ شاہ نے اس پر اور لون مرچیں لگا کر تیز کیا کہ یہ گورے اور گراب ار صاحبت کے بنوائے ہیں جسے دو صاحب تین میم کے ساتھ بھٹولی کے راجہ لونا سنگھ نے بھیجا ہے مار ڈالو وہ چاہتا ہے ہماری شکست ہو جائے انگریز کی فتح یہ[1]

مولانا کی جنگی صلاحیت

مولانا احمد اللہ شاہ کی جنگی استعداد و صلاحیت شک و شبہ سے بالا تھی۔ انھوں نے متعدد معرکوں میں حصہ لیا اور ہر معرکہ میں یہ ثابت کر دیا کہ وہ غیر معمولی طور پر صاحب تدبیر و سیاست ہیں ان کی شجاعت و بہادری حد سے بڑھی ہوئی تھی جو کبھی فائدہ کے بجائے نقصان پہنچا دیتی تھی جنرل اوٹرم کو لکھنؤ سے نکالنے کے سلسلے میں انھوں نے جس تہور و دلیری سے جنگ جاری رکھی وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ ایک انگریز پرست مورخ کی زبان سے یہ کہانی سنئے۔

"باغیوں کا شور اور لائق سرغنہ مولوی احمد اللہ شاہ تھا۔ اس نے بڑی معقول تدبیریں اوٹرم صاحب کے نکالنے کی دسمبر کے اوّل ہفتے میں کیں اور اس کے لشکر کے قریب توپیں لگ کے گولے پھینکنے شروع کیے ۲۲ دسمبر کو باغیوں نے چار ہزار پیدل اور چار سو سوار اور چار توپیں بھیجیں کہ کان پور سے انگریزوں کی راہ آمد و رفت مسدود کریں جیسے ہی انھوں نے اس راہ کو بند کرنے کا ارادہ کیا فوراً ۲۳ دسمبر کو اوٹرم صاحب نے ان کی لکھنؤ کی راہ بند کرنے کا قصد کیا۔

---

[1] قیصر التواریخ ص (۲۸) ۲۵۲ ج ۲

۲۳ر دسمبر کی صبح کو اوٹرم صاحب نے ان پر حملہ کیا۔ باغی ایسے حیران و پریشان
ہوئے کہ اپنی چار توپیں اور ایک ہاتھی چھوڑ کر فرار ہوئے پھر انہوں نے مراجعت
کا راستہ بدلا اور دل کشا میں چلے گئے۔ پچاس آدمی ان کے مارے گئے انگریزوں
نے ان کا تعاقب کرنا چھوڑ دیا۔ اس شکست کے بعد باغی تین ہفتے تک خاموش
بیٹھے رہے۔ انگریزی لشکر پر گولے مارتے رہے جن سے کچھ نقصان نہیں ہوا
ہاں بندمیں خلل پڑتا تھا۔

اوٹرم صاحب نے خالی چھکڑے کان پور بھیجے تھے کہ وہ وہاں سے سامان رسد
بھر کر پھر آئیں اور ان کے ساتھ سپاہ بھی تھی۔ باغیوں نے اپنے سرغنہ منصب
علی کو اس کام کے لئے مقرر کیا کہ اتنی تھوڑی سی سپاہ اور چھکڑوں کو کان پور
نہ پہنچنے دے مگر یہ انگریزی کاروان کان پور پہنچ گیا۔

۱۲ جنوری کو تیس ہزار کے قریب لشکر نے اوٹرم صاحب کی سپاہ میمنہ پر حملہ کیا
اوٹرم صاحب نے گوروں کو بھیجا۔ جنہوں نے اپنی توپوں سے بڑے
بہادرانہ کام کئے اور سکھوں نے بھی اپنی شجاعت دکھائی اور باغیوں کو
شکست دے کر بھگا دیا لوہے اور سیسے نے مینہ ایسا برسایا کہ سینکڑوں ان
میں ہلاک ہوئے۔ اس شکست سے باغیوں کی ہمت ایسی پست ہوئی کہ ۱۵ روز
تک پھر انہوں نے لڑنے کا قصد نہیں کیا یوں ہی حملوں کے بگل بجاتے
رہے مگر حملہ نہیں کیا۔[۵]

احمد اللہ شاہ کی اوٹرم صاحب سے ٹکر

لیکن مولانا اور دربار حضرت محل کی کشمکش بدستور جاری تھی۔ ایک مرتبہ مولانا اور بیگم کے سپاہیوں میں جنگ بھی ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا گرفتار ہو گئے اور جلد ہی رہائی بھی حاصل کر لی۔ مرزا

---

۵ تاریخ ہندوستان سوم (بغاوتِ ہند) صفحہ ۵۶

واقعہ یہ ہے :-

"حضرت محل اور مولوی احمد اللہ کے سپاہیوں میں ایسی لڑائی ہوئی کہ سو آدمیوں کا خون ہو گیا اور مولوی قید ہو گیا۔

مولوی بیگم کی قید سے بھاگ کر پھر باغیوں کا سرغنہ بن گیا اور اس نے ۱۵ فروری کو اوٹرم صاحب پر حملہ کیا لیکن توپوں کے سامنے باغی نہیں ٹھہر سکے بھاگ گئے انگریزوں کا ایک سپاہی قتل اور ایک زخمی ہوا اور پھر باغیوں نے حملے کئے۔ ایک حملہ میں ان کے ساٹھ آدمی قتل و زخمی ہوئے پھر باغیوں نے بڑا زور لگا کر آخری حملہ کیا۔ باغیوں نے یہ سمجھ کر جنرل کی سپاہ اتوار کی صبح کو نماز پڑھنے میں مصروف ہوں گے۔ اتوار کا دن حملہ کا مقرر کیا۔ یہ مقولہ کہ جو تامل کرتا ہے وہ نقصان اٹھاتا ہے لڑائیوں سے زیادہ زندگانی اور کاموں کے متعلق ہے باغیوں نے از سر نو لڑنے میں تامل کیا۔ سوا دس بجے واپس چلے گئے بہت پٹے تین سو چالیس آدمی ان کے مقتول اور مجروح ہوئے اس سے ان کی ہمت اور حوصلے پست ہو گئے باغیوں نے جب حملہ کیا ان کو شکست ہوئی مگر وہ مفرور ہونے میں کامیاب ہوئے۔

اوٹرم صاحب کے پاس تقریباً چار ہزار سپاہ تھی جس نے باغیوں کے لشکر کو روکے رکھا۔ اوٹرم صاحب کو ۲۰ فروری کو تحقیق معلوم ہوا کہ اس تاریخ کو دشمن کے لشکر میں یہ سپاہ بتفصیل ذیل تھی:-

۲۷	رجمنٹیں آئینی سپاہیوں کی	۲۷۵۵۰ سپاہی
۱۴	" نئی بھرتی کی	۵۴۰۰ "
۱۰۶	" نجیبوں کی	۵۵۱۵ "

۳۶ رجمنٹیں سواروں کی — ۷۰۰ ۱ سپاہی

سانڈنی سواروں کی رجمنٹ — ۸۰۰

۹۶۰۰۰ سپاہی

پہلی آئینی سپاہ تیس ہزار تھی مگر دہلی کے فتح ہونے کے بعد وہ سہ چند ہو گئی۔ بس اس سپاہ سے جو چاروں طرف حملہ کرتی تھی عالم باغ کو بچائے رکھنا اور کانپور کی راہ کو کھلا رکھنا اور ٹرم صاحب کا بڑی مردانگی اور فرزانگی کا کام تھا۔ ۱؎

مولانا احمد اللہ کی طرف سے بادشاہت کا اعلان

انگریزوں سے مولانا نے اس وقت بھی جنگ وپیکار کا سلسلہ جاری رکھا جب وہ لکھنؤ پر قابض ہو چکے تھے اور حضرت محل برجیس قدر کو لے کر نیپال کی طرف روانہ ہو چکی تھیں۔ مولانا نے مختلف مقامات پر ٹھہر ٹھہر کر مورچے بنائے اور ڈٹ کر انگریزوں کا مقابلہ کیا لیکن کامیابی کہیں نہیں ہوئی۔ آخر مولانا شاہ جہاں پور پہنچے یہاں بھی ناکامی سے سابقہ پڑا اس مرحلہ پر شہزادہ فیروز بھی مولانا کے رفیق کارزار تھے جس کی شجاعت و بہادری بے مثال تھی ۲؎ یہاں مولانا اور شہزادہ فیروز محمدی پہنچے یہاں مولانا نے تاج شہریاری سر پر رکھ لیا اپنا سکہ جاری کیا

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ

حامی دین محمد احمد اللہ بادشاہ

حضرت بادشاہت کے اعلان اور گزو سکہ کے اجرا ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جلال شاہی بھی عادات و اطوار سے نمایاں ہونے لگا۔ ایک مؤرخ تند و تلخ الفاظ میں لکھتا ہے۔

۱؎ تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) صفحہ ۵۷

۲؎ DISCAVERY OF INDIA

By. P. JAWAHER LAL NEHRU

نشۂ غرور و قوت جو دماغ میں سما گیا تھا شہزادے سے بھی طالب بیعت و فرمانبرداری مثل اور خادموں کے ہوا۔ شہزادہ اس حرکت سے نہایت فکر سندیلہ میں آ گیا۔[1]

مولانا احمد اللہ شاہ کے اس اعلان نے دراندازوں اور مخالفوں کو کھل کھیلنے کا موقع دیا۔ لیکن مولانا جیسے لوگ جب کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو سر دھڑ کی بازی لگا کر اس پر قائم رہتے ہیں۔ چنانچہ زندگی کی آخری سانس تک وہ اپنے عزم پر قائم رہے۔

شہادت

مولانا کی چند لغزشوں سے قطع نظر مجموعی حیثیت سے وہ سراپا خیر و برکت ہستی کے مالک تھے۔ انھوں نے جو جنگِ آزادی شروع کی تھی اُسے آخر دم تک جاری رکھا۔ ساتھیوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ دوستوں نے منھ موڑ لیا جانثاروں نے پیٹھ دکھائی قدم قدم پر ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن پائے ثبات میں لغزش نہ ہوئی۔

ذیل میں ایک انگریزوں کے مداح و ثناخواں مورخ کی زبانِ قلم سے مولانا کی داستانِ شہادت درج کرتے ہیں۔ اس داستان کا کچھ حصہ ایک انگریز نے بیان کیا ہے جس سے اس راز کا انکشاف ہوتا ہے کہ چپاتیاں تقسیم کا کارنامہ مولانا ہی کا تھا۔ فیض آباد میں ان کی گرفتاری اور پھر پھانسی کی سزا اسی جرم میں ملی تھی وہ داستان یہ ہے:۔

اب ہم چند واقعات ضروری بیان کرتے ہیں۔ خاص کر مولوی کا حال بیان کرنے کے قابل ہے۔ مسٹر طاس سیٹن صاحب مولوی کی نسبت بیان کرتے ہیں کہ وہ بڑی قابلیت رکھتا تھا نہ ایسا شجاع تھا کہ خوف نہیں کرتا تھا اور اپنے عزم میں پکا اور ارادہ میں مستقل تھا باغیوں میں اس سے بہتر کوئی سپاہی نہیں تھا۔ اس مولوی کو انگریز کہتے ہیں کہ اس نے اپریل ۱۸۵۷ء میں چپاتیاں تقسیم کرائی تھیں اور فتنہ انگیزی کے لئے سارے ——

---

[1] قیصر التواریخ جلد ۲ صفحہ ۴۶۷

اودھ میں کاغذ دوڑائے تھے اسی جرم میں گرفتار ہوا اور اس کو پھانسی لگنے کا حکم دیا گیا مگر پہلے اس سے کہ اس حکم کی تعمیل ہو اودھ میں غدر ہو گیا اور وہ جیل خانہ کے فرش سے اُٹھ کر سلطنت کے عرش پر پہنچ گیا۔ یہ فخر اس مولوی ہی کو حاصل ہے کہ اس نے سر کولن کو میدانِ جنگ میں دو دفعہ ناکامیاب رکھا۔

اب تک مولوی کے وہی دم خم چلے جاتے تھے۔ ان کے عزم جزم میں کچھ فرق نہیں آیا تھا انہوں نے اپنا نام شاہ رکھا تھا۔ وہ بہ نسبت اور باغیوں کے اس خطاب کے لئے زیادہ مستحق تھے جانسن کے کالم سے بچ کر انھوں نے پالی کے اسٹیشن پر حملہ کیا اور ایک اہلکار کے اعضاء کو قطع کیا۔ ۵ر جون کو مولوی ہاتھی پر سوار ہو کر پوایاں اس غرض سے پہنچا کہ راجہ پوایاں سے پاس جو سرکار انگریزی کے ملازم چھپے ہوئے تھے۔ ان کو حاصل کرے جب وہ آیا اس نے دروازہ کو بند پایا۔ راجہ اور اس کا بھائی اور اس کے نوکر فصیل سے لگے ہوئے کھڑے تھے ان میں اشاروں میں کچھ باتیں ہوئیں مولوی نے جانا کہ میں اندر بزور جا سکتا ہوں۔ اس نے مہاوت کو حکم دیا کہ ہاتھی سے دروازہ ٹکرا دے۔ ہاتھی نے اپنی مستک سے دروازہ پر دو تین ٹکریں مار کر دروازہ توڑا۔ راجہ کے آدمیوں نے مولوی پر گولیاں چلا کر مار ڈالا راجہ کے بھائیوں نے اس کا سر کاٹ لیا۔ راجہ کے رومال میں لپیٹ کر ہاتھی پر سوار ہوا اور شاہ جہاں پور کے مجسٹریٹ کے پاس سر کو لے گیا جو اس وقت اور دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے کھانا کھاتے تھے راجہ نے رومال کھول کر مولوی کا سر دکھایا جس کو مجسٹریٹ دیکھ کر بہت خوش ہوئے دوسرے دن یہ سر کوتوالی میں لٹکایا گیا۔

لہ تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۹۲

خراج عقیدت

پوایاں کے راجہ جگن ناتھ کو پچاس ہزار روپے انعام کا مل گیا انگریزوں کا سب سے بڑا دشمن قتل ہوگیا لیکن اس کے بارے میں ایک بڑا انگریز میلی سن یہ کہنے پر مجبور ہوگیا:۔

"مولوی ایک بہت بڑا تجربہ کار شخص تھا ان کے سوا کوئی شخص فخر کے ساتھ یہ سچا دعوی نہیں کرسکتا تھا کہ میں نے کالن کیمبل کمانڈر انچیف ہند کو دو بار میدان میں شکست دی۔ مولوی احمد اللہ شاہ سچا محبِ وطن تھا اس نے کسی نہتے کا خون بہا کر اپنی تلوار کو خراب نہ کیا۔ اس نے بہادری کے ساتھ ڈٹ کر کھلے میدان میں ان پردیشیوں کے ساتھ جنگ کی۔ جنھوں نے اس کا وطن چھین لیا تھا۔ ہر ملک کے بہادر لوگوں کو مولوی احمد اللہ شاہ کو عزت کے ساتھ یاد رکھنا چاہیئے"۔ ۱ے

ایک اور اعتراف

یہ ذکر ختم کرنے سے پہلے ایک اور بڑے انگریز کا اعتراف بھی ایک مؤرخ کے واسطے سے سن لیجئے:۔

اگر وطن کے محب ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے ملک کی آزادی کے لئے جو غلطی سے برباد ہوگئی ہو سازشیں کرے، اور لڑائیاں لڑے، تو یقینی مولوی اپنے ملک کا محبِ صادق تھا، اس نے کبھی اپنی تلوار کو مخفی اور سازشی قتلوں سے خون آلود نہیں کیا، وہ بہادرانہ کمر باندھ کر معرکہ آرا، بیگانوں اور اجنبیوں سے ہوا۔ جنھیں نے اس کا ملک چھین لیا تھا پس ساری قومیں اس مولوی کو پیار کریں گے کہ وہ تعظیم ادب کا جو شجاعت اور صداقت کے لئے لازمی ہیں۔ مستحق تھا۔ ۲ے

۱ے رسالہ مصنف دسمبر ۱۹۴۳ء مقالہ دلاور جنگ مولانا احمد اللہ شاہ" (انتظام اللہ شہابی)

۲ے "تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۹۲

مولانا کی قبر

مولانا کی قبر شاہ جہاں پور کے قریب ایک موضع میں ہے جو گنج کہلاتا ہے۔ مولانا سید طفیل احمد صاحب نے کتبہ لگوا دیا تھا۔ سالانہ عُرس کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن اب تقسیم ہند کے بعد نہیں کہا جا سکتا کہ حکومتِ ہند نے وہاں کوئی یادگار قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے یا نہیں۔ واقعات کا جواب انکار میں ہے کوئی مضائقہ نہیں

طمع فاتحہ از خلق نہ داریم نیاز
عشق من از پس من فاتحہ خوانم باقیست

(۲)

بیگم حضرت محل

بر جیس قدر

گرچہ تھے صفحۂ ہستی پہ ہم اک حرفِ غلط
لیک اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے

ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کسی قوم میں زندگی کی رمق موجود ہو اور اسے آسانی سے غلام بنا لیا جائے مسلمانوں نے سرزمینِ ہند پر تقریباً ایک ہزار سال تک دبدبا و طنطنہ کے ساتھ حکومت کی، ان کی حکومت عدل، انصاف، مساوات اور رواداری پر مبنی تھی۔ لیکن جس طرح انسان مرتے ہیں، اسی طرح قومیں بھی مرتی ہیں، ملک بھی مرتے ہیں، حکومتیں بھی مرتی ہیں، اودھ کی حکومت بھی موت کے گھاٹ چڑھ گئی، اودھ کا خاندان شاہی بھی زندہ نہ رہ سکا، اودھ کی مسلمان قوم بھی مر گئی، یعنی غلام بن گئی۔ لیکن مرتے مرتے بھی اس نے ثابت کر دیا کہ جہاں اس کی صف میں غداروں، ملت دشمنوں، خود غرضوں اور گندم نما جو فروشوں کی کمی نہیں، وہاں مٹھی بھر سہی لیکن بچوں اور عورتوں تک میں زندگی کی آخری سانس تک جنگِ آزادی لڑنے کا ولولہ اور حوصلہ موجود ہے حضرت محل یکتھی بائی اور

برجیس قدر (جن کا اصلی نام شہزادہ رمضان علی تھا) کی کارگذاریاں ہمارے دعوے کا ناقابلِ تردید ثبوت ہیں۔

کوئی شبہ نہیں، برجیس قدر تختِ حکومت پر بیٹھے، لیکن یہ تخت ان سے چھِن بھی گیا، بایں ہمہ انھوں نے بزدلی اور کم ہمتی کا مظاہرہ نہیں کیا' وہ نوعمر تھے، کم سن تھے۔ امورِ مملکت سے ناواقف تھے، حالات نامساعد تھے، دشمن بہت زیادہ تھے' لیکن نہ ان کے تیور میں فرق آیا' نہ آن میں' نہ ہمت میں نہ حوصلہ میں۔

برجیس قدر کی تخت نشینی کی تفصیل یہ ہے:۔

انگریزوں کا تسلط اور غدر

"یہ شاہزادہ حضرت محل کے بطن سے ہے جب اس کو کچھ ہوش آیا تو مولوی غلام حضرت بہ تعلیم علم و فنون اور آدابِ خاندانی کے مامور ہوئے۔ ممو خاں اس محل کا داروغہ اور ٹھاکر پرشاد دیوان تھا ۱۸۵۶ء میں جب انقلابِ زمانہ پیش ہوا اور سریر سلطنت شاہ اودھ سے منتزع ہو کر ملک اودھ کار پردازانِ انگلشیہ کے زیرِ اہتمام آیا اور واجد علی شاہ کلکتے کو چلے گئے۔ املاک قیصر باغ و دیگر مکانات سکونت محلات و اسباب دولت خانہ حسام الدولہ کے اہتمام میں چھوٹا۔ حضرت محل مثل اکثر دوسرے محلوں کے بادشاہ کے ساتھ کلکتہ نہ گئی تھیں اور بدستور اپنے مکان سکونت میں قیام پذیر تھی۔ سرکار شاہی سے مصارف معینہ عطا ہوتے تھے ضروریات معرفت حسام الدولہ بہادر رفع ہوتیں گو انتزاعِ سلطنت سے شان و شوکت شاہانہ میں فرق آیا تھا مگر خزائن و دفائن سے ایسی عسرت و تنگی تھی کہ باعثِ شکایت ہوتی۔ انگریزوں کا تسلط ملک پر بخوبی ہو گیا تھا۔ رعایا اور حکام سب مطمئن تھے۔ بادشاہ اور دوسرے متوسلان شاہی کے کان ہر وقت اس خبر کے منتظر تھے کہ صدائے واپسی ملک عنقریب فرحت بخش ہوگی۔ گریہ آرزو تو دل ہی دل میں رہی لیکن فلک شعبدہ باز نے ایک شعبدہ تازہ برپا کیا اور بلائے آسمانی خطہ دوآبہ و اودھ پر نازل کیا ۱۸۵۷ء میں سپاہ انگریزی کا دل ایسا منقلب ہوا کہ تمام خیر خواہی جاتی رہی۔ نئے کارتوس جو ولایت سے آئے تھے فوج متعینہ کو جو قریب کلکتہ ہے تقسیم ہوئے۔ ان کے خیال ناقص میں یہ سودائے خام سمایا کہ

ان کارتوسوں پر چربی لگائے اور سؤر کی لگی ہوئی ہے سب سپاہیانِ ہنود و مسلمان نے ایک دوسرے کے مشورے سے یہ قرار دیا کہ یہ کارتوس اس قابل نہیں کہ دانتوں سے کاٹے جائیں حکام کے سامنے ان کے کاٹنے سے انکار کیا اور بذریعہ نامہ و پیام خفیہ اکثر مقامات اور چھاؤنیوں میں جہاں جہاں فوج مقیم تھی اطلاع کی اور ان کو آمادۂ عدول حکمی کیا۔ افسروں نے ان کو ہر طرح سے سمجھایا کہ سرکار کو کسی کے دین و ایمان کی خرابی و بربادی سے کچھ غرض نہیں اور کارتوسوں میں کوئی شے خلافِ ملت و مشرب ہندو و اسلام نہیں ملائی گئی مگر سپاہ کے ذہن میں کچھ نہ آیا اور عدول حکمی سے باز نہ آئے۔ اب حاکم و محکوم دونوں کی طرف سے اطمینان رخصت ہوا اور تلنگوں کی بعض پلٹنیں اسی عدول حکمی کے قصور میں اس اطراف میں موقوف کی گئیں اور مقام بارک پور سے ماہ مارچ میں بعد لینے ہتھیار کے اس پار دریا کے اتار دی گئیں۔ یہ تلنگے جہاں پہنچے پیادگانِ فوج سرکاری کو اپنی چرب زبانی سے منحرف کرتے گئے۔ غرضیکہ یہ ہنگامہ ترقی پذیر ہوا۔ فوج کے ہاتھ سے حکام انگریزی پر صدمۂ جان و مال پہنچا۔ ہوتے ہوتے یہ سموم فساد گلشن ملک اودھ میں پہنچی یعنی ۲۳ر جون ۱۸۵۷ء کو فوج باغی قریب لکھنؤ پہنچی۔ صاحب کمشنر سپاہ باغی کی آمد کے انسداد کے لئے گئے چونکہ ان کا مجمع کثیر تھا واپس آئے اور مقام بیلی گارد میں جس کو حسن حسین پہلے سے تیار رکھا تھا داخل ہوئے فوج باغی تعاقب کرتا ہوا آئی اور محاصرہ قلعہ مچھی بھون اور بیلی گارد کا کر لیا دوسری جولائی تک لوٹ مار کا بازار شہر میں خوب گرم رہا۔ ہزاروں رئیسوں کا خان و مان و دولت تباہ ہوا صدہا مستوراتِ عصمت کوش بیوہ و بے بلا ہو گئیں ایک آفتِ ناگہانی برپا تھی۔

برجیس قدر کی تخت نشینی

تیسری جولائی ۱۸۵۷ء کو فوج کی منادی ہوئی کہ اور افسرانِ سپاہ معرفت راجہ جے لال سنگھ بہ مشیر راجہ درشن سنگھ ملازم سرکار شاہی کے حضرت محل کی ڈیوڑھی پر پہنچے اور مرزا برجیس قدر نابالغ کی مسند نشینی کی استدعا کی۔ حضرت محل اس امر کے سننے سے نہایت مضطرب اور حیران ہوئی اور دل میں خیال کیا کہ یہ فوج بد اندیش جن سے اپنے آقائے قدیم کے متعلقین کو بے رحمی و بے دردی ابنائے تخت پہنچی ہمارے ساتھ کیا سلوک کرے گی یہ لڑکا ابھی نہایت صغیر سن ہے نیک و بد کی تمیز نہیں' ایسے مبارک جان ستان میں کیا کرے گا ساکت رہی

اور ممو خاں داروغہ اور حسام الدولہ سے مشورہ جو ہوئی جو یہ لوگ بمقتضائے عاقبت بینی اس کارِ قبیح کے نتائج سمجھانے لگے ۔ جب سپاہ بے مہر نے لیت ولعل دیکھا اس کی نیت فتنہ کی طرف مائل ہونے لگی ۔ آخر کار یہ مشورہ قرار پایا کہ درخواست نہ قبول کرنے کی صورت میں جس امر کا آئندہ کو اندیشہ ہے اسی وقت ظہور میں آجائے گا ۔ فوج باغی خاندان دستو سلالۂ شاہی کو برباد اور قتل کر ڈالیگی ۔ پس حتی بہ تقدیر جو ہو سو ہو مروت تو جان بچانی واجب ہے[1]

مورخین کا جھوٹ اور سچ

مذکورہ بالا سطور میں جو توجیہ پیش کی گئی ہے ، وہ یقیناً غلط ہے اصل بات یہ تھی کہ انگریزوں نے بدعہدی ، محسن کشی اور احسان فراموشی کی جو نظیر المثال روایت قائم کی تھی ، اس سے ہر شخص متنفر اور بیزار تھا ۔ لیکن انگریز طاقت ور تھے اودھ کے باشندے اور شاہی خاندان کے افراد کمزور تھے ، موقع کی تاک میں رہے ، غدر کے شروع ہوتے ہی ، انھیں ایک آخری کوشش کرنے کا موقع مل گیا اور وہ تن بہ تقدیر میدان میں نکل آئے ۔ یہ کتابیں زیادہ تر انگریزوں کے عہدِ عروج میں لکھی گئیں ، جب ان کی بدگمانی موت کا پیغام تھی اور وہ فرعون و نمرود کی طرح تختِ حکومت پر بیٹھے خدائی کر رہے تھے ۔ اس لئے یہ مورخ سچی بات چھپا چھپا کر بیان کرتے ہیں اور ان کا لب و لہجہ زیادہ تر معذرتی انداز لئے ہوتا ہے تاریخ اودھ اور قیصر التواریخ وغیرہ سب کا یہی رنگ ہے ۔

شیعہ سنی سوال

نجم الغنی (تاریخ اودھ) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد انگریزوں نے ایسے ستم ڈھائے اور غدر شروع ہوتے کے بعد حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ "مجبوراً" برجیس قدر تختِ حکومت پر بیٹھے ، لیکن صاحب قیصر التواریخ نے اس جنگِ آزادی کو "شیعہ سنی سوال" بنانے سے بھی احتراز نہیں کیا ہے ۔ فرماتے ہیں :۔

> شاہجہاں آباد (دہلی) میں اہل سنت بہت تھے وہ اپنے مذہب سے شریک ہوئے ، لکھنؤ میں کثرت شیعہ تھی ، ان کے مذہب میں جہاد بغیر امام کے حرام

---

[1] تاریخ اودھ جلد پنجم (نجم الغنی) صفحہ ۲۰۸

تھا کیونکہ شریک ہوتے [1]

لیکن یہ سارا "معتقدی انداز" بے کار ہے، لکھنؤ کے عوام اور خواص، صرف اس لئے اس جنگ میں فرقہ اور مسلک سے بے پرواہو کر شریک ہوئے کہ یہ حق کی جنگ تھی ظلم کے خلاف جنگ تھی، غاصب کا مقابلہ تھا۔

شاہی سے وزارت کی طرف

برجیس قدر کی تخت نشینی کے حالات کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس تحریک کی پشت پناہی بڑے بڑے سیاست مآب دماغ کر رہے تھے۔ ابتدا میں والیان اودھ دہلی کے وزیر تھے۔ اور ان سب کو نواب وزیر "وزیر اودھ" کہا جاتا تھا۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں دہلی کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کی غرض سے انگریزوں نے اودھ میں بادشاہی کا ڈول ڈالا اور غازی الدین حیدر نواب وزیر کے بجائے شاہ کے لقب سے ملقب ہوئے مشرف الدولہ نے دہلی کے ساتھ پرانے تعلقات کی تجدید کو پیش نظر رکھتے ہوئے برجیس قدر کو بادشاہ نہیں بلکہ نواب وزیر بنایا۔

تخت نشینی کی کیفیت

۵ رجولائی ۱۸۵۷ء کو احمد حسین کی تحریک اور نواب ممو خاں کی تائید سے برجیس قدر حضرت محل کے بیٹے تخت واجدی پر متمکن ہوئے شہاب الدین اور سید برکات احمد سالار نے مندیل شاہی برجیس قدر کے سر پر رکھی تمام افسروں نے تلوار نذر گزاری ۲۱ ضرب توپ کی سلامی سر ہوئی۔ شہر میں غلغلہ مسند نشینی ہوا شہر میں منادی ہوئی خلق خدا کی۔ ملک شاہ دلی کا۔ حکم برجیس قدر کا۔ دوسرے روز تمام اہل ڈنکا گو پنشن یافتہ قدیم وجدید در دولت پر حاضر ہوئے اور اپنے عہدوں پر بحال ہوئے [2]

نئے بادشاہ کی بدانتظامی

برجیس قدر تخت پر بیٹھے، تو لوٹ مار کا بازار گرم تھا افراتفری

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۲۳

[2] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۲۷

بھی ہوئی تھی، نظم مملکت معطل تھا، عوام پریشان تھے، تلنگے اور سپاہی انھیں لوٹ رہے تھے پریشان کر رہے تھے، برجیس قدر نے تخت نشین ہوتے ہی اس مفسدہ کی طرف توجہ کی اور اس کے انسداد کا بندوبست کیا، چنانچہ جو پہلا فرمان انہوں نے نافذ کیا، وہ یہ ہے۔

"اب کوئی کسی کو شہر میں نہ لوٹے، ورنہ سزا پائے گا" [1]

عہدوں کی تقسیم

حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ میں ہندو مسلمان، شیعہ، سُنّی سب مساوی طور پر شریک تھے، اس لئے کہ یہ عوامی جنگ تھی، بعض لوگوں نے شیعہ سُنّی اور ہندو مسلم سوال پیدا کر کے افتراق برپا کرنے کی کوشش کی تھی اور بعد میں بڑی حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے کہ جنگ آزادی ناکام ہو گئی، لیکن جہاں تک حضرت محل، برجیس قدر، ممو خاں وغیرہ کا تعلق تھا یہ لوگ شیعہ ہونے کے باوجود واجد علی شاہ کے مسلک کے مطابق، ہمیشہ ہندو مسلم اور شیعہ سُنّی سوال سے بالا رہے۔ چنانچہ نئی حکومت میں جو عہدے تقسیم ہوئے، اُن کی بنیاد صرف اہلیت تھی، نہ کہ مذہب، اور فرقہ اور جماعت چنانچہ:۔

باب نیابت و دیوان میں کورٹ ہُوا، حسام الدولہ[2] نے نواب شرف الدولہ کا نام لیا، سب نے بہ اتفاق مانا کہ ان کی کارگزاری البتہ بہ نیک نامی مشہور ہے، جواہر علی خاں نے کہا وہ سُنّی ہے، ممو خاں[3] شرف الدولہ کو اپنے ساتھ خاص مکان میں لائے۔ مرزا برجیس قدر نے خلعت نائب نے خلعت نائب دیوانی منگوا کر عنایت کیا، یہ خلعت آخرت[4] تھا، خلعت دیوانی مہاراجہ بال کرشن کو ملا۔[5]

---

[1] قیصر التواریخ جلد ۲ صفحہ ۲۲۷

[2] یہ شیعہ تھے۔

[3] یہ بھی شیعہ تھے۔

[4] طنز کی گہرائی دیکھیے

[5] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۲۸

نئے بادشاہ سے ہندوؤں کی عقیدت

مال حرام اور اونچا طبقہ، خواہ ہندوؤں کا ہو، یا مسلمانوں کا، اپنے ملک کا غدار اور انگریزوں کا وفادار تھا۔ ہندوؤں کی غداری تعصب پر اور مسلمانوں کی خود غرضی پر مبنی تھی لیکن نتیجہ دونوں کا ایک تھا۔

لیکن عوام کا اور رجال یا سپاہیوں کا، جہاں تک تعلق تھا، خواہ ہندو ہوں یا مسلمان سُنی ہوں یا شیعہ، سب جان و دل سے اپنی قومی اور ملکی حکومت پر نثار تھے، یہ غدار انگریزوں سے سازباز کر رہے تھے۔ ان میں شاہی خاندان کے لوگ بھی تھے، امرا اور روسا بھی، تعلقدار، اور جاگیردار اور زمیندار بھی، اور حکام و عمال بھی، لیکن یہ عوام، یہ سپاہی، ان غداروں کا سراغ لگاتے تھے، ان کی غداریوں پر کڑھتے تھے اور انھیں کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے بے قرار رہتے تھے، ہندو عوام کی عقیدت تو خوش عقیدگی تک پہنچی ہوئی تھی، چنانچہ خاندانِ شاہی اور دوسرے غداروں کی خبر پاکر چند لوگ حضرت محل کے حضور میں پہنچے اور عرض گذار ہوئے۔

> یہاں کے سب آدمی انگریزوں سے ملے ہیں، اس میں خرابی ہے، پھر کہیں ٹھکانا نہیں جس طرح آپ کہتی ہے دعا کر کے ہم بیلی گارد میں گھس جائیں گے۔ رام چاہے تو کل انگریز نہیں یا ہم نہیں، جب تک بیلی گارد فتح نہ کریں گے تنخواہ نہ مانگیں گے، ہمارے برہمن، پنڈت علم نجوم سے کہتے ہیں کہ برجیس قدر کی سلطنت کلکتہ تک ہے، بڑا صاحبِ اقبال ہے اچھی ساعت میں گدی پر بیٹھا ہے[1]

خلوص اور ایثار کی یہ کار فرمائی، حق تو یہ ہے کہ صرف عوام ہی کی متاع، خواص اس سے ہمیشہ محروم رہے۔

برجیس قدر کا سپاہیوں سے خطاب

نئی حکومت، مالی اعتبار سے بہت کمزور تھی، امرا اپنی دولت چھپائے، کونوں میں

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۳۲

دبکے ہوئے تھے، آخر سپاہی، تلوار اور بندوق ہار دو تو نہیں کھا سکتے تھے، انہوں نے موٹی موٹی اسامیوں کو لوٹنا شروع کیا۔ فریاد و فغاں کا شور بلند ہوا۔

جب لوگوں نے خبر لوٹ مار کی برجیس قدر سے عرض کی، ایک دن سب تلنگوں کو اور افسروں کو بلوایا، آپ گھوڑوں پر سوار ہوئے ۲۱ توپ کی سلامی چلی، آہستہ آہستہ سمجھانے لگے کہ اے بہادرو ہم تم سے بہت خوش ہیں، خوب لڑتے ہو، مگر ہمیں ایک بات کا رنج ہے کہ تم شہر کو لوٹ رہے ہو، اسے موقوف کر دو، ورنہ سب رعایا بد دعا دے گی۔ افسروں نے دست بستہ عرض کی۔ جناب عالی اب شہر نہ لٹے گا۔[1]

مصارفِ جنگ روپیہ ناپید تھا، مصارفِ جنگ میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا آخر حضرت محل نے گھر کا اثاثہ سیم و زر قربان کیا۔ اس کی مالیت چار لاکھ تھی، نئی ٹکسال بنی۔ نواب حضور عالم اور دوسرے امراء سے بہ جبر جو روپیہ لیا گیا اس کی تفصیل قیصر التواریخ نے یہ بتائی ہے۔

(۱) سامان نقد و جنس	۱۸ لاکھ روپے
(۲) جواہرات	۲ " "
(۳) متفرقات	۱ " "
(۴) اچھے صاحب	۵۰ ہزار روپے
(۵) میر احسان علی خاں	۴۵ " "
(۶) منجھلی بیگم	۱۰ " "
(۷) محمد بخش داروغہ	۵ " "

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۳۳

(۸) چند سپاہئے دیوان نواب صاحب — ۵ لاکھ روپے

(۹) اہل شہر سے [1] — ۵۵ ،، ،،

بظاہر یہ رقم خاصی معلوم ہوتی ہے، لیکن انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں غیر ملکی جنگوں کے لئے ہندوستانیوں سے جو روپیہ بٹورا، وہ اس سے کئی سو گنا زیادہ ہے۔

برجیس قدر کا سکہ

ٹکسال بننے کے بعد، یہ مسئلہ اٹھا کہ سکہ کس نام کا ڈھالا جائے؟ لوگوں نے متعدد نام پیش کئے، کسی نے واجد علی شاہ کا، کسی نے بہادر شاہ کا، کسی نے شاہ عالم کا، کسی نے جواں بخت کا، برجیس قدر کے نام کے جو سکے تجویز ہوئے وہ یہ تھے

سکہ زد بر سیم و زر چوں مہر و بدر
نیرِ دیں میرزا برجیس قدر

ایک دوسرا سکہ یہ تھا۔

سکہ زد از فضلِ حق بر اشرفی مہر و بدر
اختر سلطانِ عالم، میرزا برجیس قدر [2]

تعلقہ داروں کی مدد اور کمک

زمینداروں اور تعلقہ داروں سے، جو فوجی مدد اور کمک برجیس قدر کو ملی، وہ بہت کم تھی اور اس کا بھی بڑا حصہ بے دلی اور تنگ حوصلگی پر مشتمل تھی، پھر بھی صاحب قیصر التواریخ نے جو تفصیل دی، وہ یہ ہے۔

(۱) مہاراجہ دیبی بخش، راجہ گونڈا — ۳ ہزار سپاہی

(۲) آنندی اور خوش حال وغیرہ تعلقہ دار گوشائیں گنج — ۲۰ ہزار ،،

(۳) راجہ سکھ درشن زمیندار سمردتہ — ۷ ،، ،،

(۴) اسبرام بخش زمیندار سمردتہ — ۲ ہزار سپاہی ۳ ضرب توپ

---

۱ قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۳۶

۲ قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۳۵

(۵) راجہ بلال مادھو سنگھ، تعلقہ دار گڑھی امیٹھی	ہزار سپاہی ۱۳ ضرب توپ ۲ سوار
(۶) رانا بینی مادھو سنگھ تعلقہ دار بیسواڑہ	" " ۵ " "
(۷) حشمت علی چودھری، تعلقہ دار سندیلہ	" " ۴
(۸) میر منصب علی تعلقہ دار رسول آباد	" " ۱
(۹) رگھوناتھ سنگھ تعلقہ دار کھجور گاؤں	" " ۴ ضرب توپ ۲
(۱۰) لکو خاں کارندہ نانپارہ	" " ۱۰

برجیس قدر کا حکم نامہ طلبی دوسرے تعلقہ داروں کو بھی، برجیس قدر نے پروانہ طلبی بھیجا۔

"فضل خدا سے بتاریخ سعید روز نیک ما بدولت واقبال نے مسند آبائی پر جلوس فرمایا، تمہیں لکھا جاتا ہے کہ کوئی انگریز مع فوج واہکار کسی گھاٹ سے تمہارے علاقہ میں اترنے نہ پائے، جس طرح ہو مقابلہ کرنا اور بغور دیکھنے حکمنامۂ ہذا مع فوج و توپ در دولت پر حاضر ہونا تاکید جانو۔"

لیکن اس حکمنامہ کا جواب خاطر خواہ ملا۔ نرپت سنگھ تعلقہ دار روہیا نے لکھا۔

"پروانۂ کرامت نشانہ حضور مشعر اجلاس فرمائی آیا سرفراز و ممتاز کیا اللہ تعالیٰ مبارک کرے۔ خانہ نادکی گڑھی سے علاقہ انگریز قریب ہے فقط دریائے گنگ درمیان ہے، خانہ زاد کا آنا مصلحت وقت نہیں ہے انشاء اللہ اگر کفار قصد عبور گنگ کریں گے اقبال سرکار سے مقابلہ کرکے قتل کر دوں گا۔ واجب تھا عرض کیا!"

ہردیو بخش، ماکھن سنگھ، زمیندار بانگر مئو، میر غلام جعفر زمیندار عثمان پور، میر حالم علی زمیندار بانوں، بھیکن خاں زمیندار بھوتی وغیرہ

معاصر نہ ہوئے، وجہ اُن کی غیر حاضری کی معلوم نہ ہوئی!"

لال بلونت سنگھ راجہ کالا کانکر، بابو گلاب سنگھ تعلقہ دار بزدل وغیرہ

"فوج انگریزی سے خوب لڑے، بعض راجہ اپنی اپنی فوج کو لے کر لکھنؤ آئے

اپنے پاس سے خوراک دیتے تھے۔[1]

کاروبارِ حکومت

"الغرض افسران فوج باغی نے ۱۲ ذیقعدہ ۱۲۷۳ ہجری کو مرزا برجیس قدر کو مسند ریاست اودھ پر بٹھایا اور عہد و پیمان جیسا منظور ہوا قلمبند کر لیا۔ نذر مسند نشینی کے مراسم ادا ہوئے منادی ہوئی کار گذاران شاہی جو بخوف جان و مال گوشہ احتیاط میں ہوئے تھے تلاش ہو ہو کر حاضر کئے گئے اور ہر ایک کو عہدہ جات سابقہ تفویض ہوئے۔ افسر لوگ ہر روز ڈیوڑھی برجیس قدر پر دربار کرتے اور مشورہ کر کے جو امر اُن کے مزاج میں آتا عمل میں لاتے۔ ممو خان کو نائب ریاست بنایا اور ناصر الدولہ خطاب دیا اور خدمت فراہمی اسباب جنگ و زر نقد مرزا برجیس قدر کی جانب سے اس کے متعلق کی اور مطابق احکام فوج کاروبار ملکی و جنگی جاری ہونے لگا۔

ناکامی، شکست، فرار

آخر وہی ہوا، جو ہونا چاہیے تھا، غداروں اور جاسوسوں نے انگریزوں سے ساز باز کر رکھا تھا، اپنی حکومت کے بدخواہ غیروں کو حکومت کی دعوت دے رہے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز غالب آگئے اور برجیس قدر کی حکومت شعلہ مستعجل کی طرح اپنی چمک دمک دکھا کر ختم ہو گئی۔

"جب انگریز تسلط کرتے ہوئے داخل لکھنؤ ہوئے تو سپاہ باغی نے اپنی حفاظت میں حضرت محل اور برجیس قدر کو محمود آباد کی راہ سے دریائے گھاگرا عبور کر کے مقام بونڈی میں پہنچایا۔ جب بونڈی میں بھی فوج انگریزی کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا تو دونوں ماں بیٹے داخلہ نیپال ہوئے۔ اس واقعہ کی تاریخ یہ ہے

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۳۰

مرد ار مضان علی ناکام | شد جانب کوہ چوبک تاز
تاریخ روانگی چو جستم | نیپال شناخت آمد آواز لہ

لکھنؤ کے جواہرات نیپال کے خزانہ میں

مولانا شرر فرماتے ہیں "مرزا برجیس قدر لکھنؤ سے بھاگے تو سرحد نیپال پر دم لیا۔"

لیکن یہ فرار بزدلی کا فرار نہ تھا، مہلت جنگ تھی۔ شرر صاحب کا ارشاد ہے:۔

"ہمراہ رکاب تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔ ان لوگوں نے ارادہ کیا کہ ہمالیہ کی گھاٹیوں میں پناہ گزین ہو جائیں، اور جب موقع ملے نکل کے انگریزوں پر حملہ کریں، فتح ہو تو اپنے وطن پہنچیں، شکست ہو تو پھر بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لیں، ریاست نیپال نے مرزا برجیس قدر اور اُن کی ماں کو تو پناہ دے دی، مگر ان کے ہمراہی طوفان بے تمیزی کو حکم دے دیا کہ فوراً واپس جائیں، بہت سے بھاگے، بہت سے مارے گئے، بہت سے بھیس بدل کر کسی طرف نکل گئے، مرزا برجیس قدر مع اپنی والدہ کے خاص نیپال میں جائے سکونت پذیر ہو گئے، دربار نیپال سے ان کے لئے کچھ معمولی وظیفہ مقرر ہو گیا اور ان کے ساتھ جس قدر جواہرات تھے سب حکومت نیپال کی نذر ہو گئے۔" ٹہ

واجد علی شاہ اور برجیس قدر

برجیس قدر کی کارگزاریوں سے واجد علی شاہ کو کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہی کوئی سروکار تھا، لیکن ان کا دل مہر و محبت کا گنجینہ تھا، اپنی اولاد سے انھیں غیر معمولی محبت تھی۔

لہ تاریخ اودھ جلد ۵

ٹہ گزشتہ لکھنؤ (شرر) صفحہ ۷۲

اپنی مثنوی "حزنِ اختر" میں بیویوں اور بچوں کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں برجیس قدر کا ذکر بھی کیا ہے جو عیش و راحت سے محروم ہو گئے تھے اور رنج و غم کی زندگی بسر کر رہے تھے، کہتے ہیں:

جو وہ چوتھا شہزادہ ہے نیک پے — اسے لوگ کہتے ہیں برجیس قدر
وہ بچہ دہ برس کا ہے کچھ شک نہیں — کہوں کیا کہ وہ ہے کہیں کا کہیں
ملاؤں جو حضرت سے لفظِ محل — تو نام اس کی ماں کا نکلے برمحل
جو بگڑی تھی آ گ سے انگریزی فوج — اسے لے گئی جیسے دریا کی موج
وہ منتظمہ مقصد اس میں ہے آہ — بنایا ہے اپنا اسے بادشاہ

زندگی کا انجام

حضرت محل کی زندگی تک برجیس قدر نیپال میں زندگی کی سختیاں برداشت کرتے رہے۔ ماں (حضرت محل) جب تک زندہ رہیں ان کے آغوشِ محبت سے جدا نہ ہوئے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا، تو وہاں کا سنگستان ان کے لئے وبالِ جان بن گیا۔ انگریزوں نے بھی بڑی عنایت کا مظاہرہ کیا یعنی ان کا قصور بخش دیا۔

جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے نہ ہوگا

چنانچہ آخر کار:

"ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر دولتِ برطانیہ نے مرزا برجیس قدر کا قصور معاف کر دیا۔ انھیں واپس آنے کی اجازت ملی، تو کلکتہ پہنچے، یہاں واجد علی شاہ کا انتقال ہو چکا تھا اور بہ حیثیت اولادِ اکبر مرزا قمر قدر سب سے زیادہ تنخواہ پا رہے تھے۔ برجیس قدر نے دعویٰ کیا، بادشاہ کے تمام بیٹوں سے زیادہ میرا حق ہے، اور دستورِ خاندانی بادشاہ کی پنشن میں سے ایک ثلث گورنمنٹ باقی تنخواہ میرے نام پر جاری کی جائے اور ان کے تمام ورثاء اور وابستگانِ دولت کی خبرگیری میرے ذمہ کی جائے۔"[1]

---

[1] جانِ عالم (عبد الحلیم شرر) صفحہ ۱۴۲

کی پیروی میں وہ انگلستان جانے کی تیاریاں کر ہی رہے تھے کہ ان کے خاندان والوں میں سے کسی نے دعوت کی۔ دعوت سے واپس آئے تو قے و دست جاری ہو گئے۔ آناً فاناً حالت خراب ہو گئی اور ایک ہی دن میں وہ، ان کی بیوی اور ان کے کئی فرزند سب کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔[1]

برجیس قدر کی شاعری

برجیس قدر نے بہت کم عمر پائی۔ لیکن کم عمری کے باوجود انھوں نے زندگی کے ہر مرحلہ پر ذہانت و فراست کا ثبوت دیا۔ کسی مقابلہ میں کبھی وہ پیچھے نہ رہے۔ وہ ایک شاعر باپ کے بیٹے تھے۔ خود شعر و شاعری کا ذوق انھیں ورثہ میں ملا تھا۔ کبھی کبھی شعر کہہ لیتے تھے۔ نمونہ یہ ہے:-

فرقت نصیب رہتا ہے جس نازنیں سے دور
یارب نہ کیجیو مجھے اس مہ جبیں سے دور

رکھا نصیب نے مجھے کس نازنیں سے دور
بھاگے ہے ہر حسین جہاں کے حسین سے دور

بلبل تو ہوں پر ایک گلِ یاسمیں سے دور
برجیس ہوں مگر بتِ زہرہ جبیں سے دور

ہوتا نہیں اثر ترے دل میں تو سنگ دل
یاں تیر آہ گذرا ہے عرشِ بریں سے دور

ہے شکر کردگار عقوبات سے بچے
خالق نے کر دیا مجھے تاج و نگیں سے دور

یارب وہ دن ہوں پھر کہ پری بے نقاب ہو
رکھوں حجاب کو رخِ پردہ نشیں سے دور

فرشِ زمیں یہ چرخِ بریں کا جواب ہے
افشاں جو ہو گئی ہے تمہاری جبیں سے دور

تکرار ایسے لفظ کی ہو سے کہ وقتِ آہ
للہ آپ رکھیں زباں کو نہیں سے دور

یوں خالِ روئے یار ہے رخ سے علیحدہ
رہتا ہے جیسے ملک حبش شاہِ چیں سے دور

میں اپنا سر کروں گا قدم پہ ترے نثار
اے شہسوار ہو تو ذرا آفاتِ زیں سے دور

تن خاک تیری راہ میں ہر وقت نذر ہے
کس طرح جاؤں جان تری سرزمیں سے دور

مٹی خراب ہو گئی نیپال میں مری
رہتا ہے کیوں مزارِ امامِ مبیں سے دور

---

[1] گذشتہ لکھنؤ (شرر) صفحہ ۷۰

(۳)

نواب بہادر خان

خان بہادر خان نواب حافظ رحمت خان کے فرزند دل بند تھے ۔ حافظ رحمت خان کو شجاع الدولہ نے انگریزوں سے ملاکر جنگ پر مجبور کیا اور انھیں شکست دے کر سارے روہیل کھنڈ پر قبضہ کرلیا پھر جب تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا اور پورا اودھ انگریزوں کے قبضہ میں آگیا تو روہیلکھنڈ میں بھی ان کا سکہ چلنے لگا ۔ حافظ رحمت خاں کا خاندان تباہ و برباد ہو چکا تھا لیکن بہادر خان موجود تھے انہوں نے ساری زندگی سرکاری ملازمت کی ، پنشن پا رہے تھے اور گوشہ عافیت میں آرام سے بیٹھے تھے یکایک غدر ہو گیا ۔ سپاہی بغاوت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے انگریز گھبرائے اور انھوں نے طے کرلیا کہ بریلی سے کسی امن کی جگہ روپوش ہو جائیں ۔

انگریزوں کے جانے کے بعد عوام وخواص اکابر واصاغر ہندو اور مسلمان سب کا اس پر اتفاق تھا کہ بہادر خان سے زیادہ مسند حکومت کا اور کوئی مستحق نہیں ۔ بہادر خان کو حکومت اور ریاست کی خواہش نہ تھی ۔ اُن کا دل بجھ چکا تھا ۔ زندگی کا بڑا حصہ ختم ہو چکا تھا قبر کے دہانے پر کھڑے تھے اور اب حکومت اور ریاست کی ہوس کرتے بھی کیوں ؟

وقتِ طلوع دیکھا وقتِ غروب دیکھا
اب فکرِ آخرت ہے دُنیا کو خوب دیکھا

یہی وجہ تھی کہ جب بریلی کے کمشنر مسٹر الیگزنڈر نے بہادر خان سے درخواست کی کہ ہم تو جا رہے ہیں آپ مسندِ حکومت پر متمکن ہو جایئے تو انہوں نے ضعیف العمری کا عذر کر کے انکار کر دیا لیکن جب عوام کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا تو وہ انکار نہ کر سکے۔ حکومت کی ہوس ہوتی تو کمشنر کا کہنا مان لیتے لیکن فرض کا تقاضا تھا کہ بگڑے ہوئے حالات کو سنبھالنے میں اپنی زندگی داؤں پر لگا دیں بہادر خاں نے یہی کیا۔

خوش قسمتی سے بہادر خاں کو بخت خاں جیسا دستِ بازو حاصل تھا۔ بہادر خاں نے فوج کی کمان اُس کے ہاتھ میں دے دی۔ عوام نے دل و جان سے نئے فرماں روا اور نئی حکومت کا خیر مقدم کیا۔ بہادر خاں کا دل تعصب سے خالی تھا۔ اپنی حکومت کا سب سے بڑا عہدہ یعنی وزارتِ عظمیٰ کا منصب ایک ہندو سوبھا رام کو سونپا۔

سندِ حکومت

بہادر خاں نے بھی برجیس قدر کی طرح بادشاہِ دہلی بہادر شاہ ظفر کے دربار سے سندِ حکومت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ انھوں نے بہادر خاں کا انتظام الدولہ محافظ الملک خان بہادر دلیر جنگ کا خطاب عطا فرمایا۔ بہادر خاں بے غل و غش حکومت کرنے لگے۔ شاہی مہر پر "الحکم اللہ والملک اللہ" کندہ کرایا۔[1]

بریلی میں بہادر خان نے شہر کا بہت معقول انتظام کیا۔ امن و امان قائم ہو گیا۔ عدل و انصاف کا سکہ جاری ہوا۔ یہ معلوم تھا کہ انگریز اپنا اقتدار دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے یہ بھی معلوم تھا کہ غداروں کی کمی نہیں اور وہ انگریزوں سے ساز باز کر رہے ہیں۔ بہادر خاں نے جنگ کی تیاری کی اور اودھ کے بہت سے سربرآوردہ جانبازانِ حریت کو اپنے اردگرد جمع کیا۔ ان سے بروقت صلاح و مشورہ ہوتا رہتا اور آئندہ کا پروگرام بنتا اگر دوستوں نے غداری نہ

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء

کی ہوتی تو شاید روہیلکھنڈ کی عظمتِ رفتہ ایک مرتبہ پھر واپس آجاتی۔ راقم الدولہ ظہیر دہلوی دلی سے بھاگ کر مختلف جگہوں کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے بریلی پہنچے تھے وہاں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

بریلی کا جذبۂ جنگ

"بریلی میں ہر طرف کے مفرورین کا اجتماع تھا اور سب سردار مثل نانا راؤ فیروز شاہ وغیرہ جمع ہیں۔ رام پور کے تیس ہزار آدمی بریلی میں ملازم ہیں اور مرد مان رام پور کا یہ حال ہے کہ ایک ایک تھان دوپٹہ کا سر سے بندھا ہے اور اس پر گوٹا لگا ہوا ہے۔ آدھا دوپٹہ سر سے بندھا اور آدھا گھوڑے کی رکاب سے نیچے لٹکتا ہے اور چار چار طمنچے کمر سے بندھے ہیں۔ دوہری تلواروں میں ڈاب رکھی ہوئی ہے۔ گھوڑوں پر سوار ہیں اور شہر میں گھوڑ ترنتے دوڑاتے پھر رہے ہیں۔ پچاس ہزار کا اجتماع بریلی میں موجود ہے۔"[1]

غداروں کی کارستانیاں

ایک سال تک بہادر خاں نے جاہ وجلال وشان تجمل کے ساتھ حکومت کی۔ انگریز باردم بریدہ کی طرح پیچ وتاب کھا رہے تھے انھوں نے اودھ پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی فوجِ ظفر موج کے ساتھ بریلی پر دھاوا کرنے کی سرگرم کوششیں شروع کردی تھیں۔ لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی کیونکہ عوام ان کے ساتھ تھے اور ملک کا امن وامان ہر طرح بحال ہو چکا تھا لیکن جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے مسلمان کو شکست دشمن نے کبھی نہیں دی۔ اپنی ہی صف سے غدار پیدا ہوئے اور انھوں نے شکست کا سامان مہیا کردیا۔ بہادر خاں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

بریلی پر انگریزوں کا حملہ

۵ مئی ۱۸۵۸ء کو انگریزی فوج نے دھاوا شہر پر بول دیا۔ مانڈے خاں جنرل اسمٰعیل خاں۔ نواب ولی داد خاں اور نواب تفضل حسین خاں محمدی نے سخت مقابلہ کیا۔ پیشوا نانا راؤ اور نواب تفضل حسین خاں محمدی پورسپہ گئے۔ غدارانِ ملک نے ایسی غلط افواہیں اڑائیں۔ نواب کے پیر اکھڑ گئے۔ اہل وعیال

---

[1] داستانِ غدر از ظہیر دہلوی

عیال کو پہلے بحفاظت روانہ کیا اور خود معہ فیروز شاہ کے مولوی احمد اللہ شاہ کے پاس محمدی چلے گئے شہزادہ مقابلہ پر ڈٹے رہے۔ آخرش ان کو بھی محمدی چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔ ۱؎

بہادر خاں کی گرفتاری

آخر انگریزوں کا دباؤ کامیاب ہوا اور بہادر خاں کو شکست ہوئی اہل و عیال کو وہ پہلے ہی نیپال بھیج چکے تھے، خود نیپال کے سنگستان کی طرف بڑھے لیکن قسمت ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اقبال جواب دے چکا تھا۔ حالات کی ناسازگاری انتہا کو پہنچ چکی تھی کوئی تدبیر کامیاب نہ ہوئی گرفتار کر لئے گئے اور انگریز حاکم کے سامنے مجرم کی حیثیت سے پیش ہوئے۔ یہاں سے انہیں بھی وہی سزا ملی جو دوسرے حُریت پسندوں اور آزادی خواہوں کو مل چکی تھی۔

تبصرۃ التواریخ کے مصنف نے بہادر خاں کی گرفتاری اور سزایابی پر چند سطریں لکھی ہیں وہ ایک عبرت انگیز مرقع ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

آزادی کا سپاہی پھانسی کے تختہ پر

نواب بہادر خاں رئیس و حاکم مستقل بریلی کسی پہاڑ کے جنگل میں ۱۱ آدمیوں سے پیچھے بیٹھے تھے، انہوں نے چاہا کہ اپنے تئیں ہلاک کریں صاحب نے کہا کہ ہم نے تمہیں امان دی ہے خاطر جمع رکھو جب لکھنؤ میں روبکاری ہوئی۔ کرنل میرو صاحب نے پوچھا تم نے مدت تک سرکار کا نمک کھایا۔ عہدۂ جلیلہ پر مامور رہے۔ اس سن پیری میں کیوں ایسی سرکار عالیشان سے بغاوت کی؟ جواب دیا تم نے ہمارا آبائی ملک چھین لیا تھا۔ تمہاری فوج نے تمہارا سامنا کیا جب تم بھاگے تمہارے باغیوں نے ہمیں مستحق ریاست سمجھ کر حاکم ریاست کر دیا۔ ہم اسے عنایت خدا سمجھے کہ اپنے حق کو پہنچے جہاں تک ہو سکا بچایا اب تمہارے قابو میں آئے۔ اختیار ہے صاحب نے کہا جب عملداری

۱؎ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء

سرکار ہوئی پھر تم نے ملک کو بخوشی کیوں نہ دیا کہا سرکار بھی کسی کو ملک دیتی ہے۔ غرضیکہ لکھنؤ سے حکم ہوا کہ تمہاری روبکاری خاص بریلی میں ہوگی۔ چنانچہ سوار پیدل کے پہرے میں مقید ہو کر بریلی گئے۔ حکام نے بعد میں روبکاری پھانسی کی تجویز کا حکم سنایا اور یہ بھی کہا کہ ہم اپنی تجویز لفٹنٹ گورنر کو لکھتے ہیں جیسا وہ حکم دیں عرض کیا میرے سب اظہار بھیج دیجئے۔ ان کا ایک گواہ بھی بھاگ گیا اور دوسرا حوالات میں رہا۔ قصہ مختصر آخر حکم پھانسی آیا۔ سوبھا رام جوان کا نائب تھا اسے بھی پھانسی ملی۔ ایک دوست بریلی کا کہتا تھا جب نواب کو چوک میں پھانسی کے لئے لائے خلقت شہر کی تماشے کو جمع تھی۔ صاحب کمشنر مع اور صاحبان عالیشان بھی آئے تھے۔ نواب اور صاحب کمشنر سے خوب تقریر ہوئی جب صاحب کمشنر خاموش ہوئے۔ نواب نے کہا اب دیر لگانا کیا ضروری ہے۔ حکم حاکم مرگ مفاجات ہے حسب دستور جلاد نے نواب کی مشکیں باندھ کر کپڑے اتارنے کو پوچھا منع کیا فرمایا ایک ہاتھ ان کا کلکٹر صاحب دوسرا اور صاحب تھام لے یہ فرما کہ کمشنر صاحب چلا کر روئے اور سوار ہو کر جلد چلے گئے۔ جب پھانسی دے چکے ورثاء نواب نے نعش طلب کی جواب دیا تم اسے شہید بنا کر قبر پر میلہ کیا کرو گے ہمارے لئے باعث تکلیف کا ہو گا بعد اس کے قلعہ میں گڑوا دیا۔ ان کے عیال کی بسر اوقات کو سرکار سے کچھ مقرر ہو گیا ہے۔[1]

---

[1] قیصر التواریخ جلد ۲ صفحہ ۳۶۹

اسلام کا بول بولا، فرنگی کا منھ کالا

بہادر خاں، حافظ رحمت کے پوتے تھے، اسلامی جمعیت سے سرشار، مذہبی جذبہ سے مخمور، شجاعت و تہور، رگ وپے میں طاری، شوق شہادت اور ولولہ جہاد جسم وروح میں جاری، ان کی حکومت قائم ہوئی تو لوگوں نے جوش وخروش کے ساتھ تائید کی، حالات کو درست کرنے میں انہوں نے بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، ان کا مختصر عہد حکومت، برکت وسعادت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا:

"خان بہادر خان کے زمانہ حکومت میں پورا شہر ساری رات جاگتا رہتا تھا۔ بازار کھلے رہتے، سڑکوں اور گلی کوچوں میں بڑی رونق اور چہل پہل تھی۔ مکمل امن و امان تھا۔ لوگ نواب کی انتظامی قابلیت اور رعایا پروری کے بڑے مداح تھے۔ مسجدیں۔ مسافر خانے اور سڑکیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ امن و امان کی ڈونگی پٹتے ہی ہر چیز ارزاں ہو گئی تھیں۔ تیل روپے کا پانچ سیر۔ گھی ڈھائی سیر اور گیہوں بیس سیر کے حساب سے فروخت ہو رہا تھا۔ کوئی گھر ایسا باقی نہ تھا جس میں کوئی تقریب نہ ہوئی ہو۔ لوگ خوش ہو ہو کر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے اور کہتے کہ خدا نے اپنی رحمت سے کافروں کی حکومت سے ایسی نجات دلائی کہ ہر چیز میں برکت ہو گئی ہے۔

اسلحہ سازوں کی دکانوں پر بڑی بھیڑ رہتی تھی۔ تلواروں پر دستے چڑھوائے جا رہے تھے۔ مجاہدوں کے غول کے غول زرہ بکتر سے لیس پورے شہر میں گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے اور "اسلام کا بول بولا فرنگی کا منہ کالا" کے نعروں سے زمین و آسمان ہل جاتے تھے۔" [1]

---

[1] العلم، جنگ آزادی نمبر صفحہ ۲۵

بہادرخاں کے بہادر ساتھی

جو صادق اور صالح جذبہ بہادر خان کے بڑھتے ہوئے دل میں کارفرما تھا۔ وہ نوجوان قلوب کو بھی گرما رہا تھا۔ یہ نوجوان کیسے سرفروش اور جاں باز تھے؟ ایک نمونہ دیکھیے

"جب سر جان کولن کی سرکردگی میں انگریزی فوج بریلی کی جانب بڑھی، تو دوسرے بھاگے ہوئے انگریز بھی آ گئے اور دلیرانہ حملہ کر دیا۔ ادھر عوام میں سخت پریشانی اور انتشار پھیل چکا تھا لیکن خان بہادر خاں بھلا ایسے مقابلہ کیسے میدان چھوڑتے۔ شہر سے ۵ میل باہر نکٹیا نڈی کے پار مورچہ قائم کیا۔ پہلی صف توپوں کی تھی۔ دو صفیں فوجوں کی اور خود امدادی سپاہ کے ساتھ عقب میں موجود رہے جنگ صبح صادق سے شروع ہوئی میدانِ جنگ دریا کے دونوں جانب تھا۔ بڑے میر خاں، ولی داد خاں، شہزادہ فیروز شاہ وغیرہم نے حق مردانگی ادا کیا۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ خان بہادر خاں کی فوج میں ایک دستہ جانبازوں کا بھی تھا جو بلاشبہ سر سے کفن باندھ کر جان دینے اور جان لینے کے ارادے سے آئے تھے۔ گورا پلٹن ۳۳ کے سرجنٹ میجر نے ۱۸۵۷ء کے معرکوں کی یادداشت میں ان مجاہدین کے سرداروں کی بے حد تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ

"خان بہادر خان کی فوج میں غازیوں کی ایک جماعت بھی تھی۔ یہ سب مسلمان شہادت کے نشے میں چور تھے، ان کی داڑھیاں سفید تھیں۔ انگلی میں چاندی کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھے جس کے نگینہ پر اللہ کندہ تھا۔ ہر غازی کی کمر میں سبز رنگ کا ٹپکا تھا وہ روئی کی صدری پہنے ہوئے تھے اور سر پر سفید پگڑیاں باندھے ہوئے تھے جس پر سُرخی کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں تلوار تھی اور پشت پر ڈھال۔ دین کا نعرہ لگا کر ہمارے

سامنے آئے اور حملہ آور ہونے سے پہلے ان کا سردار جو ایک بیس سال کا بے ریش و بردست نوجوان تھا جس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا، صف سے آگے بڑھ کر ہم سے یوں مخاطب ہوا "کیا تم کافروں میں کوئی شخص حوصلہ مند ہے جو میرا مقابلہ کر سکتا ہے اگر ہے تو سامنے آئے"۔ اس کی آواز پر ہماری صفوں میں سناٹا چھا گیا۔ کوئی نوجوان آگے نہیں بڑھا۔ ایک منٹ کے بعد پھر چیلنج دیا اور کہا "میں پانچ پانچ آدمیوں سے تنہا مقابلہ کر سکتا ہوں" لیکن پھر بھی کوئی حرکت نہ ہوئی۔ آخر جھنجھلا کر اس نے تلوار میان سے باہر نکالی اور ہماری صفوں پر حملہ آور ہوا۔ اس نے اس شدت سے حملہ کیا کہ چشم زدن میں اٹھارہ سپاہیوں کو زخمی کر کے ڈال دیا۔ اس کی بے نظیر شجاعت سے کمانڈنگ افسر اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے حکم دیا کہ اس نوجوان کو زندہ گرفتار کیا جائے۔ لیکن اس نے کہا تم زندہ شیر کو گرفتار نہیں کر سکتے چنانچہ زخمی ہو جانے کے باوجود جبکہ اس کے جسم کے ہر عضو سے خون کے فوارے نکل رہے تھے۔ اس نے دوبارہ اسی شدت کے ساتھ حملہ کیا۔ جب کمانڈنگ آفیسر نے یہ دیکھا کہ اگر اس کو قتل نہ کیا تو شاید ساری کمپنی (سَو آدمی کی ایک کمپنی) کا صفایا کر دے گا تو مجبوراً اس نے حکم دیا کہ سنگینوں سے خاتمہ کر دو۔ یہ حکم سن کر سپاہیوں نے اسے نرغہ میں لے کر اپنی سنگین بیک وقت اس کے سینہ میں پیوست کر دیں، لیکن جب تک اس کی روح جسم میں باقی رہی وہ برابر اپنی تلوار کے جوہر دکھاتا رہا"۔ [۱]

بہادر خاں کا ذوق تعمیر

بہادر خاں کو حکومت اور فرماں روائی کی بہت کم مہلت ملی لیکن اس مختصر مدت میں بھی انھوں نے تعمیری ذوق و شوق

---

[۱] العلم۔ جنگ آزادی نمبر صفحہ ۴۸

شاندار مثالیں قائم کر دکھائیں۔

"نواب بہادر خاں کو حکومت کرنے کے لئے صرف دس ماہ کا عرصہ ملا تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اس مختصر زمانے میں اپنے نامور دادا حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے مقبرہ کی مرمت کرائی۔ محلہ کھجوڑ میں قبرستان سے متصل ایک مسجد تعمیر کرائی، جو اب تک موجود ہے خود ان کی عظیم الشان کوٹھی انگریزوں نے ایک وسیع کھنڈر میں تبدیل کر دی جو ۱۸۵۷ء کے بعد تک کھیڑا خان بہادر خاں کہلاتی تھی۔ یہ کھیڑہ اب برادرانِ وطن کے قبضہ میں ہے اور اس پر جدید عمارات تعمیر ہو رہی ہیں۔"

بہادر خاں کی ایک غزل

رزم کے میدان میں بہادر خاں تلوار سے کھیلتے تھے، لیکن بزم کی بساط پر وہ غزل سرائی سے بھی دلچسپی لیتے تھے:

تا حشر اب خیال نہ میرا کرے گا دل
تو اس کو مل گیا تو مرا کیا کرے گا دل

جان و جگر تو نام کو باقی نہیں رہے
کیونکر اب اس کی زلف کا سودا کرے گا دل

جان و جگر کے واسطے دیکھو گے دوستو
کن کن خرابیوں کو نہ برپا کرے گا دل

شانے کی طرح اور بھی ہووے گا چاک چاک
جیوں جیوں کہ اس کی زلف سنوارا کریگا دل

مصروف دیکھ پیروئی دل نہ کیجیو
میری طرح سے تجھ کو بھی رسوا کرے گا دل[1]

نواب خان بہادر خاں اعلیٰ پایہ کے مصنف بھی تھے افسوس ہے کہ ان کی صرف ایک تصنیف ہم تک پہنچی ہے، اس کتاب کا نام "مقاصد الصالحین" ہے اس کتاب کی دریافت کا سہرا پروفیسر قاری بشیر الدین پنڈت شاہجہانپوری کے سر ہے۔ نواب خان بہادر خاں کا خط بہت پاکیزہ تھا۔

غداروں پر انعامات کی بارش۔ جن ہم وطنوں اور ہم قوموں نے بہادر خاں کے ساتھ غداری

---

[1] حیات حافظ رحمت خاں

کی اور انگریزوں کی خفیہ یا علانیہ مدد کی۔ ان کو سرکار فرنگ نے انعام و اکرام سے سرفراز بھی کیا۔

ایک مختصر سی فہرست یہ ہے :۔

۱۔ ٹھاکر لاکھن سنگھ آف بدھیلی	خطاب راؤ بہادر۔ آنریری مجسٹریٹ اور آٹھ ہزار روپے مالگزاری کی ریاست
۲۔ ٹھاکر رگھوناتھ سنگھ آف بدھیلی	پانچ ہزار روپیہ مالگزاری کی جائداد دوسروں کی ضبط کے دی گئی
۳۔ ٹھاکر ظالم سنگھ آف اُج پور جس نے کپتان ہارڈن اور (اس کے خاندان کو بچایا تھا)	دو ہزار روپیہ مالگزاری کی زمینداری
۴۔ بیج ناتھ مصرا بینکر	راجہ کا خطاب تقریباً ۲۰ گاؤں محبانِ وطن کے ضبط شدہ
۵۔ لچھمی نرائن خزانچی	۲ ہزار روپیہ مالگزاری کی زمینداری
۶۔ چودھری نوبت رام	۲ ہزار روپیہ مال گزاری کی زمینداری
۷۔ گنگا پرشاد تحصیلدار بدایوں	۱۲۰۰ روپیہ مالگزاری کی زمینداری۔ بریلی کا تحصیلدار مقرر تھا اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر محبانِ وطن کو پھانسی پر لٹکوایا۔
۸۔ ٹھاکر بختاور سنگھ آف مراداباد (اس نے انگریزوں کی مدد کے واسطے فوجی دستہ تیار کیا تھا)	قصبہ شاہی کا تحصیلدار مقرر کیا گیا اور دو ہزار روپیہ مالگزاری کی زمینداری دی گئی۔
۹۔ شیخ بدرالدین	یہ انگریزوں کے ساتھ نینی تال بھاگ گیا تھا ان کی بہت مدد کی تھی۔ ۱۲۰۰ روپیہ مالگزاری کی زمین دی گئی [1]

---

[1] العلم (جنگِ آزادی نمبر) صفحہ ۹۰

تانتیا ٹوپے

مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میر
کیا دیوانے نے موت پائی ہے

جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب "تلاش ہند" میں جہاں جنگِ آزادی اور جانبازانِ حریت کا تذکرہ کیا ہے، وہاں تانتیا ٹوپے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے :-

اس تحریک نے بعض بہت اچھے گوریلا لیڈر پیدا کئے - ان میں بہادر شاہ کا ایک عزیز فیروز شاہ بھی تھا مگر سب سے زیادہ ہوشیار تانتیا ٹوپے تھا جو برطانوی حکومت کو اس دقت بھی مہینوں تک پریشان کرتا رہا - جب اس کو اپنی شکست کا یقین ہو گیا تھا - آخر کار جب وہ نربدا کو پار کر کے مرہٹوں کے علاقے میں پہنچا اس امید پر کہ اس کے ہم وطن اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور اس کا ساتھ دیں گے مگر اس کا خیر مقدم کرنے کی بجائے اس کے ساتھ دغا کی گئی - ؎۱

؎۱ DISCOVERY OF INDIA

حقیقت یہ ہے کہ تانتیا ٹوپے جیسا گوریلا سپاہی اس جیسا من چلا اور جیالا جنگجو ہندوستان کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس نے ہر مرحلہ پر شکست کھائی، لیکن اس کے عزم و ہمت کو شکست کوئی نہ دے سکا، جنگ کے ہر میدان میں وہ ہارا لیکن اس کے ثبات و استقلال نے ہزیمت اور شکست ایک لمحہ کے لئے بھی قبول نہیں کی ـــ یہ بہت بڑی بات ہے۔

تانتیا ٹوپے، نانا صاحب کا مصاحب اور ندیم تھا، مرہٹہ خون اس کی رگوں میں بھی گردش کر رہا تھا انگریزوں سے نفرت کا جذبہ اس کے سینہ میں بھی موجزن تھا، ہر مرحلہ پر، ہر مورچہ پر، ہر معرکہ میں، تانتیا نے اپنے ہوش و حواس قائم رکھے، اپنی راہِ عمل پر گامزن رہا۔

کانپور میں جب نانا کا قلعہ اجڑا تو وہ اس شکست سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا اس کے تیور دیکھئے، اس کے دم خم کا وہی عالم تھا۔ کانپور کی شکست کے بعد تانتیا ٹوپے کو تحریک کا دائرہ بنا کر نانا صاحب لکھنؤ آئے۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:-

مسٹر اسّی ہزار آدمی بہادری، استقلال اور ہوشیاری سے اپنے مستحکم مقام کو استوار کر بیگم نے یہاں کو حضرت محل نائب السلطنت کے علم کے نیچے شہر میں جمع کر لیا تھا۔[1]

چرکھاری پر یورش

مولانا ذکاء اللہ، تانتیا ٹوپے سے بھی اتنے ہی خفا تھے، جتنے ہر اس شخص سے جس نے انگریزوں کے خلاف تلوار اٹھائی۔ لیکن تانتیا کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

> تانتیا ٹوپے بڑا لائق مرہٹہ سردار تھا وہ رندھیم پر فتح پا کر اور سر کولن کیمبل سے شکست پا کر گنگا پار اتر آیا۔ پھر نانا کے بھتیجے راؤ صاحب کے حکم سے چرکھاری گیا اور نو سو سپاہی اور چار توپیں ساتھ لیتا گیا تھا۔ گیارہویں دن چرکھاری کو فتح کر لیا۔ یہاں ۳ لاکھ روپیہ اور چوبیس توپیں ہاتھ آئیں۔

---

[1] ہسٹری جلد انگلشیہ

رانی جھانسی کی استمداد۔ اس وقت اس کے پاس جھانسی کی رانی کا
خط آیا کہ میری استعانت کرو پھر راؤ صاحب سے جھانسی جانے کی اجازت حاصل
کی۔ اس وقت اس کی سپاہ میں پانچ یا چھ رجمنٹ گوالیار کنٹنجنٹ کی اور
سرکش راجاؤں کی سپاہ شامل ہو گئی تھیں جس کے سبب سے اس کے پاس
بائیس ہزار سپاہ کی جمعیت تھی۔ اٹھائیس توپیں ہو گئی تھیں۔ اس سپاہ کو ساتھ
لے کر وہ جھانسی کے سامنے آیا۔ اس وقت سر ہیو روز کی حالت معرضِ خطر
میں تھی اس کے آگے ایک قلعہ غیر مفتوح تھا جس میں گیارہ ہزار آدمی بڑے
پرجوش لڑنے والے موجود تھے بیس ہزار سپاہ کا ایک سردار جس کو انگریزوں
سے عداوت تھی اور وہ ان کو شکست دینے کی مسرت حاصل کر چکا تھا آگے
بڑھتا ہوا قریب آرہا تھا۔ ایسی حالت کی جواب دہی کے واسطے ایک خاص
درجہ کی بہادری اور نہایت استقلال و قوت کی ضرورت تھی۔ اگر ایک
قدم پیچھے رکھا جاتا یا رائے میں فقط غلطی ہوتی تو وہ ہلاک کر دیتی۔ مگر
سر ہیو روز اس موقع کے لئے سب طرح سے سزاوار اور لائق تھے۔ انہوں
نے یہ یقین کیا کہ قلعہ کا جو سپاہ محاصرہ کر رہی ہے اگر اس کو اس مطلب کے
لئے ہٹا لوں کہ نئے دشمن کی سپاہ سے جا کر لڑے تو محصورین کو اخلاقی فائدے
فتح کے ایسے ہی حاصل ہوں گے جیسے مادی فائدے اصلی محاصرہ کے
اٹھ جانے سے۔ اس انگریزی جنرل نے محاصرہ میں اور زیادہ تشدد کیا اور
اس سپاہ کو ساتھ لے کر جو درحقیقت لڑائی میں شریک نہ تھی، نئے دشمن
سے لڑنے گیا۔ پڑھنے والے جب یہ جانیں گے کہ اس کے پاس سب قسم کی
سپاہ پندرہ سو آدمیوں سے زیادہ جمع نہ ہو سکی تو سمجھیں گے کہ یہ کام
کیسا جلیل القدر شجاعت کا تھا اس کی سپاہ میں صرف ۵ سو گورے

تھے۔ اور تانتیا ٹوپے کے بیان کے موافق اس کے پاس بائیس ہزار سپاہ تھی
سر ہیوروز نے ۳۱ مئی کو جنگ کی تیاریاں کیں اور پہلی اپریل کو لڑنے کا
ارادہ مصمم کیا۔

سر ہیوروز نے دو تو برگیڈ سے سپاہ لی۔ پہلی اپریل کو ۴ بجے رات کے
تانتیا ٹوپے نے انگریزی لشکر کی طرف پیش قدمی کی آدھ گھنٹہ کے بعد انگلش جنرل
کو ان کے قریب آجانے کی خبر ہوئی۔ چند منٹ بعد انگریزی توپوں نے دشمن
کے لشکر پر فیر کئے اور اس نے ان کے جواب دیئے۔ تانتیا اس سپاہ کی
طرف بڑھا چلا جو قلعہ کو محاصرہ کر رہی تھی۔ سر ہیوروز فوراً اپنے مقام کی
حالت کو سمجھ گئے اور یہ تدبیر کی کہ اسی توپ خانہ کو جو ماتحت کپتان لائٹ
فٹ کے تھا اور اس کے ساتھ چودھویں ڈریگونس کو جو کپتان پرسٹ جان
کے ماتحت تھا حکم دیا کہ دشمن کے میمنہ پر حملہ کرے اور اپنے لئے میسرہ پر حملہ
کرنا مقرر کیا۔ کرنل صاحب کی دو توپوں کے ڈویژن کو بھیجا کہ دشمن کے
میسرہ کی خبر لیں۔ ایک توپ سے ایسی صحیح نشان اندازی کی کہ میسرہ تتر بتر
ہو گیا۔ دشمن سپاہ کے قلب نے جواب تک استقلال کے ساتھ بڑھا چلا
آتا تھا انگریزی پیدلوں کی رفتار کو دیکھا تو وہ غیر مرتب غولوں میں منتشر
ہو گیا۔ سر ہیوروز نے پیدلوں کو گولیوں کی باڑ ماری اور یورش کی۔ اس
کا اثر جادو کا سا ہوا۔ دشمن کے لشکر کی پہلی لائن شکستہ ہوئی اور وہ بالکل
ابتر اور پریشان ہو کر دوسری لائن کی طرف بھاگی۔

مقابلہ اور شکست:۔ دوسری لائن پر تانتیا ٹوپے خود حکمران تھا وہ ایک
پہاڑی پر مقیم تھا۔ پہلی لائن کے عقب میں ایک جنگل دو میل لمبا تھا۔ اس
نے دیکھا کہ دو ہزار سپاہی اس کی طرف بھاگے چلے آتے ہیں اور اس کے

تعاقب میں تین قسم کی سپاہ انگریزی چلی آئی ہے اور برگیڈیر مع سپاہ کے پہاڑی کے سامنے میدان چلے آتے ہیں۔ تاکہ اس سپاہ کثیر کو روکیں جو جھانسی کی طرف جاری ہے۔ سٹوورٹ صاحب نے اس پر حملہ کیا اور شکست دی اور پسپا کیا۔ بڑی سرگرمی سے وہ اس کے پیچھے گئے۔ یہ تعاقب ایسا تھا کہ دشمن کو فرصت نہیں ملی کہ وہ اپنے تئیں درست کرے۔ وہ منتشر اور پریشان ایسا بھاگا کہ توپ پر توپ چھوڑتا گیا جو فتحمندوں کے ہاتھ آئیں۔ میدانِ جنگ میں بہت سے مرے ہوئے اور مرتے ہوئے چھوڑ گئے۔ تانتیا ٹوپے یہ حال دیکھ کر مایوس اور دل شکستہ ہوا۔

تعاقب:۔ پہلے ہم نے بیان کیا ہے کہ تانتیا کے لشکر گاہ کے آگے جنگل تھا وہ خشک تھا اس لئے آگ لگائی اور اس کے دھوئیں اور روشنی کی آڑ میں بھاگ کر پار اتر گیا اور ندی کو اپنے اور اپنے تعاقب کرنے والوں کے درمیان حائل کر لیا۔ وہ اپنے پیادوں اور سواروں کو پار لے گیا مگر اس طرح سے اس کا پیچھا نہ چھوٹا۔ انگریزی لشکر نے جلتے ہوئے جنگل میں گذر کر تعاقب کیا اور ساری توپیں چھین لیں۔ آج پندرہ سو باغی مارے گئے اور زخمی ہوئے باقی سپاہ تانتیا ٹوپے کے ساتھ کالپی کی سڑک پر بھاگ گئی۔ ۱؎

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

تانتیا ہار رہا تھا، بھاگ رہا تھا، پسپا ہو رہا تھا۔ لیکن انگریزوں کے لئے ناقابلِ علاج دردِ سر بنا ہوا تھا:۔

۷؍۔ جون کو روبرٹس صاحب کو معلوم ہوا کہ تانتیا ٹوپے نے اپنے مخفی آدمی جے پور میں انگریزوں کے بدخواہ کے پاس بھیجے ہیں کہ ان کو یقین دلادیں

۱؎ تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۱۴۳

کہ وہ جے پور میں آتا ہے۔ اس کے ساتھ ملنے کے لئے وہ تیار رہیں۔
روبرٹس صاحب نے ۲۸ جون کو نصیر آباد سے کوچ کیا اور تانتیا ٹوپے سے
آنے سے پہلے وہ جے پور میں آگئے۔

جب تانتیا نے جے پور کا یہ حال دیکھا تو اس نے ٹونک کی طرف رُخ
کیا۔ اس کے پیچھے کرنل ہولمس صاحب گئے اور یا ہر جو سپاہ تھی اور ان کے
پاس چار توپیں تھیں اس کو حکم دیا کہ وہ باغیوں کا مقابلہ کرے۔ لیکن
اس سپاہ نے باغیوں سے مقابلہ کرنے کے بجائے برادرانہ مدارات کی اور
اپنی چاروں توپیں ان کو دے دیں جس سے تانتیا کی سپاہ کا اضافہ ہو
اور مع اضافہ کے جنوب کی طرف مادھو پور اور اندر گڑھ کی جانب گیا
جو کوٹہ سے ۴۵ میل شمال مشرق میں ہے یہاں پر ہولمس صاحب اس کے تعاقب
میں موجود تھے اور اس کے بعد روبرٹس صاحب آگے بڑھے۔ بارش کی وہ شدت
تھی کہ نہ اس میں گھوڑے اچھی طرح بھاگ سکتے تھے۔ نہ ان کے پیچھے
تعاقب کرنے والے اچھی طرح جا سکتے ہیں۔ چنبل ایسی چڑھی ہوئی تھی کہ
تانتیا پار نہ جا سکا تو بوندی میں چلا آیا۔ ہولمس صاحب اس کے تعاقب
میں رہتے تھے اس لئے وہ کہیں قیام نہ کر سکتا تھا۔ وہ بوندی کے پہاڑوں
کے پار کینیاہ کے گھاٹ کر سانگانیر اور بھیلواڑہ کے درمیان آ گیا
یہ دونوں مقام اودے پور کی ریاست میں نصیر آباد اور نیمچ کی سڑک پر تھے
روبرٹس صاحب بارش کی کثرت کے سبب سے سردار میں تھے جو اجمیر سے
تیس میل پر ہے۔ بھیلواڑہ کے سامنے باغیوں کے پیدل اور توپیں اور سوار
ندی کوٹھاریا کے پار سنگانیر تک پڑے ہوئے تھے اور ہاتھی اور اسباب ان
کے پیچھے تھے۔ روبرٹس صاحب نے باغیوں پر حملہ کیا اور تانتیا کو بھگا دیا

دوسرے دن رودبرٹس صاحب کے پاس سوار آئے تو تانتیا کا تعاقب کیا اور باغیوں کو ان کے مقامات سے نکالنا شروع کیا۔ باغی بیاس ندی کے کنارے پہنچ گئے ۔ ۱۳ اگست کو تانتیا ناتھ دوارا کے درشن کرنے گیا جب وہاں سے آتا تھا تو آدھی رات کو اس نے سنا کہ انگریزی لشکر قریب آگیا ہے۔ حملہ کے خوف سے اس نے اپنے خیمے ڈیرے کے اکھیڑنے کا اور لشکر کو سفر کرنے کا حکم دیا۔ دوسرے دن ایک مستحکم مقام میں قیام کیا۔ انگریزی لشکر نے چنبل کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ کیا۔ روبرٹس صاحب نے اپنی عقل سے اس کے ارادہ کو جان لیا وہ سفر کرکے بیدنور چھوڑ کے قریب قصبہ پونا میں پہنچے یہاں بریگیڈیر پارک سے ملے وہ ٹیم بریگیڈ کا کمانڈر تھا۔ اب روبرٹس صاحب نے تانتیا کے تعاقب کا کام اس کو سپرد کردیا۔ اس عرصہ میں تانتیا چنبل سے اترا اور تیس میل کے فاصلہ پر جھالراپاٹن میں پہنچا۔ جھالراپاٹن ایک خوب صورت شہر ریاست جھالاوڑ میں ہے جے پور کے نمونے پر بنایا گیا ہے اس ریاست کا رانا پرتھی سنگھ تھا وہ بڑا خیر خواہ سرکار انگریزی کا تھا رانا کی سپاہ باغیوں سے مل گئی۔

جھالراپاٹن پر تانتیا کا قبضہ:۔ تانتیا نے اول رانا کی توپوں پر قبضہ کیا جو تیس سے کم نہ تھیں ان کا میگزین اور بیل گھوڑے لے لئے پھر رانا کے محل کو گھیرا اور دوسرے روز رانا سے ملاقات کی اور روپیہ مانگا۔ رانا نے پانچ لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا مگر راؤ صاحب نے جو پیشوا کی جگہ تھی۔ پچیس لاکھ روپے مانگے۔ آخر رانا پندرہ لاکھ روپے دینے کو تیار ہوگیا۔ لیکن اصل میں اس نے ۵ لاکھ روپے دیئے مگر تانتیا نے اس پر طعن و تشنیع ایسے کئے کہ وہ اسی رات کو بھیس بدل کر بھاگا اور مہو میں آگیا اور اپنی بی بی کی

بھی بارود کے پیسے دے گیا کہ اگر کوئی اس کی مورچہ حصمت کو بگاڑنا چاہے تو وہ
بارود میں اُڑ جائے۔ غرض تانتیا کو یہاں بہت سا روپیہ اور جواہرات اور ہر قسم
کا اسباب ہاتھ آیا۔ یہاں پانچ روز قیام کیا جو روپیہ ہاتھ آیا تھا وہ اپنی
سپاہ کی تین مہینے کی تنخواہ میں تقسیم کیا۔ سوار کو تیس روپے ماہوار پیادہ
کو بارہ روپے ماہوار کے حساب سے تنخواہ دی۔ یہاں کی اقامت میں اس
کے ہمراہیوں راؤ صاحب اور نواب باندہ کو یہ سوجھی کہ اندور چلیے اور ہلکر کی
سپاہ اپنے ساتھ ملایئے وہ مرہٹوں کے پیشوا کی خدمت کریں۔ بس اس
خیال سے تانتیا ٹوپے راج گڑھ میں آیا

راج گڑھ سے تانتیا کا فرار۔ لاک ہارٹ صاحب اجین سے سوس
نیر جب راج گڑھ سے سترہ میل کے فاصلہ پر آ گئے اور سوسنیر سے تین میل کے
فاصلہ پر جنوب میں ان کی کمک نال کیڑہ میں آ گئی۔ میجر جنرل رابرٹس کی جگہ
میجر جنرل میچل صاحب مقرر ہوئے۔ وہ مالوہ اور راجپوتانہ کے قریب پہنچے
تو یہاں سے تانتیا اپنی سپاہ کے رات کو بھاگ گیا۔ میچل صاحب نے اس
کا تعاقب کیا اور اس کو شکست فاش دی اور ستائیس توپیں چھین لیں تانتیا
سرونج میں بھاگ گیا اب جاڑے کے موسم کا آغاز تھا۔

تانتیا سرونج میں۔ اب برسات کا موسم ختم ہو گیا تھا۔ جاڑے کی
فوج کشی کا حال ہم سناتے ہیں کہ تانتیا ٹوپے بیتوا ندی کے دونوں طرف جنگلوں
میں سرونج کی طرف پھرتا رہا اور وسط ستمبر میں سرونج پہنچ گیا یہاں آٹھ روز
ٹھہر کر ایسی گڑھ میں پہنچا۔ یہ قصبہ مع قلعہ سندھیا کی عملداری میں سپیری کے
جنوب میں تھا۔ یہاں اس نے لوگوں سے مدد مانگی انہوں نے دینے سے انکار کیا تو
اس نے اس قصبہ کو لوٹ لیا اور سات توپیں لے لیں پھر تانتیا تو سپاہ لے کر

چندیری کی طرف اور راؤ صاحب مع سپاہ بھٹ کی طرف روانہ ہوئے چندیری میں مہاراجہ سندھیا کا ایک سچا خیر خواہ سپاہی موجود تھا۔ اس نے تانتیا کو چندیری میں داخل ہونے نہیں دیا تو تانتیا نے چندیری کو حملہ کر کے لینا چاہا تین دن تک اس کے لینے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے مگر کچھ نہ ہوا تو وہ تونگر ولی میں بیسوا کے بائیں کنارہ پر چندیری سے بیس میل کے فاصلہ پر جنوب میں چلا گیا۔

للت پور میں تانتیا کا ورود: - ۹ر اکتوبر کو میچل صاحب منگرولی کی طرف چلے۔ ان کو معلوم ہوا کہ تانتیا اس مقام کے منفصل مرتفع زمین پر موجود ہے۔ یہاں تانتیا میچل صاحب سے لڑا اور شکست کھا کر اور اپنی توپیں چھوڑ کر بھاگا۔ تانتیا بیسوا سے پار ہو کر جکلاؤں میں آیا۔ دوسرے روز للت پور میں جا کر راؤ صاحب سے ملا اور دوسرے دن راؤ صاحب مع سپاہ اور توپوں کے جنوب مشرق کی طرف آگے بڑھا اور سندھوایا میں آیا۔ میچل صاحب نے اس کو یہاں شکست فاش دی اور بارہ میل تک تعاقب کیا۔ باغیوں کا بہت نقصان ہوا مگر راؤ صاحب بھاگ کر نکل گیا۔ انگریزوں کے ۱۵ افسر اور بیس سپاہی مقتول و مجروح ہوئے۔ راؤ صاحب للت پور میں تانتیا سے ملا اور دونوں کی یہ صلاح ہوئی کہ اس ملک میں تو انگریزی سپاہ نے ہم کو نرغہ میں لے رکھا ہے۔ نربدا کے پار جانا چاہیئے۔

تانتیا ناگ پور پہنچ گیا: - جب میچل صاحب کو معلوم ہوا کہ تانتیا ٹوپے جنوب کی طرف جا رہا ہے تو انہوں نے اس کو کوروی میں شکست دی اور تانتیا کے میسرہ کو بالکل غارت کر دیا مگر تانتیا اور راؤ صاحب اپنی نصف سپاہ کو ذبح کرا کے خود بھاگ گئے۔ یہ لڑائی ۲۵ر اکتوبر ۱۸۵۸ء کو ہوئی۔ اب

تانتیا راج گڑھ میں پہنچا راہ میں کرنیل چارلس میجر نے اس پر حملہ کیا اور چالیس آدمی اس کے مار ڈالے لیکن تانتیا ٹوپے ناگ پور کے ملک میں چلا گیا جو ہوشنگ آباد سے چالیس میل پر تھا۔ اب راؤ صاحب اور تانتیا مرہٹوں کے ملک میں آ گئے انہوں نے بمبئی اور آگرہ کی سڑک پر انگریزوں کی رسد کے چھکڑوں کو لوٹ لیا۔ جس کے سبب سے بمبئی مدراس پریزیڈنسیوں میں انگریزوں کو اندیشے اور خطرے پیدا ہوئے۔

اس ملک میں تانتیا نے دیکھا کہ کہیں اس کو انگریزوں کے تعاقب سے نجات نہیں ہے تو اس نے نربدا سے پار ہو کر بڑودہ جانے کا قصد کیا۔

راج پور میں تانتیا کی آمد ۔مچل صاحب تانتیا کے تعاقب کے لئے نزبدا کو ہوشنگ آباد میں پہنچے وہاں وہ پارک صاحب سے ملے جن کو انہوں نے ہوشنگ آباد میں چھوڑا اور خود نربدا کے پار جا کر بیتول کے قریب آئے تانتیا بھاگتا پھرا شکست پر شکست کھاتا رہا۔ اب اس کے پاس تین چار ہزار آدمی تھے۔ سدرلینڈ صاحب اس کے تعاقب میں تھے اس کو ایک جگہ شکست دی اور توپیں چھین لیں۔ تانتیا توپوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا اور نربدا کے پار اتر گیا اور ایک گاؤں جکلا لوٹ لیا اور بڑودہ کی طرف چلا۔ نربدا کے کنارے سے چونتیس میل چل کر وہ راج پور میں پہنچا۔ یہاں کے رئیس سے تین ہزار نو سو روپیہ اور تین گھوڑے لئے اور پھر چھوٹے اودے پور کی طرف چلا جو بڑودہ سے پچاس میل تھا۔ مگر اس کا تعاقب کرنے والے بہت تھے۔ پارک صاحب تانتیا کے تعاقب میں چلے آتے تھے انہوں نے چھوٹے اودے پور میں تانتیا کو آ لیا اور تانتیا کو شکست دے کر بڑودہ اس کو نہ جانے دیا تو وہ بھاگ کر بانسواڑہ کے جنگلوں میں آیا جو اجپوتانہ کے نہایت جنوب میں تھے یہ جنگل

بڑے گھنے تھے اور اس میں بھیل رہتے تھے۔ غرض اب راؤ صاحب اور تانتیا بڑی مصیبت کی حالت میں تھے۔ نواب باندہ نے اشتہار شاہی سے استفادہ اٹھایا اور اپنے تئیں سرکار کے حوالہ کیا۔

تانتیا دیوگڑھ میں۔ تانتیا جنگلوں میں ہوتا ہوا دیوگڑھ میں پہنچا۔ اب اس کے پاس سپاہ بہت تھوڑی رہ گئی تھی۔ دو دن اس نے قیام کیا کہ اس کی سپاہ پھر اس کے پاس آن پہنچی۔ وہ دسویں دسمبر کو بانسواڑہ میں داخل ہوا یہاں ایک دن ٹھیرا۔ سولہ سترہ اونٹ کپڑوں سے لدے ہوئے احمد آباد سے جاتے تھے، ان کو لوٹ لیا وہ یہاں زیادہ ٹھیرتا مگر اس کو خبر لگی کہ رتلام سے کرنیل سمرسٹ کا کالم قریب آگیا ہے تو وہ سلومبا میں بھاگا۔ یہ ایک قلعہ اودے پور کے رانا کا ہے یہاں اس نے سامانِ رسد بہم پہنچایا جس کی ضرورت اسے بہت تھی دوسرے دن اس امید میں چلا کہ اودے پور کو جاکر دھمکاوے گا مگر جب انگریزوں کو خبر ہوئی تو میجر روک صاحب کالم لے کر آئے جہاں سے ان کو اودے پور کی حمایت کرنی اور تانتیا کو روکنا آسان تھا۔ تانتیا اس سے بچ کر بھیلواڑہ گاؤں میں آیا۔ اس نے یہاں یہ صلاح کی کہ اپنے تئیں حوالہ کر دینا چاہیے۔ مگر مان سنگھ اور فیروز شاہ اس کے پاس آنے والے تھے اس لئے یہ صلاح موقوف رہی۔

تانتیا بھیلواڑہ میں دو روز مقیم رہا۔ پھر پرتاب گڑھ گیا۔ انگلش جنرل تانتیا کی راہ کو جانتا تھا۔ اب اس کو فیروز شاہ کی حرکت کی بھی خبر ملی۔

تانتیا اور فیروز شاہ کی ملاقات۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۵۸ء کو جب تانتیا جنگلوں سے نکل کر پرتاب گڑھ کی طرف چلا تو میجر روک سے اس کا سامنا ہوا۔ تانتیا اس سے دو گھنٹہ تک لڑا۔ اس عرصے میں اس کے ہاتھی نکل

گئے تو پھر وہ مندسور کی طرف گیا اور چھ میل کے فاصلہ پر رات کو ٹھیر کر پھر تین دن میں جلدی سفر کر کے زیرا پور میں آیا۔ جو ٹونک سے مشرق جنوب میں سو میل کے فاصلہ پر ہے تانتیا جس روز زیرا پور میں آیا اسی روز رابرٹس صاحب یہاں آن موجود ہوئے، تو تانتیا متحیر ہو کر اپنے تین ہاتھی چھوڑ کر چلا گیا ۱۳ جون کو وہ اندر گڑھ میں آیا۔ یہاں فیروز شاہ محض اپنے باڈی گارڈ اور بارہویں غیر آئینی رجمنٹ کے ان سے آن ملا[1]

یہاں سے فیروز شاہ راج گڑھ اس امید میں گیا کہ وہاں تانتیا ٹوپی سے ملے گا چند روز وہ یہاں پڑا رہا مگر جب اس کو معلوم ہوا کہ بریگیڈیر سمتھ اس کی سراغ رسانی کر رہا ہے تو وہ اندر گڑھ میں ۱۳۔ جنوری ۱۹۵۹ء کو تانتیا ٹوپے سے جا ملا۔

تانتیا کی راجپوتانہ میں سرگرمیاں۔ اندر گڑھ امن کی جگہ نہ تھی تانتیا کو معلوم تھا کہ انگریزی سپاہیوں کے دو کالم ادھر چلے آرہے ہیں۔ اس لئے دیواسا میں چلا گیا۔ یہ ایک بڑا قصبہ ہے جو جے پور اور بھرت پور کے درمیان ہے۔ ۱۶۔ جنوری ۱۸۵۹ء کو جس وقت تانتیا، راؤ صاحب اور فیروز شاہ آپس میں جنگ کے باب میں صلاح مشورے کر رہے تھے کہ شووِرس صاحب آگئے۔ اس وقت ان تینوں آدمیوں کا جانا کرامت تھی۔ تانتیا اپنے روزنامہ میں لکھتا ہے کہ انگریزی لشکر نے یکایک ہم پر چڑھ کر متحیر کر دیا۔ تین سو باغیوں کو مقتول و مجروح کیا۔

فیروز شاہ اور تانتیا کی جدائی:۔ اس شکست سے باغیوں کا جتھا ٹوٹ گیا۔ اسی دن فیروز شاہ مع اپنے سواروں کے تانتیا ٹوپے سے جدا ہو گیا۔

---

[1] تاریخ ہندوستان (بغاوتِ ہند) صفحہ ۱۸۷

اب راؤ صاحب اور تانتیا میں بھی ان بن ہوگئی۔ تانتیا لکھتا ہے کہ میں نے اس سے کہا کہ اب میں زیادہ دنوں نہیں بھاگوں گا اور جب کبھی مجھے موقع ملے گا تو میں آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ مان سنگھ کے بعض رشتہ دار بھاگ کر تانتیا سے آن ملے۔ سیاہ کو چھوڑ کر تانتیا صرف دو برہمن رسوئی کرنے کے لئے اور ایک سائیس اور دو گھوڑے اور ایک ٹٹو اپنے ساتھ لے کر پردن میں چلا گیا۔ پردن کے جنگل میں راجہ مان سنگھ سے تانتیا ملا۔ راجہ مان سنگھ نے پوچھا کہ سیاہ کو کیوں چھوڑ دیا۔ یہ کام تم کو نہیں کرنا چاہیے تھا، تو تانتیا نے جواب دیا کہ اب بھاگتے بھاگتے تھک گیا تھا۔ اب میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ خواہ یہ کام میں نے صحیح و صواب کیا یا غلط و خطا۔ اس عرصہ میں راؤ صاحب تین چار ہزار سپاہیوں کو ساتھ لے کر کشائی میں اجمیر کے مغرب میں جودھپور سے دس میل کے فاصلہ پر ۱۰ فروری ۱۸۵۹ء کو آیا انتقام لینے والے اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ہومز صاحب کشائی میں آموجود ہوئے اور ساتھوں نے راؤ صاحب پر حملہ کیا اور دو سو آدمی اس کے مار ڈالے۔ راؤ صاحب بھاگ کر ۱۵ جاری کو چترنجھ کے درّہ میں پہنچا۔ جب انگریزی لشکر ادھر کی طرف آیا تو راؤ صاحب بانسواڑہ کے جنگل میں چلا آیا۔ سومرسٹ صاحب نے اس کا تعاقب کیا۔ تو راؤ صاحب کے ساتھی تھوڑے رہ گئے اور وہ بھی تانتیا کی طرح بھاگتے بھاگتے تھک گیا۔ اس کے ساتھیوں میں سے بہت سے آدمی ہتھیار پھینک کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔ بڑے بڑے سرغنہ سرونج کے جنگل میں چلے گئے۔ وہ فقیرانہ گذران کرنے لگے۔ دیہاتیوں سے بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالتے تھے۔ باغیوں کے صرف ۵ منڈ باقی رہ گئے تھے۔ راؤ صاحب، فیروز شاہ، مان سنگھ، اجیت سنگھ تانتیا ٹوپے ہر ایک کی قسمت کا حال بڑا دل چسپ ہے۔ راؤ صاحب تو ایک

جگہ سے دوسری جگہ مارا مارا پھرا۔ ۱۸۶۱ء میں وہ پنجاب کے شمالی پہاڑیوں میں جاتریوں کے بھیس میں پکڑا گیا۔ اور کان پور بھیجا گیا۔ یہاں اس جرم ثابت ہوئے وہ ۲۰ اگست کو پھانسی دیا گیا۔ فیروز شاہ حاجیوں کے لباس میں انگریزوں کے ہاتھ سے بچ کر مکہ چلا گیا۔ سلطان روم اس کے ساتھ سلوک کرتا رہا۔ مکہ میں مرگیا۔ بس سارہ میں ایک بوڑھے ٹھاکر نرائن سنگھ نے جو مان سنگھ کا رشتہ دار تھا۔ مان سنگھ کے معتمد مختار کو میڈ صاحب کے پاس آیا۔ اس کی معرفت میڈ صاحب اور مان سنگھ کے درمیان ایسے قول و قرار ہوئے کہ مان سنگھ نے اپنے تئیں ان کے حوالہ کیا اور اس کے تمام اہل و عیال جو شہر کے قریب تھے انگلش کیمپ میں آگئے۔ اجیت سنگھ کچھ تھوڑے آدمیوں کے ساتھ ۵ میل کے فاصلہ پر جنگل میں رہتا تھا۔ میڈ صاحب کے لشکر کے ساتھ مان سنگھ وہاں پہنچا جہاں اجیت سنگھ رہتا تھا جب اجیت سنگھ کو انگریزی سپاہ کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ ستر اسی میں بھاگ کر مروبخ میں باغیوں سے جا ملا۔

مان سنگھ اور تانتیا ۔ میڈ صاحب کو یقین تھا کہ پرون کے جنگل میں تانتیا ٹوپے ہے، مان سنگھ کو بڑی آرزو تمنا یہ تھی کہ وہ اپنی حالت سابقہ پر عود کر آئے۔ ۸ اپریل کو سر روبرٹ ہملٹن نے میڈ صاحب کے پاس تار بھیج دیا تھا کہ اگر مان سنگھ اپنے تئیں حوالہ کرے گا تو اس کی جان بچائی جائے گی اور اس کے حقوق پر خیال کیا جائے گا۔ میڈ صاحب نے اس کو سمجھایا اگر وہ تانتیا کو پکڑوا دے گا تو اس خدمت عظیم کے عوض میں وہ اپنی حالت سابقہ پر بحال ہو جائے گا۔ بس اُس وقت سے مان سنگھ کو یہ دھن لگی ہوئی تھی کہ وہ تانتیا کو گرفتار کرائے اس کو یہ اندیشہ تھا کہ مبادا

تانتیا اس کی مٹھی میں سے نکل جائے۔ تانتیا نے میڈ صاحب کے لشکر میں آدمی بھیج کر مان سنگھ سے صلاح ومشورہ پوچھا تھا کہ وہ فیروز شاہ سے جاکر ملے یا نہ ملے۔ مان سنگھ جانتا تھا کہ اگر تانتیا کہیں چلا گیا تو پھر اس کو پکڑوانے کا موقع ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ مان سنگھ کو نہ اپنی عزت کا نہ اپنے مصاحب کا نہ دوست کی دوستی کا خیال تھا۔ وہ تانتیا کو دغا وفریب سے پکڑوانے پر اس شرط پر تیار تھا کہ اس کو پہلے اپنی ریاست مل جائے۔ میڈ صاحب کو تو ریاست پر بحال کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ اس لئے وہ سر رابرٹ ہملٹن سے یہ وعدہ کرانا چاہتا تھا کہ شاہ آباد یا واڑی اس کو مل جائے۔ میڈ صاحب مان سنگھ سے اس معاملہ میں گفتگو کر رہے تھے۔ تانتیا ٹوپے جنگل میں پراچ بنا رہا تھا۔

تانتیا کا حشر:۔ تانتیا کے پرانے ہمراہی سرونج میں آٹھ ہزار آدمی موجود تھے۔ راؤ صاحب نے ان کو چھوڑ دیا تھا مگر فیروز شاہ اور نواب ادر امام علی وردی میجر ان کے ساتھ تھے۔ اس وردی میجر نے تانتیا کو خط بھی لکھا تھا کہ وہ ہم سے آن کر مل جائے۔ تانتیا جانتا تھا کہ مان سنگھ نے یہ کہلا بھیجا تھا کہ وہ دو تین دن کے اندر اندر اس سے ملنے آئے گا۔ اسے یہ بھی کہا تھا کہ ایک آدمی میں بھیج رہا ہوں جس جس جگہ ٹھہرنے کے لئے یہ کہے اُسی جگہ قیام کرنا۔ اس اقرار کے موافق تیسرے دن ۷ راپریل کو آدھی رات کے وقت تانتیا کے چھپنے کی جگہ پر مان سنگھ آیا اور بمبئی کے سپاہیوں کو فاصلہ پر چھوڑ دیا۔ تانتیا سوتا تھا۔ اس کو سوتا ہوا پکڑ کر میڈ صاحب کے کیمپ میں لے آئے۔ وہ یہاں ۸ راپریل ۱۸۵۹ء کو طلوع آفتاب کے وقت آیا۔ سیپری میں کورٹ مارشل کے سپرد ہوا۔

اور اس پر جرم لگایا گیا کہ اس نے جون ۱۸۵۷ء سے دسمبر ۱۸۵۸ء تک برٹش گورنمنٹ کے ساتھ باغیانہ جنگ کی۔ "تانتیا نے بری ہونے کے لئے یہ سیدھا سادا جواب دیا کہ میں نے کالپی کے فتح ہونے تک سب باتوں میں اپنے آقا نانا کے حکم کی تعمیل کی اور اس کے بعد راؤ صاحب کے حکموں کی میں نے کسی انگریزوں کے قتل کرنے میں کوئی حصہ نہیں لیا، نہ میں نے کسی کو پھانسی دینے کا حکم دیا۔" مگر ۱۸ اپریل ۱۸۵۹ء کو اس کو پھانسی دے دی گئی[1]

---

[1] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۱۹۲

(۵)

حضرت محل

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ارباب نشاط کے گھر میں ایک لڑکی پیدا ہوئی، بچپن میں فتنہ تھی۔ جوانی میں قیامت بن گئی، صورت سحر طراز انداز دل فریب، چتون میں شوخی، باتوں میں لگاوٹ، تبسم جانستاں، عشوہ دشمن ایمان اور رنہ، تمکین رقص میں برق، نغمہ سرائی میں طاق۔ غالب کے اس شعر کی ہو بہو تصویر:۔

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

وہ ساقی گلفام بھی تھی اور مطرب خوشنوا بھی، گھر میں صرف امراؤ[1] تھی۔ واجد علی شاہ کے "پری خانہ" میں پہنچ کر "مہک پری" بن گئی۔ پھر جب واجد علی شاہ کے ایک چاند سے لڑکے کی ماں بنی تو "حضرت محل" کا

---

[1] تاریخ اودھ جلد ۵

[2] محل خانہ شاہی

خطاب پایا، دو ہزار ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگی۔

پہنچا کہاں کہاں سے ہے کہاں سلسلۂ دراز عشق

دوسروں کا کیا ذکر، آدمی خود اپنی بہت صلاحیتوں سے ناواقف ہوتا ہے پھر جب کوئی مرحلہ درپیش آتا ہے تو یہ خفیہ صلاحیت ابھرتی ہے اور انسان کچھ سے کچھ بن جاتا ہے، امراؤ جب بالاخانہ کی زینت تھی، اس کے دل میں کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ شاہی "پری خانہ" کی زینت بنے گی جب پری خانہ میں پہنچی، تو سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ شاہ ذی جاہ کی بیگم بنے گی۔ جب ایک بچہ کی ماں بنی تو تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ ایک دن اس بچہ کو اپنے ہاتھ سے تخت حکومت پر بٹھائے گی اور اس کی نگہبان بن کر سارے اودھ پر حکمرانی کرے گی۔ لیکن جب واجد علی شاہ سے تخت حکومت چھنا وہ کلکتہ جلا وطن ہوئے، پھر کچھ عرصہ بعد غدر شروع ہوا تو اس کی خفتہ صلاحیت بیدار ہوئی۔ اس نے ایک سپاہی کی طرح تلوار سنبھالی۔ ایک فرمانروا کی طرح حکومت کی، ایک مدبر کی طرح سیاست کی گتھیاں حل کیں، اس نے رعایا کی یاس کو آس سے بدلا، سپاہیوں کی بددلی دور کی۔ ان میں حوصلہ پیدا کیا، افسروں کو ایثار و عمل کی ترغیب دی۔ دشمنوں سے مدارات کا برتاؤ کیا، دوستوں کو نوازا، وفاداروں کی سرپرستی کی مخالفوں کو رام کیا، دشمنوں سے حسن سلوک کا برتاؤ کیا اور بہت ہی مختصر مدت میں ایسے عظیم و جلیل کارنامے انجام دیے کہ تاریخ میں ایک مستقل اور باعظمت مقام حاصل کر لیا۔ لوگ اس کا ذکر پڑھتے ہیں اور احترام سے سر جھکانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جوشِ پیکار حضرت عالیہ لندن میں تھیں اور واجد علی شاہ کلکتہ کی قید فرنگ میں غدر جیسے پر آشوب زمانے میں حضرت محل نے ان تمام باتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے قیادت کے بار گراں کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر غیر معمولی جرأت اور بہادری کا ثبوت دیا عام بھرتی کا اعلان ہوا تمام تعلقہ داروں اور زمینداروں کے نام احکام جاری ہوئے کہ

"ملک آبائی خدا نے ہم کو عطا کیا۔ دفع کفار فرنگ لازم ہے۔ باہم شریک ہو کر باقی ماندگان بیلی گارد کو قتل کر دو۔ جوان کو قتل کرے گا اس کا نصف علاقہ اس کو معاف ہوگا۔[۱]

[۱] قیصر التواریخ صفحہ ۲۴۹

چنانچہ مذکورہ حکم نامے کے جواب میں جو زمیندار اور تعلقہ داران اودھ مع فوج کثیر و زر خطیر لکھنؤ پہنچے اور تحریک میں شامل ہو کر انھوں نے نام نیک پایا اور بقائے دوام حاصل کی، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

نواب علی خاں رئیس محمود آباد۔ درگیج سنگھ، منشی محمد حسین قدوائی، اولاد حسین بیدپور، حشمت علی سندیلہ، منصب علی رسول آباد، کلو خاں نانپارہ [1]

تمام امور سلطنت کو حضرت محل، نواب ممو خاں اور مولوی احمد اللہ شاہ صاحب کی رائے سے مرتب کرتیں۔ غدر کے زمانے میں عمارت "چولکھی" ہی میں ان کا قیام تھا اور اسی عمارت میں ان کا دربار لگتا تھا [2]

حضرت محل کے تدبر، اعلیٰ دماغی قابلیت اور استقامت، نیز ممو خاں اور مولوی احمد اللہ شاہ کی حسن تدبیر نے تحریک کو اس کامیابی سے چلایا کہ ملت کی سپاہیانہ زندگی سے علیحدگی نے طبیعتوں میں جو بے حسی اور جمود پیدا کر دیا تھا۔ وہ یکدم رخصت ہو گیا۔ جو ہتھیار زنگ آلود ہو کر بے کار پڑے تھے وہ صیقل کر دیے گئے ان کی جھنکار فضائے آسمانی میں گونج کر یخ بستہ دلوں کو پھر گرمانے لگی۔

حضرت محل کی شجاعت

حضرت محل کی بہادری اور جوش کا یہ حال تھا کہ باوجود پردے میں رہنے کے گھوڑے پر چلتیں۔ انھوں نے تقریباً دس ماہ انگریزوں کا مقابلہ کیا [3]۔ کمپنی کے خلاف جذبہ نفرت و حقارت سرعت سے بڑھ رہا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں

"صرف گیارہ روز میں اودھ کے کسی ضلع میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کوئی حاکم نہ تھا اور انگریزی عملداری خواب معلوم ہوتی تھی" [4]۔

سر ہنری لارنس اپنی ایک چٹھی میں جو اس نے لفٹنٹ گورنر کو لکھی تھی۔ رقم طراز ہے:-

---

[1] قیصر التواریخ صفحہ ۲۳

[2] ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ صفحہ ۵۶

[3] مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۹۰

[4] قیصر التواریخ صفحہ ۲۳۰

"ہمارے ضلعے ہماری حکومت سے نکل گئے اور ہر روز حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ سارے تعلقہ دار مسلح ہو رہے ہیں اور بعض نے دیہات پر قبضہ کر لیا ہے۔"

دارالسلطنت کا ذکر ہی کیا ہے گاؤں اور قصبات ملک کی یہ حالت تھی کہ:۔

"قصبہ اناؤ کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں جس کا رقبہ پون میل تھا، لڑنے والوں سے بھرا پڑا تھا۔ اور گاؤں کے تمام گھروں میں رہیلیاں بنی ہوئی تھیں۔"

منادی ہوئی کہ پرسوں بیلی گارد پر حملہ ہوگا۔ مسلمانوں نے قرآن شریف اور ہندوؤں نے گنگا جل اٹھا کر قسم کھائی کہ جب تک محصورین کو تہ تیغ کر کے بیلی گارد کو زمین کے برابر نہ کر دیا جائے گا کھانا پینا اور اپنا ذاتی کام کرنا سب حرام ہے کل انگریز یہ نہیں یا ہم نہیں۔[۱]

جنگ کی گہما گہمی

۳۱۔ جولائی کو پہلا حملہ مولوی احمد اللہ شاہ صاحب کی سپہ سالاری میں بیلی گارد پر ہوا۔ مولوی صاحب نے تمام فوج میں اعلان کیا۔

"بیگم کے حکم سے لڑنے جاتے ہو۔ تنخواہ بھی دیں گی۔"

حملے کے روز حضرت محل کو رات بھر نیند نہ آتی تھی۔ لوگ ان کی مستعدی اور نیک نفسی کی تعریف کرتے وہ سپاہیوں کی نہایت قدر کرتیں اور حوصلہ سے زیادہ انعام دیتیں۔[۲]

معرکہ عالم باغ کے سلسلہ میں راجہ مان سنگھ کو ان کی غیر معمولی جانفشانی کے صلے میں علاوہ خلعت، رومال اور دوشالہ کے ساتھ "فرزند خاص" کا خطاب دیا اور ملبوس خاص سے اپنا دوپٹہ عنایت کیا اور فرمایا کہ بعد فتح کے بہت سا روپیہ اور جاگیر دے کر خوش کروں گی۔[۳]

لڑائی کا زور

اگست میں لڑائی کا زور بہت بندھ گیا۔ چونکہ کانپور کی شکست خوردہ فوج کی کافی تعداد فدا حسین رسالدار کی معیت میں مع توپ خانہ کے لکھنؤ آ گئی تھی۔

---

[۱] عروج عہد انگلشیہ صفحہ ۱۸۰

[۲] ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ صفحہ ۵۹

[۳] قیصر التواریخ صفحہ ۲۶۷

جنرل سید برکات احمد اور کپتان صوبہ سنگھ نے اپنے اپنے رسالوں کے ساتھ بیلی گارد پر زبردست حملہ کیا۔ انگریزی مورچوں کے اندر بھوکے پیاسے گھس گئے۔ دست بدست تلوار چلنے لگی۔ ایک صاحب زیرہ علم نے کر آگے بڑھے اور مورچے کی خندق میں اتر گئے ہر مورچہ پر ابدانگ مسمے لڑائی ہوتی تھی مولوی ذکاء اللہ رقم طراز ہیں۔

"بیلی گارد پر اس قدر زبردست حملہ کیا گیا کہ اس کی اس سے بڑی حضرت الٹگی سپاہی زینے کر کے بڑھے اور دیواروں پر سپاہی کر دیئے اور توپ کی زدوں میں گھس گئے۔ آج وہ دلیری سے حملہ کرنے آئے تھے انگریزی سپاہ کو پریشان کرنے کے لیے مات کو کھنٹوں شور وغل مچاتے ہیں"

حضرت محل کے مہمان

فیروز شاہ شہزادہ اور جنرل بخت خاں بھی اس وقت آ گئے تھے اور حضرت محل کے ہاں بطور مہمان خاص قیام پذیر تھے ان ہر دو فدایان وطن کی موجودگی اور حضرت محل کے استقلال نے جنگ کو مارچ تک جاری رکھا۔

بیگم کی کوٹھی پر گھمسان کا رن

مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:-

"بیگم کی کوٹھی پر سخت لڑائی ہوئی ایسی کوئی لڑائی اس محاصرہ میں نہیں ہوئی اٹھ نو گھنٹہ تک گولہ زنی رہی تو ایک دراز پڑی نیپیر نے اسے ایدرشن کر کے لے لیا باغیوں کی لاشیں ۵ سو شمار کی گئیں انگریزوں کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ ڈسن صاحب ایسے زخمی ہوئے کہ زندہ نہ رہے وہ بڑے بہادر جوانمرد دلیر تھے سپاہیوں سے بڑی محبت کرتے تھے جب وہ مرے ہیں سپاہی ان کے لیے بچوں کی طرح روتے تھے۔ غرض ایسے روشن دماغ سپاہی کم ہوتے ہیں۔ وہ عالم باغ میں دفن ہوئے اور ٹرم صاحب نے مییس ہدس اور قیصر باغ پر توپوں کی ضربیں لگائیں۔ ان کے سپاہیوں نے ایک مسجد پر قبضہ کیا اور باغیوں کو گومتی کے کنارہ پہ مچھی بھون تک بھگایا اور آہنی پل پر قبضہ کیا۔ ان لڑائیوں میں

ذکاء اللہ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ صفحہ ۶۴۳

انگریزوں کے آدمی ۲۶ مقتول اور ایک سو تیرہ مجروح ہوئے۔

۱۲۔مارچ کو بیگم کی کوٹھی پر اور قیصر باغ کی درمیانی عمارت پر قبضہ ہوا پھر امام باڑہ ہاتھ آیا ۱۴ تاریخ قیصر باغ فتح ہوا پھر میس ہوس ڈلما کی کوٹھی موتی محل چتر منزل جہاں پہلے ۱۱ نومبر میں بڑی معرکہ آرائیاں ہوئیں تھیں قبضے میں آئیں غرض تمام فتوحات بڑی ارزاں حاصل ہوئیں کہ صرف دو سو آدمی مجروح و مقتول ہوئے اور شہر پر قبضہ ہو گیا باغیوں کی تعداد انگریزوں کی سپاہ سے سہ چند تھی مگر ان کے پاس توپیں اتنی نہیں تھیں جتنی کہ انگریزوں کے پاس تھیں[1]

عالم باغ پر حملہ

نیپالیوں اور انگریزوں کا پہلا متحدہ حملہ عالم باغ پر ہوا حضرت محل کی کوٹھی پر بڑی سخت لڑائی ہوئی جس کے اردگرد باغیوں کی سینکڑوں لاشیں شمار کی گئی تھیں۔ قریب تھا کہ چوکھی پر قبضہ ہو جائے کہ عین اس وقت خان علی خان ایک ہزار سپاہ کے ساتھ آ گئے

خوب رن پڑا۔ چمن پر خون کی نہریں جاری تھیں۔ پیچھے سے جنگ بہادر نے باڑ ماری سینکڑوں گر پڑے خان علی خان بھی زخمی ہوئے۔ حضرت محل کسی طرح پر چوکھی چھوڑنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سب سے زیادہ حملہ کا رخ چوکھی کی جانب ہے۔ قیصر التواریخ میں مرقوم ہے:-

"ایک روز صبح کو بہ کنایہ و اشارہ حضرت محل کو نواب ممو خاں نے بہت سمجھایا لیکن ان کے استقلال میں فرق نہ آیا۔ کمپنی کی فوجوں کے چو طرفہ حملوں نے اب مجاہدین کو امان لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس وقت جنگ نے بھی جارحانہ کے بجائے مدافعانہ صورت اختیار کر لی تھی۔ ملک کے تمام حصص پر برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس نے آلاتِ حرب کی کثیر تعداد جن میں بہت زیادہ توپیں تھیں۔ مع قواعد دان توپچیوں کے خاص دار السلطنت

---

[1] تاریخ ہندوستان سوم (تمادیۃ الہند) ذکاء اللہ۔ صفحہ ۵۹

لکھنؤ نے ان مجاہد[illegible]ہر میں لاکر جمع کر دیا۔ جن کے پاس جدید قسم کی توپیں اور آلات کی کمی تھی۔ لے دے کر صرف ایک، وسط درجہ کا توپ خانہ تھا۔ وہ کہاں تک مقابلہ کرتا۔ آخر شکست ہوئی اور انگریزی فوج کا تسلط ہو گیا۔"

حضرت محل کی پسپائی

شکست کے بعد حضرت محل سراسیمہ اور پریشان تھیں، کیونکہ ان کی گرفتاری کا خدشہ روز بروز بڑھ رہا تھا۔ اس لئے سرزمین وطن کو ہمیشہ کے لئے خیرآباد کہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ان کی لکھنؤ سے روانگی کا منظر حد درجہ دردانگیز تھا۔ مصنف قیصر التواریخ رقم طراز ہیں:

"حضرت محل بحالِ تباہ مع دیگر بیگمات و شاگرد پیشہ عورات اور ملازمین کے پیادہ پا مکان سے نکلیں۔ اس طرح کہ وہ آگے تھیں اور سب ان کے پیچھے۔ صغر سنہ برجیس قدر ایک سیہ کی گود میں تھے۔ پیادہ پائی کی وجہ سے ہر ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتی اور گرتی تھیں۔ ٹیلہ شاہ پیر جلیل سے گذر کر پل مولوی گنج پر پہنچیں۔ تلنگے ہر طرف تماشائی تھے۔ رات کو غلام رضا کے یہاں قیام کیا۔ پھر وہاں سے شرف الدولہ کے گھر گئیں اور وہاں سے محل سرائے حسین آباد گئیں۔ شام تک جتنا عملہ شاگرد پیشہ کا تھا سب جمع ہو گیا اور ان کی حفاظت کو پہرے کھڑے تھے۔ علی رضا کے یہاں جنرل اوٹرم کا پیغام پہنچا کہ ہم زمانہ واجد علی شاہ کا پنشن تم کو تمہارا ملک دیں گے۔ جنگ سے دست بردار ہو جائیے۔ فوج مغلیہ کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ حضرت محل نے اوٹرم کی یہ بات نہ مانی۔"[1]

نیپال میں قیام

حضرت محل، برجیس قدر اور اپنے جاں نثاروں کو لے کر نیپال پہنچیں۔ ممو خاں بھی ساتھ تھے۔ نیپال کی حکومت نے خاندانِ شاہی کو قیام کی اجازت دے دی، لیکن والیگانِ دولت کو ایک منٹ نہ ٹھہرنے دیا۔ مولانا شبلی کی تحقیق یہ ہے کہ

---

[1] قیصر التواریخ صفحہ ۲۴۳

"حضرت محل کے پاس جو کثیر تعداد میں ہیرے جواہرات تھے انہوں نے ان سب کو حکومت نیپال کے سپرد کر دیا۔" [1]

حضرت محل کی خودداری

مولانا شہابی فرماتے ہیں:۔

"خدا کی قدرت ہے کجا وہ محلات شاہی جن پر بلاشبہ جنت ارضی کا گمان ہوتا تھا کجا نیپال کی گنجان اور سنسان پہاڑیاں۔ دیارِ غیر میں نشیمن کے لئے چند تنکوں کی تلاش و جستجو اور پھر اسیر متنزاد صیاد کی برق آسا نظروں کا قیامت خیز سامنا لیکن پائے ثبات کو لغزش ہو، ناممکن" آخری وقت میں اسلام کی غیرت کی نمود" کا اس سے پوچھا اور کون سا مظاہرہ ہو سکتا تھا۔ عرصہ تک انگریزوں نے یہ خواہش بلکہ کوشش کی کہ حضرت محل ہندوستان واپس آجائیں۔ ایک انگریز مصور جو رجبیں قدر کی تصویر کھینچنے گیا تھا۔ اس کے ذریعہ انگریزوں نے یہ پیام بھیجا تھا کہ حکم سرکار ہے فیض آباد، لکھنؤ جہاں رہنا چاہیں آجائیں۔ تنخواہ کے علاوہ احترام شاہانہ بھی کیا جائے گا۔" [2]

ممو خاں کی گرفتاری اور سزایابی

ممو خاں نے بڑی وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا۔ وہ آخر وقت تک حضرت محل کے خادم خاص اور معتمد باختصاص بنے رہے۔ رانا جنگ بہادر نے انھیں نیپال سے باہر جانے کی بہت ترغیب دی لیکن ناکام رہے۔ انگریز ممو خاں سے بہت خفا تھے اور انھیں کیفر کردار کو پہنچانے کے لئے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے، لیکن وہ ہاتھ نہ آتے تھے۔ آخر یہ مشکل رانا جنگ بہادر نے حل کر دی:۔

"جب کوئی صورت کارگر ہوتی نظر نہ آئی تو جنگ بہادر کو ایک ترکیب چال سوجھی

---

[1] غدر کے ہیرو (مولانا شہابی)

[2] قیصر التواریخ صفحہ ۳۶۸۔ غدر کے ہیرو

جس سے نواب ممّو خاں اور ان کی فوج کا بآسانی خاتمہ ہو گیا۔ اب یہ شیرِ کوہسار بھیڑ کی کھال اوڑھ کر نمودار ہوا تھا۔ اس دوران میں بہادر جنگ نے نواب ممّو خاں سے تعلقات بڑھانا شروع کیے۔ اکثر ملاقات ہوتی۔ ایک روز حسبِ معمول باتیں کرتے کرتے جنگ بہادر نواب ممّو خاں کو اس پہاڑی پر لے آیا جہاں ایک انگریز جنرل صاحب عربی لباس پہنے مع کچھ آدمیوں کے چھپا بیٹھا تھا۔ ممّو خاں اس ناگہانی آفت سے قطعی بے خبر تھے۔ اس لئے کچھ پیش نہ گئی اور گرفتار ہو کر لکھنؤ لائے گئے۔ پھانسی کی سزا ہوئی لیکن یہ ایسے بڑے مجرم کے لئے ناکافی خیال کی گئی اور حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور ہوا۔ وہیں فوت ہوئے۔"

حضرت محل کی وفات

حضرت محل نے نہایت خودداری اور استقامت کے ساتھ خود اختیاری جلاوطنی کا زمانہ نیپال میں گذارا مگر [illegible] اپنے غلام ملک کی سرزمین پر قدم نہ رکھا:-

"اپریل ۱۸۷۹ء میں حضرت محل نے انتقال کیا، لکھنؤ میں پیدا ہوئیں اور بخت ہمایوں نے یہ یاوری کی کہ شاہِ اودھ کی زوجیت کا شرف حاصل کیا عیش و عشرت میں بسر کرنی پڑی، یہ کیا جانتی تھی کہ سنگستان نیپال میں سر ٹکرانا پڑے گا۔"[1]

بے شک حضرت محل مر گئیں لیکن مرتے مرتے اس نے حیاتِ جاوداں حاصل کر لی خوب کہا ہے ریاض مرحوم نے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

---

[1] تاریخ اودھ جلد ۲ صفحہ ۲۱۶

اودھ کی بہادر عورتیں

حضرت محل سے پہلے بھی اودھ کے شبستانِ عشرت میں بہادر اور شمشیر زن خواتین کا وجود نظر آتا ہے۔ ایک انگریز اپنی ڈائری میں لکھتا ہے :-

"میں نے بچشمِ خود ان کو قواعد کرتے دیکھا۔ یہ عورتیں پوری طرح سے بندوق چھتیانے آگے بڑھنے - پیچھے ہٹنے، بندوق بھرنے اور نشانہ لگانے۔ سنگین چڑھانے کے کام اسی ترتیب سے کرتیں جیسے بارکوں میں سپاہی ہوتے ہیں۔ ان کی جماعتوں میں سارجنٹ بھی ہوتے تھے۔ ان زنانہ سپاہیوں کی دو کمپنیاں تھیں۔ غازی الدین حیدر اپنے بعد نصیر الدین حیدر کو تخت دینا نہ چاہتے تھے اس پر نصیر الدین حیدر کی ماں بڑی جرأت اور استقلال سے لڑیں انہوں نے اپنے سپاہیوں کو مسلح کر کے اپنی مردانگی سے اچھی مثال قائم کی تھی۔ بالآخر فتح مند ہوئیں اور بادشاہ نے شکست کھائی۔

نصیر الدین کو زہر دیا گیا تو ان ہی بیگم صاحبہ نے ازسرِ نو ہنگامہ اٹھایا اپنی زنانہ فوج کو بھیج کر ریذیڈنسی کا محاصرہ کر لیا اور نصیر الدین کے لڑکے کو تخت پر بٹھایا۔ اگر بیگم صاحبہ کسی اور زمانے میں پیدا ہوتیں تو یقینی ان کے کارنامے نمایاں دنیا کی تاریخ میں روشن حروف میں لکھے جاتے۔ ان کی شجاعت پر صد آفرین کہنی چاہیے۔"[1]

---

[1] شباب لکھنؤ - صفحہ ۱۰۴

منشی رسول بخش کاکوروی

منشی رسول بخش کے مورث اعلیٰ ملا ابوبکر حاجی علوی تھے جن کے صاحبزادے ملک بہار الدین سلاطین شرقیہ کی طرف سے کاکوری فتح کرنے آئے۔ بعد فتح وہیں مقیم ہو گئے۔ منشی صاحب کے والد فیض بخش نواب شجاع الدولہ کی فوج میں صوبیدار تھے۔ بکسر کی جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ ان کے ساتھی محمد کاظم بھی تھے۔ فیض بخش صاحب کی تصنیف "چشمہ فیض" مشہور ہے۔ منشی رسول بخش بھی نواب واجد علی شاہ کی فوج میں عہدیدار تھے۔ نواب ان کی تعظیم و تکریم کیا کرتے تھے۔ نواب کی معزولی پر فوجیں ختم کی گئیں تو یہ اپنے وطن چلے آئے اور اپنے معزول ساتھیوں کی ایک جماعت بنا کر فوجوں میں انگریز کے خلاف نفرت پھیلاتے رہے۔ ان کی یہ کوشش تھی کہ انگریز کی حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ عظیم اللہ خاں سے بھی یہ ملے تھے۔ انہوں نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے اودھ کے کل جاگیرداروں اور راجاؤں کو خفیہ طور پر تیار کر کے بغاوت کا انتظام کیا تھا اودھ میں جگہ جگہ جو چھاؤنیاں تھیں۔ ان میں افسروں سے مل کر انھیں اپنا ہم خیال بنا لیا تھا اور ان کی ماتحت فوج کے لئے تنخواہ کا بھی انتظام کیا تھا اس زمانہ میں ہندوستان میں مختلف مقامات پر آزادی کی خفیہ تحریک چل رہی تھی۔ اس کے سربراہوں سے منشی صاحب نے تعلق پیدا کر لیا ابھی پورا کام نہیں ہوا تھا اور ۲۱ رجون "انقلاب کے آغاز" کی

تاریخ تھی کہ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے کارتوس کا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا جس کا اثر دور و نزدیک ہر جگہ پڑا۔ فوجیں دوسرے روز لکھنؤ میں داخل ہونے والی تھیں لکھنؤ چھاؤنی کی فوجیں بھی تیار تھیں۔ انگریزوں کی ملازمت میں جو ہندوستانی اہلکار تھے بہت سے ان میں ان کے شریک اور معین تھے۔ ان میں ایک پولیس انسپکٹر یا سب انسپکٹر بھی تھا جو منشی صاحب کا خاص معتمد اور راز دار تھا۔ خدا جانے کیوں اس کے دل میں دفعتاً کھوٹ پیدا ہوئی اور اس نے جا کر انگریزی فوج کے اعلیٰ افسر غالباً کرنل بیلی سے مخبری کر دی نتیجہ میں منشی صاحب، ان کے بڑے صاحبزادے منشی عبدالصمد صاحب اور دیگر شریک کار ۲۸ نفوس کو گرفتار کر کے شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلہ پر پھانسی دے دی گئی اور پورے خاندان کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔

منشی صاحب کے باقی دو صاحبزادگان منشی عبدالحی صاحب اور منشی عبدالعزیز صاحب کاکوری میں اپنے مکان پر تھے ان کو رات ہی کو اطلاع پہنچی۔ یہ دونوں صاحب مع اپنے گھر کی مستورات اور بچوں کے اسی وقت گھر چھوڑ کر روپوش ہونے کی غرض سے نکل کھڑے ہوئے۔ شاہ تراب علی صاحب سجادہ نشین تکیہ شریف کاظمیہ کاکوری کو کشف سے اس کی خبر ہوگئی اور حضرت نے اپنے دونوں صاحبزادگان شاہ حیدر علی صاحب اور شاہ تقی علی صاحب کو جگا کر بھیجا اور منشی رسول بخش صاحب کے خاندان کو بلا کر اپنے زنانہ مکان میں روپوش کر دیا اور کئی ماہ تک یہ خاندان وہاں روپوش ہوا۔ اس کے بعد سندیلہ جا کر اپنے ایک عزیز کے یہاں روپوش ہوا۔

بغاوت کچھ دنوں رہی۔ اس کے بعد فرو ہوگئی مگر جاگیرداران و راجگان اودھ برابر لڑ رہے تھے اور کسی طرح اطاعت قبول نہ کرتے تھے۔ ایک روز لکھنؤ کے فوجی اعلیٰ افسر یا چیف کمشنر نے نواب اکرام اللہ خاں صاحب سے جو منشی رسول بخش کے سالے کے بیٹے تھے اور سرکار انگریزی میں ممتاز عہدہ پر فائز تھے اور بعد میں ریاست حیدرآباد میں صوبیدار ہوئے اور نواب یار جنگ کا خطاب پایا اہم مشورہ کیا اور کہا کہ غدر فرو ہو گیا مگر یہ جاگیردار اور راجگان کسی طرح ہتھیار نہیں ڈالتے۔ میں سخت پریشان ہوں۔ تم کوئی تدبیر بتاؤ۔ انھوں نے کہا کہ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کردوں۔ اس نے اجازت دی تب انھوں نے کہا کہ منشی رسول بخش صاحب نے بغاوت کی تھی ان کو گرفتار کر کے آپ نے پھانسی دے

دی ان کو اپنے کیے کی سزا مل گئی۔ ابھی ان کی اولاد میں ۲ دو بیٹے موجود ہیں۔ جس شخص کا یہ اثر تھا کہ اس کو پھانسی دے دینے کے بعد بھی اس کی لگائی آگ بجھانا مشکل ہوگیا ہے۔ اس کے بیٹوں کا بھی کافی اثر ہوگا۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ ان کے خاندان کی معافی کا اعلان کر دیجئے اور جب ان کے بیٹے اپنی ہمائے پناہ سے باہر آجائیں تو انھیں بلوائیے اور ان کے سپرد یہ کام کیجئے۔ وہی اس کام کو کر سکتے ہیں۔ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ یہ تجویز اس کی سمجھ میں آگئی اور اس نے ایسا ہی کیا۔ عبدالحی عرش نے تمام جاگیرداروں کو موافق بنالیا انہیں کے صلے میں علاقہ ملنے کو تھا مگر قبول نہیں کیا۔ تمام عمر لکھنؤ میں وکالت کرتے رہے۔[1]

منشی رسول بخش کا عالی شان مکان ابھی تک کوٹھی کے نام سے مشہور ہے[2] اور جس محلہ میں وہ واقع ہے کوٹھی ٹولہ کہلاتا ہے۔[2]

---

[1] اس مضمون کی بنیادی مرقیصر التواریخ حصہ دوم مشاہیر کاکوری اور ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء سے کی گئی ہے (شہابی)

[2] منشی انتظام اللہ شہابی کا مقالہ دارالعلم جنگ آزادی نمبر صفحہ ۱۰۸

۷

امیر المجاہدین مولوی سرفراز علی شاہجہانپوری

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں اودھ کا بڑا حصّہ ہے۔ کان پور اور لکھنؤ دلی کے مرکز بنے ہوئے تھے مگر اودھ میں جہاں جہاں افواجِ انگریزی تھیں ان میں انقلاب کی روح پھونکنے میں منشی رسول بخش کاکوری کا بڑا حصّہ ہے۔ انہوں نے ایک منظم جماعت سے کام لیا اور کامیاب ہوئے مگر اس کی بہار دیکھ نہ سکے کہ پھانسی پر لٹکا دیئے گئے ان کا ذکر قیصر التواریخ اور مشاہیر کاکوری اور ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء میں ہے مگر چند سطور سے زیادہ نہیں۔ مجلّہ العلم کے لئے اس شہید کے مزید حالات پیش کیے جاتے ہیں:

فوجوں میں بغاوت پھیلانے کے سلسلے میں دو ایک کا نام لیا جاتا ہے "کتاب سیلابِ خون" کی روایت سے جو پتہ چلا کہ تانتیا ٹوپے نے جوگیانہ لباس پہن کر فوجوں میں گشت لگایا مگر اس کتاب کے سوا کہیں اور سے یہ ثبوت نہ مل سکا۔ ایک عرصہ تک یہ مسئلہ زیرِ بحث رہا کہ خود فوجوں نے بغاوت کی یا دوسرے لوگ بغاوت کرانے والے تھے۔ چنانچہ تحقیقات کے بعد چند حقیقتیں سامنے آئیں یہ ضرور ہے کہ بعض فوجیوں نے بھی اپنی ہم پیشہ جماعت کو ابھارا مگر منظم طریقے سے دو ہستیاں تاریخ میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک امیر المجاہدین مولوی سرفراز علی شاہجہان پوری، دوسرے رسول بخش

کاکوری، ان کے علاوہ بارک پور میں محمد شفیع دفعدار اور کان پور میں جوالا پرشاد اور شمشاد الدین بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ سپاہی جو بہادر شاہ کے مرید ہوتے اور شجرہ کے ساتھ سرخ رومال ان کو ملتا تھا اور پانچ روپے وظیفہ پاتے تھے ان کی کارگزاری بھی پردۂ خفا میں ہے مگر ان کی کوشش دلی اور میرٹھ میں رنگ لائے بغیر نہ رہی۔

مولوی سرفراز علی شاہجہانپوری علماءِ وقت سے تھے۔ مولوی سید احمد شہید بریلوی کے مرید تھے۔ درس وتدریس کے ساتھ شہر بہ شہر بیعتِ جہاد لیتے اور فوجیوں کو بھی مرید کرتے۔ چنانچہ سلطان پور جب آپ گئے، تو وہاں صوبیدار خاں آپ کے مرید ہوئے اور جو کچھ انقلاب ۱۸۵۷ء میں ان کا کارنامہ ہے، وہ اظہر من الشمس ہے۔ مولوی سرفراز علی ہی کا یہ کارنامہ تھا کہ اودھ کے علاقہ میں شوقِ جہاد پیدا کیا اور ہزارہ مجاہدین سر بکف میدانِ عمل میں نکل آئے۔ مولانا احمد اللہ شاہ کے بعد یہی واجب التعظیم شخصیت ہے جس نے دلی اور لکھنؤ کے لئے ہزارہا مجاہدین تیار کر دیے۔ چنانچہ ان کو امیر المجاہدین کا لقب دیا گیا [۱]

---

[۱] مفتی انتظام اللہ شہابی کا مقالہ ''علمِ جنگِ آزادی نمبر'' صفحہ ۱۰۶

۸

عظیم اللہ خاں

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

وہ نہ اونچے خاندان میں پیدا ہوا کہ لوگ اس کے لئے دیدہ و دل فرشِ راہ کرتے، نہ صاحبِ دولت و ثروت تھا کہ خلقِ خدا اس کے در پر جبہ سائی کرتی، وہ ایک معمولی شخص تھا، بغیر کسی سہارے کے آگے بڑھا اور بڑھتا چلا گیا ذہنِ رسا، طبعِ خداداد، عزمِ بلند، فکرِ عالی، یہ تھی اس کی پونجی اور جس کے پاس ایسی گراں مایہ متاع ہو پھر اسے کسی اور چیز کی ضرورت کیا ہے؟ وہ ایک زوال آشنا قوم کا فرد تھا، شعلۂ مستعجل کی طرح چمکا اور اپنی نمود دکھا کر راکھ بن گیا اگر وہ کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتا تو زندگیِ جاوید حاصل کر چکا ہوتا، اس کا شمار ہیروز میں ہوتا لوگ اس کی قیادت اور شہامت کے افسانے بیان کیا کرتے، عزت اسے وراثت میں نہیں ملی تھی، اس نے چھینی تھی، شہرت کا اس کے پاس کوئی وسیلہ نہ تھا لیکن وہ اس کے پیچھے پیچھے دوڑتی رہی سربلندی

اور جاہ و مرتبت کے حصول کا اس کے لئے کوئی امکان نہ تھا، لیکن اس نے وہ کارنامے انجام دیئے کہ سربلندی اس پر فخر کرنے لگی اور جاہ و مرتبت کا اس کے دم سے نام بلند ہوا جب کار زارِ حیات میں اس نے قدم رکھا، تو وہ تہی دست و بے نوا تھا، ہیچ اور بے مایہ تھا لیکن جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو دشمن بھی اس کے جوہر قابل اور خداداد صلاحیت کے معترف تھے۔

روہیل کھنڈ کا مرد جانباز محمد علی حسن نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اپنی جان قربان کی عظیم اللہ خاں کے بارے میں کہتا ہے۔

"میں نے اور عظیم اللہ خاں نے گورنمنٹ اسکول کان پور میں گنگا دین سے انگریزی کی تعلیم حاصل کی تھی اور بعد کامیابی عظیم اللہ خاں اسی اسکول میں ملازم ہو گئے۔"[1]

مولانا انتظام اللہ شہابی، فرماتے ہیں :۔

"عظیم اللہ خاں ذہین اور تیز طبع تھے بہت جلد مطالعہ سے استعداد فاضلانہ بڑھالی۔ تھوڑے عرصہ میں عظیم اللہ کی انگریزی دانی کی کان پور میں دھوم مچ گئی جو گورنر کان پور آتا ہی ایڈریس لکھتے۔ غضب کہ حکام ضلع میں بڑا رسوخ ان کا ہو گیا۔ کلکٹر کان پور نے نانا راؤ رئیس بٹھور سے ان کی اعلیٰ قابلیت کا ذکر کیا نانا صاحب نے عظیم اللہ خاں کو بلایا اور ان کی گفتگو کا اثر بہت کچھ لیا۔ کچھ عرصہ بعد عظیم اللہ خاں کو اپنا سربراہ کار بنالیا اور ان کی کارکردگی سے ایسا خوش ہوا کہ ان کے بغیر نانا صاحب کوئی کام ہی نہیں کرتا تھا۔

اس زمانہ میں ہندو مسلمان اگر مذہبی اعتبار سے الگ الگ "قوم" تھے، لیکن ذاتی اور ملکی معاملات میں ان کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں تھی، مسلمان ہندوؤں پر اور ہندو مسلمانوں پر آنکھ بند کر کے اعتبار کرتے تھے، چنانچہ نانا صاحب کو، جب لارڈ ڈلہوزی نے باجی راؤ کا جانشین ماننے سے انکار کیا،

---

[1] مقالہ "محمد علی حسن جی گرین" مصنف (علی گڑھ) مارچ ۱۹۴۳ء

اور آٹھ لاکھ سالانہ پنشن بند کر دی، تو بھی عظیم اللہ خاں اس کے وکیل بن کر لندن گئے مولانا شہابی فرماتے ہیں

"۱۸۵۳ء میں عظیم اللہ خاں کو پانچ لاکھ روپے دے کر نانا صاحب نے ولایت روانہ کیا محمد علی خاں روہیلکھنڈی ان کے ساتھ تھے اور نانا صاحب کے بھائی بالا صاحب گو کھلے کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ انگلستان جا کر ایک اعلیٰ ہوٹل میں ٹھہرے اور ڈائرکٹران سے عظیم اللہ خاں نے تبادلہ خیال کیا اور لارڈ ڈلہوزی کی پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کی۔ دعوتوں کا سلسلہ بھی قائم رکھا مگر ڈائرکٹران نے صاف جواب دے دیا۔ جس سے ان کو سخت ناامیدی ہوئی یہ پانچ لاکھ روپیہ بھی صرف ہو گئے سب بے سود رہا۔"

عظیم اللہ خاں انگلستان پہنچا، حسن مردانہ کا اس دلآویز پیکر نے وہاں کی سوسائٹی میں ہلچل بپا کر دی۔ اس کی سحر طراز گفتگو، اس کا باوقار انداز، اس کا رکھ رکھاؤ، اور اس کی شان دلربائی نے خوب خوب خراج تحسین حاصل کیا، بقول مولانا شہابی :-

"عظیم اللہ کی حسن لیاقت اور طور طریق کی انگلستان میں بڑی دھوم تھی۔ اخبارات میں "پرنس آف انڈیا" لکھا جاتا تھا، ان کی خوبیاں، نوجوانی اور خوبصورتی نے امراء کی صاحبزادیوں کو ان کا متوالا بنا دیا۔ ان کے عاشقانہ خطوط ان کے نام آنے لگے[2] مگر عظیم اللہ کو سب سے مراسم رکھتا تھا اور ہر ایک کو اس کی محبت کا جواب محبت سے دیتا تھا مگر کسی غلط راستے پر اپنے کو لگنے نہ دیا اور نہ کسی برائی کا دھبہ دامن پر آنے دیا۔ صرف عاشقانہ خطوط تک لطف اندوز ہوتا رہا۔ انگلستان سے فرانس آیا یہاں بھی بعض ان فرانس اس کی گرویدہ ہو گئیں مگر اپنے دامن کو آلودگی سے بچاتا ہوا قسطنطنیہ چلا گیا یہاں سلطان عبدالعزیز کا زمانہ تھا۔ ... امراء اور اراکین سلطنت سے ملا جلا اس کے بعد کریمیا گیا۔ ان دنوں روس اور انگلستان اور فرانس سے جنگ ہو رہی تھی، لندن ٹائمز کے نامہ نگار مسٹر رسل کے خیمہ میں عظیم اللہ فروکش ہوا اور اس کے ساتھ سبستاپول جو میدان جنگ بنا ہوا تھا جہاں سے نامہ نگار اور امرائے روس جنگ کا نقشہ دیکھ

---

[1] تاریخ بغاوت ہند صفحہ ۲۱۰ [2] یہ خطوط انڈین ریس اینڈ دی انگلش کے نام سے شائع ہوئے ہیں

رہے تھے یہ بھی وہیں بیٹھے تھے۔ اتفاقاً ایک گولہ ان کے سامنے آکر گرا ان کے پاس بیٹھے لوگ سب بھاگ گئے مگر یہ پُرسکون طور پر اپنی جگہ سے نہ ہلے جب گرد و غبار چھٹا تو مسٹر رسل ان کو دیکھنے آیا کہ عظیم اللہ گولے سے مر چکا ہوگا۔ اس کی لاش کی تدفین کا انتظام کیا جائے۔ یہاں یہ حال دیکھا کہ عظیم اللہ اپنی کرسی کے پاس کھڑے ہوئے کپڑے جو غبار سے گرد آلود ہوگئے تھے بڑے اطمینان سے جھاڑ رہے ہیں۔ مسٹر رسل اور ان کے ساتھی ان کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور عظیم اللہ سے بولے آپ جب گولے سے بچ گئے تھے تو کیوں نہ بھاگے؟ عظیم اللہ نے کہا میں بزدل نہ تھا جو واقعہ ہونے والا تھا ہو چکا تھا عبث تھا کہ میں پھر جگہ چھوڑتا جو روسی وہاں موجود تھے ان پر عظیم اللہ کے استقلالِ طبیعت کا بے حد اثر ہوا اور وہ ان کی قیام گاہ پر آکر ملے اور ان سے تعلقات قائم کئے اور ان کو آمادہ کیا کہ ہندوستان میں انگریز کے خلاف قدم اٹھائیں۔

ہندوستان کی جاترا

چنانچہ کچھ روز رہ کر قسطنطنیہ لوٹے اور مصر ہوتے ہوئے ہندوستان آ گئے۔ نانا راؤ سے تمام واقعات کہے اور نانا راؤ کو آمادہ کیا کہ وہ بٹھور میں بیٹھ کر تمام نوابوں اور راجاؤں کے پاس سفیر روانہ کرے۔ چنانچہ نانا راؤ نے کل اختیارات عظیم اللہ کے سپرد کر دیئے انہوں نے ہر جگہ ایلچی بھیجے۔ مگر راجہ اور نواب انگریزی اقتدار سے خوفزدہ تھے جواب لکھتے ہوئے ڈرتے تھے۔ مشورہ یہ ٹھہرا کہ نانا راؤ اور عظیم اللہ جاترا کے نام سے تمام ہندوستان کا دورہ کریں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ان کی جماعت کا بڑا رکن سردار مرہٹہ جہاں بیر تانتیا ٹوپے اور اس کا باپ ہری پانڈورنگ راؤ بھٹ تھے۔ نانا صاحب کی دختر نیک اختر مینا بائی جو عظیم اللہ خاں کی منگیتر تھی۔ وہ بھی ہمنوا تھی باپ سے زیادہ اس کے دل میں انگریز دشمنی تھی۔ تانتیا ٹوپے نے فقیرانہ لباس اختیار کر کے ملک کا دورہ کیا اور اپنے چیلوں کو فوج سرکاری میں چھوڑ دیا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ مولوی احمد اللہ شاہ نے اکبرآباد میں علماء کی ایک جماعت بنائی تھی۔ پیری مریدی کا سلسلہ قائم کر کے انگریز کے خلاف خفیہ طور پر کام کر رہے تھے۔ ظاہرہ مذہبی تبلیغ تھی۔ باطن میں کمپنی کے اقتدار کا خاتمہ کرنا تھا۔ عظیم اللہ بھی شاہ صاحب سے مل چکا تھا۔

جنگِ آزادی کا دن ۱۸۵۶ء میں انگریزی حکومت نے واجد علی شاہ کو معزول کر کے اودھ میں عام بے چینی پیدا کر دی تھی اس کے بعد وزیر علی خاں نے کلکتہ جا کر فوجوں میں بغاوت پھیلانے کا انتظام کر لیا تھا۔ چنانچہ اس کا اثر یہ پڑا کہ بارک پور میں منگل پانڈے نے اعلانیہ بغاوت کا اظہار کرنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے فوجی قانون کی رو سے گولی کا نشانہ بنا۔ ادھر عظیم اللہ اور نانا راؤ کا دورہ کامیاب رہا، دہلی، لکھنؤ، پونا وغیرہ غرضیکہ جہاں جہاں گئے وہاں شورش کے انتظام ہو گئے۔

نانا کی حکومت کا اعلان ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ہی فوج میں بغاوت انگریز کے خلاف کھڑی ہوئی۔ نانا راؤ اور عظیم اللہ کانپور میں تھے عظیم اللہ نے کہا جگہ جگہ شورش ہونا چاہیے۔ دلی کو ہی مرکز نہ بنایا جائے چنانچہ کانپور سے لوٹ کر بٹھور میں جھنڈا آزادی حکومت کا لہرایا نانا راؤ کو گدی نشین کیا گیا اور مہاراج کے خطاب دیئے گئے۔ توپوں کی سلامی ہوئی نانا صاحب نے عدالت مقرر کی جس کے ارکان میں عظیم اللہ خاں، بابا بھٹ، جوالا پرشاد و جج مقرر ہوئے اور نانا صاحب نے یکم جولائی کو دربار کیا جس میں عظیم اللہ کو وائسرائے مقرر کیا گیا پھر کانپور آ کر کل علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ جنرل ویلر نے اسپتال کو دمدمہ سے مضبوط کر کے بطور قلعہ استعمال کرنے لگے۔

نانا صاحب کی فوج نے انگریزی فوج پر حملہ کر دیا۔ فوج کی کمان مینا بائی اور تانتیا ٹوپے کے ہاتھ میں تھی ۲۸ دن معرکہ رہا۔ آخرش جنرل نے مینا کے ذریعہ امان طلب کی عظیم اللہ اپنے سرداروں کو لے کر جنرل ویلر سے ملے اور عہد و میثاق ہوا۔[1]

نانا کے بھائی کی بدعہدی: صاحب قیصر التواریخ رقمطراز ہیں:-

اس کے بعد کشتیوں پر اسلحہ حرب اسباب ضروری بار کر کے مع جنرل صاحب روانہ کلکتہ ہوئے، بالاجی راؤ بھائی نانا راؤ نے ارادہ خیانت اور فسخ عہد کر کے حکم شلک توپ دیا، جب توپ چلنے

---

[1] غدر کے چند علماء (شہابانی)

لگی اور کشتیاں دریا میں بیٹھ گئیں، اس وقت سپاہ باغی کا تش کی کا
یک طرف تلوار پڑتی تھی دوسری طرف سے گولیاں برستی تھیں (انگریز
میمیوں کا پاس سے ہر ایک سے ملتجی ہونا، ایک ایک سے سہارا اور پناہ
ڈھونڈنا بیان سے باہر ہے ایک سوار رحم سے بچاتا تھا دوسرا گولی مار تا تھا[۱]

نانا راؤ سے عظیم اللہ کا اختلاف

ظلم وسفاکی اور جور وستم کی یہ روش عظیم اللہ خاں کو پسند نہ آئی۔ نانا کی بیٹی مینا اور تانتیا ٹوپے بھی اس حرکت سے نالاں تھے، چنانچہ عظیم اللہ خاں نے بددل ہو کر نانا کا ساتھ چھوڑ دیا اور لکھنؤ آکر احمد اللہ شاہ کے ساتھ ہو گئے انہوں نے معرکہ بیلی گارد میں حصہ لیا۔ عظیم اللہ کا بھی ایک بدنہ تھا جنرل ادہرم نے مقابلہ کیا۔ عظیم اللہ اور تانتیا ٹوپے کے ہٹتے ہی نانا راؤ عیش وعشرت میں مشغول ہو گئے پندرہ ہزار فوج صرف رہ گئی تھی جن قیدیوں کو پناہ دے رکھی تھی ان میں سے دو میموں نے اپنے حالات کی چٹھیاں الہ آباد بھیجدیں وہ راہ میں پکڑی گئیں اس پر جھنجھلا کر نانا راؤ نے سب قیدیوں کو تہہ تیغ کیا۔ ۱۵۔ جولائی ۱۸۵۷ء کو جنرل ہیولاک کانپور پہ متصرف ہو گئے اور عملہ دخلہ ہو گیا

عظیم اللہ خاں کی وفات

نانا راؤ سے بددل ہو کر عظیم اللہ خاں نے انگریزوں کے خلاف رزم پیکار کا سلسلہ جاری رکھا مولانا شہابی فرماتے ہیں[۲]
پھر عظیم اللہ خاں مولوی احمد اللہ شاہ کے ساتھ شاہجہانپور تک رہے پھر نانا راؤ کے ساتھ نیپال چلے گئے۔ وہیں ۱۸۵۹ء میں انتقال ہوا[۳]

۱۔ قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۰۹

۲۔ غدر کے چند علماء (شہابی)

۳۔ غدر کے چند علماء صفحہ ۱۱۰

ساور اکر اور ذکاء اللہ کی رائے

ساور اکر اپنی ذات سے کتنا ہی متعصب مہا سبھائی جن سنگھی اور مسلح دشمن کیوں نہ ہو لیکن اس نے آج سے پچاس برس پہلے بغاوت ہند کی جو دلچسپ، مستند اور معرکہ آرا تاریخ لکھی تھی اس میں مسلمان جاں بازانِ حریت کو بڑی فراخ دلی سے خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اس نے رانی جھانسی، تانتیا توپے اور نانا وغیرہ کی مدح و توصیف میں جہاں زورِ قلم دکھایا ہے وہاں اسی جوش و خروش اور عقیدت و محبت کے ساتھ فیروز شاہ، مولانا احمد اللہ اور عظیم اللہ خاں وغیرہ کے مجاہدانہ اور اولوالعزمانہ کارناموں کو بھی پرخروش انداز سے بیان کیا ہے۔ عظیم اللہ خاں کی تعریف و توصیف میں تو اس کا قلم طرارے بھرنے لگتا ہے، عقیدت اور محبت، حرف حرف سے ٹپکتی ہے۔

لیکن مولوی ذکاء اللہ نے اپنی تاریخ ہند میں گو واقعات و حقائق بیان کرنے میں پوری دیانت اور راستبازی سے کام لیا ہے لیکن چونکہ وہ جنگِ آزادی کے مخالف تھے اور انگریزوں کو خدا کا فرستادہ سمجھتے تھے اس لئے بہادر شاہ سے لے کر جس قدر لکشمی بائی سے لے کر حضرت محل تک، تانتیا توپے سے لے کر عظیم اللہ خاں تک، ان حریت دوست اور آزادی خواہ تھا کا ذکر، طنز و تحقیر کے ساتھ کیا ہے، عظیم اللہ خاں کے استخفاف میں تو وہ حد گزر گئے ہیں ذیل میں ان کی بے دردانہ رائے کا ایک حصہ نمونے کے طور پر درج کرتے ہیں:-

> نانا سب سے زیادہ ہوشیار تھا۔ جب نانا صاحب برٹش گورنمنٹ سے مایوس ہوا کہ اب وہ اس کے مقدمہ پر کچھ توجہ نہیں کرے گی۔ تو اس نے اپنا ایجنٹ بنا کر عظیم اللہ خاں کو بھیجا جو یورپ میں تین برس رہا اس عرصہ میں زیادہ تر وہ لندن میں رہا۔ وہ پیرس اور قسطنطنیہ اور کریمیا میں جنگ کے وقت گیا۔ جب انگریز فرانسیسیوں کے ساتھ ہو کر روسیوں سے لڑتے تھے۔ ہندوستان میں تو عظیم اللہ خاں کوئی بڑی وقعت و عزت نہ رکھتا تھا۔ نانا کا فقط ایجنٹ تھا

مگر لندن میں انگلش سوسائٹی کے اندر شہزادہ سمجھا جاتا تھا اور ایک انگلش لیڈی سے وعدہ بھی ہوگیا تھا کہ وہ ہندوستان میں آکر اس سے شادی کرے گی۔ ایک بڑی بوڑھی لیڈی اس کو مشرقی بیٹا کہتی تھی۔ اس کے پاس بہت سی چٹھیاں بڑے بڑے انگریزوں کی تھیں اور دو فرانسیسی چٹھیاں تھیں جو چندر نگر کے بابت لکھی تھیں جس میں فرانسیسی آباد ہیں۔ غرض وہ بڑا چلتا ہوا پُرزہ تانا صاحب کے ہاتھ آ گیا تھا۔[1]

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۱۱۳

(۹)

فیروز شاہ

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک، انتہا یہ ہے!

فیروز شاہ دلّی کے شاہی خاندان کے ایک فرد تھے، لیکن نہ انھیں چوسر سے دلچسپی تھی نہ شطرنج سے، نہ کسی حور وش رقاصہ سے لگاؤ تھا، نہ کسی ملائک فریب مغنیہ سے، نہ سیر و شکار ان کا مشغلہ تھا، نہ بٹیر بازی اور پتنگ بازی سے انھیں کوئی سروکار تھا، فطرت کی طرف سے دلیری اور شجاعت کی نعمت فراوانی سے ملی تھی، بڑے سے بڑے خطرہ کا مقابلہ کرنا، طوفانوں سے لڑنا، چٹانوں سے ٹکرانا ان کی سرشت تھی، اولوالعزمی ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی، خطرات و مہالک کو یہ خود دعوت دیا کرتے تھے۔ انگریزوں سے انھیں نفرت تھی، ان کے عروج و اقتدار کو ختم کر دینا ان کی زندگی کا مقصد تھا اور اس مقصد کے حصول میں کسی ایثار اور قربانی سے انھیں دریغ نہ تھا۔

ہندوستان میں بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرائی، عبادت و ریاضت کے ہمیشہ سے دلدادہ تھے ارادہ کیا حج سے بھی فراغت کر لیں، اس ارادہ کو اندر تک پہنچے تھے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بغاوت شروع ہو گئی، حج بعد میں بھی کیا جا سکتا تھا لیکن یہ رزم گاہ حریت میں شرکت کی

سعادت سے اگر محرومی رہتی تو پھر اس کی تلافی نہیں ہو سکتی تھی، ارادۂ حج فسخ کیا اور مین جلو
اور جیالوں کی ایک فوج لے کر گوالیار، وہاں سے آگرہ پہنچے، محاصرہ کیا لیکن شکست سے دوچار
ہوگئے۔ پھر متعدد مقامات پر ہوتے ہوتے لکھنؤ پہنچے، یہاں کے کارفرماؤں نے بڑی دلی سے انھیں گوارا کیا
لیکن حضرت محل نے ہاتھوں ہاتھ لیا، چونکہ یہ خاندان شاہی سے تھے، اس لئے جہاں جاتے
تھے وہاں یہ اندیشہ بھی ساتھ جاتا تھا کہ کہیں خاندان شاہی کی نسبت سے فائدہ اٹھا کر صاحب
تاج و تخت نہ بن جائیں، پھر بھی جہاں گئے، اپنی دلیری اور شجاعت، بے غرضی اور بے لوثی کا سکہ جما دیا[۱]
لکھنؤ میں اب تک آزادی کی لڑائی لڑی جا رہی تھی، یہاں حضرت محل نے خلعت عطا کیا،
۵ ہزار روپے دعوت کے دیئے۔ چھتر منزل میں قیام کا بندوبست کیا۔

لیکن بدقسمتی یہاں بھی ساتھ تھی۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی حکومت تھی اور
مولوی احمد اللہ شاہ کا طوطی بول رہا تھا دونوں کو فیروز شاہ سے خطرہ اور اندیشہ پیدا ہوا
مشہور ہوا، ان کا رہنا متصل در دولت اچھا نہیں۔ یہ صاحب حوصلہ
اولوالعزم ہیں ایسا نہ ہو تخت شاہی پر بیٹھ جائیں[۲]

دوسری طرف مولوی احمد اللہ شاہ صاحب سے بھی نہ بنی بعض معاملات میں
اختلاف پیدا ہوا[۳] فیروز شاہ ذاتی سربلندی کے لئے شریک جنگ نہیں تھے، انھیں تخت
حکومت درکار تھا، نہ تاج شاہی وہ اپنے ملک کو آزاد کرنا اور انگریزوں کو اس دیس سے
نکالنا چاہتے تھے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہر ایک سے تعاون پر تیار تھے۔

چنانچہ یہاں آنے سے پہلے وہ تانتیا ٹوپے کے ساتھ بھی اشتراکی تعاون کر چکے تھے
اور وسطی ہند میں انہوں نے اپنی تلوار کا لوہا منوا لیا تھا، جواہر لال نے انھیں بہت اچھا گوریلا لیڈر[۴]

---

۱ قیصر التواریخ جلد ۲ صفحہ [illegible]۴

۲ قیصر التواریخ جلد ۲ صفحہ ۳۱۴

۳ غدر کے ہیرو صفحہ ۳۷

۴ DISCOVERY OF INDIA

تسلیم کیا ہے۔ لکھنؤ سے دل برداشتہ ہوکر، وہ بریلی پہنچے، یہاں بھی اچھی خاصی فوج ان کے ساتھ تھی، بہادر خاں کی حکومت اب تک یہاں قائم تھی - ان کی بے لوثی اور بے غرضی پر کسی کی نظر نہ تھی، یہ اندیشہ سب کے دل میں تھا کہیں یہ بادشاہ نہ ہو جائیں شروع میں بہادر خاں کا رویہ بھی اچھا نہ تھا۔

> "خان بہادر خاں نے اجازت شہزادے دی مرادآباد گئے وہاں کا ناظم چچا بہادر خاں کا تھا اس نے کہلا بھیجا بہتر ہے یہاں سے چلے جاؤ۔ شاہزادے نے عذر خستگی راہ کیا اور کہا ہم افطار روزہ کرکے کل صبح آپ یا د چلے جائینگے، آج یہاں رہنے دو، قبول نہ کیا - ایک پلٹن رسالہ چار توپیں مسجد کے مقابل ان کے خیمہ کے توپیں لگا دیں جب شاہزادے نے توپوں کو دیکھا اپنے ساتھ کی توپ کو آگ دی"[1]

اس جنگ میں فیروز شاہ کو فتح ہوئی، نواب صاحب رامپور تاک میں تھے کہ مرادآباد اور بریلی پر قبضہ کرلیں وہ ہزار فوج لے کر آگے بڑھے اور ادھر انگریزوں کی فوج بھی پہنچ گئی سامان و وسائل کی کمی سے دل برداشتہ ہوکر بریلی پھر واپس آیا - اس مرتبہ بہادر خاں نے گرم جوشی سے استقبال کیا۔ شاید انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ فیروز شاہ کے بارے میں یہ خیال غلط ہے کہ وہ اپنے لئے لڑ رہا ہے

فیروز شاہ کی حیرت انگیز شجاعت

فیروز شاہ کی رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا تھا - اسکی شجاعت و دلیری، ہمت و جرأت، استقامت و عزیمت، تہور اور شجاعت کی مثالیں تاریخ کے اوراق میں مشکل سے ملے گی اسے قدم قدم پر ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا، ہر مرحلہ پر رفیقانِ گریز پا کی غداریوں سے دوچار ہونا پڑا - ساتھیوں اور دوستوں کو جدا ہوتے اور ساتھ چھوڑتے دیکھا لیکن اسکی پیشانی پر بل نہ آیا، وہ کس بلا کا بہادر تھا، ایک شریک جنگ گل داد خاں کی زبانی سنیے:-

> جب بریلی میں انگریزی فوج کے حملہ کی افواہ پھیلی اسی وقت بہادر خاں اور

[1] قیصر التواریخ جلد ۲ صفحہ ۴۶۶

فیروز شاہ کے باہم مشورہ سے بختیا کے پُل پر مورچہ لگایا گیا۔ کیونکہ انگریزی فوج کے حملہ کا زور اسی جانب تھا۔

بڑا گھمسان کا رن پڑا۔ فیروز شاہ نے بہادری اور بے جگری کے وہ مافوق البشر کارنامے انجام دیئے کہ دشمن بھی عش عش پکار اٹھے جس سمت گھوڑے کی باگ موڑ دیتے صفیں کی صفیں کاٹ کر رکھ دیتے مجاہدین کی فوج شہزادہ کے قدم بقدم رہتی لیکن بہت سے ایسے مواقع آئے جب شہزادہ سپاہی نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور جب پردہ غبار چھٹتا تو دیکھا جاتا کہ فیروز گھوڑے کو تھپ تھپا کر شاباشی دے رہے ہیں انھیں دیکھ کر ہم سب مجاہدین کو بڑی ڈھارس بندھ جاتی اور جان توڑ حملہ کی تیاریاں شروع کر دیتے اس وقت فوج دو حصوں میں بٹ گئی تھی ایک کی کمان فیروز شاہ اور دوسرے کی خان بہادر کر رہے تھے۔ بڑی زبردست معرکہ آرائی ہو رہی تھی جب مجاہدین اللہ اکبر اور یا علی! کے نعرے بلند کرتے تو دشمنوں کے دل دہل جاتے۔ ان نعروں کی گونج سے ایسا معلوم ہوتا کہ عرش کے کنگرے ٹوٹ پڑیں گے عین اسی وقت ہم نے کیا دیکھا کہ خان بہادر خان کا ہاتھی بگڑ کر بھاگ کھڑا ہوا اور انکی فوج میں افراتفری پھیل گئی اور ہم نے سمجھا کہ خان شہید ہو گئے ہیں لیکن فیروز شاہ نے ابھی تک باگ نہیں موڑی تھی اور وہ تنہا تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ میدان کارزار میں ڈٹے کھڑے ہوئے تھے۔"[1]

بہادر خاں کی شکست کے بعد فیروز شاہ محمدی گئے، جہاں مولوی احمد اللہ شاہ برسرِ جنگ تھے، مولوی احمد اللہ شاہ بڑے اچھے آدمی تھے لیکن ہر آدمی میں کچھ نہ کچھ کمزوری ہوتی ہے انھوں نے دیکھا۔ دلی ختم ہوئی۔ لکھنؤ گیا۔ کیوں نہ میں بادشاہت کا اعلان کر دوں

۱؎ العلم جنگِ آزادی نمبر صفحہ ۳۰

یہاں تک بھی غنیمت تھا لیکن انہوں نے فیروز شاہ پر اب شاہی دکھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ جواہر لال نہرو کے الفاظ میں فیروز شاہ نے گوریلا جنگ شروع کردی:

"شاہزادہ سندیلہ میں آیا، تھانہ سرکاری کو لوٹ کر اپنا تسلط کیا اور اکثر اضلاع تھانہ جات، بانگرمئو، صفی پور وغیرہ کو لوٹا، غارت کیا، بہرائچ بھی اسی دوران میں گزرا۔ پھر سندیلہ میں شکست کھائی، خیرآباد آئے وہاں کے ناظم ہرپرشاد کو اور مولوی محمد ناظم کو واسطے ... راجہ گنا ... سنجھ راجہ ... ویروا بھیجا اور خود ہر ضلع و مقام میں آگ لگاتے گزرتے فوج سرکار سے بھی ... آیا کیا، کہیں ثبات نہ رہا محمود آباد آیا۔ وہاں سب افسروں کو جمع کیا، کہا اب تن بہ مرگ آیا ہے، جسے مرنا ہو میرا ساتھ دے، دیگرے اختیار رکھتا ہے۔ چلا جائے اسی دن شہزادہ فاتحہ سے تھا، آخر ۴ سو سوار اور قریب ہزار آدمی کے جمع ہو کر روانہ باڑی ہوا۔ باڑی سے بیرہا، کنارہ دریائے گنگ پہنچا۔ گھاٹ سے بسلامت پار اتر گیا، راہ میں اکثر مقام پر لڑائی بھی ہوئی خوب بہادری سے لڑا اور بسلامت نکلا چلا گیا، کئی برس سرگرداں آخر کار کابل سے ہو کر داخل ملک ایران ہوا وہاں سے داخل ملک روس ہوا، کہتے ہیں کہ وہاں اپنی جماعت قلیل سے بخوبی بسر کرتے ہیں۔"[1]

بے قرار روح

قیصر التواریخ کی مذکورہ تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیروز شاہ ایک بیقرار روح کا حامل تھا، جب تک وہ زندہ رہا، ٹھوکریں کھاتا رہا پریشان ہوتا رہا اور پھرتا رہا لیکن سر میں جو سودا سمایا تھا وہ ختم نہ ہوا۔ وہ روس گیا ہو یا مکہ معظمہ، یا کسی دوسرے شہر میں بہرحال یہ ایک تاریخی حقیقت کہ وہ انگریزوں کے ہاتھ نہ آیا، اس نے انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔

---

[1] قیصر التواریخ جلد ۲ صفحہ

۱۰

مولانا کفایت علی کافی مرادآبادی

"جنگ آزادی ۱۸۵۷ء مسلمانانِ برصغیر پاک و ہند کی وہ منظم اور ہمہ گیر تحریک تھی کہ جس میں انہوں نے وطنِ عزیز کو غیر ملکی اقتدار سے آزاد کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ اس تحریک میں اگر ایک طرف امرا اور رؤسا اور فوجی طاقت پیش پیش تھی تو دوسری جانب علما و صلحا و فقرا و شعرا اور عوام بھی شریک تھے۔ فتویٰ جہاد سے علما کی مساعی جمیلہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ فقرا نے فقیری کے پردے میں بیعت جہاد شروع کردی۔ شعرا بھی بزمِ سخن کو چھوڑ کر میدانِ رزم میں آگئے۔ مجاہدین نے غیر ملکی حکومت کے قدم اکھاڑ دیئے۔ انہیں سرفروش اور کفن بردوش مجاہدین میں مولانا کفایت علی کافی ہیں جنہوں نے مسندِ علم و بزمِ سخن کو چھوڑ کر جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصہ لیا اور جامِ شہادت نوش کیا۔

ابتدائی حالات کفایت علی نام تخلص کافی ہے۔ ایک معزز خانوادہ سادات کے رکن اور مرادآباد کے قدیم ساکن تھے۔

ابتدائی تعلیم مرادآباد میں حاصل کی۔ بریلی اور بدایوں تحصیلِ علم کے سلسلے میں گئے۔ شاہ ابوسعید مجددی رامپوری سے علم حدیث پڑھا۔

علم و فضل مولانا کافی تمام علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت کامل رکھتے خصوصاً علم طب

صرف ونحو اور شاعری و ادب وغیرہ میں کمال حاصل تھا علم حدیث سے بڑا تعلق تھا شاعری کے سلسلے میں مولوی عبدالغفور لکھتے ہیں۔ صاحب علم وفضل وزہد وتقوی ہیں۔ بیشتر اشعار ان کے حمد ونعت میں ہوتے ہیں[۱]۔

میرٹھ میں فوج کے باغی ہو جانے کی خبریں ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو مراد آباد پہنچیں اس وقت سی بی سانڈرس مجسٹریٹ مراد آباد اور مسٹر جے کیمبل جوائنٹ مجسٹریٹ اور مسٹر کرافسٹ ولسن جج تھے آخر الذکر اس ضلع میں سترہ سال سے تعینات تھے اور وہ ضلع اور باشندگان ضلع سے بخوبی واقف تھے۔ لہذا جب مراد آباد کی صورت حال زیادہ تشویشناک ہو گئی تو ضلع مراد آباد کا انتظام انھیں کے سپرد کر دیا گیا[۲]۔ ۱۹ رمئی ۱۸۵۷ء کو مراد آباد کے مجاہدین نے جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ فوج نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فوجی قطعہ کو مضبوط کیا۔

قومی حکومت کا قیام

ضلع مراد آباد میں مجاہدین کا بڑا جوش وخروش تھا۔ نواب مجدالدین عرف مجو خاں حاکم مراد آباد بنائے گئے تو خزانہ نواب اسد خاں کے سپرد ہوا۔ نواب شیر علی خاں فوج کے جرنیل مقرر ہوئے۔ مولانا کفایت علی کافی صدر الشریعت بنائے گئے اور انگریزی حکومت اٹھ جانے کے بعد احکام حکومت جاری کئے گئے۔ مولوی موصوف نے مسلمانوں میں جہاد کی روح پھونک دی جس کا یہ اثر تھا کہ جب شہزادہ فیروز شاہ مراد آباد میں داخل ہوا ہے تو شہر مراد آباد کے سولہ ہزار آدمیوں نے تقسیم شرعی ایک محضر نامے پر شرکت کے واسطے دستخط کئے تھے[۳]۔ جمعہ کو مسجد کے مجمع میں جہاد کے واسطے وعظ کہا جاتا تھا جس کا خاطر خواہ اثر ہوتا تھا۔ مسلمانوں نے اس علاقہ میں اسلامی حکومت کے قیام کا مستقل ارادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ گزیٹیر مراد آباد میں لکھا ہے:۔

"مسلمانوں نے من حیث القوم ضلع بھر میں برٹش گورنمنٹ سے اپنی مخالفت کو

---

[۱] سخن شعراء صفحہ ۳۹۵ [۲] گزیٹیر ضلع مراد آباد

[۳] اخبار الصنادید جلد دوم مؤلفہ حکیم نجم الغنی رامپوری مرحوم

نہایت صفا اور صریح طریق پر ظاہر کیا۔ روہیلکھنڈ کے اضلاع کی طرح مرادآباد کے ضلع میں بھی تعصب مذہبی اور انگریزوں کی ہر بات سے انتہائی تنفر کے جذبات نے مسلمانوں کو عام بغاوت پر مشتعل کیا تھا"

جب بریلی اور مرادآباد وغیرہ میں مجاہدین کی سرگرمیاں شباب پر تھیں تو انگریزوں نے نینی تال میں پناہ لی تھی اس وقت انگریزوں کی سلیف ریاست رامپور نے کمشنر روہیلکھنڈ مسٹر الگزینڈر سے اجازت لے کر مرادآباد پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں کی قوت کو منتشر اور کمزور کر دیا۔

فتوی جہاد کی اشاعت

جس وقت مرادآباد میں نواب رامپور کی بالادستی قایم ہو گئی اس زمانہ میں مولانا کافی نے انگریزوں کے خلاف ایک فتوی جہاد مرتب کیا اور اسکی نقول آپ نے دوسرے مقامات پر بھجوائیں بلکہ بعض مقامات پر خود تشریف لے گئے۔ مولانا کافی آنولہ سے بریلی پہنچے وہاں نواب خان بہادر خاں اور امام المجاہدین مولوی سرفراز علی سے مشورے ہوئے۔ جنرل بخت خاں کی ماتحتی میں بریلی سے جو فوج دہلی جارہی تھی اسی فوج کے ساتھ مولانا کافی مرادآباد پہنچے۔

مرادآباد پر انگریزوں کا قبضہ

جب جنرل بخت خاں کی فوج مرادآباد سے گزر گئی تو نواب رامپور نے پھر مرادآباد پر قبضہ کر لیا لیکن جب شہزادہ فیروز شاہ کا گزر مرادآباد سے ہوا تو ریاست رامپور کی فوج کو سخت زک اٹھانی پڑی لیکن جنرل جونس کی آمد کی خبر معلوم ہوتے ہی شہزادہ فیروز شاہ نے میدان چھوڑ دیا۔ ۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء کو اچانک جنرل جونس مرادآباد میں آگیا۔ ریاست رامپور کے اہلکاروں نے مرادآباد کا انتظام اس کے سپرد کر دیا مسٹر انگلس کے آتے ہی دار و گیر شروع ہوئی۔ کرنل لگ نے شہر کی ناکہ بندی کر کے خانہ تلاشی اور گرفتاری شروع کی۔ ذرا ذرا سے شبہ پر مسلمان گرفتار ہوئے۔

پھانسی کا حکم اور غزل سرائی

فخر الدین (کلال) نامی ایک شخص نے مخبری کی مولانا کفایت علی کافی گرفتار ہوئے مولانا کافی پر

مختلف الزامات قائم کیے گئے معمولی ضابطہ کی کارروائی کے بعد پھانسی کا حکم ہوا۔ مولانا کافی نے یہ حکم پاتے ہی نہایت خوشی کا اظہار کیا اور جب مولانا کو پھانسی دینے کے لئے لے جایا گیا تو مولانا کافی نہایت بلند آواز سے اپنی ایک تازہ غزل پڑھتے ہوئے جا رہے تھے جو کہ درج ذیل ہے۔

کوئی گل باقی رہے گا نے چمن رہ جائیگا
پر رسول اللہ کا دین حسن رہ جائے گا

ہم صفیرو باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بلبلیں اڑ جائیں گی سونا چمن رہ جائیگا

اطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
اس تن بے جان پر خاکی کفن رہ جائیگا

نام شاہان جہاں مٹ جائینگے لیکن یہاں
حشر تک نام و نشان پنجتن رہ جائے گا

جو پڑھے گا صاحب لولاک کے اوپر درود
آگ سے محفوظ اس کا تن بدن رہ جائیگا

سب فنا ہو جائیں گے کافی ولیکن حشر تک
نعت حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا

۳۵ برس بعد لاش صحیح سلامت نکلی

مولوی محمد عمر صاحب نعیمی مراد آبادی کا بیان ہے کہ شہادت سے تقریباً پینتیس ۳۵ سال بعد مولانا کافی کی قبر جو کہ جیل کے قریب واقع تھی سڑک میں آگئی تو بارش سے قبر کھل گئی دیکھا گیا تو جسم ویسا ہی رکھا تھا مولوی محمد عمر نعیمی مراد آبادی کے نانا شیخ کرامت اللہ ٹھیکہ دار نے جسم مبارک کو دوسری جگہ مقبرہ میں دفن کرا دیا تھا۔ قبر تا ہنوز محفوظ ہے۔[1]

---

[1] ماخوذ از علم (جنگ آزادی نمبر) صفحہ ۱۱۷ (ایوب قادری)

(۱۱)

لکشمی بائی رانی جھانسی

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا؟

لکشمی بائی ایک مرہٹہ خاتون تھی، حسنِ صورت اور حسنِ سیرت کا نمونۂ کامل، خوب رو اور شجاع، نازنین اور شمشیر زن، عورت اور میدان جنگ کی روح! وہ ایک کھاتے پیتے گھر میں پیدا ہوئی، بچپن کا زمانہ بٹھور (کان پور) میں نانا صاحب کے ساتھ گزرا، دونوں ساتھ ساتھ کھیلتے، سیر کرتے، تفریح کرتے، گھوڑے پر سوار ہوتے، تیر اندازی اور شمشیر زنی کی مشق کرتے لیکن یہ سنگم کچھ ہی عرصہ بعد ٹوٹ گیا، لکشمی بائی نے ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک ضعیف اور لاولد فرماں روا گنگا دھر راؤ کی رفیقۂ حیات بن کر، بٹھور سے جھانسی پہنچ گئی، اب تک وہ ایک الھڑ دوشیزہ تھی شوخ اور چنچل لڑکی تھی، خوش باش اور

خوش طبع نازنین تھی، لیکن آج کی تاریخ ہے، وہ ایک سنجیدہ خاتون، ایک باوقار رانی، ایک مدبر اور سیاست داں عورت بن گئی۔ پہلی زندگی اس نے جس سادگی سے بسر کی تھی، دوسری زندگی اس سے کہیں زیادہ وقار اور شوکت کے ساتھ گزار دی۔

جھانسی آگرہ سے ایک سو بیالیس میل کے فاصلہ پر ایک شہر ہے، جو ایک چھوٹی سی مرہٹہ ریاست کا پایۂ تخت تھا، جس زمانہ میں "مرہٹہ امپائر" کا خواب دیکھا جا رہا تھا اور شاہانِ مغلیہ کی کمزوری اور بے چارگی سے فائدہ اٹھایا جا رہا تھا، نظام الملک کی بے تدبیری اور خود غرضی کے باعث مرہٹوں کو مالوہ اور وسطی ہند میں بھی قدم جمانے کا موقع مل گیا اور جھانسی میں بھی ایک مرہٹہ ریاست قائم ہوگئی۔

انگریزوں کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی کہ ریاستوں کو ان کے مرکز سے جدا کر کے براہِ راست معاہدے کرلیے جائیں، اس طرزِ عمل سے دو فائدے متصور تھے، ایک تو مرکزی کمزوری، دوسرے معاہدہ پاتعلق پہلے اخلاقی، پھر مادی تسلط، اودھ کے فرماں روا "نواب وزیر" کہلاتے تھے، کیونکہ وہ شاہ دہلی کے وزیر کی حیثیت سے، اودھ کے صوبہ پر فرماں روائی کرتے تھے، انگریزوں نے غازی الدین حیدر کو "بادشاہ" بنا دیا۔ اودھ کا صوبہ ایک خود مختار ملک بن گیا، دلی سے تعلق منقطع ہوگیا، ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیادت قائم ہوگئی۔ یہی جھانسی کے ساتھ ہوا۔ یہاں کا راجہ پیشوا کا ماتحت اور باجگزار تھا، اور اودھ کے نواب وزیر کی طرح، وہ صوبے دار سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا لیکن انگریزوں نے اسے "مہاراج دھیراج" بنا دیا، پیشوا سے اس کا تعلق منقطع ہوگیا اور راجہ انگریزوں سے پیمانِ وفا باندھ گیا۔

لکشمی بائی کے بطن سے گنگادھر راؤ کا ایک لڑکا پیدا ہوا لیکن وہ چند ہی ماہ بعد دنیا سے رخصت ہوگیا، اب گنگادھر راؤ نے ایک وصیت کی رو سے اپنے خاندان کے ایک نوعمر بچہ کو دامودر گنگادھر راؤ کے نام سے اپنا متبنّٰی کیا، لکشمی بائی کو اس کے بلوغ تک کیلئے ملازم مقرر کیا۔ اس واقعہ کے کچھ دن بعد وہ فوت ہوگیا۔ لارڈ ڈلہوزی کا عہدِ الحاق کہا جاتا

ہے انھیں نادر موقع ہاتھ آگیا۔ انہوں نے متبنیٰ تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ رانی کی پنشن ساٹھ ہزار سالانہ مقرر کردی اور ریاست کا الحاق کرلیا جو حقیر پنشن مقرر کی تھی اسی پر آنجہانی راجہ کے قرض کا بار بھی ڈال دیا ادھر جھانسی میں گاؤکشی بھی علانیہ ہونے لگی، ظاہر ہے اس ستم ظریفی کو لکشمی بائی برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

رانی کو ۱۸۵۴ء سے ۶۰ ہزار سالانہ پنشن ملتی تھی، اس پنشن پر وہ راضی نہ تھی اور جب خاوند کے قرض کا بار بھی اس پنشن پر پڑا تو اور زیادہ ناراض ہوگئی۔ اس نے دہائی مچائی کہ جب اس کے خاوند کی ریاست سرکار نے ضبط کی تو اس کا قرض بھی اپنے ذمے لیا ہوتا مگر گورنمنٹ نے اس کی یہ شکایت سنی نہیں تو وہ بڑے غصہ و طیش میں آئی اور جب اس کی راجدھانی جھانسی میں گائے ذبح ہوئی۔ جواب تک کبھی ہوئی تو پھر وہ سرکار سے اور زیادہ نفرت کرنے لگی۔[۱]

انگریزوں کی بودی دلیل الحاق کے سلسلہ میں انگریزوں کی دلیل بڑی بودی اور کمزور تھی۔

۱۸۳۷ء میں سر چارلس مٹکف نے اس بیان میں ایک نوشتہ لکھا تھا، جس سے ثابت ہوتا تھا کہ ہندو راجہ خودمختار شاہانہ حکومت رکھتے ہیں، دوسرے ہندو سردار ہیں جن کو ملک یا محاصل ملک بادشاہ کی طرف سے عطا کیا گیا ہے۔ ان دونوں میں فرق ہے جس حکومت نے یہ جاگیر معافی دی ہے وہ مستحق ہے کہ جاگیر کے لئے یہ مقرر کرے کہ یہ کتنے پشتوں کے لیے دی گئی ہے؟ اسکی مدت کیا ہے؟ جب قطع نسل ہو تو اس کو واپس لے لے اب سرکار کے ضبط کرنے کا حق خوب چمکتا تھا۔ جھانسی ضبط ہوگئی، آخر راجہ کی بیوہ

---

[۱] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۷۸۵

غل مچاتی دہائی دیتی رہی کہ خاوند کا خاندان سرکار کا بڑا خیرخواہ ہے۔ اس نے بڑے بڑے کام نیک خواہی کے کیئے ہیں جن کو سرکار بھی مانتی ہے۔ اس نے عہدنامہ کی شرائط کو بھی دکھایا، مگر اسکی ساری حجتیں بیکار رہیں یہ قرار پایا کہ ریاست جھانسی کا برٹش گورنمنٹ کے اغراض و فوائد کے لئے حکماً الحاق کرنا ضروری ہے۔ لارڈ ڈلہوزی نے کہا۔ چونکہ جھانسی سرکاری اضلاع کے وسط میں واقع ہے۔ اس پر قبضہ ہونے سے ہماری مرضی کے موافق اس کا تمام انتظام ہوگا جو ہم تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور سرکاری اضلاع کے ساتھ شامل ہونے سے جھانسی کی رعایا کو بہت فائدہ پہنچے گا۔[1]

جھانسی کے سلسلہ میں بھی انگریزوں نے بڑی بے تدبیری اور حرص و آز کا مظاہرہ کیا اگر وہ جھانسی کا الحاق نہ کرتے اور برائے نام ہی مرہٹہ حکومت قائم رکھتے، تو شاید حالات اتنے نہ ابتر ہوتے، بہرحال ان کی اس روش نے جھانسی کے ہندو مسلم عوام اور مہارانی کو بہت زیادہ مشتعل کردیا، اس اثنا میں خوش قسمتی سے غدر شروع ہو گیا۔

رانی جھانسی کی ہوشیاری

جھانسی ایک فصیل دار شہر ہے۔ شہر سے تھوڑی دور کے فاصلہ پر چھاؤنی تھی۔ اس میں ایک چھوٹا سا قلعہ تھا، جس کو ستارہ قلعہ کہتے تھے۔ اس میں توپ خانہ اور خزانہ رہتا تھا ایک اور قلعہ تھا، جس کو قلعہ کلاں کہتے تھے۔

سپاہ کے کمانڈر کپتان ڈن لوپ صاحب اور پولیٹکل افسر کپتان الیگزینڈر تھے جب رانی کو میرٹھ کے ۱۰ رمئی کے واقعہ کی خبر پہنچی تو وہ بڑی خوش ہوئی کہ اب میرے بھلے دن آئے مگر اس نے انگریزوں سے ایسی خیرخواہی کی باتیں بنائیں کہ جو آپکے دشمن ہیں وہ میرے بھی دشمن ہوں ان کی آنکھوں میں خاک ڈالی کہ انہوں نے اسکو اجازت دیدی

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۱۳۸

کر وہ اپنی محافظت کے لیئے سپاہ بھرتی کرلے۔اس نے یہ اجازت پاتے ہی اپنی ریاست کے پرانے سپاہیوں کو نوکر رکھ لیا اور بھاری توپیں جو زمین میں اس کے خاوند کے زمانہ کی دبی دبائی پڑی تھیں۔ ان کو نکال لیا۔ انگریزوں کو اپنی ہندوستانی سپاہ پر اور رانی پر بالکل اپنے خیر خواہ ہونے کا اعتبار تھا۔

لکشمی بائی تخت حکومت پر اس تیاری کے بعد انگریزوں کی سرکوبی اور قتل و غارت کا دور شروع ہو گیا:۔

جھانسی میں جن بنگلوں میں انگریز رہتے تھے، آگ لگنی شروع ہوئی جو بغاوت کے آغاز پر دلالت کرتی تھی۔ نمبر ۱۲ رجمنٹ پیدل نے ۵ رجون کو ستارہ قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

ڈن لاپ صاحب کو جو اپنے خطوط ڈاک میں ڈال کر آتے تھے مار ڈالا۔

۵ رجون کو جب ستارہ قلعہ پر باغیوں نے قبضہ کر لیا۔ تو ۶ رجون کی دو پہر کو رانی مع اپنے جلوس کے محل سے باہر سوار ہو کر چھاؤنی کی طرف گئی۔ شہر میں ایک ملاں نے اس کے لیئے دعائیں پڑھیں۔

کونسل آف وار۔ انگریزوں نے کونسل آف وار جمع کی اس میں یہ فیصلہ ہوا۔ کہ رانی کے پاس تین افسر یہ پیغام لے کر جائیں کہ قلعہ خالی کر دیں، بچے، مرد ہیں ان کو انگریزی عملداری میں کسی امن کی جگہ بخیر و عافیت جانے دے۔

انگریزوں کا قتل۔ ۷ رجون کی صبح کو انڈریو صاحب اور سکوٹ صاحب و پرسل صاحب پیغام لے جانے کے واسطے قلعہ سے باہر نکلے اور فوراً ان کو باغیوں نے گرفتار کر لیا اور رانی کے محل میں لے گئے رانی صاحبہ اس وقت اپنے راج کی خوشی میں مست ہو رہی تھی اس نے کہا کہ مجھے ان انگریز سوروں سے کچھ کام نہیں۔ اس نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ ان قیدیوں

کو غیر آئینی رسالہ کے رسالدار کے پاس لے جاؤ۔ وہ رانی کے محل سے باہر نکلے تھے کہ باغیوں نے ان کو مار ڈالا۔

رانی کے شرائط صلح۔ جب رانی اور باغیوں کو معلوم ہوا کہ قلعہ کا ختم کرنا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، تو ایک آدمی صلح کا جھنڈا ہلاتا ہوا رانی کی طرف سے قلعہ میں یہ پیغام لایا کہ رانی فقط قلعہ چاہتی ہے اگر یورپین ہتھیار دیدیں اور قلعہ حوالہ کردیں تو وہ بہ حفاظت دوسرے مقام میں پہنچا دیئے جائیں گے۔

کپتان سکین نے ان شرائط کو منظور کرلیا۔ اہل قلعہ نے ہتھیار دیدیئے اور قلعہ سے باہر نکل آئے۔

انگریزوں کا مظلومانہ قتل۔ یورپین قلعہ سے باہر نکلے ہی تھے کہ سرکش ان پر ٹوٹ پڑے اور سب کو باندھ کر جوکن باغ میں لے گئے اور درختوں کے جھنڈ کے نیچے ان کو کھڑا کردیا۔ پھر رسالدار نے سب کے قتل کرنے کا حکم بھیجا۔ قیدیوں کی تین قطاریں ایک مردوں کی دوسری عورتوں کی تیسری بچوں کی بنائی گئیں اور سب بڑی بے رحمی سے قتل ہوئے، کوئی ان میں زندہ سلامت نہ رہا۔[1]

انگریزوں کا ہراس و اضطراب

سندھیا اور ہلکر کے سپاہیوں نے جو بغاوتیں کی وہ سرکار کمپنی کی پوربی سپاہ سے الگ رہیں یہاں کے رئیسوں کے ملک میں انگریز پائے گئے لیکن ان کے درباروں نے کوئی اب بغاوت کی بات نہیں کی۔

آگرہ میں جو ممالک مغربی کا دار الحکومت تھا ماہ مئی میں شتہ امن و امان رہا مگر جون میں

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ ذکاء اللہ صفحہ ۸۰۷

نیمچ اور نصیر آباد سے باغی رجمنٹ نے آن کر اس پر حملہ کیا۔ لفٹنٹ گورنر اور سب افسران قلعہ میں بند بیٹھے تھے، کل ممالک شمال مغربی کے اضلاع میں کہیں کچھ انتظام نہیں تھا جولائی کے اول ہفتے میں سپریم گورمنٹ کو یقین تھا کہ اس وقت ممالک مغربی و شمالی ہماری حکومت کے تلے سے نکل گئے۔ غرض انگریز اس وقت چاروں طرف نظر اٹھا کر دیکھتے تھے کہیں اطمینانِ خاطر نظر نہیں آتا تھا۔

باغیوں کے حوصلے، رانی کی دلیری، عوام کا جوش

منشی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:-

"قلعہ جھانسی میں ایسی بڑی وسعت اور قدرتی اور مصنوعی حصانت تھی کہ وہ ایک حصن حصین لاجواب تھا۔ لاجواب تھا وہ میدان میں ایک اونچی پہاڑی پر نہایت مضبوط گچ کا بنا ہوا تھا اس کی دیواروں کے آثار ۱۶ فٹ سے ۲۰ فٹ تک تھے اس کے گرد بڑے مستحکم برج بنے ہوئے تھے جن پر توپیں لگی ہوئی تھیں سفید برج پر رانی کا پھریرا لہرا رہا تھا قلعہ چاروں طرف باستثنا مغربی اور جنوبی جانب کے ایک حصے کے شہر سے گھرا ہوا تھا۔ مغربی جانب کا بہت اونچا ڈھلوان پہاڑ تھا اور جنوبی مشرقی سرے پر ایک بڑا اونچا ٹیلہ تھا اس کے اوپر ایک گول گرگج بنا ہوا تھا جس پر پانچ توپیں لگی ہوئی تھیں اور اس کے گول کے گرد خندق ۱۲ فٹ گہری اور پندرہ فٹ چوڑی بڑی مضبوط گچ کی بنی ہوئی تھیں اور شہر اور قلعہ میں دس ہزار بندیلے اور ولائتی سپاہی اور پندرہ سو باغی سپاہی تھے جن کی سپہ سالار ایک عورت تھی، عظمت و شجاعت کی جو تعریف کی جاتی ہے اس کے مؤلف رانی کی شجاعت و عظمت اس کے دشمن بھی مانتے ہیں۔[۱]

رانی نے محاصرین کو حیران کرنے کے لیے یہ تدبیر کی تھی کہ جھانسی کے گرد

---

[۱] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۷۰۹

ملک کو ایسا ویران کر دیا تھا کہ کہیں گھاس کا پتہ تک نظر نہیں آتا تھا
مہاراجہ سندھیا اور راجہ ٹھیری کی سرکار انگریزی بڑی ممنون کہ انہوں نے
ایام جنگ میں گھاس اور جلانے کی لکڑیاں اور ترکاریاں افراط سے بھیجی تھیں
شہر کی فصیل کی شرقی جانب اودھ کی سڑک پر ایک بیٹری لگائی گئی اور
رات دن محنت کر کے یورش (سپاہ حملہ آور دو حصوں میں منقسم ہوئی تھی
جن میں سے ایک حصہ کا نام یورش راست اور دوسرے حصہ کا نام
یورش چپ رکھا گیا تھا) راست کے لئے چار بیٹریاں بنائی گئیں اور
۲۰ سے انہوں نے توپ کی شروع کی اس دن پچھلے بریگیڈ کی بہت سی
سپاہ آ گئی اور قلعہ کے جنوب میں خیمہ زن ہوئی اور یورش چپ کے لئے تجویز ہوئی
سترہ دن تک برابر محاصرہ کرنے والی توپوں نے اور شہر اور قلعہ کی توپوں نے
برابر اور متواتر ایک دوسرے پر گولہ باری کی گولے شہر کے اندر جاتے تھے
دشمن بھی ان کا جواب دیتے تھے کبھی اس میں توقف نہیں کرتے تھے محاصرین
کی سپاہ تھوڑی تھی اس کو بڑی مشقت اٹھانی پڑی ان دنوں میں
سپاہیوں نے کپڑے نہیں اتارے اور گھوڑوں کے دہن سے کبھی لگامیں دور
پانی پینے کے وقت بھی نہیں اتریں محصورین بھی بڑی محنت کرتے تھے۔ عورتیں
اور بچے دکھائی دیتے تھے کہ وہ دیواروں کی شکست و ریخت کی مرمت میں
مدد کرتے تھے اور پانی اور کھانا ان سپاہیوں کے پاس لے جاتے تھے
جو اپنے کام میں مصروف ہوتے تھے رانی ہمیشہ سپاہ میں خود آتی اور اپنی
باتوں سے ان کی محبت اور جرأت بڑھاتی اور ان کے دلوں میں لڑائی کا
جوش پیدا کرتی۔ سر ہیوروز نے دو توپیں شگاف اندازی کیلئے مقرر کی تھیں
اور باقی توپیں شہر میں گولہ اندازی کے لئے۔ فصیل ایسی مضبوط تھی کہ ان اٹھارہ

بنی توپوں کا اثر آہستہ آہستہ ہوتا تھا ۲۹ کو ٹیلہ کے گرنج کے سب گنگورے توپوں نے اڑا دیئے اور اس پر دشمنوں کی توپیں بند ہو گئیں آئندہ دو دن تک توپ زنی بڑے زور سے ہوئی اور فقط ایک دڑاڑ پڑی جس سے کام چل سکتا تھا مگر باغیوں کی جرأت و ہمت میں اس سے کچھ خلل نہیں آیا۔[1]

لڑائی کی ضروری اور اہم تفصیلات

انگریز مورخوں کی ساری کتابیں پڑھ جائیے ہندو اور مسلمان مورخوں کے تمام بیانات پیش نظر رکھیے حامیوں و رمخالفوں کی جملہ آراء کا جائزہ لیجیے، پھر منشی ذکاء اللہ کی تاریخ کی مجلدات پڑھیے: یعنی ان کی ذاتی رائے زنی نکال دیجیے، تو خلاصتہً پوری جامعیت کے ساتھ وہ ساری باتیں ترتیب و استناد کے ساتھ مل جائینگی، جو دوسروں کے ہاں متفرق اور پراگندہ نظر آئینگی، یہی وجہ ہے کہ میں نے ذکاء اللہ کی تاریخ پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔

انگریزوں کا حملہ، باغیوں کا شاندار مقابلہ

قلعہ کا محاصرہ انگریز کر چکے تھے تانتیا ٹوپی بھی رانی کی مدد کے لئے آ گیا تھا، مگر وہ شکست کھا کر نامراد واپس گیا تھا، قلعہ کے محصورین اس سانحہ کے باوجود ہراساں اور بددل نہ ہوئے۔ ان کے جوش و خروش کا وہی عالم تھا، جو پہلے دن تھا۔

> سپاہ انگریزی مظفر و منصور ہو کر اپنے مقام سابقہ پر آئی، تانتیا ٹوپی کی شکست نے قلعہ نشینوں کا بڑا دل شکستہ کیا۔ سر ہیوروز نے پہلی اپریل کو رات بھر توپوں کی بھرمار رکھی ۲ اپریل کو شہر کی فصیل میں ایک بڑا شگاف پڑا تو سر ہیوروز نے مصمم ارادہ کیا کہ دوسرے دن صبح کو یورش کی جائے انہوں نے حملہ آور لشکر کو دو حصوں میں منقسم کیا اور ان کا نام یورش راست اور یورش چپ رکھا۔ ان میں سے ہر ایک کو پھر تقسیم در تقسیم دو کالموں اور ایک

[1] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۲۰۱

ارز دہیں کی او حملہ کے اشارہ کے لئے یہ تجویز ہوئی کہ تھوڑی سی سپاہ مغربی دیوار پر فصیل پر زینے لگا کے حملہ کرے اور یورش چپ چاپ بایاں کالم شگاف پر حملہ کرے اور دایاں کالم ایک برج پر اور قلعہ کی النگ پر حملہ کرے ۔ ۳ اپریل کو ۳ بجے رات کو کالموں نے چپ چاپ سفر کیا ۔ چاندنی خوب کھل رہی تھی یورش شب کے سپاہیوں نے اس خوف سے کہ ہم کو دشمن دیکھ لے کچھ دیر توقف حملہ کے مقررہ اشارہ کے انتظار میں کیا ۔ آخر کو حکام حملہ نے گوشی کی سب نے اپنے کندھوں پر زینوں کو اٹھایا اور آگے چلے اور سپاہ اس کے پیچھے چاندنی میں اپنی تلواروں اور سنگینوں کو چمکاتی ہوئی چلی ۔ جب وہ اس سڑک پر مڑے جو فصیل کی طرف جاتی تھی تو بگلوں کا شور مچا اور فصیل اور برج ایسے روشن معلوم ہونے لگے کہ ان پر آتشیں فرش کیا گیا ہے اور گولے اور گولیاں ویر سے ان پر پڑنے لگے ۔ باوجود اس کے وہ بڑھتے گئے اور سیڑھیاں اپنے زینے لگا دیئے تو باغیوں نے اور زیادہ گولیاں مارنی شروع کیں ۔ توپیں خوب ماریں اور بان چلائے اور بجائے پتھر لکڑیوں کے کندی بھینکے درختوں کو فصیل پر سے گرایا تو کالموں نے تھوڑی دیر متزلزل ہو کر توقف کیا اور اپنی کمین گاہ میں گئے ۔ لیکن سیڑھیوں کو پکڑے ہوئے کھڑے رہے تو حملہ کرنے والوں کے پھر اوسان درست ہوئے اور انھوں نے زینوں پر چڑھنا شروع کیا بعض زینے بہت چھوٹے تھے اور تین زینے ایسے بھی تھے کہ آدمیوں کے بوجھ سے ٹوٹ گئے اور بہت سے آدمی ان پر سے زمین پر گر پڑے اس سے تھوڑی دیر کچھ کاؤ ہوا ۔ کپتان ڈک زینے پر چڑھ کر فصیل پر کودے اور لفٹنٹ ہیکل جان کود کر باغیوں کے اندر گھس گئے ۔ پیچھے اور آدمی چڑھے اور انھوں نے فصیل پر قبضہ کر لیا اور صاحب مذکور قتل ہوئے[1]

---

[1] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۱۴۴

قلعہ فتح ہو گیا لیکن جذبۂ آزادی؟

انگریزوں نے قلعہ فتح کر لیا لیکن محل میں جا کر انہوں نے محسوس کیا کہ اینٹ اور چونے کی دیواریں فتح ہوئی ہیں، عزم جہاد اور جذبۂ جنگ کو وہ فتح نہیں کر سکتے تھے:۔

محل کو باغیوں نے لڑنے کے لئے تیار اور استوار کیا تھا حملہ آوروں کو گلیوں اور بازاروں میں سے ہو کر محل پر جانا پڑا تھا تو سخت لڑائی لڑنی پڑی اور محل پر جا کر اور بھی زیادہ ہنگامۂ جنگ گرم ہوا محل کی طرف بازاروں اور گلیوں کے دونوں طرف کے مکانات جل رہے تھے اور گرمی بڑی غضب کی پڑ رہی تھی۔ جب حملہ آور محل کے چوک میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ابھی مقابلہ کی ابتدا ہوئی ہے۔ ہر ایک کمرہ میں وحشیانہ جنگ ہوئی سنگینوں سے ایک ایک کوٹھڑی اور دالان سے دشمن نکالے گئے۔ آخر کو سارا محل فتح ہو گیا۔ ابھی لڑائی کا خاتمہ نہیں ہوا تھا کہ دو گھنٹہ کے بعد معلوم ہوا کہ اصطبل میں پچاس سپاہی رانی کے باڈی گارڈ کے موجود ہیں۔ سب خوب لڑے اور مارے گئے۔ انگریزی لشکر کو یونین کے جیک (علم انگریزی) ہاتھ آیا! لارڈ ولیم بنٹنگ نے رانی کے دادا کو وفاداری اور خیر خواہی کے صلہ میں دیا تھا! اور اجازت دی تھی کہ اس کو آگے اپنی سواری میں رکھا کریں۔[1]

پانچ ہزار کشتگان ستم۔

پانچویں اپریل کو سر ہیوروز نے قلعہ پر قبضہ کیا۔ اس لڑائی میں انگریزوں کے ۳۴۵ آدمی مجروح ہوئے جن میں ۳۶ افسر تھے اور دشمنوں کے آدمیوں کی مرنے کی تعداد پانچ ہزار شمار ہوتی ہے۔[2]

---

[1] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۱۴۵

[2] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۱۴۵

بازی اگرچہ لے نہ سکے سر تو کھو سکے

اس جنگ میں حریت دوستوں اور آزادی کے متوالوں کو شکست ہوئی لیکن وہ بھاگے نہیں، انھوں نے پیٹھ نہیں پھیری انہوں نے زندگی کی بھیک نہیں مانگی، بلکہ مردانہ حوصلہ کے ساتھ، غلامی کی زندگی خود اپنے ہاتھوں ختم کر لی:-

چار سَو کے قریب باغیوں نے ایک پہاڑی پر قیام کیا میجر گال نے وہاں جا کر سب کو مارا تو ان کے بیس آدمی بچے تھے جنھوں نے پہاڑی پر جا کر اپنے تئیں آپ مار ڈالا - انگریزوں کے ان پر حملہ کرنے میں ایک افسر اور کئی سپاہی ضائع ہوئے ایک اور گروہ پندرہ سَو باغیوں کا شہر کے حوالی میں جمع تھے - وہ بھی بھاگ گئے ان میں تین سَو آدمی ضائع ہوئے[1]

لکشمی بائی کی جفاکشی

اس جنگ میں رانی جھانسی لکشمی بائی نے غیر معمولی ہمت و دلیری کا مظاہرہ کیا - اس نے بڑی سے بڑی تکلیف و مصیبت کا مردانہ حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کیا کسی حادثہ اور مصیبت نے اسکے عزم میں تزلزل نہیں پیدا کیا

۱۶-۱۷-۱۸-۱۹-۲۰ کو دونوں لشکروں میں لڑائیاں ہوتی رہیں جبکی ابتدا باغیوں کی طرف سے ہوئی تھی - ان سب لڑائیوں میں باغی پسپا ہوئے اور بھاگے، ان کا تعاقب ہوا - اس بھاگڑ میں رانی بھی ایک رات درخت کے نیچے سوئی[2]

یہ لٹیرا تھا یا فاتح؟

نواب صاحب باندہ رانی جھانسی کے ساتھ تھے، انگریزوں کے مخالف تھے، انگریزوں نے باندہ فتح کر لیا، اچھا کیا، وہاں لوٹ مار کی آئین جنگ کی رو سے یہ بھی جائز تھا، لیکن پاس کی ایک دوست، وفادار اور نیازمند ریاست کو لوٹ مار کر کیوں تاراج

---

[1] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۱۴۵

[2] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۱۴۹

کیا؟ اس کا جواب زبانِ خاموشی ہی اب تک دیتی رہی ہے، واقعہ یہ ہے:-

وٹ لوک صاحب کی سپاہ بڑی خوش نصیب تھی کہ ہیوروز کی جفا کشی کا فائدہ باندہ کو فتح کر کے اس نے اٹھایا۔ باندہ کی ساری لوٹ وٹ لوک صاحب کے لشکر کو ہاتھ لگی اس میں کسی اور لشکر کو کوڑی نہیں ملی کرڑوی کی دولت بھی بغیر ایک گولی چلائے وٹ لوک صاحب کو مل گئی (کرڑوی جسکو پہلے نروہا کہتے تھے باندہ سے ۵۴ میل اور الہ آباد سے ستر میل ہے) اس وقت کرڑوی کی یہ کیفیت تھی کہ اس میں نو برس کی عمر کا لڑکا مادھو راؤ اور اُدھا رام چندر اس کا مدار المہام تھا جسکو گورنمنٹ انگریزی سے عداوت تھی جس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کرڑوی کے راؤ امرت راؤ نے گورنمنٹ کو ۱۸۲۷ء میں دو لاکھ روپیہ چھ روپیہ سینکڑہ سالانہ سود پر اس غرض سے دیئے تھے کہ وہ اس کے سود کو بنارس کے مندروں میں خرچ کیا کرے۔ دس برس بعد ۱۸۳۷ء میں گورنمنٹ نے اپنے نوٹوں کا سود چار روپیہ سینکڑہ کر دیا تو کرڑوی کے راؤ نانک راؤ نے تین لاکھ روپیہ اور گورنمنٹ کو دے دیا کہ کل پانچ لاکھ روپیہ کا سود چار روپیہ سینکڑہ کے حساب سے بنارس کے مندروں کے خرچ کے لیئے دیا کرے۔ نانک راؤ کی زندگی میں تو تین برس تک یہ سود مندروں پر خرچ ہوتا رہا مگر اس کے مرنے کے بعد کسی وجہ سے جس کو گورنمنٹ نے عوام میں مشتہر نہیں کیا یہ سود دینا موقوف کر دیا۔ راؤ تو سات برس کا بچہ تھا، وہ تو اس بات کو سمجھتا نہ تھا کہ کیا ہوتا ہے مگر اس امر کی شہرت پانے سے گورنمنٹ نے مندروں کے خرچ کو ناحق بند کر دیا۔ تمام کرڑوی اور ریاست میں رعایا کو گورنمنٹ سے نفرت ہو گئی جب غدر ہوا تو اگرچہ اس وقت نو برس کا تھا وہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ بغاوت کرتا۔ اس نے ۱۹ اپریل ۱۸۵۸ء کو جب باندہ فتح ہوا اس سے دو برس بڑے

ہملٹن کو لکھا کہ میں سرکار کا خیر خواہ ہوں۔ برٹش سپاہ کو میری راجدھانی میں بھیجدیجئے جب وٹ لوک صاحب باندہ سے چل کر ۲ جون کو بھرت کوپ میں آئے تو راجہ ان سے آن کر ملا اور ان کو دوست سمجھ کر مبارکباد دی راؤ تو خیر خواہ سرکار تھا مگر اسکی کل رعایا بدخواہ سرکار تھی جسکی سزا راؤ کو بھگتنی پڑی وٹ لوک صاحب ۶ جون کو کرڈی میں داخل ہوئے کسی نے ان کا مقابلہ نہیں کیا۔ ایک گولی بھی نہیں چھوٹی مگر وٹ لوک صاحب نے اس نوعمر راؤ سے ایسی مدارت کی کہ گویا وہ برسر مقابلہ آیا تھا۔ وجہ اسکی یہ تھی کہ کرڈی میں اس قدر زر و جواہر تھے کہ ان کی طمع سے وٹ لوک صاحب کو اپنے تئیں باز رکھنا ایسی حالت میں مشکل تھا کہ جس سپاہ نے ایسی مشقت شاقہ لڑائیوں میں کی ہو وہ اس سے متمتع نہ ہو وہ اس دولت کا مستحق اس سپاہ ہی کو جانتے تھے انھوں نے راؤ کا تمام مال و اسباب پرائز منی (انعام کارزار) میں داخل کیا کرڈی کے راؤ کو بریلی کالج میں تحصیل علم کے لئے بھیجدیا۔[۵]

لکشمی بائی کی حکمت عملی

رانی لکشمی بائی کی قسمت میں شکست تھی، وہ جھانسی سے ہار کر نکلی، اسے کالپی میں قدم جمانے کا موقع نہ ملا، لیکن اسکی ہمت اور حوصلہ کا وہی عالم تھا، اب اس نے گوالیار کو فتح کر لینے اور وہاں کے مرہٹوں کو ملی اور قومی عصبیت کے نام پر برانگیختہ کر کے اور انگریزوں سے بھڑا دینے کا پروگرام بنایا اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئی، مولوی ذکاءاللہ نے اسکی فراست اور حکمت عملی کو بادل نخواستہ پرزور الفاظ میں سراہا ہے:-

> تانتیا ٹوپی کونچ میں شکست پاکر چرکی میں گیا جو چار میل کے فاصلہ پر تھی جہاں اس کے ماں باپ رہتے تھے وہ یہاں جب تک رہا، سر ہیوروز نے کالپی کو

۵؎ تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاءاللہ صفحہ ۱۵۳

فتح کیا جب اس نے سُنا کہ راؤ صاحب اور جھانسی کی رانی گلادی سی شکست پاکر گوپال پور گئے ہیں جو گوالیار سے جنوب مغرب میں ۴۶ میل ہے تو وہ کمربستہ ہو کر ان سے آملا۔ اسوقت ان سب پر بنی ہوئی تھی۔ ان کو جنوب مشرق مغرب میں انگریزی لشکروں نے گھیر لیا تھا اور شمال میں گوالیا تھا اس کا مہاراجہ ان کا ایسا ہی دشمن تھا جیسے کہ انگریز۔ رانی انگریزوں کے جانی دشمن تھی اس نازک حالت میں ایک تدبیر سوجھی جس سے بہتر اور کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی تھی۔

رانی کی حکمت عملی۔ جھانسی کی رانی نے اپنے ہمراہیوں کے سامنے یہ تدبیر پیش کی کہ گوالیار کی طرف سپاہ کے ساتھ سفر کرنا چاہیئے اور سندھیا کی فوج کو مذہبی اور قومی جوش دلانا چاہیئے اور اس کے دار السلطنت گوالیار پر بشرط ضرورت زبردستی قبضہ کرنا اور پھر اس کے قلعہ کوہ تمثال پر سے انگریزوں کو للکار کر کہنا چاہیئے کہ آئیے ہم سب سے لڑئیے۔ یہ تدبیر سب کو پسند آئی اور اس کی تعمیل فوراً ہوئی۔ گوالیار کی سپاہ کو بہکانے کے لئے جاسوس بھیجے اور پھر لشکر روانہ ہوا اور ۲۰ مئی کی رات کو مرار میں جہاں پہلے کنٹنجنٹ کی چھاؤنی تھی آن پہنچا۔ مہاراجہ سندھیا اس بات کی بڑی قدر کرتا تھا کہ سرکار انگریزی کے والا اقتدار ہونے سے وہ ایسی راحت و عافیت و امن میں رہتا ہے کہ کبھی اس کے باپ دادا کو نہیں میسر ہوا۔ کبھی بیرونی حملہ کا خوف نہیں ہوا کہ جس سے ملک میں خلل و فتور پڑنے کا اندیشہ ہوتا۔ اب انگریزوں نے دہلی اور لکھنؤ تو تسخیر کر لیا تھا علاوہ بہت سی فتوحات حاصل کی تھیں جس سے راجہ کو یقین واثق ہو گیا تھا کہ آخر کو انگریز فتح یاب ہونگے مگر اس کی قوم اور اس کے حالی موالی انگریزوں سے ایسے ناراض تھے کہ جب انھوں نے دیکھا کہ وہ انگریزوں کے دامن کو نہیں چھوڑتا ان کے سایہ عاطفت ہی میں

ہمیشہ رہنا چاہتا ہے، تو ان کا یہ ارادہ ہوا کہ اسکو معزول کر کے کسی اور کو گوالیار کا مہاراجہ بنائیں۔ جب مہاراج کے پاس خبر آئی کہ تانتیا ٹوپی اور جھانسی کی رانی اور بڑے بڑے امیر ایک لشکر عظیم کے ساتھ مرار میں آگئے ہیں جس میں سات ہزار پیدل اور چار ہزار سوار اور بارہ توپیں ہیں تو وہ پہلی جون کی صبح کو مرار کے مشرق میں دو میل کے فاصلہ پر لڑنے کے لئے گیا اس کے ساتھ چھ ہزار پیدل اور پندرہ سو سوار تھے اور باڈی گارڈ چھ سو تنومند سپاہیوں کا تھا اور آٹھ توپیں تھیں، اس سپاہ کو تین ڈویژنوں میں تقسیم کیا توپوں کو مرکز میں رکھا اور دشمن کے حملہ کرنے کا منتظر ہوا۔ ۷ بجے صبح کے باغی شرقی توپخانوں نے گولے مارے۔ جب توپوں کا دھواں صاف ہوا تو باغیوں کے پیادے اور دو ہزار سوار سندھیا کی توپوں کو چھین کر لے گئے۔ سو مہاراج کے باڈی گارڈ کے سب پیدل اور سوار یا تو باغیوں سے جا ملے یا ایسے مقام پر جا کھڑے ہوئے کہ جس سے معلوم ہو کہ وہ اب لڑنے کے نہیں۔

مہاراجہ گوالیار کا فرار۔ پھر باغیوں کے سواروں نے مہاراجہ کے باڈی گارڈ پر حملہ کیا جن کے ساتھ سندھیا تھا۔ باڈی گارڈ کے بعض سپاہی بڑی بہادری سے لڑے اور جب تک ان کے بہت سے مارے نہیں گئے وہ لڑتے رہے۔ اب سندھیا نے دیکھا کہ لڑنے سے کچھ فائدہ نہیں تو وہ گھوڑے پر سوار ہو کر سرپٹ آگرہ کو بھاگا۔ کہیں گھوڑے کی باگ کو روکا نہیں۔

گوالیار پر اُن کا قبضہ۔ باغی گوالیار میں داخل ہوئے قلعہ اور خزانہ زر و جواہر تھے، اسلحہ خانہ سب قسم کے ہتھیاروں سے اور شہر دولت مندوں سے معمور تھا، یہ سب ان کے ہاتھ آیا۔ اب انھوں نے اپنی باقاعدہ گورنمنٹ قائم کی۔ نانا نے پیشوا ہونے کا اشتہار دیا اور راؤ صاحب کو گوالیار کا گورنر

مقرر کیا۔ گوالیار کی سپاہ کو اور کالپی سے جو سپاہ آئی تھی اسکو بخشش اور انعامات تقسیم کئے۔ رام راؤ گوبند جس کو سندھیا نے اپنے اہل دربار میں سے نہایت ذلیل کیا تھا اس کو وزیر اول مقرر کیا۔ مہاراجہ کا سارا مال و اسباب ضبط کرلیا۔ چار مرہٹے سردار جن کو بغاوت کے جرم میں سندھیا نے مقید کیا تھا۔ چھوڑ دیئے گئے اور ان کو اضلاع میں بھیجا کہ وہ سپاہ کو بھرتی کریں چنبل پر انگریزوں کا ایسا مقابلہ کریں کہ وہ اس سے اترنے نہ پائیں، شہر کے باہر جو سپاہ تھی وہ جھانسی کی رانی کے زیر فرمان آئی اور جو شہر کے اندر تھی وہ تانتیا ٹوپے کے حوالے ہوئی اس کے احکام کی اطاعت کرے۔ اضلاع میں سرکش راجاؤں کے نام جن میں زیادہ سربرآوردہ بان پور اور شاہ گڑھ کے راجہ تھے خطوط جاری ہوئے کہ وہ گوالیار میں آن کر نئی گورنمنٹ میں شامل ہوں۔

انگریزوں کی تلملاہٹ۔ ۲۵ر نومبر کو سر ہیو روز نے کرنیل ڈبرٹس کو ایک چھوٹا سا کالم دے کر جنوب مغرب میں ان باغیوں کے تعاقب میں بھیجا تھا جو کالپی سے بھاگے تھے۔ چوتھی جون کو سر ہیو روز کے پاس خبر آئی کہ گوالیار پر باغیوں نے قبضہ کرلیا ہے۔ انہوں نے سٹوورٹ صاحب کو پہلے برگیڈ کی کچھ سپاہ کے ساتھ روبرٹس کی مدد کو بھیجا۔ سر ہیو روز نے اس واقعہ کے سب پہلوؤں پر غور کرکے کسی خوف و اندیشہ کا خیال نہیں کیا اور گوالیار کو دوبارہ فتح کرنے کا عزم مصمم کیا۔[1]

لکشمی بائی اپنی آن پر مرگئی | گوالیار کی فتح رانی کو راس نہ آئی، سندھیا انگریزوں کی پناہ میں پہنچ گیا۔ اسکے آدمی ہیو روز کی رہبری کیلئے آن موجود

[1] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۱۵۷

ہوئے، مراد آباد چھاؤنی پر انگریزوں اور انقلاب پسندوں کی آخری اور فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں انگریز جیت گئے، رانی ہار گئی لیکن رانی نے ہار کر حیاتِ ابدی حاصل کر لی اور انگریزوں نے جیت کر ہمیشہ کے لیے، اپنے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ لگوالیا:-

ہیوروز نے وٹ لوک صاحب کو کالپی کی محافظت پر متعین کیا اور خود اپنے قدیمی برگیڈ کو جن کے سردار سٹوورٹ صاحب اور ریبے میر صاحب تھے ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ یہ سپاہ ۱۶؍ جون کو ایسے مقام پر آئی کہ مرار پانچ میل کے فاصلہ پر تھا۔ سواروں نے دشمن کے مقامات تحقیق کر کے اسے اطلاع دی کہ فوراً دشمنوں کی لینوں پر کامیاب حملہ ہوا پہلے اس سے کہ باغیوں کی کمک اور معاونات سے پہونچنے پائے چھاؤنی کے محافظین کو پیچھے ہٹا دیا اور درمیانی میدانوں میں شکار کر کے شہر میں بھگا دیا سر ہیوروز سمتھ اس لشکر کے ساتھ تھے جو جنوب مشرق کی جانب سے دشمن کے مقامات پر حملہ کرتا ہوا چلا آتا تھا۔ ۱۷؍ جون کی شام کو اس افسر نے راہ میں لڑائی لڑ کر کئی توپیں بعض ان بلندیوں تک لے لیں جو لشکر کے اوپر تھیں، دوسرے دن انھوں نے پہاڑیوں کے ہلال پر قبضہ کر لیا جو جنوب کی طرف سے گوالیار کے آنے میں سدِ راہ تھی۔

جب ہیوروز نے مرار پر یورش کر کے اس کو لے لیا بعض باغی خشک نالہ میں جو ایک گاؤں کے گرد تھا بھاگ گئے۔ اکہترویں ہائی لینڈرس نے ان میں سے ایک آدمی کو زندہ نہیں چھوڑا۔ باقی اور باغی بھاگ گئے ان کا چودھویں ڈریگون نے شکار کیا۔ ۱۸؍ سر ہیوروز مرار کے بالکل مالک تھے جس کے سبب سے آگرہ کی سڑک پر وہ حکمراں ہو گئے اور سمتھ صاحب کے ساتھ ان کی آمد و رفت کی راہ کھل گئی۔

جھانسی کی رانی بھی جو بڑی مستقل مزاج تھی اور باغیوں کے ساتھ میدان جنگ میں اور صلاح اور مشورہ کی محفل میں روح رواں تھی مردانہ لباس پہنے ہوئے گھوڑے پر سوار تھی وہ سات دن اپنی سپاہ کو لڑنے کے لئے تازہ دم کرتی رہی۔ جب انگریزوں نے گھاٹی میں ایک ایک چپہ لے لیا اور سمتھ صاحب پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے تو انہوں نے حصار سے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ رانی جھانسی نے بہادرانہ انگریزی سواروں کا مقابلہ کیا۔ جب سب سپاہی بھاگ گئے، تو رانی نے ہر چند اپنے گھوڑے کو بڑا کا گروہ نہ رکا اور گھوڑوں کے ساتھ بھاگا اور چھاؤنی کے قریب نہر کے پار جانے میں اس کا گھوڑا گرا۔ رانی کو ایک سوار نے مار ڈالا، اس نے یہ نہیں جانا کہ یہ بڑے رتبہ کی عورت ہے، بس وہ ایسی گری کہ پھر نہ اٹھی۔ اس کے ہمراہیوں نے یہ سمجھ کر اس کا مردہ بھی انگریزوں کے ہاتھوں میں نہ پڑے اس کی لاش کو جلا دیا۔[1]

حریف مقابل کا خراج تحسین جواہرلال نے اپنی تاریخ میں رانی جھانسی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:۔

"ایک ہستی ان سب انقلاب پسندوں میں ممتاز نظر آتی ہے اور آج بھی عوام اس کا نام عزت و احترام سے لیتے ہیں، یعنی جھانسی کی رانی لکشمی بائی، یہ ایک بیس سال کی لڑکی تھی، جو میدان جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرتی ہوئی ماری گئی۔ اس انگریز جنرل نے جو اس کا حریف تھا، یہ اعتراف کیا ہے کہ

وہ باغی لیڈروں میں سب سے بہتر اور سب سے زیادہ بہادر تھی"[2]

---

[1] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۱۵۸

[2] DSICOVERY OF INDIA

جھانسی کی رانی اور مسلمان

جھانسی کی رانی لکشمی بائی نے جس عزیمت و استقامت اور استقلال کے ساتھ انگریزوں سے جنگ جاری رکھی وہ تاریخ کا ایک ناقابل فراموش صفحہ ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ اس جنگ میں جس وفاداری اور جانبازی کا مسلمانوں نے مظاہرہ کیا اس کی مثال بھی نہیں مل سکتی۔

(۱) ذکاء اللہ کی تاریخ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ جب رانی نے میدان جنگ میں قدم رکھا تو مسلمان ملاؤں نے اس کے پیچھے دعائیں کیں۔

ساورکر نے اپنی تاریخ بغاوت ہند میں بتایا ہے کہ

(۲) کالے خاں رسالدار، محمد حسین تحصیلدار، حکیم صالح محمد وغیرہ انگریزوں کے خلاف سراپا جوش و عمل بنے ہوئے تھے۔

(۳) بندیل کھنڈ کی ریاست اوڑچھا کے رانا صاحب اپنے جنرل نتھے خاں کی سرکردگی میں جھانسی پر چڑھ آئے۔ لیکن ان نتھے خاں کا کس بل رانی کے میر آتش غوث محمد خاں نے نکال دیا اور یادگار شکست دی

(۴) جھانسی کے محاصرہ کے وقت انگریزوں نے توپوں سے انقلابیوں کے حوصلے پست کر دیئے توپوں کا جواب خاموشی سے دیا جانے لگا۔ مگر غوث محمد خاں اپنے مغربی دروازے کی طرف سے توپیں چلا رہا تھا۔ اس توپ زنی میں انگریزوں کو اپنے ایک بہترین توپچی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ رانی اس کارنامہ سے اتنی خوش ہوئی کہ اپنی پازیب انعام میں بخش دی۔

(۵) غوث محمد خاں اور خدا بخش خاں پر رانی سب سے زیادہ بھروسہ کرتی تھی، اور ان دونوں نے بھی اپنی جان نثار کر کے حق وفا ادا کر دیا۔

(۶) ایک انگریز مورخ ہمیں بتاتا ہے کہ جب رانی حالات سے مجبور ہو کر جھانسی سے نکلی تو تین سو افغانی سپاہی اسے اپنے جھرمٹ میں لئے ہوئے تھے۔

اس واقعہ سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ مسلمان جنگِ آزادی میں ہر جگہ پیش پیش

رہے، دوسرے یہ کہ جن ہندو اکابر نے اس جنگ میں حصہ لیا، انھوں نے بھی ہر طرح کے تعصب کو بالائے طاق رکھ کر مسلمانوں کے تعاون، وفاداری اور انسانیت پر پورا پورا بھروسہ کیا۔ آج کی سی صورت نہ تھی کہ سیکولر حکومت ہو اور مسلمان پر سول اور فوجی ملازمتوں کے دروازے بند کر دیے جائیں۔

(۱۲)

محمود خاں

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جن لوگوں نے مردانہ وار حصہ لیا، کارہائے نمایاں انجام دیے اور اپنی معرکہ آرائیوں سے ایوان فرنگ میں تزلزل برپا کر دیا، ان میں نواب محمود خاں کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

دنیا کو تاریخ فن مسلمانوں نے دیا تھا لیکن جب وہ انحطاط و ادبار سے دوچار ہوئے، تو دوسری چیزوں کی طرح اس فن کو بھی بھول گئے۔ کتنی عجیب بات ہے اس جنگ میں جن غیر مسلموں نے، معمولی حصہ لیا تھا آج ان پر ہزاروں صفحات کی کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں لیکن جن مسلمانوں نے، استقلال و عزیمت کے ساتھ یہ جنگ لڑی ان کے حالات کہیں نہیں ملتے۔

گزشتہ سال ڈیڑھ سو سال کی مدت میں غدر اور کارفرمایان غدر پر کئی کتابیں بازار میں آ چکی ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جن اصحاب ہم نے ۱۸۵۷ء کے غازیوں اور مجاہدوں پر خامہ فرسائی ہے۔ ان کی بے مائگی کا بھی یہ عالم ہے کہ چند پیش پا افتادہ کتابوں سے آگے

نہیں پڑھ سکے ہیں۔ محمود خاں کے بارے میں تو ان کی بے مائگی خاص طور پر قابل رحم ہے حالیؔ کی حیات جاوید تو مل گئی جس سے اخذ و اقتباس کر لیا، لیکن سر سید کی لکھی ہوئی تاریخ سرکشی بجنور نہ مل سکی۔ حالی نے جو کچھ لکھا ہے سر سید کی مدافعت میں لکھا ہے لہٰذا تاریخی نقطہ نظر سے وہ زیادہ مستند نہیں۔ خود سر سید نے جو کچھ لکھا ہے وہ مستند بھی ہے اور عبرت انگیز بھی سر سید انگریزوں کے ہواخواہ تھے اور یقیناً ان کا یہ طرزِ عمل ذاتی اغراض پر مبنی نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے اپنی کتاب میں محمود خاں وغیرہ پر جو کچھ لکھا ہے اس کا انداز بیان اور طرز تحریر حد درجہ پست اور رکیک ہے، انھوں نے محمود خاں کو ہر جگہ "نامحمود خاں" لکھا ہے اسے گالیاں تک دی ہیں اور شاید پھر بھی دل کے چھپھولے نہیں پھوٹ سکے ہیں۔

ذیل میں ہم نواب محمود خاں کے حالات مختصر طور پر لکھتے ہیں، ناخذ کے طور پر ہم نے سر سید کی کتاب سرکشی بجنور سے اور مولانا شہابی کی کتاب ۱۸۵۷ء کے ہیرو سے مدد لی ہے۔

ابتدائی حالات

محمود خاں نجیب الطرفین یوسف زئی روہیلہ پٹھان تھے۔ نواب معین الدین عرف جھنو خاں ابن نواب ضابطہ خاں ابن نواب نجیب الدولہ کے رشتے کے تھے۔ نجیب آباد ضلع بجنور کی کوٹھی مبارک محل میں پیدا ہوئے اس محل اور نواب کی دوسری عمارتوں کے بارے میں مصنف نجیب التواریخ رقم طراز ہیں :

راقم نے قبل از غدر جبکہ میری عمر ۱۶ برس کی تھی سیر قلعہ اور مہتاب باغ کی اور جس احاطہ میں تحصیل نجیب آباد اور واقع ہے۔ وہ محل سرا نواب کی تھی۔ دروازہ نہایت عجیب اور با شوکت تھا۔ باغ میں ایک مکان بھی بھول بھلیاں تھا ایام گرما میں اس کی چھت سے باریک بوندیں بارش کی سی برسائی جاتی تھیں۔[1]

---

[1] نجیب التواریخ صفحہ ۲۷۹

نواب بھنو خاں نے محمود خاں کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا جب سن شعور کو پہنچے تو علاقے
کا انتظام ان کے سپرد کر دیا

نواب محمود خاں فیاض اور فضول خرچ تھے داد و دہش کے باعث ہمیشہ مقروض رہتے
یہاں تک کہ ۱۸۵۵ء میں اپنی کثیر جائداد نواب محمد سعید خاں بہادر والئی رام پور کے پاس مرہون
کر دی۔

نواب محمود خاں نہایت خوش طبع یار باش اور مہمان نواز تھے۔ سپاہیانہ مزاج رکھتے تھے۔
شکار کا بہت شوق تھا۔ اکثر اوقات اسی شغل میں بسر ہوتا تھا۔ گولی کا نشانہ خوب لگاتے

محمود خاں میدان عمل میں

ہندوستان میں غدر شروع ہوا تو ہر طرف آگ لگ گئی اودھ کی
حالت سب سے زیادہ نازک تھی، یہاں کے لوگ بڑی جیداری
سے لڑے، مراد آباد میں جب ہنگامہ آرائیاں شروع ہو گئیں اور بریلی میں بہادر خاں نے اپنی
حکومت کا اعلان کر دیا تو نجیب آباد میں بھی حریت کا جھنڈا بلند ہوا اور یہاں بھی آزادی کی جنگ شروع
ہو گئی کلکٹر مسٹر شیکسپیئر، سر سید اور رحمت علی کو، جو علی الترتیب صدر امین اور ڈپٹی
کلکٹر تھے، محمود خاں کے سپرد کر کے بھاگ کھڑے ہوئے اس لئے کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ
اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ محمود خاں کی سربراہی تسلیم کر لی جائے، چنانچہ محمود خاں
نے خزانہ پر قبضہ کیا اور ۵ جون ۱۸۵۷ء کو اپنی فرماں روائی کا اعلان کر دیا۔

سر سید اور ڈپٹی رحمت خاں نے انگریزوں سے حق وفا ادا کیا اور خفیہ علانیہ، ایسی
سرگرمیاں جاری رکھیں جن سے انگریزوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور محمود خاں کی حکومت
قائم نہ رہ سکی محمود خاں کی شرافت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ اس نے امکان و استطاعت کے
باوجود سر سید وغیرہ کو کسی طرح گزند نہیں پہنچایا، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ سر سید کی نیت نیک
تھی ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ سر سید کی وجہ سے انفرادی طور پر مسلمانوں کو انگریزوں کے
دوبارہ تسلط کے بعد کم نقصان پہنچا، لیکن ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی

اور ملکی مفاد کو ان کی نیک نیتی کے باوجود بہت زیادہ نقصان پہنچا۔

ایک مستند بیان

ذیل میں ہم مولوی ذکاء اللہ کا ایک بیان درج کرتے ہیں جس کے مستند ہونے میں شبہ نہیں۔ ذکاء اللہ صاحب کے اس بیان سے کئی امور پر روشنی پڑتی ہے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

ذکاء اللہ صاحب فرماتے ہیں:۔

نواب نے یہ سنا کہ شیکسپیر صاحب کا ارادہ ہے کہ باقی خزانہ خیر خواہ ہندوؤں کے سپرد کر دیں تو وہ بجنور میں بن بلائے آیا۔ اس کی نیت بگڑی ہوئی تھی خوش نصیبی سے شیکسپیر صاحب کے پاس سر سید احمد خاں جو سچے، وفادار اور جاں نثار ایماندار خیر خواہ سرکار تھے اور عقل و دانش کے پتلے موجود تھے وہ نواب محمود خاں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ چند انگریزوں کے مار ڈالنے سے تم کو کیا ہاتھ آئے گا؟ ان کو زندہ جانے دو اور تم ضلع کے مالک ہو جاؤ اور اس کو سارے نشیب و فراز ایسی خوبی سے سمجھائے کہ اس نے سب انگریزوں کو اسی رات باغیوں سے بچا کر رڑکی روانہ کر دیا۔ شیکسپیر صاحب نے ایک دستاویز لکھ کر نواب کو دی کہ وہ دس روز تک ضلع میں حکمرانی کرے مگر مال گزاری وصول کرنے کا اس کو اختیار نہیں ہے۔

خزانہ میں سے روپیہ خرچ کرے مگر اس کا حساب کتاب باقاعدہ کے موافق رکھے۔

شیکسپیر صاحب مع اور تمام فرنگیوں کے سواروں کی محافظت میں رڑکی پہنچ گئے۔ دس روز کے بعد انھوں نے پھر سے بجنور میں

واپس آنے کی بہت کوشش کی مگر پھر ایک سپاہی بھی ان کے ہاتھ نہ لگا کراں کو وہاں پہنچا دیا اس لئے واپس آنا ممکن نہ تھا۔

نواب نے اوّل یہ اعلان کیا کہ وہ دہلی کے بادشاہ کی طرف سے یہاں حکمراں مقرر ہوا ہے۔ دوئم نواب نے بیاہ بیت سے سارا روپیہ نکال لیا اور اپنے گھر نجیب آباد روانہ کیا۔ ڈاک بند کر دی۔ دریاؤں کے گھاٹوں پر پہرہ لگا دیا۔ سپاہ جس قدر بڑھا سکا بڑھائی۔ ایک معتمد آدمی دہلی کے بادشاہ کے پاس بھیجا کہ ضلع بجنور میں اس کی جاگیر یا دشاہ عنایت کرے اوزان اور پیمانے سرکاری بدل کر بادشاہی وزن اور پیمانے جاری کئے جن پر دہلی منقش کرایا

اس نے ہندوؤں سے لڑنا شروع کیا۔ شیر کوٹ کے چودھری کو باہر نکال دیا۔ یہ کام اس کے حق میں زہر ہوا۔ ہندو رئیس اور چودھری اس کے دشمن ہو گئے۔ ہلدور کے چودھریوں نے نواب کو بجنور سے نکال کر نجیب آباد بھگا یا تو شکسپیر صاحب نے پھر چودھریوں کے حوالے ضلع کیا اور رحمت خاں اور سید احمد خاں کے پاس حکم بھیجا کہ ضلع میں سرکار کی طرف سے انتظام کریں۔ ان دونوں وفادار جاں نثار خیر خواہوں نے انتظام اچھی طرح کیا مگر محمود خاں نے اپنا تسلط دوبارہ بجنور پر کر لیا! تو ان دونوں کو ضلع چھوڑ کر بھاگ جانا پڑا [1]

یہی وہ چودھری تھے جن کو ہلدور مشتعل کر کے انگریزوں کے حامیوں نے ہلدور میں مسلمانوں کا قتل عام کرایا۔ سر سید لکھتے ہیں:۔

"قبل طلوع آفتاب سے شام تک مسلمانوں کا قتل عام ہوتا رہا اطاکے

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکا اللہ) صفحہ ۸۲۱

بعد تمام مکانات جلا دیے گئے کوئی گھر باقی نہ بچا۔[1]

المیہ

اس المیہ کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ اس ہندو مسلم فساد کے محرک اور بانی انگریزوں کے خیر خواہ مسلمان تھے، یہی تھے جنھوں نے ہندو چودھریوں کو محمود خاں کے خلاف بھڑکایا، یہی تھے جن کی شہ پر ہندو چودھریوں کے حوصلے بڑھے اور انھوں نے مسلمانوں کے قتل عام سے بھی دریغ نہ کیا۔

سیر چشمی اور وسیع القلبی میں محمود خاں اپنے دادا نجیب الدولہ کے قدم بقدم تھے چودھریوں کے خلاف کوئی تعزیری کارروائی عمل لانے کی انھوں نے اجازت نہ دی حالانکہ مسلم عوام بہت مشتعل تھے اور سرسید کے خلاف ان کو برانگیختہ کر رہے تھے۔

سرسید لکھتے ہیں:۔

"چاندپور میں اس سے زیادہ مصیبت دیکھنی تھی، جب ہم وہاں پہنچے اور لوگوں کو معلوم ہوا تو صدہا آدمی تلوار بندوق اور گنڈاسے لے کے ہم پر چڑھ آئے اور سب ہوائی پکار پکار کر کہہ رہے تھے چودھریوں سے مل کر مسلمانوں کو مروا دیا، مسلمانوں کو ذبح کروا دیا اب ہم تم کو نہ چھوڑیں گے؟"

محمود خاں کا حسن سلوک ہندوؤں سے

لیکن اس اشتعال انگیز روش کے باوجود محمود خاں کا حسن سلوک ہندوؤں سے برابر جاری تھا۔

محمود خاں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات خوشگوار رکھنے کے لئے چودھریوں کی جماعت پر بدستور سابق پدرانہ شفقت جاری رکھی کہ احمد اللہ خاں نے مندروں پر پہرے لگوا دیے تاکہ کوئی مسلمان ان کو گزند نہ پہنچائے جس سے آپس میں جھگڑے کی صورت پیدا ہو۔[2]

---

[1] سرکشی ضلع بجنور صفحہ ۱۰۶ [2] ۱۸۵۷ء کے ہیرو (شہابی)، ملخصاً

آخر کیوں نہ ہو یہ لوگ نواب نجیب الدولہ جیسی پر عظمت شخصیت کے نام لیوا تھے۔ جن کے مالے میں مولانا اکبر شاہ خاں نے لکھا ہے:-

"نواب نجیب الدولہ نے نجیب آباد کے بازار خاص میں کوئی مسجد تعمیر نہ کی کہ مبادا ہندو دکانداروں کو تکلیف ہو نیز جب ان کی والدہ انتقال ہوا تو دوسری جگہ تجویز ہوئی وہ کسی ہندو کی تھی۔ اس طرح معلوم ہوا کہ تمام حوالی ہندوؤں کو عطا کئے ہوئے ہیں۔ مجبور ہو کر نواب نے کہا کہ جنازہ مانیر ڈی لے چلیں۔ آخر ایک ہندو کو رحم آیا اور اس نے اجازت دی کہ مقبرہ اس کی زمین پر بنایا جائے۔

انگریزوں کی چڑھائی

مارچ ۱۸۵۸ء میں اودھ کا سب سے بڑا محاذ آزادی سر کرنے کے بعد انگریزوں نے اطمینان کے ساتھ نجیب آباد کے خلاف اقدام کیا مصنف بجنور گزیٹیر لکھتا ہے

"لکھنؤ کی فتح کے بعد کرمیل کمپبل رڑکی اور روہیل کھنڈ کی طرف بڑھا یہ فوج مسٹر جانسن کے ماتحت تھی۔ ۱۵ اپریل کو اس فوج نے ہرودار پر قبضہ کیا پھر گنگا کو عبور کر کے ناگل کی طرف بڑھی تاکہ دشمن کا جو کہ جنگل میں مضبوط حالت میں تھا مقابلہ کرے۔ چار میل چلنے کے بعد ایک بڑی تعداد سے مقابلہ ہوا"

انگریزوں کا سفاکانہ رویہ

سر سید لکھتے ہیں:-

"شیو پرشاد نے خبر دی کہ نواب کی فوج اندر ہی ہے۔ ڈائمنڈ صاحب نے نہر پر کھڑے ہو کر دوربین سے دیکھا اور حکم دیا کہ نہر کا پانی چھوڑ دیا جائے اس حکمت سے جنگل سے دشمن کو موت نے جنگل میں پکڑ لیا۔ بیسیوں پانی میں ڈوب

۱؎ ۱۸۵۷ء کے ہیرو (شہابی)

گئے اور باقی جو پانی کے بیچ میں کھڑے تھے یا کنارے پر تھے سب کو مار دیا گیا
نہر انجینئر شیو پرشاد کو سو روپیہ انعام ملے ؎

شکست

نجیب آبادی فوج کو غیر متوقع طریقے پر ہزیمت ہوئی۔ نیز تمام اقطاع ملک ایسٹ انڈیا کمپنی کی گرفت میں آ جانے سے محمود خاں سخت بد حواس ہو گئے اور انھوں نے اندازہ لگایا کہ اب آزادی ملک و ملت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ جائے پناہ عبث جان کر جنرل محمود نے اپنے آپ کو انگریزی فوج کے حوالے کر دیا۔

کالے پانی کی سزا

جب الوطنی کے جرم میں کالے پانی کی سزا ہوئی لیکن اس پر عملدرآمد کی ہنوز نوبت نہ آئی تھی کہ انھوں نے آخرت کے لئے رخت سفر باندھ لیا جیل خانہ ہی میں انتقال فرمایا۔

جنرل صاحب کے اوصاف حمیدہ کا آج تک روہیل کھنڈ میں اعتراف کیا جاتا ہے۔ حد درجہ دلیر اور بہادر ہونے کے باوجود الاغ انزام اور متوسط القد تھے۔ غلامی کی پہلی بیڑی بنگال اور آخری نجیب آباد نے پہنی۔ بہادر شاہ پر تخلیہ اور ان کا خاتمہ ہوا اور محمود خاں پر آزادی روہیل کھنڈ کا۔

سر سید کی گالیاں

سر سید جب محمود خاں اور بہادر خاں فرماں روایان نجیب آباد و بریلی کا ذکر کرتے ہیں، تو ان کے سب و شتم کا انداز کیا ہوتا ہے ملاحظہ کیجئے۔

"۱۰ جون ۱۸۵۷ء کو چودھری پرتاب سنگھ رئیس تاجپور کے پاس مفصل خطوط حالات بگڑنے بریلی اور مراد آباد کے آ گئے اور بہادر خاں کی بدذاتی اور نمک حرامی کی بھی مفصل خبر آ گئی اور انھوں نے وہ سب خط جناب ؎

؎ سرکشی بجنور (سر سید)
(۲) غدر ۱۸۵۷ء کے ہیرو صفحہ ۱۰۶

صاحب کلکٹر بہادر کو دکھاوے اور کمبخت نا محمود خاں کو بھی بدذات خان بہادر
کی خبر ملی تھی اور درحقیقت اسی خبر سے اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ بہادر خان کی پیروی
کرے اور رات کا وقت اپنا ارادہ پورا کرنے کا ٹھہرا چکا تھا مگر اس وقت تک
ہم کو اس بدذات کے ارادے کی خبر نہیں ملی تھی۔ صرف اتنی بات ہوتی تھی کہ جب
نا محمود خاں آیا تو جناب صاحب کلکٹر بہادر نے دو دفعہ اس کمبخت کو بلایا اور نہ
گیا اور جب گیا تو اس کی بات چیت میں خود جناب صاحب کلکٹر بہادر نے بے رخی
دیکھی اور اس کی پیشانی پر اس کے دلی ارادہ کا اثر پایا۔ رات کو آٹھ بجے محمد سعید
خاں محرر کلکٹری ساکن نجیب آباد نے مجھے خبر دی کہ محمود خاں کا ارادہ آج رات
فساد کرنے کا ہے کیونکہ اس بات کے سننے سے کہ صاحب کلکٹر بہادر خزانہ بلدور
بھیجتے تھے نہایت برہم ہے کچھ عجب نہیں کہ رات کو کشت و خون ہو جاوے میں
نے محمد سعید خاں سے کہا کہ تم بھی جاؤ اور تدبیر کرو کہ فساد نہ ہو اور خود اور دلی
محمد کی معرفت میری طرف سے نواب کی خاطر جمع کردو کہ خزانہ بلدور نہیں جانے
کا اور نہ وہاں بھیجے جانے کی صلاح ٹھہری ہے۔ اسی وقت میں نے سعد اللہ
خاں کو بلایا اور اس کو بہت سمجھایا کہ تم فساد کو روکو اور نواب کو سمجھاؤ اور کہہ
دو کہ اگر بالفرض خدانخواستہ دو انگریز مارے بھی جاویں گے تو کیا فائدہ ہوگا اور
بدنامی اور نمک حرامی جدا ہوگی اور خدا کے یہاں جدا منہ کالا ہوگا اور اس بات
کا میں بھی ذمہ دار ہوں کہ خزانہ بلدور نہیں جانے کا اور جناب صاحب کلکٹر بہادر
کوئی ایسی بات نہیں کریں گے۔ جس سے نواب صاحب کی سرداری
اور اعتبار پر دوسرے کو ترجیح ہو۔ پھر فساد کرنے اور بدنامی اٹھانے اور
خون ریزی کرنے سے کیا نتیجہ ہے"[1]

---

[1] سرکشی بجنور (سرسید احمد خاں)

(۱۳)

نانا صاحب

آخری پیشوا باجی راؤ کو انگریزوں نے میدان جنگ میں شکست نہیں دی تھی الفنسٹن صاحب نے اپنی تاریخ میں تسلیم کیا ہے کہ اگر باجی راؤ جنگ جاری رکھنا چاہتا تو ہمیں غیر معمولی مصیبتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا، لیکن جیسا ہر زوال پذیر خاندان میں ہوتا ہے۔ باجی راؤ عافیت پسند ہو گیا تھا وہ جنگ کے میدان میں نہیں ہارا، لیکن حوصلہ ہار گیا ہمت ہار گیا، انگریزوں نے آٹھ لاکھ روپے سالانہ اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ وہ اپنے حواریوں موالیوں کے ساتھ کانپور کے قریب بٹھور میں امن و آسائش کی زندگی بسر کرنے لگا، فکر امروز نہ غم فردا، عیش کی زندگی بسر کرتا تھا اور انگریزوں کے گیت گاتا تھا۔ جب بھی انگریزوں پر کوئی بپتا پڑی وہ تن من دھن سے ان کی مدد کرنے کو تیار ہو گیا۔ افغانوں سے جنگ کے وقت بھی اور سکھوں سے لڑائی کے وقت بھی۔

کئی شادیوں کے باوجود باجی راؤ لاولد رہا، آخر اس نے ایک برہمن لڑکے نانا راؤ کو اپنا متبنیٰ بنالیا، ۱۸۵۱ء میں وہ مرگیا۔ گورنر جنرل نے جس طرح راجہ جھانسی کا متبنیٰ تسلیم نہیں کیا تھا اسی طرح باجی راؤ کا متبنیٰ بھی تسلیم نہیں کیا اور وظیفہ بند کر دیا رانی جھانسی کی طرح نانا نے عرض

مروضِ التجا اور عرضداشت، سفارت اور وکالت سے کام نکالنا چاہا، لیکن یہاں معاملہ وہ تھا کہ

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

بہ التماسی کی ان سنی کردی۔

۱۸۵۷ء میں جب جنگ آزادی شروع ہوئی، تو نانا کو خدا داد موقع قسمت آزمائی کا ملا گیا۔ علاوہ جنگجو اور مردِ میدان نہیں تھا لیکن حالات نے تلوار سنبھالنے پر مجبور کردیا۔ عظیم اللہ، جوالا پرشاد، تانتیا ٹوپے وغیرہ اس کے دست راست تھے، انھوں نے اور زیادہ اکسایا، آخر وہ تخت یا تختہ کہہ کر میدان میں کود پڑا۔

وسط مئی میں کان پور میں ہلچل پیدا ہوئی، جون کے آغاز میں یہ ہلچل شورش اور ہنگامے کی صورت میں تبدیل ہوگئی۔ ۲۵ جون کو انگریزی تسلط سے کان پور آزاد ہو گیا۔ بکم جولائی کو نانا صاحب نے فرماں روائی کے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

انقلابیوں کے خفیہ جلسے

نانا صاحب کے برسرِ اقتدار آنے سے کافی پہلے کان پور کے انقلاب پسند انگریزوں کو نکالنے اور قومی حکومت قائم کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ سلور کہتا ہے:۔

انقلاب پسندوں کے جلسے بالعموم صوبیدار ٹیکا سنگھ اور سپاہی شمس الدین خاں کے مکان پر ہوتے تھے۔ جس دن انقلاب کی تاریخ کا فیصلہ ہوا، اس سے دوسرے دن شمس الدین نے اپنی محبوبہ عزیزن کو بتایا کہ جنگ شروع ہونے والی ہے۔ عزیزن ایک نوجوان لڑکی تھی، ناچنا گانا اس کا پیشہ تھا۔ سب سپاہی اس پر جان نثار کرتے تھے، لیکن وہ دولت کے لئے اپنا حسن نہیں بیچتی تھی، ان سپاہیوں پر فدا تھی جن کے دل میں حُبِ وطن کی آگ بھڑک رہی تھی۔

انگریزوں کا بے محاقتل

کانپور میں انگریزی حکومت اٹھ جانے کے بعد جو انگریز بچے تھے وہ ایک بند تھے انکی حالت بہت نازک تھی نہ وہ جنگ جاری رکھ سکتے تھے نہ اطمینان و عافیت سے اپنی زندگی بسر کر سکتے تھے نہ ان کے پاس سامان خورد و نوش تھا، نہ فوج اور سپاہی عظیم اللہ خاں نے نانا صاحب کی طرف سے ان انگریزوں کو یہ تحریر دی کہ:

"جو لوگ اپنے ہتھیار رکھ دیں گے وہ صحیح سالم الہ آباد پہنچا دئے جائیں گے"۔[1]

کافی کشمکش اور تامل کے بعد انگریزوں نے یہ پیش کش قبول کرلی، کیونکہ عورتوں اور بچوں کو بچانے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں تھی، مسٹر ٹوڈ جو نانا کے استاد تھے، خود صلح نامہ لے کر نانا کے پاس پہنچ گئے، وہ اخلاق و تپاک سے پیش آیا اور دستخط کر دیئے۔

مولوی ذکاء اللہ نے اس سانحہ کا ذکر اپنی تاریخ میں بڑی تفصیل سے کیا ہے، ہم انہی کے الفاظ میں خلاصہ درج کرتے ہیں:۔

صبح کو عورتیں اور بچے اور سپاہی نکلے، ان کی شکلوں پر مردنی چھائی ہوئی تھی وہ بڑے لاغر اور ناتواں ہو گئے تھے، لباس ان کا پھٹا ہوا تھا، فاقوں کے مارے خستہ اور شکستہ حال تھے، بعض زخمی تھے جہاں سے یہ گروہ چلا تھا وہاں سے دریا ایک میل تھا۔ مگر ان مصیبت زدوں کے لئے تو یہ ایک منزل کا سفر بھی سقر سے کچھ کم نہ تھا۔ اکثر زخمی پالکیوں میں سوار تھے، عورتیں اور بچے بہلیوں کی گاڑیوں میں سوار تھے یا ہاتھیوں پر، تمام آدمی پیدل تھے، کشتیاں دریا میں تیار تھیں۔ گرمی کے موسم میں دریا اترا ہوا تھا اس لئے کنارہ سے فاصلہ پر تھیں جن میں سوار ہونے کے لئے پایاب پانی میں ہو کر جانا پڑتا تھا۔ نو بجے تھے کہ سب کشتیوں میں بیٹھ گئے سارے اسباب خوں ریزی کے لئے تیار تھے تانتیا ٹوپے نے اس قتل کا اہتمام اپنے ذمہ

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ از ذکاء اللہ صفحہ ۵۱۸

چیزیں بھی ہوتی پڑی تھیں جس کمرے میں سب انگریز قتل کیے گئے تھے اس کا فرش خون سے تربتر تھا۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ ہندستانیوں کو ایسی سخت سزا دوں کہ وہ بھی یاد رکھیں کہ ایسے کاموں کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ میں نے ۲۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو حکم دیا کہ گڈھے اس کنوئیں کو قبر کی صورت بنا دیں جس میں بدذات نانا نے انگریزوں کی لاشیں ڈلوائی تھیں۔ جس گھر میں وہ قتل ہوئے وہ ان کے خون سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے یہ ارادہ مصمم کرلیا کہ بے گناہوں کے خون کے دھبے وہ لچے بدمعاش صاف کریں جن کو پھانسی کا حکم دیا گیا ہو۔ اگر وہ صاف کرنے میں عذر کریں تو تازیانے لگائے جائیں اور اس کے بعد فوراً پھانسی دے دی جائے۔

اوّل مجرم حبشی رجمنٹ کا ایک صوبہ دار اونچی ذات کا برہمن بنا ہوا تھا وہ پکڑا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں جھاڑو بھنگی نے دیا اسے حکم ہوا کہ مکان میں جھاڑو دے۔ اس نے نصف مربع فٹ صاف کیا تھا کہ اس کام سے انکار کیا۔ لیکن جب وہ تازیانے کے نیچے آیا تو پھر اس نے حکم مانا اور سب مکان اس نے صاف کر ڈالا پھر اس کو پھانسی دی گئی۔

نانا کا مسلمان ساتھی

کچھ دنوں کے بعد سول کورٹ کا ایک مسلمان ملازم جو بڑا بدمعاش تھا پکڑا گیا۔ اس نے اس کام پر اعتراض کیا تو اس کو بید لگائے گئے اور خون کے دھبے اس کی زبان سے چٹوا کر صاف کرائے گئے پھر پھانسی دی گئی۔ اگرچہ یہ عجیب قانون تھا مگر موقعہ وقت کے لئے نہایت موزوں تھا جب تک کہ سارا کمرہ بالکل صاف نہیں ہو جائے گا میں اپنا حکم نہیں بدلوں گا خدا میری مدد کرے گا۔

لیا تھا عظیم اللہ اور نانا کے بھائی اور ٹیکا سنگھ اور بہت سے آدمی موجود تھے اور ضلع کے بہت سے زمیندار اور شہر کے بہت سے آدمی تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ان میں اکثر آدمی جانتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے اور شاید وہ انگریزوں کی اس تذلیل سے خوش ہو رہے تھے غرض ایک میلے کی سی خوشی و گہما گہمی ہو رہی تھی سواروں اور پیدلوں نے اشارے کے ہوتے ذبح کرنا شروع کر دیا۔

فرنگی کشتیوں میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک بگل کی آواز سنائی دی ہندوستانی ملاح کشتیوں میں سوار ہوتے۔ ان کو دریا کے کنارے کی طرف کھینچنے لگے۔ پھر توپوں کے گولے اور بندوقوں کی گولیاں دریا کے دونوں طرف کے کناروں سے مسافروں پر چلنے لگیں اور جن کے چھپروں میں آگ لگا دی گئی کان سے شعلے اٹھنے لگے اور آگ پھیلنی شروع ہوئی۔ زخمی بیمار جلکر خاکستر ہوئے یا دھوئیں سے ان کا دم ایسا گھٹا کہ دم نکل گیا۔ طاقتور عورتیں بچوں کو اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے دریا میں کود پڑیں تو ان پر گولیاں چلا دی گئیں۔ سوار ان کے پیچھے دوڑنے لگے اور تلواروں سے ان کو مار ڈالا گیا قبضہ کر لیا تاکہ اور زیادہ تکلیف پہنچا کر قتل کریں

ہولناک انتقام

نانا نے اور اس کے ساتھیوں نے انگریزوں پر جو ظلم و ستم توڑے ان کی تعریف نہیں کی جا سکتی انہیں حق بجانب نہیں ثابت کیا جا سکتا لیکن نانا صاحب کی شکست کے بعد جب انگریزوں کا پھر سے تسلط ہوا انہیں زیادہ ہولناک انتقام بھگتنا پڑا یہ داستان بھی سننے کے قابل ہے:۔

نیل صاحب لکھتے ہیں کہ جب میں کانپور میں آیا تو پہلے بی بی گڑھ گیا۔ وہاں۔ میں نے لیڈیوں کے اور بچوں کے کپڑے اور جوتیاں خون آلودہ بکھری دیکھیں۔ ان کی

ذکاءاللہ کا تاثر ایسے وقت میں بڑے بڑے رحم دل عاقلوں میں حق ناحق میں فرق کرنے کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ بڑے بڑے عقلمند انگریز اپنا فرض سمجھتے تھے کہ رحم کو اپنے سے دور رکھیں جیسے یہ جرائم مستثنیٰ صورت کے ہیں۔ ایسی ہی ان کو سزا بھی مستثنیٰ صورت کی ہونی چاہیے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ جیسے قتل کے مختلف درجے ہوتے ہیں ایسے ہی ان کی سزا کے مختلف درجے ہونے چاہئیں۔ نکلسن جیسے عاقل شجاع کی رائے یہ تھی کہ ایک ایکٹ پاس ہو جس میں موت کی سزا طرح طرح کی تکلیفات دے کر دی جائے انھوں نے مئی کے اخیر میں ایڈورڈس صاحب کو لکھا کہ ایک بل پیش کریں جس میں عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کو موت کی سزا اس طرح دی جائے کہ مجرم کی زندہ کھال اتاری جائے، سولی دی جائے۔ زندہ جلایا جائے۔ [1]

بٹھور کا ویرانہ شکست کے باوجود انگریزوں کے ہاتھ نہ آیا۔ نیپال کی طرف بھاگ گیا لیکن انگریزوں نے اس کی گرفتاری سے مایوس ہو کر اس کے مکان کے۔ جو کچھ کیا یہ ملاحظہ فرمائیے۔ میجر [illegible] صاحب تھوڑی سی سپاہ کے ساتھ بٹھور بھیجے گئے وہاں کوئی دشمن نظر نہ آیا۔ تمام سامان اسکا رکھ گیا اس کے مکانوں میں انگریزی اسباب لوٹ کا بچا ہوا تھا نانا تمام زر و جواہر اپنے ساتھ لے گیا یا چھپا گیا تھا جن کا پتہ اس سبب سے نہیں لگ سکا تھا کہ ان پر مکانات ڈھے ہوئے پڑے تھے اگر جانے سے پہلے تلاش کی جاتی تو شاید وہ مل جاتے۔ اب پیشوا کے خاندان کا ایک رکن نانا راؤ کا بھائی تھا جس کو نانا نے قید کیا تھا اس نے جرنیل کے پاس خبر بھیجی کہ بٹھور خالی ہے آپ تشریف لائیے۔ جنرل اس پر عنایت بہت احتیاط کے ساتھ کرتا تھا۔ [2]

---

[1] [illegible] ذکاءاللہ صفحہ ۵۲

[2] [illegible] ۵۲۱

ناقابلِ فراموش

غدر کے سلسلے میں اودھ کی بہت سی تاریخیں، انگریزوں، ہندوؤں اور مسلمانوں نے لکھی ہیں ان میں قیصر التواریخ خاص طور پر اہم ہے۔ یہ تاریخ سید کمال الدین حیدر حسنی الحسینی المشہدی معروف بہ سید میر نادر نے لکھی ہے۔ لکھنے والے میر نادر صاحب ہیں، اور لکھوانے والے مشہور مؤرخ سر ہنری الیٹ ہیں، جو گورنر جنرل ہند کے سکریٹری تھے۔ طبع و اشاعت کا اہتمام سر دگ بجے سنگھ راجہ بلرام پور نے کیا تھا، جو سرکار کمپنی بہادر اور سرکار انگریز بہادر کی وفاداری اور اپنے ملک کی غداری میں مشہور ہیں۔ چھاپنے والا نول کشور پریس ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کتاب انگریزوں کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے، ان کے دفاع میں لکھی گئی ہے باغیوں کو، انقلاب پسندوں کو، جنگِ آزادی کے رہنماؤں کو، نہایت نا ملائم اور ناشائستہ الفاظ میں یاد کیا گیا ہے۔

لیکن اسے کیا کیا جائے کہ لکھنے والا مسلمان بھی ہے، انسان بھی ہے، ہندوستانی بھی ہے لہٰذا انگریزوں کی طرف داری، ان سے تائید و حمایت کے باوجود ایسے واقعات لکھنے پر مجبور ہو

ہو گیا ہے جو ناقابل فراموش ہیں، یہ واقعات مشتمل ہیں، ہندوؤں کی مسلمان بادشاہ سے وفاداری پر مشترکہ مقصد کے لئے، ہندو مسلم اتحاد پر، جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں کی جرأت و بہادری، جاں نثاری اور جاں بازی پر، ہندوستانیوں اور انگریزوں کے ظلم و ستم پر، اودھ پر دوبارہ قبضہ و تسلط کے بعد انگریزوں کی خون آشامی، بربریت اور درندگی پر، اسیر رؤسا اور رئیسوں، شریفوں اور مرحوموں کی بدحالی، آشفتہ روزگاری اور تباہی و بربادی پر۔

کتاب خاصی طویل، ضخیم ہے، میں نے ترتیب کے ساتھ چند ناقابل فراموش واقعات چن لیے ہیں، جو ذیل میں درج کر رہا ہوں۔

راجہ جوالا پرشاد کی وفاداری

واجد علی شاہ لکھنؤ سے روانہ ہوتے ہیں تو مہاراجہ دلراجہ جوالا پرشاد بہ ضعف قویٰ و کبر سنی کان پور تک ساتھ چلے گئے لیکن بادشاہ نے کمال عطوفت ہمدردی سے بواسطہ معلم السلطان فرمایا تم ضعیف ہو سفر نہ کرو، حسام الدولہ کے پاس حاضر رہو۔

(قیصر التواریخ جلد ۲ صفحہ ۱۶۲)

مہاراجہ بنارس کا اخلاص

قبل ازیں دو نگر بکمال لطف و اخلاق عرض داشت مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ بہادر مہاراجہ بنارس سنحر اقدس سے گزری کہ فدوی محض خیر طلب و موروثی ہے اور ممنون تہ دل اس خاندان عالی شان کا ہے۔ امیدوار مرحمت خسروانہ ہے کہ حضور بنارس میں اس اک خیر اندیش میں رونق افروز ہوں۔

ہاتھیوں کے آنسو

شاہان چہ عجب گر بنوازند گدا را

واجد علی شاہ کے کلکتہ جانے کے بعد

(صفحہ ۱۶۹ ایضاً)

اکثر ہاتھیوں کو وقت نیلام سر پر خاک اڑاتے اور آنسو آنکھوں سے بہاتے دیکھا اکثر صاحبوں کو تعجب ہوتا تھا۔ فیل بانوں نے کہا ہم تیس برس سے نوکر ہیں یہ شل ہمارے خاک اڑاتے اور روتے ہیں۔

(صفحہ ۱۷۱ ایضاً)

کتب خانہ پھکوادیا

میجر کارنگی نے ایک دن سارا کتب خانہ جو فرح بخش کی الماریوں میں بہ ترتیب تھا، باہر نکلوا کر پھکوا دیا

(صفحہ ۱۸۲)

ہائے ری بے بسی

ایک دن حکام نے مچا ہا کہ درگاہ حضرت عباس میں جو اسباب سونے چاندی کا ہے اسے بھی ضبط کریں۔ مفتاح الدولہ نے عرض کیا تصرف مال وقف جائز نہیں، مگر ازراہ حکومت اختیار ہے

(صفحہ ۱۸۷)

پھانسی

پہلے دن شام کو صوبہ دار اور شیخ کو مچھی بھون سے باہر لائے۔ نقار خانے کے جو خانہ میں پھانسی دی، ایک حلقہ بر قبدار، دوسرا گوروں کا حلقہ محیط چوب پھانسی (دن) عوض بیگ، آغا مرزا اور کئی تلنگوں کو پھانسی دی، عوض بیگ نے کہا میں عیسائی ہوتا ہوں مجھے پھانسی نہ دو، وہ اپنی سزائے اعمال کو پہنچا۔ غرض چودہ آدمی پھانسی دیے گئے

(صفحہ ۱۹۸)

لارنس کو میموں کی صلواتیں

اکثر نیم مجروح نیم جان چھکڑوں پر سوار بھوکی پیاسی اس شدت گرما میں لکھنؤ پہنچ جاتی تھیں لیکن زبان طعن خوب لارنس صاحب پر کھولی تھیں

(صفحہ ۲۰۲)

معصوم انگریز بچہ

کپتان اینڈرسن صاحب نے اپنے رسالہ محاصرۂ لکھنؤ میں لکھا ہے ایک صاحب کا لڑکا چار برس کا حالت اضطرار میں معلوم نہیں کس طرح اپنے ماں باپ سے چھٹ کر ایک بنگلے میں رہ گیا، دو دن اور دو رات بر کمرے میں گھبرا کر جاتا تھا، کبھی ماما کبھی پاپا کہہ کر چلاتا تھا تو، جب طاقت نہ رہی غش کھا کر ایک کمرے گر پڑا، اتفاقاً تیسرے دن ایک نامرد لال کوٹھی کو داخل ہوا، جب نظر اس پر پڑی لوٹ پھول گیا، ایک کندا بندوق اس کے سر پر مارا، جاں بحق ہو گیا

(صفحہ ۲۰۱)

انگریز عورتوں کی درگت

بیبیوں (میموں) کی یہ نوبت پہنچی کہ بھوکی پیاسی پابرہنہ کپڑے پھٹے ہوئے تھے گرد آلودہ بعض بچہ گود میں

نے جس طرف چاہا چلیں، جہاں آدمی کو دیکھا خوف جان سے راہ جنگل کی لی، صاحبان عالی شان کا یہی حال تھا۔ اگر کسی گاؤں میں بیبیاں اس خراب حالت سے پہنچیں زمیندار نے رحم کھا کر ان کو اپنے گھر مہمان کیا، جو حاضر تھا حاضر کیا، صبح کو ایک چھکڑے پر سوار کر کے لکھنؤ پہنچا دیا۔

(صفحہ ۲۰۱)

کمشنر خیرآباد کی ہلاکت

کرسٹن صاحب کمشنر خیرآباد کا بنگلہ کنارِ دریا تھا مع میم صاحبہ گھوڑوں پر سوار ہو کر لکھنؤ چلے، پیچھے سے تلنگوں نے بندوق ماری، زمین پر گر پڑے۔ میم صاحبہ مڑ کر صاحب کی نعش سے لپٹ گئیں۔ دفعۃً ان پر بھی گولی پڑی، اپنے خاوند سے جا ملیں۔

(صفحہ ۲۰۲)

انگریزوں کی بدحواسی

(شاہجہانپور) ڈاکٹر صاحب رات کو ایک زمیندار کے مہمان ہوئے، پانی پیا اور روٹی کھانے لگے، کہنے لگے تین میم ہم سے چھوٹ گئی ہیں، گاؤں میں آئی ہیں، تلاش کرو۔ چوکیدار ان کو ڈھونڈ کر لایک دھوبی کے گھر سے لایا، لیکن اس عرصہ میں صاحب گھبرا کر لکھنؤ کو چلے گئے، بیبیاں چوکیدار کے ساتھ بہزار خرابی لکھنؤ پہنچیں۔

(صفحہ ۲۰۲)

جاں نثار بیوی

ایک روز کمشنر صاحب (فیض آباد) اور حکام مع صاحبان و فرزند میم صاحبہ کے بھاگنے لگے۔ افسران ہندوستانی سے فرمایا: ہم موجود ہیں مار ڈالو یا نکال دو، سب افسران راضی ہو گئے، کشتیوں پر سوار ہو کر چلے، یہ خبر سپاہ باغی نے سنی۔ تلنگے دوڑ پڑے، کمشنر خود طمنچہ مار کر دریا میں کود پڑے، مر گئے، ان کا سگ باوفا بھی دریا میں کود پڑا، مر گیا، واہ ری وفاداری! میم صاحبہ بھی ڈوب کر مر گئیں، باقی اور صاحبوں سے مقابلہ ہوا، مارے گئے۔

(صفحہ ۲۰۳)

پاسِ وفا

سلطان پور ۱۵ رسالے میں کرنل فشر صاحب تھے۔ برکات احمد رسالدار نے صاحب سے عرض کیا جہاں آپ فرمائیں ہم آپ کو بسلامت پہنچا دیں۔ پھر

ہم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ نمک حرام ہو جائیں گے۔

(صفحہ ۲۰۴)

چھاؤنی میں آگ لگادی

ایک آیا چھوٹے لڑکے کو گود میں لئے جاتی تھی ایک نامرد سوار نے گھوڑے گرا کر برچھی کی انی اسے چبھو کر مار ڈالا پھر چھاؤنی میں آگ لگادی۔

(صفحہ ۲۰۴)

صلۂ وفا

کاظم علی خاں کنبوہ تحصیلدار بھاگ کر ملیح آباد چلے گئے۔ اپنی حکمت عملی سے آپ بھی بچے۔ کپتان وٹسن صاحب کو بھی بچایا۔ خزانہ سرکار بیلی گارد میں پہنچایا۔ فی الحقیقت بڑا کام کیا۔ لیکن رفع ہنگامہ کے بعد ان کو پنشن بھی نہ ملی۔

(صفحہ ۲۰۵)

بھگوڑا کپتان

رمضان علی خاں نے کپتان ہیر صاحب سے مخاطب ہو کر شکایت گالی دینے کی کر کے تلوار ماری۔

باقی سوار کپتان گال سے کہنے لگے ہم نے آپ کا نمک کھایا ہے آپ بسلامت چلے جایئے کپتان ڈرانی سے منہ پھیر کر سیدھے لکھنؤ آئے۔ مورد طعن و تشنیع ہوئے۔ اکثر اپنے حال پر رویا کرتے تھے۔

گورے بھاگنا بھی جانتے تھے

صاحبان عالی شان نے گھونگھٹ کھایا اسماعیل گنج میں پناہ لی۔ وہاں جا کے فوج باغی نے گنج کو اپنی پشت پر دیا۔ سامنے بائیں سے توپ چلنے لگی۔ دو ہے کے پل تک بڑا کھیت رہا۔ لاش پر لاش گرنے لگی۔ کپتان اینڈرسن لکھتے ہیں ۱۱۱ گورے جان سے مارے گئے۔ صاحبان عالی شان بگٹٹ بھاگے۔ دفعتاً بیلی گارد پہنچے پھر کسی نے پیچھے پھر کر نہ دیکھا۔

(صفحہ ۲۱۳)

کپڑا تک نہ چھوڑا

جب عملداری سرکار ہوئی، کارنگی صاحب آئے جتنا مال نواب حشمت الدولہ کا تھا سب لے کر چلے گئے۔ تقریباً کئی لاکھ روپے کا سامان تھا وہ اس وقت لنگی باندھے بیٹھے تھے کپڑا تک نہ چھوڑا۔

(صفحہ ۲۱۹)

لارنس کی ہلاکت

جنرل لارنس چیف کمشنر ریذیڈنسی میں مصروف تحریر تھے کہ دفعتاً ایک گولہ دونوں پاؤں پر سے ہو کر گوشت اعصاب لیتا چلا گیا۔ اس صدمہ ناگہانی سے ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو صاحب نے انتقال کیا موقت آخر گبنس صاحب کو اپنا قائم مقام کیا۔ بعد ہفتہ عشرہ آمنی صاحب ڈپٹی کمشنر ایک صبح کو مورچے دیکھتے پھرتے تھے ناگاہ ایک گولی قضا کی آ کے مر گئے۔ محصورین بیلی گارد کی حالت یاس ہو گئی۔ میجر بنگ نے چیف کمشنر گبنس صاحب کو قبول نہ کیا۔ کس واسطے کہ وقت محاربہ صاحب فوج سزاوار عہدہ جلیلہ ہوتا

(صفحہ ۲۳۱)

انگریزوں کے ہندوستانی جلوس

ہر روز گوئندے بیلی گارد کے پکڑے جاتے تھے اگرچہ تبدیل لباس وضع صورت سے ہوتے تھے اور انگریزی چٹھی نئے ڈھنگ سے چھپا کر اپنے پاس رکھتے تھے

(صفحہ ۲۲۹)

بابو پورن چند

نواب شرف الدولہ نے بابو پورن چند سے عرضداشت زبانی شاہ کو لکھوائی۔

(صفحہ ۲۴۰)

پہلے نقدی لی پھر پھانسی دی

شکست ماناراؤ صاحب ۱۶ جولائی ۱۸۵۷ء کو ہوئی اور صاحبان عالی شان نے بندوبست شہر کانپور کا کیا۔ جسے پایا بے تحقیق سرکاری نے بے تکلف پھانسی دے دیا۔ کئی ہزار کی نوبت پھانسی کی پہنچی۔ اکثر اپنے تئیں بے قصور جان کر رہ گئے۔ نہ بھاگے۔ ہزار ہا لوگ گرفتار ہو کر پھانسی دیے گئے۔ از انجملہ اعظم علی خاں کو بالاتفاق لوگ بے قصور کہتے ہیں۔ انگریزوں نے پہلے جو کچھ دیا تھا جنس سے لیا بعد اس کے پھانسی دی۔ اب سرکار سے از راہ عدالت کو ضرور ہے ان کے عیال کے نام بھیجے دے کہ اپنی بسر اوقات کریں۔

(صفحہ ۲)

فتح پور کا صفایا

فتح پور میں پھانسی شروع ہوئی وہاں کی رعایا اور تمام بستی ... نے اول آپ بلا تامل ہر دھری بنا سنگھ کے ڈاکٹر صاحب کی سفر ...

الہ آباد میں سات ہزار کو پھانسی

الہ آباد میں سب سے زیادہ پھانسی دی گئی کہ ایک مولوی نے محمدی جھنڈا اٹھا کے تمام رعایا کو باغی بنا دیا۔ بہیر جہاد پر کمر باندھ کر مقابلہ کیا، مثل مشہور ہے کمزور مار کھانے کی نشانی ہے یعنی ہم مقابلہ بمسر کا سے کرتے ہیں آخر فوج نے ان سب کا ستیاناس کر دیا، گرد شہر کے آگ لگا دی بعد تسلط ساتھ ہزار کو پھانسی دی، بعض اولو العزم اپنی حماقت سے لکھنؤ کمک لینے چلے مگر قضائے الخبیر، جانے نہ دیا کہ میں خود تمہارے پاس حاضر ہوں اتنی دور کا ہے کو تکلیف اٹھا کر آتے؟

(صفحہ ۱۷۲)

کانپور میں ہزاروں کو پھانسی

کانپور میں تین ہزار نے پھانسی پائی، ہزاروں بھاگے ازاں جملہ ایک سقہ رہنے والا لکھنؤ کا ایک شخص کے گھر میں چھپ رہا، بعد کئی دن کے صاحب خانہ نے کہا، تم میرے گھر سے چلے جاؤ ایسا نہ ہو کوئی مخبر خبر کر دے۔ یہ سقہ مضطر ہو کر نواب گنج کی سڑک پر چلا جاتا تھا۔ اتفاقاً ایک صاحب (انگریز) نواب گنج سے آتا تھا، پوچھا کون ہے؟ کہاں جاتا ہے؟ کہا لکھنؤ میں احمد علی کی سبیل پر نوکر تھا، فرخ آباد میں میرا بھائی ہے اسے دیکھنے جاتا ہوں۔ کہا تو جھوٹ کہتا ہے راجا (نانا) کا نوکر تھا، ہر چند اس نے عذر کیا مگر انگریز نے اسے گوروں کے حلقہ میں دیا، کہا تیری قوم مسلمان نے ہمارے میم بچوں کو مار ڈالا ہے، اس نے کہا میں نے تو نہیں مارا؟ کہا ہم تمہاری سب قوم کو پھانسی دیں گے، ایک کو بھی نہ چھوڑیں گے اگر تیرے خدا میں کچھ طاقت ہوگی ہماری قید سے چھڑا لے گا، اس نے کہا اب میرا آسرا اور بھروسا خدا ہی پر ہے۔ غرض اس کی مشکیں باندھ نیچے درخت کے بٹھا دیا، کھانا پانی چھوڑ دیا۔ تیسرے دن مینہ شدت سے برسنے لگا۔ لگل کوچ کا ہوا جتنے گورے سکھ تھے متوجہ تیاری سفر ہوئے اس وقت سقہ نے منہ اپنا آسمان کی طرف اٹھایا اس کے ہاتھ کی رسی ڈھیلی ہو کر گر پڑی، یہ بہ ہزار خرابی شیشم کے درختوں پر چڑھ کر ایک ٹہنی سے لپٹ کر بیٹھ گیا جب گورے

آکر ڈھونڈنے لگے نہ ملا۔ مایوس ہو کر چلا گیا۔ (صفحہ ۲۵۱

دغا کانپور سے جب فوج بھاگ کر آئی تو ممو خاں کو بتایا گیا:۔
جتنی فوج کانپور سے بھاگ کر آئی ہے انہیں دغا ہے انگریز نے انہیں اپنی فوج ملادی ہے
کہ تم پہلے بھاگو تو فوج از خود بھاگ جائے گی۔ (صفحہ ۲۵۶

بہادر صوبہ کھا صوبہ سنگھ کی پلٹن خوب لڑی انگریزوں کے اس معرکہ میں ہزار سے زیادہ
آدمی مارے گئے۔ (صفحہ ۲۶۰

راجہ مان سنگھ کی بہادری مان سنگھ نے لڑائی میں ایک معرکہ سر کیا تو:۔
جناب عالیہ نے راجہ مان سنگھ بہادر کو اس جاں نشانی و
جاں نثاری پر خطاب فرزندی دیا، خلعت، دوشالہ، رومال اور ملبوس خاص اپنا دوپٹہ عنایت کیا انکی
بہادری کی بہت تعریف کی اور فرمایا بعد فتح بہت سا روپیہ جاگیر دے کر خوش کروں گی الخ انہوں نے
عرض کیا، میں قدیم نمک خوار اس سرکار کا ہوں، میں بھی چاہتا ہوں کہ روبرو تے
حضور تصدق ہو جاؤں اور حق نمک ادا ہو (صفحہ ۲۶۷

وادِ مردانگی دیکر مارے گئے میر محمد علی خاں داروغہ توپخانہ، مرزا امام علی بیگ
صوبہ دار توپ خانہ اپنا لے کر حسب سے مستعد کھڑے
تھے کہ دفعتاً سامنے سے ہزار گوروں کا نمودار ہوا۔ گورے مثل عقاب جھپٹ پڑے، مثل
باد صرصر آ پہنچے، گولہ انداز سب بھاگ گئے، مگر یہ دونوں افسر اپنی تھوڑی سی فوج سے
داد مردانگی دے کر مارے گئے۔ (صفحہ ۲۶۸

سب مارے گئے انگریزوں کے داخلہ لکھنؤ کے وقت:۔
غلام حسین کی مسجد پر بخش خاں سگے بھائی ہادی حسن خاں، زمیندار
اپنے جاں نثاروں کے ساتھ وہاں تھے، مقابلہ ہوا خوب تلوار چلی، خون ناحق ندی اسکے گھر
میں بہا۔ آخر وہیں لڑ بھڑ کر سب مارے گئے ایک نام کر دیا، اس معرکہ میں پانچ سو ہر

مارے گئے، سوار بھر کے۔

رعایا نے ڈھیلے مارے

جب گوہر سے برف خانے کے پل کے قریب سے گنج دولا حسینی پر پہنچے، جنرل اڈرم یہ رہبری پورن داروغہ چلے آئے دونوں نے مکر قندہاری بازار کی راہ لی برف خانے کو آگ لگادی، راہ میں جو سامنے آیا تہ تیغ کیا، رعایا نے ڈھیلے پتھر مارے گوروں نے آگ لگائی چھاؤنی کو جلادیا۔

راجہ مان سنگھ گڑھ سے جب راہ میں مقابلہ ہوا، خوب لڑے، ملک ہ کے خاص بہاروں نے کوٹھوں پر چڑھ کر خوب گولوں کا برسایا۔ (صفحہ ٢٢٩)

ڈہاڑی کا بہادر لڑکا

انگریز فوج جب لکھنؤ میں داخل ہوئی:۔ بشیر الدولہ کے دروازے پر ایک ڈہاڑی کا لڑکا خدا بخش نام اور ایک سپاہی ملازم اور ایک خلاصی نے مل کر توپ مارنی شروع کی، جو گورا چوپٹ کا ہمعبل سے آتا تھا اسے نشانہ کرتے تھے، یہاں تک گراپ مارے کہ گوروں کو نہ آنے دیا (صفحہ ٢٦٩)

پانچ سو بہادر

پانچ سو نجیبوں نے بڑی جرات سے مقابلہ کیا وہ مارے گئے۔

(صفحہ ٢٦٩)

ایک لڑکے نے گوروں کو بھگا دیا

ایک لڑکا جوان سید زادہ فقط اپنی ہتوڑی سے توپ کے تخت کے نیچے چھپ گیا۔ جب گورے سامنے آئے۔ اس لڑکے نے توپ کو داغا کئی گورے گر پڑے (رباقی) اُلٹے پاؤں موتی محل کو پھسر گئے۔

(صفحہ ٢٧١)

دو سو بہادر کٹ گئے

قریب مکان عظیم اللہ خاں کپتان بارو کی پلٹن کا مقابلہ ہوا، خوب لڑائی ہوئی، دو سو تلنگے پچاس گورے مارے گئے (صفحہ ٢٧١)

اوڈرم بیلی گارد میں

جنرل اوڈرم داخل بیلی گارد ہوا تقریباً دس ہزار بدمعاش دریا میں ڈوب کر مر گئے بیس ہزار سوار وپیدل، رعایا نے شہر سے

بھاگ کر دس کوس پر دم لیا۔ (صفحہ ۲۷۲)

حق نمک سے ادا ہوئے

گوروں سے مرزا سکندر حشمت کی ڈیوڑھی پر آئے اب پاہیوں نے یکایک بند کر لیا طرفین سے گولی چلنے لگی، صاحب میر ظلو وغیرہ امر تقی خاں، میر صفدر علی، میر نواب مخدوم بخش تمندار وغیرہ یہ سب مارے گئے، حق نمک سے ادا ہوئے (صفحہ ۲۷۲)

احمد اللہ شاہ کے بارے میں انکشاف

۲۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شاہ جی کو خبر ہوئی گورے بیلی گارد میں چلے گئے۔ تو تکیہ وتنہا اٹھا، کہا میں اکیلا دھاوا کر دوں گا۔ یہ کہہ کر موتی محل میں گیا ایک مردہ گورے کا سر کاٹ لیا، جب فوج نے سنا شاہ صاحب نے اکیلے دھاوا کیا ہے پیچھے سے پہنچی شاہ جی کے ہاتھ میں سر تھا، لاف زنی کرنے لگا، فوج میں چرچا شاہ جی کی کرامات کا ہونے لگا، تلنگے شل جہلاء تمنوت کرنے لگا، سوار اپنا مرشد ایمانی جاننے لگے، شاہ جی نے جوش و خروش میں یہ شعر پڑھا:۔

چوں شود در جہاں نیاں احمد و بدعت رار واج
شاہ غزنی بہر قتلش خوش عنان پیدا شود
درمیان ایں وآں گردد بسے جنگ عظیم
قوم عیسیٰ را شکست بے گماں پیدا شود

وہ شاہ غزنی میں ہوں میرا کوئی ہمسر نہیں، برجیس قدر کیا ہے، شاہ ولی میرے رتبہ سے کم ہے، مجھ کو حکم اللہ ہے میرے ہاتھ یہ فرقۂ انصاری تباہ ہوگا، میں ظل اللہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہوں، پھر چوب دار کو حکم دیا، ممو خاں کے پاس جاؤ کہ اب بھی آنکھیں کھول کر ہوش میں آؤ، اگر تم چاہتے ہو سر گوروں کے بوٹ سے بچے اور بیلی گارد ہاتھ آجائے، چار توپیں اسپی، پانچ ہزار روپیہ نقد دعوت فقرا بھیج دو، برجیس قدر میری اطاعت کرے، بیگم میری بیعت کرے، چوب دار نے ممو خاں سے کہا، شدہ شدہ یہ خبر جناب عالیہ تک پہنچی، انھوں نے مفتاح الدولہ، شرف الدولہ، ممو خاں، میر واجد علی کو بلایا، سب نے کہا شاہ جی کوئی امام نہیں، یہ سب باتیں کفر و الحاد کی ہیں (صفحہ ۲۷۰، ۲۷۱)

کمانڈر انچیف زخمی ہوئے

گوروں نے سکندر باغ لینے کا ارادہ کیا، خورشید منزل سے گورے اور گولی مار پڑنے لگی گوروں نے بہادری سے سکندر باغ

گھیر لیا، تلنگے گھر گئے، بڑا کھیت پڑا ۲۲۱ افسر ہندوستانی جان سے مارے گئے ۲۵ زخمی و نیم جان ہوئے، ۱۶ نومبر ۱۸۵۷ء سے ۲۰ تک ۱۱۰ افسران مرے ۳۲۳ زخمی ہوئے، کمانڈر انچیف بھی زخمی ہوئے اور جرنیل صاحب کے بھی گولی لگی۔

(صفحہ ۲۸۵)

غیر ملکیوں کے ملکی جاسوس

گوئندے انگریزی روز پکڑے جاتے تھے زر نقد روپیہ اشرفی ان کے پاس ہوتا تھا اکثر تلنگے جھنجھلا کر گولی مار دیتے تھے۔

(صفحہ ۲۵۸)

غدار تعلقہ دار

مہاراج بال کرشن نے بنظر خیر خواہی سرکار انگریزی تعلقداروں کو رخصت کرا دیا۔ اس حیلے سے اگر یہ لوگ اپنے علاقہ پر نہ جائیں گے زر تحصیل کیونکر ہوگا؟

(صفحہ ۳۱۵)

مثل عقاب

ایک شہسوار نے پرے سے نکل کر سواروں سے کہا تم میں سے کون ایسا ہے جو اس پار جا کر صاحب کا سر لائے۔ سب چپ ہو رہے، اس نے پکار کر کلمۂ شہادت پڑھ زیر بند گھوڑے کا کاٹ ڈالا، دریا سے مثل عقاب صاحب کے سر پر پہنچ کر پہلے گولی گھوڑے کو ماری، صاحب نے دونالی بندوق سر کی، اس نے طپنچہ مارا، صاحب آ پڑے۔

(صفحہ ۳۳۱)

خون کی نہر

گورے باغ پر پہنچے، کلہاڑوں سے پھاٹک توڑ داخل باغ ہوئے، چاندی کی بارہ دری کے صحن میں نشان فتح گاڑ دیا، افسر بارہ دری میں کرسی پر بیٹھے، بڑی دھوم مچائی ہزار ہا ملازم نمک حرام ہو کر مل گئے، خان علی خان اس وقت داخل ہو گئے تکیہ بو علی شاہ پر کسی گوئندے کے بہکانے سے تھوڑی دیر تک رک رہے تھے بہرحال گوروں سے باغ میں خوب گھمسان ہوا ہر روش چمن پر نہر خون کی جاری تھی، ہر طرف لاش کا انبار تھا، گورے سمٹ کر سنگین بارہ دری میں بند ہو رہے، پیچھے سے جنگ بہادر کی فوج نے آ کر باڑھ ماری، سیکڑوں گر پڑے، خان بھی زخمی ہو گئے۔

(صفحہ ۳۳۳)

وفادار اب بھی وفادار تھے

انگریزوں نے لکھنؤ فتح کر لیا، حضرت محل لکھنؤ سے باہر نکلیں اور بعد کے راجہ احمد آباد راجہ نواب علی خاں کے گھر میں مہمان ہوئیں پھر بونڈی راجہ منوا کی گڑھی میں رہیں، وہاں وکیل راجہ ہر دت سنگھ حاضر ہوا عرض کی کہ ہم آپ کے بحال

شریک و فریق برادر ہیں۔ پھر وہاں سے وکیل کے ساتھ داخل بونڈی ہوئیں اور بتہیہ انتظام ممالک محروسہ اور حکمرانی ہوئیں۔ چند روز میں جتنے لکھنؤ سے بھاگے تھے اندرونی و بیرونی مع سپاہ تلنگی جمع ہو گئے اور ملازمین قدیم و جدید وغیرہ آپہنچے اور جتنے اہل حرفہ اور اہل بازار تھے مع اجناس از خود جمع ہوئے۔ مثل لکھنؤ چوک آباد ہو گیا اس کے سوا زمینداروں اور تعلقہ داروں نے بلا طلب زر تحصیل بھیجنا شروع کیا اس زر تحصیل کی عدم رسی پر کیا کیا لڑائی اکثر ہار گئی تھی اس امر میں سب کو استعجاب تھا کہ ایسے وقت انتشار و مایوسی و قطع امید میں اس طرح آمدنی کا بے منت پہنچا۔ غرض اس مدت قیام میں جتنا سامان سلطنت شاہی تھا اور اسباب لوازمہ ریاست سب طرح کا موجود ہو گیا بلکہ اکثروں کے پاس جو اسباب سلطانی کسی طریق سے ہاتھ آ گیا تھا انھوں نے بے مطلب سرکار میں دیدیا۔ ہر شخص اپنے واسطے اس انبوہ کو صورت عافیت سمجھتا تھا اور پچھلی مصیبتیں جو لکھنؤ یا میان راہ ہر طرح سے پائی تھیں دل سے بھلا دی تھیں اور بازار مثل چوک لکھنؤ ہو گیا تھا۔ (صفحہ ۳۴۸)

ہندو اور مسلمان دوش بدوش

راجہ بینی مادھو بخش نظامت بیسواڑے مستعد برسرگرم قتال و جدال ہے سلون میں شیخ فضل عظیم خاں میر مہدی حسن خاں نظامت سلطان پور میں، مقرب الدولہ میر محمد حسن خاں نظامت گورکھپور میں اور مختار الملک خاں علی قسمت خیر آباد میں، مولوی محمد خاں سندیلہ میں اس شرط پر گئے تھے کہ یا فتح کر دنگا یا مارا جاؤں گا۔ چنانچہ اس معرکہ سے منہ نہ پھیرا۔ پانچ ہزار مرنے والے سر فروش ساتھ تھے داد مردانگی دے کر خوب لڑ بھڑ کر نام کر گئے۔ گونیا صاحب اس معرکہ میں زخمی ہوئے یوسف خاں بھائی ممو خاں کے سپہ سالار فوج ہو گئے۔ نواب گنج میں فوج انگریزی سے مقابلہ ہوا راجہ بلبھدر سنگھ نے نام و نمود سے اس لڑائی میں مارا گیا۔ (صفحہ ۳۴۸ ۔ ۳۹)

وفادار زمیندار

نظامت بہرائچ میں کاظم حسین خاں، تجمل حسین خاں زمیندار جبودا مہوا، راجہ دیبی بخش گونڈے میں، گلاب سنگھ ماہیدرا و ربجے سنگھ راجہ بھوناز بہت سنگھ راجہ رہیہ راجا مادھو بخش بہادر، چودھری مصاحب علی، اندی کولی، جوت سنگھ راجہ چردا یہ سب ہر جگہ

لڑتے رہے جب تاب مقابلہ نہ سکے لونڈی میں جمع ہوئے پس اگر انصاف سے دیکھئے زمینداروں کی طاقت کہاں اور مقابلہ کس کی فوج سے تھا؟

(صفحہ ۳۳۹)

حضرت محل نیپال میں

کمانڈر انچیف جنرل کلائیڈ بہادر فوج قاہرہ لیکر لکھنؤ سے لونڈی پہنچے فوج جنگی مع زمینداروں و تعلقداران خوب لڑی جب فوج انگریزی نے دھاوا کیا نہ ٹھہر سکی حدود نیپال میں جنگل میں متفرق ہوگئی، جنگ بہادر نے جابجا گھاٹیوں پر پہرے بٹھا دیئے تھے مگر اس قافلہ مور و ملخ کو نہ روک سکے، اس وقت جناب عالیہ کوہ بٹول پر جہاں نواب آصف الدولہ کی یادگاری ابتک بنا ہوئی ہے پہنچیں، جنگ بہادر کا خط کپتان ترجمن مانجھی کی طرف آیا کہ انگریزوں سے صلح کیجئے یا نیپال رہنا اختیار کیجئے ہم سے توقع کسی امداد و اعانت کی نہ رکھیے

(صفحہ ۳۴۰)

عورتیں کنوؤں میں کود گئیں

انگریزوں کا لکھنؤ میں داخلہ۔

کوچہ بہ کوچہ قیامت برپا تھی، عورات پردہ نشین یہاں ہجوم ہوا تھا عام ہر طرف سے بم کا گولہ برس رہا تھا، گوروں نے جو سامنے آیا مارا عورات صاحب غیرت اور لڑکیاں بن بیاہی گوروں کی صورت دیکھتے ہی کنوؤں میں گر کر مر گئیں

(صفحہ ۳۴۶)

لکھنؤ دو دن تک لٹتا رہا

صاحبان عالی شان بہ فتح فیروزی داخل لکھنؤ ہوئے دو دن تک شہر برابر لٹتا رہا، سوائے گولی دروازہ کے جہاں مہاجن بستے تھے اور سعادت گنج بھی بچا شاید کوئی صورت عافیت مہاجنوں نے نکالی جو سکھ نیپالی اور گوروں سے کوئی جگہ نہ بچی تھی

(صفحہ ۳۴۶)

شریف عورتوں کی آبروریزی

درگاہ حضرت عباس میں کئی سو عورات پردہ نشین جاکر چھپی تھیں گوروں کے ہاتھ سے بہت آبروریزی ہوئی

(صفحہ ۳۴۶)

درگاہ کا اسباب لوٹ لیا

اسباب درگاہ کا سب لُٹ گیا، زیورات سونے کے ایک مہاجن نے چوروں کے ہاتھ سے روپیہ تولہ خرید لیا اور اسباب بھی اسی طرح بکا

(صفحہ ۳۹۶)

مالِ مفت دلِ بے رحم

بادشاہ باغ جو راجہ بختاور سنگھ کے اہتمام میں ۳۵ لاکھ میں تیار ہوا تھا، ۲۵ ہزار میں راجہ کپور تھلہ نے مول لے لیا، دل آرام کی کوٹھی بھی خریدی، قیصر باغ تعلقہ داروں کو تقسیم ہوا، چونکھی جو حضرت سلطان عالم نے اعظم الدولہ سے چار لاکھ کو لی تھی، نیلام ہوتی تھی، ۱۲ ہزار کو گئی۔

(صفحہ ـ ۳۵۳)

تصویر کے دو رُخ

جب انگریز مظلوم تھے ـــــ جب انگریز ظالم بنے

غدر جب شروع ہوا تو انگریز مجبور و مظلوم تھے، غدر جب فرو ہوا، تو انگریز ظالم اور ستمگر بن گئے ظلم اور ستمگری کی یہ تاریخ دلچسپ بھی ہے، عبرت انگیز بھی اور سبق آموز بھی!

غدر کی ذمہ داری صرف انگریزوں کے پندار و نخوت، بے تدبیری، اور عوام کے استحصال، جبر اور سزا کی پر عائد ہوتی ہے انھوں نے اپنے قبضہ اور تسلط کے دور میں کوئی ظلم ایسا نہیں تھا جو خستہ جان اور خستہ تن عوام پر روا نہ رکھا ہو انھوں نے صرف روپیہ پیسہ ہی نہیں لوٹا، دولت ہی نہیں سمیٹی، اناج اور غلہ کے انبار ہی نہیں چھینے، انھوں نے تمدن کچلا، انھوں نے دل توڑے انھوں نے ذہن و دماغ کو دلدل میں تبدیل کردیا عزت نفس پامال کی، انھوں نے آبرو اور عزت اور ناموس پر ڈاکہ ڈالا۔

لیکن محکوم اور حاکم کا تہذیبی فرق دیکھیے، عوام کے ہاتھ میں جب حکومت عارضی طور پر آئی، تو وہ بے حد مشتعل تھے اور کوئی شبہ نہیں اس اشتعال کے باعث ننگ انسانیت

حرکتیں بھی ان سے سرزد ہوئیں، انھوں نے مظالم بھی کیے، انگریزوں کو مارا اور کاٹا بھی، اور ہمیں تسلیم کرنا چاہیے، یہ حرکتیں کسی درجہ میں بھی قابل ستائش نہ تھیں لیکن جب انگریز پھر برسر اقتدار آئے، تو انھوں نے سارا اگلا پچھلا حساب بیباق کرلیا۔ سارے مظالم کا بدلہ سود در سود بمیت وصول کرلیا، انگریزوں کے مظالم پر آسمان تھرا گیا، زمین کانپ اٹھی، قیامت لرز گئی، شقاوت نے سر جھکا کیا، سفاکی، خوں آشامی، درندگی اور بہیمیت نے اپنا عجز تسلیم کرلیا۔ چنگیز اور ہلاکو کی روحیں، عالم بالا پر تڑپ اٹھیں۔

اس باب میں ہم یہ بتائیں گے کہ غدر کے دوران میں انگریزوں پر جو مظالم ہوئے اور غدر فرو ہونے کے بعد انگریزوں نے جو بے پناہ مظالم، ناکردہ گناہ لوگوں تک پر روا رکھے انکی نوعیت کیا تھی؟ اور اگر دونوں طرف کے مظالم ترازو کے دو پلڑوں میں رکھے جائیں تو کونسا پلڑا جھکیگا؟ مقصد کسی کی رعایت یا جانبداری نہیں ہے۔ صرف حقیقت واقعہ اور احوال واقعی کا اظہار ہے۔ پہلے ہم دوران غدر کے واقعات کا جائزہ لینگے، پھر بعد از غدر کے سانحات وحوادث پر ایک نظر ڈالیں گے۔

غدر سے پہلے اور غدر کے بعد سب سے زیادہ مظالم مسلمانوں پر

ایک وفادار مسلمان

ہوئے، اسلئے وہ حاکم قوم سے بیحد متنفر تھے لیکن غدر کے دوران میں بھی جب وہ انتہا مشتعل تھے، انسانیت وشرافت کا دامن انھوں نے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

آگرہ سے مشرق میں اٹھتر میل کے فاصلہ پر مین پوری ہے وہاں ہندوستانی پیدل پلٹن کا ایک حصہ تھا، لفٹنٹ کرافورڈ اسکے کمانڈر تھے۔ ۲۲ مئی کو علی گڑھ کی سپاہ کی بغاوت کی خبر مین پوری میں آئی، مسٹر کوپ مجسٹریٹ نے مسٹر آرتھر کوکس سے صلاح ومشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے؟ ان دونوں کی یہ صلاح ہوئی کہ لیڈیوں اور بچوں کو آگرہ اور سپاہیوں کو مین پوری سے باہر بھگاؤں کو روانہ کیا جائے۔

دوسرے دن صبح کو مسٹر جی۔ این۔ یور اسسٹنٹ مجسٹریٹ عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر آگرہ روانہ ہوئے۔ وہ ایک منزل جاکر عورتوں اور بچوں کو ایک مسلمان کے حوالہ کرکے مین پوری چلے آئے اور مسلمان نے عورتوں و بچوں کو آگرہ پہنچادیا۔[1]

جاں نثار فیل بان، محمد

ایک انگریز تاجر کا فیلبان مسلمان تھا جسکا نام محمد تھا، اس خاندان کو غیر معمولی تباہیوں سے دوچار ہونا پڑا، لیکن محمد نے آخر وقت تک اپنی زندگی کی آخری سانس تک جادۂ وفا سے سر مو انحراف نہیں کیا، انگریز تاجر کی بیوی اپنی خود نوشت میں لکھتی ہے کہ محمد نے اسے ایک گھر میں چھپا دیا یہاں جب خطرہ بڑھا تو اس نے اطمینان دلاتے ہوئے اپنے آقا کی بیوی سے کہا:۔

تم کو زیادہ پریشان نہ ہونا چاہیے۔ رحمت خدا پر نظر رکھو۔ باغیوں نے ابھی ان ہی لوگوں کو قتل کیا ہے جو شہر کے اندر تھے۔ باہر کے گروہ پر ابھی قبضہ نہیں پایا۔ یقین ہے کہ انگریزی فوج جلد مجتمع ہوکر نہایت قوت و سطوت کیساتھ دہلی پہنچنے والی ہے۔ ان سے باغیوں کو قرار واقعی سزا مل جائیگی اور تم سب لوگ آزاد ہو جاؤ گے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ جبتک میری جان میں جان ہے۔ تمہاری رفاقت سے ہرگز منہ نہ موڑونگا۔ اور تم کو اس ورطۂ ہلاکت میں تنہا نہ چھوڑونگا۔ ہاں اگر میں قتل کرڈالا گیا، تو مجبوری ہے۔ اس گھر کا مالک علی میرا ہم مذہب اور خاص دوست ہے خفیہ طور پر اس بات کو جانتا ہے کہ تم لوگ یہاں پوشیدہ ہو لیکن وہ اس کو زبان پر نہیں لاتا اور تجاہل عارفانہ کررہا ہے۔ آج صبح میری اور اسکی جب ملاقات ہوئی تو اس نے کہا کہ میں ان لوگوں کو صرف ۲۴ گھنٹہ اور اپنے گھر میں پناہ

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۷۰۳

دے سکتا ہوں۔ اس مدت کے گزرنیکے بعد ان کو یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اسکا ذرا غم نہ کرو اور کوئی خطرہ دل میں نہ لاؤ۔ انشاءاللہ میں اس ۴۸ گھنٹے کے اندر ہی تمھارے لئے کوئی دوسری پناہ کی جگہ تلاش کئے دیتا ہوں۔ بلکہ اس فکر میں، تو ابھی جاتا ہوں۔[1]

جو کہا تھا وہ کر دکھایا

محمد فیلیبان نے اپنی وفاداری اور جاں نثاری کے سلسلہ میں جو کہا تھا وہ کر دکھایا، اس خاندان کو وہ ایک اور گھر میں ایک عورت کے ذریعہ لیگیا پھر کوئی مستقل جائے پناہ تلاش کرنے کیلئے نکلا، مگر پھر واپس نہ آسکا، راہ وفا میں قربان ہو گیا۔

"وہی عورت جو ہم کو یہاں لائی تھی، اندر داخل ہوئی۔ اُس وقت کیا بتاؤں کہ خوشی میں میرا کیا حال تھا۔ جھٹ اُٹھ کر دوڑی اور اسکا بازو پکڑ کر پوچھا "ہمارا فیلیبان کہاں ہے؟" یہ ہندوستانی عورتیں انگریزوں کی جو خدمتگاری کرتی ہیں۔ بقدر ضرورت انگریزی کے چند کلمے اپنے مطلب کے اظہار کے لئے طوطے کی مانند یاد کر لیتی ہیں۔ اگر ان سے کوئی طولانی تقریر کی جاتی، تو وہ اس کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتیں۔ لہٰذا اس عورت نے میرے سوال کے جواب میں صرف اتنا ہی کہا کہ وہ گرفتار ہو گیا۔

اس سے زیادہ مطلب حل نہ کر سکی۔ ہاتھ کے اشارہ سے بتایا کہ لوگ اُسے کھینچتے ہوئے لے گئے اور ہلاک کر دیا۔

یہ سنتے ہی زمین میرے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ انسان حالت بدبختی میں بعض اوقات بہت زیادہ اپنا بہی خواہ ہو جاتا ہے۔

---

[1] خانمِ انگلیسی در بلوائے ہندوستان

یہ کس کی لاش تھی؟

یہ انگریز خاندان، محمد کے قتل کے بعد، اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرا، ایک روز راستہ بھول کر، اپنے گھر کے قریب ایک جنگل میں پہنچا، وہاں وہ ہاتھی دکھائی دیا، جس کا فیلبان محمد تھا۔

ہاتھی ہمارے بالکل قریب آگیا اور اپنی سونڈ سے ہم میں سے ایک ایک کو سلام کیا۔ میرے شوہر نے ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے اسکی سونڈ کو سہلایا اور ہندی زبان میں کہا۔ "تو یہاں گیا کر رہا ہے؟" ہاتھی یہ سنکر ہم سے جدا ہو گیا اور درخت کے تنے سے جا لپٹا۔ اپنی سونڈ کو بار بار بلند کر کے ایک لاش پر ملتا تھا جو درخت پر لٹکی ہوئی تھی۔ ولیم نے کہا۔ یہ حیوان بہ سبب اُس اُنس کے جو اپنے فیلبان محمد سے رکھتا تھا اسوقت سے کہ باغیوں نے اس بیچارے کو اسکی آنکھوں کے سامنے قتل کیا اور درخت سے لٹکایا۔ اس درخت کے نیچے کھڑا ہوا ہے اور لاش کے چاروں طرف جا جا کر نالے کرتا ہے۔ شاید یہ لاش سے اسلئے جُدا نہیں ہوتا کہ صحرائی جانور اس کو کھا ڈالیں گے۔

ہاتھی جسقدر بڑے ڈیل ڈول کا ہے اسی قدر زیادہ خوشخو اور صاحب ادراک ہے۔ بلکہ اسکا ادراک تمام حیوانوں سے زیادہ ہے۔ وہ انسان کیطرح نیکی و بدی۔ محبت اور عداوت کا ادراک کرتا ہے۔ دوستی میں غمخواری کے وقت یار و مددگار ہے اور کینہ اور دشمنی کے وقت بلائے جان۔ یہ ہاتھی چونکہ بچہ پکڑا گیا تھا۔ اسلئے فیلبان (محمد) سے بہت زیادہ مانوس ہو گیا تھا اور اس شک نہیں کہ فیلبان مرحوم نے اسکی خدمت بھی بہت کی تھی۔

چونکہ ہاتھی کی قیمت دو ہزار روپیہ سے زیادہ تھی۔ باغیوں نے فیلبان کے قتل کر دینے کے بعد چاہا کہ اسیر قابو ہو جائے مگر یہ قابو میں نہ آیا۔ دن بھر جنگل میں مارا مارا پھرتا اور رات کو اپنے قدیم خدمتگار کی حفاظت کے لئے

اس درخت کے نیچے آجاتا۔

یہ دستگیری کرنیوالے کون تھے؟

غدر اپنی پوری ہولناکی کے ساتھ شروع ہو چکا تھا؛ انگریز قتل کئے جا رہے تھے لیکن اس نازک موقع پر بھی، ان لوگوں تک نے جو انگریزوں کے دشمن اور تحریک بغاوت کے شریک تھے، اپنے انگریز افسروں کی جان کی حفاظت کی:۔

۹ تاریخ کی دوپہر کو تیسرے رسالہ کے افسر قیدی سواروں کے پاس جیلخانہ میں گئے کہ قیدیوں کی تنخواہوں کا حساب کر کے دیدیں۔ تو ان افسروں میں لفٹنٹ ہیوگیف صاحب بھی تھے؛ جب وہ اپنے گھر کو لوٹے جیلخانہ سے آ رہے تھے، تو بعض ہندوستانی افسروں نے ان سے کہا کہ سپاہیوں نے اپنا یہ ارادہ مصمم کر لیا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو قید سے چھڑائیں اور جیل خانہ کے ہندوستانی سپاہیوں کے پہرہ داروں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے کہ ہم اس کام میں ان کے ممد و معاون ہونگے۔

گف صاحب اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور انہیں سواروں کے ساتھ جتنی جلد ممکن تھا۔ پیدل سپاہ کی پریڈ کے میدان میں گئے۔ اس وقت یہاں بلوہ بڑی شدت سے ہو رہا تھا جس کا اوپر بیان ہوا بعض سپاہی وردی اور بعض اپنا ہندوستانی لباس پہنے ہوئے ادھر ادھر تگ و دو کر رہے تھے۔ ناچتے، کودتے، غل غپاڑہ ایسا کرتے تھے کہ انھوں نے کوئی گڑھ فتح کر لیا۔

گف صاحب نے یہ حال دیکھ کر کہ اب بلوہ روکنے پر کوئی اختیار نہ رہا اپنے تینوں سواروں کیساتھ اپنی لین میں گئے تو وہاں انھوں نے دیکھا کہ

لے خانم انگلیسی در بلوائے ہندوستان

سپاہی اپنے گھوڑوں پر زین لگا رہے ہیں اور رجمنٹوں کے میگزین لوٹ کر گولی بارود لے رہے ہیں۔ انھوں نے اس برافروختگی کے فرو کرنے کی کوشش کی ریکروٹوں (رنگروٹ) نے دو گولیاں ان پر چلائیں مگر انکی جان لینے کا سپاہیوں نے عزم مصمم نہیں کیا۔ آخیر کو ہندوستانی افسروں نے ان سے کہدیا کہ اب ہم آپ کی جان بچانے کے ضامن نہیں ہیں۔ اسوقت کیمپ بالکل ابتر تھا۔ گف صاحب مع اپنے معتمد سواروں کے یورپین لین کیطرف گئے انکو راستہ میں آدمیوں کی بڑی بھیڑ ملی جو باہر سے چلے آتے تھے۔ انکے پاس تلواریں اور لکڑیاں اور ہتھیار تھے۔ انکو چھاڑ چیر کر وہ نکل گئے۔ ہندوستانی افسر اور دو سوار انکے پیچھے تھے، انھوں نے صاحب کا ساتھ جب تک نہ چھوڑا کہ آرٹلیری میس صاحب کو نظر آیا۔ تو انھوں نے اپنے گھوڑے کی باگیں تھام کر کہا کہ اب ہم آپکے ساتھ نہیں چلینگے۔ ہرچند صاحب نے انکو اپنے ساتھ رہنے کیلئے کہا مگر ان پر اثر نہیں ہوا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو چھوڑ دیں۔ انھوں نے صاحب کو مودبانہ سلام کیا اور اپنے باغیوں کیساتھ گھوڑے دوڑانے لگے۔ پھر گف صاحب نے ان اپنے دوستوں کی جنھوں نے مصیبت کے وقت میں دستگیری کی تھی، تلاش کی مگر کچھ پتہ نہ ملا۔[1]

انگریز عورتوں اور پادریوں کا لحاظ

بغاوت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ انگریزی حکومت قصۂ ماضی بن گئی تھی، صاحب بہادر عالیشان مع اپنے حوالیوں موالیوں کے گرفتار ہوتے تھے۔ ان پر زیادتی بھی ہوتی تھی لیکن کیا مجال ہے کہ عورت کی بےحرمتی یا پادری کی توہین کی جائے۔ ایک مسلمان گروہ باغیان کا ذکر ہے وہ

۱؎ تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۴۰۴

"باغیوں نے خوب اچھی طرح لوٹ مار کر کے سرائے کے قریب آگ روشن کردی اور مال غنیمت تقسیم کرنے لگے۔ میں تارک الدنیا عورتوں کیساتھ ایک تاریک گوشہ میں بیٹھی انکی یہ حالت دیکھ رہی تھی۔ سردار انکا ایک گوشہ میں خاموش بیٹھا تھا اور ان کے جرم میں شریک نہ تھا۔ اور منع بھی نہ کرتا تھا البتہ جس وقت سپاہیوں نے چاہا کہ بیکس عورتوں کو ستائیں اور پادری کو ایذا دیں تو وہ اس فعل زشت سے مانع آیا ۱؎

وہ مسلمان باغی سوار

بغاوت میں عملی حصہ لینے والے اور انگریزی حکومت کو بیخ و بن سے اکھیڑ دینے کا عزم کرنے والے سپاہی بھی انگریز کے خون ناحق سے' اپنے ہاتھ کو آلودہ ہونے نہیں دیتے تھے:-

انگریزی پیادوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ وہ دشمن کی وسیع لائن پر حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اپنے کیمپ میں ساڑھے آٹھ بجے رات کے واپس گئے۔ باغیوں کی آتشبازی بالکل موقوف ہوئی۔ اس لڑائی میں تین افسر اور ستر سپاہی ۲۵ گھوڑے مقتول' اور سات افسر اور ستر سپاہی مجروح ہوئے اور ۳۵ گھوڑے زخمی اور دو سپاہی گم ہوئے۔ مقتول افسروں میں لفٹنٹ کرنیل ہوں تھے جو جسیںٔ اگرڈبہادر تھے۔ زخمیوں میں برگیڈیر جان ہوپ گرینٹ تھے' انکے گھوڑے کے گولی لگی۔ انکی جان بچانے میں ان کی آئینی رجمنٹ کے دو سپاہیوں نے اپنی جان کا کچھ خیال نہ کیا اور گرینٹ صاحب سے کہا میرے گھوڑے پر سوار ہو جائیے۔ اس سبب سے آپ کی جان بچ سکتی ہے برگیڈیر صاحب لکھتے ہیں۔ اس سوار کی میں بڑی تعریف کرتا ہوں وہ ایک ہندوستانی مسلمان سوار اس رجمنٹ کا تھا کہ جس نے بغاوت کی تھی۔ اسکے

۱؎ خانم انگلیسی در بلوائے ہندوستان

لئے آسان سی بات تھی کہ وہ مجھ کو مار کر دشمن سے جا ملتا مگر اس نے نہایت عمدہ
کام کیا کہ میری جان بچانے کیلئے اپنی جان کی پروا نہ کی۔ میں نے اس کا
گھوڑا نہ لیا مگر میں نے اسکے گھوڑے کی دم کو مضبوط پکڑ کر کہا کہ تو مجھے
اس بھیڑ سے نکال لے جا۔ اس نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے اور جرأت
سے کیا۔ دوسرے دن برگیڈیر نے اس خان کو اپنے خیمہ پر بلایا اور اسکی
بہادری کی تعریف کی اور کچھ روپے اسکے آگے رکھے۔ تو اس خان نے
ایک استغنا کے ساتھ روپے لینے سے سلام کرکے انکار کیا۔ [1]

انگریزوں کی مدد کرنے والے بھی گرداب بلا میں پھنسے

ذیل کا عجیب واقعہ خاص طور پر دلچسپ اور قابل ملاحظہ ہے

مولانا عالم علی مرحوم رئیس مراد آباد جو روہیلکھنڈ کے ایک مشہور عالم اور طبیب
اور نامور محدث تھے۔ انھوں نے چند یورپین عورتوں اور بچوں کو باغیوں کے
ظلم سے بچانے کیلئے اپنے مکان میں چھپا لیا تھا۔ مگر اتفاق سے باغی سپاہیوں
کو خبر ہو گئی اور انھوں نے مولوی صاحب کے مکان میں گھس کر ان سب کو قتل کر ڈالا
مولانا موصوف اس خیال سے کہ یہ حادثہ عظیم ان کے مکان میں گزرا تھا
اور انکا کوئی عزیز یا رشتہ دار ان مظلوموں کے ساتھ نہیں مارا گیا تھا سرکاری
تسلط کے وقت مراد آباد سے کہیں چلے گئے تھے اور حکام ضلع کو انکی تلاش
درپیش تھی اور انکی نسبت یہ گمان تھا کہ باغیوں کے ساتھ انکی ضرور سازش
تھی ورنہ انکے آدمی بھی مقتولوں کیساتھ ضرور مارے جاتے مگر سرسید کو
معلوم ہو گیا تھا کہ مولوی عالم علی محض بیقصور تھے کہ باغیوں کو مولوی صاحب
کوئی وجہ عداوت کی نہ تھی کہ وہ ان کو یا ان کے رشتہ داروں کو بھی مار

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۵۹۱

ڈالتے اور خود ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ باغی سپاہ کا مقابلہ کرتے چنانچہ سرسید نے مولوی صاحب کی بریت کیلئے صاحب ضلع سے باوجودیکہ وہ نہایت برافروختہ تھے بڑی دلیری سے گفتگو کی اور یہ کہا کہ مولوی عالم علی کو میں آپ کے سامنے حاضر کر سکتا ہوں لیکن جبتک آپ وعدہ نہ کریں کہ ان سے کچھ مواخذہ نہ کیا جائیگا۔ اس وقت تک میں ان کے بلانے کی جراءت نہیں کر سکتا۔ آخر صاحب ضلع نے ان سے یہ وعدہ کر لیا کہ ہم ضابطہ کی تحقیقات تو ضرور کرینگے لیکن چونکہ ہمارے نزدیک وہ بیقصور ہیں۔ بعد ضابطہ کی کارروائی کے انکو بری کر دیا جائیگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ سرسید نے مولوی صاحب کو بلا کر عدالت میں پیش کر دیا اور ضابطہ کی کارروائی کے بعد وہ بری کر دیئے گئے[1]

انگریز کا اعتراف

خود انگریز بھی اس حقیقت کے معترف ہیں کہ غدر کے دوران میں اندھا دھند مظالم ان کی قوم پر نہیں کئے گئے:۔

دس دن کے اندر اندر تمام اودھ سے انگریزی حکومت اسطرح غائب ہوگئی کہ ڈھونڈھنے سے بھی اسکا کہیں سراغ نہ ملتا تھا۔ فوجوں نے بغاوت کا اعلان کر دیا اور لوگوں نے بھی اپنے آپ کو آزاد سمجھ لیا لیکن اس تمام عرصہ میں کوئی منتقمانہ کارروائی عمل میں لائی گئی اور نہ کہیں کسی پر ظلم کیا گیا۔ چنانچہ اودھ کے بہادر اور سرکش باشندوں نے سوائے چند مستثنیات کے عام طور پر پناہ گزیں انگریزوں کو نہایت مہربانی اور شفقت سے اپنے ہاں پناہ دی۔ بالخصوص اودھ کے تعلقہ داروں نے تو نہایت فیاضی اور فراخ حوصلگی سے اپنے مفتوح آقاؤں کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کیا۔ حالانکہ اس سے پیشتر انگریزوں کے ہاتھوں سے انھیں متعدد نقصانات اٹھانے پڑے تھے اور وہ کئی قسم

---

[1] حیات جاوید (حالی) صفحہ ۵۷

کی ناانصافیوں کا شکار رہ چکے تھے۔[1]

حقیقت واقعہ | پنڈت جواہر لال نہرو، اپنی تاریخ میں بالکل صحیح لکھتے ہیں:۔

"بہت سی جھوٹی تاریخیں لکھی گئی ہیں جن میں غدر کے واقعات مسخ کرکے دکھائے گئے ہیں۔ ہندوستانیوں کے جو خیالات اس بارے میں ہیں انکو چھپنے اور شائع ہونیکا موقع شاذونادر ہی ملتا ہے۔ ساورکر نے ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ" آج سے تقریباً تیس سال پیشتر لکھی تھی مگر یہ کتاب اسوقت ممنوع کر دی گئی اور آجتک ممنوع ہے البتہ کبھی کبھی بعض منصف مزاج انگریز مورخین نے حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھائی اور اس طرح ہمیں اس زمانے کی قاتلانہ ذہنیت اور نسل پرستی کے جنون کی ایک جھلک نظر آجاتی ہے۔"

"میرے اپنے وطن یعنی الہ آباد کے شہر اور ضلع اور اس کے قرب و جوار میں جنرل نیل کی خونریز عدالتوں (BLOODY ASSIZNS.) کا ذہن چھایا۔[2]

ہر ہندوستانی تہ تیغ کیا گیا | جب انگریزوں نے تلوار سنبھالی تو کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی کسی پر رحم نہیں کھایا، کسی کے ساتھ انسانیت اور شرافت کا برتاؤ نہیں کیا، ایک انگریز اعتراف کرتا ہے:۔

لکھنؤ پر قبضہ کرنیکے بعد قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا۔ چنانچہ ہر ایسے ہندوستانی کو قطع نظر اس سے کہ وہ سپاہی ہے۔ یا اودھ کا دیہاتی۔ بے دریغ تہ تیغ کیا گیا یہاں تک کہ نہ تو کوئی سوال ہی کیا جاتا تھا اور نہ ہی اس قسم کا کوئی تکلف روا رکھا جاتا تھا۔ بلکہ محض سیاہ رنگت ہی اس کے مجرم ہونے کے لئے کافی

---

[1] FOREST ا، I.P.222

[2] DISCOVERY OF INDIA.
By.P.J.NAHRO.

دلیل سمجھی جاتی تھی اور ہلاکت کے لئے ایک رسہ اور درخت کی شاخ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ یا اگر یہ مہربانہ ہوں تو بندوق کی ایک گولی بیگناہ انسان کے دماغ کو چیرتی ہوئی نکل جاتی تھی۔[1]

پھانسی۔ دلدار علی خاں کپتان ساکن دہلی اور مرزا نواب نائب کپتان رسالہ میرٹھ نے جب دیکھا کہ تلنگے بھاگ نکلے۔ تو یہ دونوں بھی بھاگ نکلے۔ میر نواب گرفتار ہو کر آگئے لیکن انکے خسر تحصیل خانے کے داروغہ تھے۔ انکی سفارش سے یہ چھوٹ گئے اور پھر اپنے وطن چلے گئے۔ دلدار علی خاں کی گرفتاری کا اشتہار ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد پانی پت سے گرفتار کر کے لائے گئے۔ ۱۷ جون ۱۸۵۸ء کو پھانسی دے دی گئی۔[2]

یہ انسان تھے یا درندے؟

لکھنؤ پر انگریزوں نے قبضہ کیا۔ تو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے انھیں ہفت اقلیم کا خزانہ لوٹنے کی اجازت مل گئی، یہ حاکم قوم کے فرد تھے، لیکن اپنی حرکتوں سے انھوں نے لیٹروں، قزاقوں، رہزنوں اور ڈاکوؤں کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر رسل لکھنؤ کی لوٹ کا چشم دید حال لکھتے ہیں اس میں کہتے ہیں کہ لوٹ کا حال بیان نہیں ہوسکتا۔ سپاہیوں نے (لکھنؤ میں) مکانوں کے کواڑوں کو توڑا جنمیں زربفت، زردوزی، کمخواب کے لباس، چاندی سونے کے ڈھیر تھے، چاندی کے برتنوں کا انبار تھا۔ طبلے، دوشالے، دوپٹے، دولائیاں، رضائیاں، آلات موسیقی، تصویریں، کتابیں، بیاضیں، بڑے پرتکلف جھنڈے، نیزے غرض اگر ان سب چیزوں کے ڈھیروں کی فہرست بنائی جائے تو وہ ایک

---

1. MAJENDIE. P.195, 196.
2. نفرت نامہ گورنمنٹ صفحہ ۶۳

سوداگر کی دکان کی فہرست اسباب بن جائیگی، ان چیزوں کے لیٹنے کے لئے سپاہی غنیمت کی خوشی سے مست ہو رہے تھے۔ انھوں نے تمام جامہ ہائے زریں میں آگ لگادی کہ ان میں سے چاندی سونا نکال لیں، زیوروں میں سے جواہر اکھیڑے۔ چینی کے برتنوں اور گلاسوں کو توڑ ڈالا۔ تصویروں کو پھینکر آگ میں ڈالا۔ دوسرے اسباب کا یہی حال کیا۔ یہ سارے کام دل بھر شوخی و شرارت کیلئے۔ غرض لکھنؤ پر سپاہ قابض ہوئی تو لوٹ کا عجب تماشا تھا۔ ان مکانوں میں تمام ایشیائی صناعوں کی چیزوں کے اور عیش و نشاط کے اسباب کے خزانے تھے وہ سب خلط ملط پڑے تھے۔ جو سپاہی حریص تھے انھوں نے پوشیدہ مدفون مالوں کو نکال لیا۔ بیش قیمت چیزیں انکے حصے میں آئیں کم قیمت چیزیں بھیڑ بنگاہ کے آدمیوں کے ہاتھ لگیں۔[1]

انگریزوں کے عبرت ناک مظالم

سرسید اعتراف کرتے ہیں کہ:-

لوگوں کو عبرتناک سبق دینے کیلئے نجیب آباد میں بھی انہی مظالم کا اعادہ کیا گیا۔ جو بقیہ ہندوستان پر توڑے جا رہے تھے۔ ۱۹ اپریل ۱۸۵۸ء کو محمود خاں کے چھوٹے بھائی جلال الدین خاں اور سعد اللہ خاں کو نور پور میں پھانسی دیگئی اور ان کا دیوانخانہ بارود سے اڑادیا گیا۔ نگینہ کے باغوں میں چھپے ہوئے لوگوں کو انگریزی فوج نے قتل کیا۔ قاضی محلہ کے سب آدمی مارے گئے۔ دھامپور کی سڑک پر جس قدر بھی آدمی ہاتھیوں پر سوار ملے سب کو قتل کیا گیا۔ خاص باغی دیہات بتادیے گئے تھے کہ وہ بالکل غارت کردیے جائیں۔ اور انہیں باغیوں کے سر لٹکائے جائیں۔[2]

---

[1] تاریخ ہندوستان حصہ سوم (نجات ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۶۱

[2] تاریخ سرکشی بجنور (سرسید)

جانس کی رائے تھی کہ "موت کی سزا طرح طرح کی تکلیفیں دیکر دیجائے مثلاً مجرم کی کھال اتاری جائے، زندہ جلایا جائے۔ پھانسی آسان موت ہے۔ جو مسلمان تنومند یا وجیہہ تھے انکو پکڑ کر کوتوالی پہنچایا گیا بہت کم ایسے مسلمان تھے جو سپاہیانہ شان رکھتے ہوں اور پھانسی سے بچے ہوں۔ پشاور سے لیکر مشرقی و شمالی ہند تک، شاید ہی کوئی مالدار مولوی۔ نمازی مسلمان ہوگا جو نہ پکڑا گیا ہو۔[1]

معصوم انسانوں کا سنگدلانہ قتل۔

پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے بھی مرد، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ نہ صرف پھانسی پر اکتفا کیا گیا بلکہ دیہاتوں میں ان کو اپنے مکانوں میں بند کرکے آگ لگادی گئی جنرل اوٹرم کی رائے میں یہ واقعہ معصوم انسانوں کا سنگدلانہ قتل تھا۔[2]

اوٹرم اور کیننگ۔ جب اوٹرم صاحب فاتح لکھنؤ موسی باغ سے واپس اپنے پہلے مقام میں آئے تو لارڈ کیننگ کا اشتہار اودھ انکو ملا۔ اس اشتہار کا منشا یہ تھا کہ سرزمین اودھ کی کل اراضی باستثناء چھ تعلقہ داروں کی ضبط کیجائے۔ سرکش تعلقہ داروں میں جو کوئی فوراً اپنے تئیں گورنمنٹ کے حوالہ کردے تو اس سے موت اور قید کی سزا معاف کرنیکا وعدہ کیا جاتا تھا بشرطیکہ وہ ثابت کرے کہ وہ بغیر اشتعال کے کسی قتل کا مرتکب نہیں ہوا اور جن لوگوں نے انگریزوں کی جانیں بچائی ہیں۔ ان کے ساتھ خاص عنایتوں کا وعدہ

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ)
[2] غدر سنہ ۱۹۵۷ء کے بیس روپیہ صفحہ ۶۲

جاتا ہے ۔ یہ اشتہار اس وقت آیا کہ لکھنؤ پر قبضہ ہو گیا تھا۔ مگر کل اودھ میں فتنہ و فساد برپا تھا۔ باغی سپاہ جسکی کوشش لکھنؤ کے بچانے میں اکارت گئی تھی وہ ضلعوں میں چلی گئی کہ از سر نو انگریزوں کا مقابلہ کرے۔ ہر افسر جو اس لشکر کشی میں شریک تھا اس اشتہار کی پالیسی کے خلاف تھا کہ ایسی حالت میں کل آدمی جو مسلح میدان جنگ میں موجود ہیں۔ اپنے حق موروثی سے محروم کئے جائیں۔ اوٹرم صاحب نے گورنر جنرل کو سمجھایا کہ ۱۸۵۶ء کے بندوبست میں تعلقہ داروں کے ساتھ ناانصافی کیگئی ہے وہ گورنمنٹ کی ایسی متزلزل حالت میں کبھی خیر خواہ نہیں رہ سکتے تھے ان وجوہ سے انکے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے جیسا کہ معزز دشمن سے کیا جاتا ہے نہ ایسا کہ باغیوں کے ساتھ۔ اگر ان سے سوائے اسکے کہ وہ موت اور قید کی سزا سے معاف کئے جائینگے کوئی اور نیک سلوک کا وعدہ نہیں کیا جائیگا تو وہ مایوس ہو کر نمانسوں کی لڑائی لڑیں گے جس میں یورپین ہزاروں مارے جائیں گے۔ اسکے برعکس اگر یہ مستحکم سند ان کو دیجائیگی کہ وہ اپنی زمینوں پر قابض رہینگے۔ تو وہ گورنمنٹ کے ممد و معاون ہونگے۔ اس کا جواب لارڈ کیننگ نے رنجیدہ خاطر ہو کر لکھا اور اپنی بات پر اڑے رہے مگر بہت سی بحث و تکرار کے بعد سر جیمس اوٹرم کو یہ اجازت دیگئی کہ وہ اس اشتہار میں یہ فقرہ اور اضافہ کریں کہ وہ لوگ جو اپنے تئیں گورنمنٹ کے لطف و کرم کے حوالہ کرینگے اور امن و امان کے قائم کرنے میں گورنمنٹ کے ممد و معاون ہونگے انکے استحقاق مستحکم کئے جائینگے۔ اشتہار میں باقی فقرے بدستور رہیں۔ [1]

---

[1] تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ صفحہ ۶۳

بندوبست کے نام پر غارتگری

غدر کے بعد تسلط اور اقتدار حاصل کرتے ہی انگریزوں نے نیا بندوبست کیا اور اس بہانہ تعلقہ داروں اور زمینداروں کو مفلس اور کنگال بنانیکا فیصلہ کر لیا حالانکہ اس گروہ کی اکثریت دل و جان سے انگریزوں کے ساتھ تھی۔ ۱۸۵۶-۵۷ء میں جو بندوبست ہوا اسکی اور واجد علی شاہ کے عہد کی آمدنی کا مقابلہ کر کے ہنت پرشاد متوطن آگرہ کی تاریخ اودھ سے دکھاتا ہوں۔ یہ تاریخ سلیمن صاحب ریزیڈنٹ کے کہنے سے لکھی گئی ہے۔ یہ شخص ریزیڈنٹ کے ساتھ رہتا تھا اور اخبار نویس کا عہدہ رکھتا تھا۔

قسمت	ضلع	مالگذاری عہد سلطنت	مالگذاری عہد انگریزی حسب بندوبست ۱۸۵۶ء	سابق جمع مالگذاری بعد بندوبست انگریزی	کمی مالگذاری عہد انگریزی حسب بندوبست	تعداد و تعلقہ جات و جمع مالگذاری: تعداد تعلقہ	تعداد و تعلقہ جات و جمع مالگذاری: جمع
	خاص لکھنؤ	۹۹۸۶۸۱	۹۲۱۰۸۷	۱۷۱۳۸۹	۱۱۳۳۶	۵۷	۳۰۷۶۳۴
لکھنؤ	دریاباد	۳۶۸۷۲۶	۹۹۷۳۳۵	۳۷۷۲۷	۱۸۸۵۱	۶۹	۵۳۰۳۴۹
	اناؤ	۱۱۱۵۳۶۴	۱۱۲۳۷۹۸	۱۷۶۶۳	۳۳۴۶	۴۴	۳۱۷۲۰۵
	سلطانپور	۱۱۶۱۹۵۷	۹۵۷۴۶	۶۸۲۳۳	۱۲۵۶۳	۲۷	۵۱۹۹۸۹
فیض آباد	خاص فیض آباد	۱۱۱۰۳۹۴	۱۱۲۷۳۹۷	۳۹۲۲۹	۶۲۰۳	۲۸	۷۶۱۸۱۴
	پرتاب گڑھ	۴۴۳۶۶۸	۱۲۷۹۳۰	۵۶۲۵	۱۶۵۷۷	۳۴	۱۰۳۹۷۴۴
	ہردوئی	۱۴۶۱۳۶۱	۱۱۹۶۵۶۴	۲۷۳۹۴	۳۱۴۱	۶۴	۴۷۷۱۲۸
خیرآباد	سیتاپور	۱۲۵۸۵۷۴	۹۴۱۹۸۷	۳۱۵۶۰	۳۲۸۰	۱۷۱	۷۱۷۳۴۵
	لکھیم پور	۵۰۰۰۰۰	۴۲۱۱۶۰			۷۲	۱۱۵۶۱۷
	خاص بہرائچ	۸۹۸۹۱	۵۸۹۶۱۶	۱۹۳۱۷	۳۶۶۱	۴۲	۵۶۸۵۳۹
بہرائچ	گونڈہ	۱۷۷۸۷۹	۹۴۷۳۵۰	۱۰۱۶۰	۱۹۳۹۵	۵۲	۵۵۰۰۷۰
	ملانواں	۳۶۴۳۳۰	۲۵۷۳۸۰	۹۰۲۵۰	۱۸۰۰	۳۶	۲۹۰۰۲۰

جب ملک اودھ سرکاری عملداری میں شامل ہوا تو انگریزوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ یہاں تعلقہ دار دو تہائی زمین کے مالک ہیں۔ پہلے ہی سال کے بندوبست سرسری کا یہ نتیجہ تھا کہ جب ملک انگریزی عملداری میں آیا تو سال اول میں ۶۶ لاکھ روپے تعلقہ داروں نے خزانہ سرکاری میں داخل کیا اور ۲۳۵۰۰ گاؤں انکے پاس تھے اور سنہ ۵۷-۱۸۵۶ء کے بندوبست میں نصف زمین انکے قبضہ سے نکل گئی بعض صورتوں میں نصف سے بھی زیادہ جائیداد سے بے دخل ہوئے۔ راجہ مان سنگھ کے پاس ۵۷۷ گاؤں تھے اور دو لاکھ روپے مالگذاری کے دیتے تھے۔ بندوبست سنہ ۵۷-۱۸۵۶ء میں انکے پاس ۶ گاؤں رہ گئے اور صرف ۲۹۰۰ روپے کے مالگذار ہو گئے۔ دو لاکھ روپیہ سال کی آمدنی تھی۔ یا تین ہزار روپیہ کے قریب رہ گئی۔ اسٹریچی صاحب لکھتے ہیں کہ اگرچہ یہ سچ ہے کہ راجہ مان سنگھ اودھ کے پرانے خاندانی رئیسوں میں نہ تھا مگر بہت قدیمی خاندان بھی اس آفت سے نہیں بچے۔ ایک خاندان کے پاس ۳۷۸ مواضع تھے ۲۶۶ چھن گئے۔ ایک دوسرے خاندان کے پاس ۲۰۴ دیہات تھے انمیں سے ۱۱۸ لیلئے گئے۔ راجہ مہادت سنگھ کے پاس ۳۲۲ گاؤں تھے ستر ہزار اسی ہزار روپے مالگذاری کا دیتے تھے۔ وہ بھی دو سو دیہات سے بے دخل ہوئے۔

اودھ کی رعایا ہتھیار بند تھی اور اسے اپنے ہتھیار عزیز بھی تھے لیکن ایک سال کے اندر رعایائے اودھ سے بتفصیل ذیل ہتھیار چھینے گئے اور ۵۰۶۹ قلعے گڑھیاں مسمار کیگئیں۔

توپیں	۷۲۰
آتشی ہتھیار	۱۹۲۳۰۷
تلواریں	۵۷۹۵۵۴
مختلف ہتھیار	۶۹۴۰۶۰

انگریزی دور حکومت کی برکتیں

انگریزوں کے برسر اقتدار آنیکے بعد نہ صرف لکھنؤ بلکہ پورا اودھ تباہ ہو گیا۔ بلند بستیاں پست ہو گئے اور محلے ویران

لے۔ تاریخ اودھ۔ جلد پنجم (نجم الغنی) صفحہ ۲۹

گئے، مکان کھد گئے، امیر مینائی کہتے ہیں :-

گھر کھدنے کی نہ پوچھو مصیبت ہم سے
روتی ہے لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے
یا ہم جاتے ہیں گھر سے رخصت ہو کر
یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے

منشی ذکاءاللہ، ان لوگوں میں تھے، جو انگریزوں کو فرشتۂ رحمت سمجھتے تھے، باغیوں اور انقلابیوں کو "نمک حرام" کہتے تھے، دلی کی شہنشاہی اور لکھنؤ کی بادشاہی کا انکے دل میں ذرا احترام نہ تھا، لیکن وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ :-

اودھ کی ضبطی والحاق کیلئے خواہ کچھ ہی بجا و درست دلائل بیان کیجائیں مگر اسمیں کچھ شک نہیں ہو سکتا کہ جس طریقہ سے یہ پالیسی کام میں آئی اس سے ہندوستانیوں میں عام ناراضگی و برگشتگی سرکار سے پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کی ایک خود مختار آزاد سلطنت کی ضبطی نے علی العموم مسلمانوں کے دلوں کو آزار دیا اور ان کا سرکار سے برگشتہ خاطر مسلمانوں کے سوا ہندوستان کے والیان ملک بھی ناخوش تھے کہ سرکار دولتمدار کے اقتدار کی خواہ کیسی ہی خیر خواہی کیجئے، اسکا سچا انکا قرض دیجئے مگر اس نے ملکوں کی ضبطی کے لئے اپنا دست آز ایسا دراز کیا ہے کہ وہ کسی طرح کوتاہ نہیں ہوتا اودھ کی ضبطی نے ہر گروہ کو بدخواہ کیا، انگریزی سرکار نے جو نیا انتظام کیا اس میں بعض تعلقہ دار کل ریاست سے محروم ہوگئے وہ کیوں نہ ناراض ہوتے؟ بادشاہ کے اہل دربار کو جو فائدے بادشاہ سے ہوتے تھے وہ اب کہاں تھے؟ وہ سرکار سے نفرت کیوں نہ کرتے؟ ہزار ہا آدمی بادشاہ کی ملازمت سے پرورش پاتے تھے اب وہ تھوڑی سی پنشن یا عطیہ پا کر اپنے گھر میں خالی بیٹھے مشکل سے پیٹ پالتے تھے وہ کیوں نہ سرکار سے عداوت رکھتے؟ سرکار انگریزی کی سپاہ کے بھی

بعض استحقاق اس الحاق سے تلف ہو گئے تھے وہ بھی کبیدہ خاطر تھے اہل زراعت کو اور شہر کے صناعوں کو اور کاریگروں کو ٹیکسوں نے ناراض کردیا۔ غرض بادشاہ کی معزولی نے تعلقہ داروں اور امرار دربار اور وظیفہ خواروں پر رزق کا دروازہ ایسا بند کردیا تھا کہ ان میں سے بعض نان شبینہ کو محتاج تھے۔ راتوں کو بھیک مانگتے تھے۔ بعض پوتڑوں کے بڑے بڑے امیر نازونعم میں پلے ہوئے جن کے پاس سامان عیش وعشرت کی کچھ کمی نہ تھی، وہ ایسے بے سروسامان ہو گئے تھے۔ کہ اپنی بی بی، بہو، بیٹیوں کے زیور ولباس بیچکر گزارہ کرتے تھے۔

غرض ہر فریق و ہر جماعت کی ناراضگی کی وجہ تھی۔ طبع بشری کا مقتضا و سرکار کا بدخواہ بناتا تھا؛ گو سرکار کا منشاء یہ نہ تھا کہ اس ملک پر جو خیر خواہی میں ضرب المثل تھا۔ اس طرح کی آفتیں اور بلائیں نازل ہوں کہ وہ اس کا بدخواہ ہو جائے [۱]

۱؎ تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۷۹۲

اسبابِ بغاوتِ ہند

سر سیّد احمد خاں کی زبان سے

ہم نے واجد علی شاہ کی معزولی دیکھ لی، جلاوطنی کا دور دیکھ لیا۔ قید فرنگ کے مصائب دیکھ لئے۔ غدر کی ہولناکیاں دیکھ لیں۔ اہل وطن کی ناچاریاں اور انگریزوں کی سفاکیاں اور خون آشامیاں دیکھ لیں، غریبوں کو امیر ہوتے اور امیروں کو غریب ہوتے دیکھ لیا۔ صاحبانِ جاہ و اعزاز کو ذلیل و رسوا ہوتے اور اربابِ اقتدار و اختیار کو محبوس و مقتول ہوتے دیکھ لیا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ آخر ان ساری ہنگامہ آرائیوں کا پس منظر کیا تھا؟ ——— وہ کیا اسباب و عوامل اور محرکات تھے جنہوں نے ایک سوتی ہوئی قوم کو بیدار کر دیا؟ ایک عافیت پسند قوم میں مرمٹنے کا جذبہ پیدا کر دیا؟ جس قوم نے نہایت آسانی اور خاموشی کے ساتھ فرنگی سامراج کا طوق اپنی گردن میں خود ڈال لیا تھا۔ آخر کیا بات کہ وہی قوم، کفن سر سے باندھکر میدان میں اُتری اور اس وقت تک لڑتی رہی۔ جب تک اس کے ہاتھ شل نہ ہو گئے، جب تک اس کی تلوار کند نہ ہو گئی، جب تک اس کی ہمت اور سکت جواب نہ دے گئی۔

غدر کے اسباب و محرکات پر ہندو، مسلمان اور انگریز مورخوں نے اپنے

خیالات کا اظہار مختلف مواقع پر کیا ہے۔ لیکن اس موضوع پر سرسید احمد خاں نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اس کارزار میں شریک تھے۔ وہ انگریزوں کے دوست اور وفادار جاں نثار اور فداکار تھے۔ وہ وطن پرستوں، ملت پروروں، آزادی کے پرستاروں اور حریت کے متوالوں کو علی الاعلان "نمک حرام" "کمینیت" اور طرح طرح کے خطابات سے نوازتے ہیں۔ یعنی وہ ان لوگوں سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے۔ جو فرنگی سامراج کے مقابلے میں صف آرا ہوئے تھے۔ پھر بھی انھوں نے اسباب بغاوت ہند لکھ کر ان کوتاہیوں کی طرف نشاندہی کی ہے۔ جو انگریزوں میں رچ گئی تھیں۔ یہ بڑی بات ہے اور اہم بھی۔ اس لئے ہم اسے نظرانداز نہیں کرسکتے۔ اور مجبور ہیں کہ ان کی تحریر کا ایک قابل توجہ مقصد قارئین کے سامنے پیش کردیں۔ تاکہ بہ آسانی وہ اسباب نظر آجائیں، جنھوں نے سرسید جیسے وفادار ازلی کو بھی چیخنے پر مجبور کردیا تھا!

۱۸۵۷ء کی سرکشی

۱۸۵۷ء کی سرکشی میں یہی ہوا کہ بہت سی باتیں ایک مدت دراز سے لوگوں کے دلوں میں جمع ہوتی جاتی تھیں اور بہت بڑا میگزین جمع ہوگیا تھا۔ صرف اس کی شتابی میں آگ لگانی باقی تھی کہ سال گزشتہ میں فوج کی بغاوت نے اس میں آگ لگادی ،

چپاتی بٹنا کوئی سازش کی بات نہ تھی

۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے اکثر ضلعوں میں وہ بدہ چپاتی بٹی اور اسی کے قریب زمانے میں سرکشی ہوئی۔ اگرچہ اس زمانے میں تمام ہندوستان میں وبا کی بیماری تھی اور خیال میں آتا ہے کہ اس کے دفعیہ کرنے کو بطور ٹوٹکہ یہ کام ہوا ہو۔ کیونکہ جاہل ہندوستانی اس قسم کے ٹوٹکے بہت کیا کرتے ہیں مگر حق یہ ہے کہ اسکا اصلی سبب ابتک نہیں کھلا لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ چپاتی کسی سازش کی بنیاد نہیں ہوسکتی۔ یہ قاعدہ ہے کہ اس قسم کی چیز البتہ ایک نشانی ہوتی ہے۔ واسطے تصدیق زبانی پیغام کے اور ظاہر ہے کہ اس چپاتی کے ساتھ کوئی پیغام نہ تھا۔ اگر ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ باوجود منتشر ہونیکے اور ہر قوم اور ہر طبیعت کے آدمیوں میں پھیلنے کے مخفی رہتا۔ جس طرح پر کہ ہندوستان میں سرکشی پھیلی اور یہاں سے وہاں اور وہاں سے وہاں دوڑی۔ صاف دلیل ہے کہ پہلے سے کچھ سازش نہ تھی۔

اودھ کی ضبطی

اودھ کی ضبطی کو بھی ہم سبب اس سرکشی کا نہیں سمجھتے۔ اس میں شک نہیں کہ اودھ کی ضبطی سے سب لوگ ناراض ہوئے اور سب نے یقین کیا کہ ازبیل ایسٹ انڈیا کمپنی نے خلاف عہد اور اقرار کے کیا۔ عموماً رعایا کو ضبطی اودھ سے اسقدر ناراضی ہوئی تھی جتنی کہ ہمیشہ ہوا کرتی تھی۔ جب کمپنی کسی ملک کو فتح کرتی تھی جسکا بیان آگے آویگا۔ زیادہ تر تردد اور خوف اور ناراضگی دلی۔ والیان اور رئیسان خود مختار ہندوستان کو ہوئی تھی۔ سب کو یقین تھا کہ اسی طرح سب کے ملک اور سب کی ریاستیں اور حکومتیں چھینی جاویںگی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب ملک رئیسوں میں سے کوئی باغی نہیں ہوا۔ اس فساد

میں اکثر وہی لوگ ہیں جن کے ملک انکے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ اسکے جواب میں یہ مت کہو کہ جھجر کا نواب اور بلبگڑھ کا راجہ اور فلاں فلاں باغی ہو گیا۔

لارڈ امہرسٹ صاحب کا کہنا کہ خاندان تیموریہ دلی کا بادشاہ نہیں

سنہ ۱۸۲۷ء میں لارڈ امہرسٹ صاحب بہادر نے علانیہ کہہ دیا تھا کہ ہماری گورنمنٹ اب کچھ تیموریہ خاندان کے تابع نہیں ہے بلکہ وہ خود ہندوستان کی بادشاہ ہے تو اس وقت رعایا اور والیان ہندوستان کو کچھ بھی خیال نہیں ہوا تھا کہ خاص بادشاہی کے خاندان کو کچھ رنج ہوا ہو۔

پہلے سے فوج باغی کی بادشاہ دہلی سے سازش نہ تھی

فوج باغی کا پہلے سے دلی کے معزول بادشاہ سے سازش کرنا محض بے اصل ہے۔ دلی کے بادشاہ کو کوئی شخص ولی اور مقدس نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے منھ پر اس کی لوگ خوشامد کرتے تھے اور پیٹھ پیچھے ہنستے تھے لوگ اسکے مرید ہوتے تھے۔ کسی فائدے کی نظر سے نہ بطور اعتقاد کچھ عجب نہیں کہ کسی پلٹن کا کوئی تلنگا یا صوبہ دار بھی مرید ہوا ہو مگر اس بات کو سازش بغاوت سے کچھ بھی علاقہ نہیں ہے۔ بلا شبہ فوج باغی دلی پر جمع ہو گئی۔ مگر جب اس نے سرکار سے بگاڑ دی تھی تو دلی کے بادشاہ کے سوا ایسا اور کون شخص تھا کہ جس کی طرف فوج رجوع کرتی۔ اس میں کچھ پہلے سازش کی حاجت تھی بلا شبہ جو حیثیت بادشاہ دہلی کی سرکار نے بنا رکھی تھی وہ ہمیشہ نامناسب اور قابل اعتراض تھی اور جناب لارڈ النبرا صاحب بہادر نے جو تجویز کی تھی۔ وہ بے شک لائق منظوری کے تھی بلکہ اس سے زیادہ عملدرآمد کرنا واجب تھا۔ بے شک دلی کا بادشاہ بھوبل میں ایک چنگاری تھا جس نے ہوا کے زور سے اڑ کر تمام ہندوستان کو جلا دیا۔

شریک ہونا ہندوستانیوں کا لیجسلیٹو کونسل میں اصلی سبب فساد کا ہوا

اصلی سبب اس فساد کا

میں تو ایک ہی سمجھتا ہوں باقی جس قدر اسباب ہیں وہ سب اسکی شاخیں ہیں۔
اور یہ سمجھ میری کچھ وہمی اور قیاسی ہی نہیں بلکہ اگلے زمانہ کے بہت سے عقلمندوں کی رائے کا
اتفاق ہو چکا ہے اور تمام مصنفین پرنسپل آف گورنمنٹ کے اس باب میں میرے طرفدار
ہیں اور تمام تاریخیں یورپ اور افریقہ کی میری رائے کی صداقت پر بہت معتبر گواہ ہیں۔

یہ بات بہت ضروری تھی

سب لوگ تسلیم کرتے چلے آئے ہیں کہ واسطے خوش اسلوبی
اور خوبی اور پائداری گورنمنٹ کے مداخلت رعایا کی
حکومت ملک میں واجبات سے ہے حکام کی برائی یا بھلائی تدبیر کی صرف لوگوں سے معلوم ہوتی ہے
پیشتر اس سے کہ خرابیاں اس درجہ کو پہنچیں کہ پھر جن کا علاج ممکن نہ ہو۔

سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل
چو پر شد نشاید گذشتن بہ پیل

اور یہ بات نہیں حاصل ہوتی۔ جبتک کہ مداخلت رعایا کی حکومت ملک میں نہ ہو
علی الخصوص ہماری گورنمنٹ کو جو غیر ملک کے رہنے والے تھے۔ مذہب اور رواج اور راہ
و رسم اور طبیعت اور عادت بھی اس ملک سے مختلف رکھتے تھے۔ اس بات پر خیال رکھنا
واجبات سے تھا۔ گورنمنٹ کا انتظام اور اسکی خوبی اور اسلوبی اور پائداری ملکی اطوار و عادات
کی واقفیت اور پھر اُسکی رعایت پر موقوف ہے کیونکہ اگلی تاریخوں کے دیکھنے سے جو
درحقیقت ایک روزنامچہ ہے۔ عادات و خیالات اور اطوار متعلقہ نوع انسان کا معلوم
ہو سکتا ہے کہ اُنکی عادتیں اور خیالات اور اطوار موافق کسی عقلی قاعدہ کے حاصل نہیں ہوئی ہیں
بلکہ ہر ایک ملک اور قوم میں بسبب اتفاق ہو گئی ہیں پس قواعد گورنمنٹ ان اوضاع اور
اطوار پر موقوف ہیں نہ یہ کہ وہ اوضاع و اطوار اور عادات گورنمنٹ پر اور اسی بات میں
گورنمنٹ کی پائداری اور قیام ہے۔ کیونکہ جب تک وہ عادتیں اور اخلاق رعایا کے دلمیں
مستحکم اور بمنزلہ خاصیت ناگہانی کے ہو گئی ہیں۔ اس وقت تک اسکے برخلاف کوئی اقدام

کرنا صریح خاصیت انسانی کے خلاف کرنا اور سب کو رنجیدہ رکھنا ہے۔ کیا ہم بھول جاوینگے۔
بنگالہ کی اس بے انتظامی کی حالت کو جو ۱۷۶۵ء میں بوقت تفویض ہونے دیوانی بنگالہ
بہ کمپنی انگریز بہادر اسی ناواقفیت کے سبب ہوئی تھی۔ باوصفیکہ جان کلارک مارشمن
صاحب کی تاریخ ہم کو اسے یاد دلا رہی ہے اور کیا یاد نہ رہیگی ہم کو وہ خوبی جو بنگالہ میں لارڈ
ہسٹنگز صاحب بہادر کی زبان دانی اور ملکی راہ و رسم کی واقفیت سے حاصل ہوئی تھی۔

بلاشبہ پارلیمنٹ میں ہندوستان کی رعایا کی مداخلت غیر ممکن اور بے قاعدہ محض
تھی مگر لیجس لیٹیف کونسل میں مداخلت نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ پس یہی ایک بات ہے
جو جڑ ہے تمام ہندوستان کے فساد کی اور جتنی باتیں جمع ہوتی گئیں وہ سب اسکی شاخیں ہیں

ہم یہ نہیں کہتے کہ ہماری گورنمنٹ نے ملکی حالات اور اطوار دریافت کرنے میں کوشش
نہیں کی۔ بلکہ ہم اسکے بدل مقر ہیں اور بعض قوانین گورنمنٹ اور ہدایات بورڈ آف ریونیو
اور آنریبل ٹامسن صاحب کے ہدایت نامہ مال کو اسکا گواہ سمجھتے ہیں مگر اسمیں شک نہیں
کہ رعایا کے حالات اور عادات اور خیالات اور اوضاع اور اطوار اور طبیعت و طینت
اور لیاقت کے دریافت کرنے میں توجہ نہیں کی۔ بلاشبہ ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم تھا کہ ہماری
رعیت پر دن کیسا گذرتا ہے اور رات کس مصیبت کی آتی ہے اور وہ دن بدن کس غم اور
مصیبت میں پڑتے جاتے ہیں اور کیا کیا رنج روز بروز انکے دل میں جم جاتے ہیں۔ جو رفتہ رفتہ
بہت کثرت سے جمع ہوگئے تھے اور ایک ادنیٰ تحریک سے دفعتاً بہہ پڑے۔

اسی سبب سے رعایا کا منشا گورنمنٹ پر کھلا اور گورنمنٹ کا نیک ارادہ ہندوستانیوں پر ظاہر نہ ہوا بلکہ برعکس سمجھا گیا

لیجس لیٹیف کونسل میں ہندوستان
کے شریک نہ ہونے سے صرف اتنا ہی نقصان نہیں ہوا کہ گورنمنٹ کو اصلی مضرت قوانین
اور ضوابط کے جو جاری ہوئے بخوبی معلوم نہیں ہوسکے اور اعتراض عام رعایا کا اسمیں مضرت

کے رفع کرنے میں اور اپنے مطالب کے پیش کرنے کی فرصت اور قدرت نہیں ملی بلکہ بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ رعایا کو منشاء اور اصلی مطلب اور دلی ارادہ گورنمنٹ کا معلوم نہ ہوا گورنمنٹ کی ہر تجویز پر رعایا کو غلط فہمی ہوئی جو تجویز گورنمنٹ کی ہوتی تھی۔ ہندوستانیوں کو بسبب اسکے کہ وہ لوگ اس میں شریک نہ تھے اور شاید بہم اس تجویز سے واقف نہ تھے۔ اس کی بنیاد معلوم نہ ہوئی اور ہمیشہ یہی سمجھے کہ یہ بات بھی ہمارے اور ہمارے وطنیوں کو خراب اور برباد اور ذلیل اور بے دھرم کرنے کو ہے۔ اور وہ بعضی باتیں جو درحقیقت گورنمنٹ سے خلاف رواج اور مخالف طبیعت اور طینت ہندوستانیوں کے صادر ہوئی تھیں قطع نظر اس سے کہ وہ فی نفسہٖ اچھی تھیں یا بری۔ زیادہ تر ان کے غلط خیال کو تقویت دیتی تھیں رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچ گئی کہ رعایا ہندوستان کی ہماری گورنمنٹ کو میٹھے زہر اور شہد کی چھری اور ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی۔ اور پھر اس کو اپنے دلمیں سچ سمجھتی تھی اور یہ جانتی تھی کہ ہم اگر آج گورنمنٹ کے ہاتھ سے بچے ہوئے ہیں تو کل نہیں اور کل ہیں تو پرسوں نہیں اور کوئی شخص ان کے حالات کا پوچھنے والا اور کوئی تدبیر ان کے اس غلط خیال کو دور کرنے والی نہ تھی۔ جبکہ رعایا کا گورنمنٹ کے ساتھ یہ حال ہو جو دلی دشمن کے ساتھ ہونا چاہئے تو پھر کیا توقع ہوسکتی ہے وفاداری کی ایسی گورنمنٹ کو ایسی رعایا سے اور جبکہ ہماری گورنمنٹ درحقیقت ایسی نہ تھی تو ان غلط خیالات کا ہندوستانیوں کے دل میں جمنا اور جو رنج کہ انکے دل پر تھا اسکا علاج نہ ہونا صرف اسی سبب سے تھا کہ لیجسلیٹف کونسل میں ہندوستانی شریک نہ تھے اگر ہوتے تو یہ سب باتیں رفع ہو جاتیں اب اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف یہی ایک بات ہے جس نے اپنی بہت سی شاخیں پیدا کر کر تمام ہندوستانیوں میں بے جا فساد پیدا کر دیا۔

یہ مت کہو کہ ہماری گورنمنٹ نے چھاپہ خانوں میں سوائے گالی اور افترا اور جن باتوں سے فتنہ یا سرکشی وقوع میں آئے اور سب امورات چھاپنے کی اجازت دی تھی اور قانون

جاری ہونے سے پہلے مشورہ کیا جاتا تھا اور ہر شخص کو اس پر عذر پیش کرنے کا اختیار تھا۔ کیونکہ یہ امور ان بڑی عظیم الشان باتوں کے علاج کو جس کا ہم ذکر کرتے ہیں محض ناکافی بلکہ محض بے فائدہ تھی۔

اور ہم نہیں چاہتے کہ اس مقام پر ہم سے یہ گفتگو کی جائے کہ ہندوستانیوں کا جو نہایت جاہل ہیں اور بے تمیز لیجس لیٹیف کونسل میں شریک ہونا کس طرح ہوتا؟ اور کیا فائدہ ہندوستانیوں کی شرکت کا نکلتا؟ اور اگر رعایائے ہندوستان کو شامل پارلیمنٹ کے لیجس لیٹیف کونسل میں مداخلت دی جاتی تو طریقہ انکے انتخاب کا کیا ہوتا؟ اور اس میں بہت سی مشکلیں پیش آتیں۔ کیونکہ اس مقام پر ہم کو صرف اتنا ثابت کرنا ہے کہ یہ بات گورنمنٹ کیلئے بہت اچھی اور پُر ضرور تھی اور اسکے نہ ہونیکے سبب یہ فساد برپا ہوئے اور طریقہ مداخلت رعایا کی بابت ہماری علیحدہ رائے ہے۔ اس کو دیکھنا چاہئے اور جو بحث ہو وہاں کرنی چاہئے

مداخلت مذہبی سمجھنا

مداخلت مذہبی کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل اور قابل اور اعلیٰ اور ادنیٰ یقین جانتے تھے کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے اور سب کو کیا ہندو اور کیا مسلمان، عیسائی مذہب اور اپنے ملک کی رسم و رواج پر لا ڈالے اور سب سے بڑا سبب اس سرکشی میں یہی ہے۔

ہر شخص دل سے جانتا تھا کہ ہماری گورنمنٹ کے احکام بہت آہستہ آہستہ ظہور میں آتے ہیں اور جو کام کرنا ہوتا ہے رفتہ رفتہ کیا کرتے ہیں۔ اس واسطے دفعتاً اور جبراً مسلمانوں کی طرح دین بدلنے کو نہیں کہتے مگر جتنا جتنا قابو پاتے جاویں گے اتنی اتنی مداخلت کرتے جاوینگے اور جو باتیں رفتہ رفتہ ظہور میں آتی گئیں جن کا بیان آگے آئیگا۔ انکے اس غلط شبہ کو زیادہ تر مستحکم اور مضبوط کرتی گئیں۔ سب کو یقین تھا کہ ہماری گورنمنٹ علانیہ جبر

مذہب بدلنے پر نہیں کرینگے۔ بلکہ خفیہ تدبیریں کر کر مثل نابود کر دینے علم عربی و سنسکرت کے اور مفلس و محتاج کر دینے ملک کے اور لوگوں کو جو اُن کا مذہب ہے اس کے مسائل سے ناواقف کر کر اور اپنے دین مذہب کی کتابیں اور مسائل اور وعظ کو پھیلا کر نوکری کا لالچ دے کر لوگوں کو بے دین کر دینگے۔ سنہ ۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے۔ کم عمر عیسائی کیئے گئے وہ تمام اضلاع ممالک مغربی و شمالی میں ارادہ گورنمنٹ کے ایک نمونے گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اس طرح پر مفلس اور محتاج کر کر اپنے مذہب میں لے آوینگے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جب سرکار آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کوئی ملک فتح کرتی تھی تو ہندوستان کی رعایا کو کمال رنج ہوتا تھا اور یہ بھی میں سچ کہتا ہوں کہ خشا اس رنج کا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ بجز اس کے کہ لوگ جانتے تھے کہ جیوں جیوں اختیار ہماری گورنمنٹ کا زیادہ ہوتا جاویگا اور کسی دشمن اور ہمسایہ حاکم کے مقابلہ اور فساد کا اندیشہ نہ رہیگا۔ تو دوں ہمارے مذہب اور رسم و رواج میں زیادہ تر مداخلت کرینگے۔

مذہبی گفتگو بہت ہوئی | ہماری گورنمنٹ کی ابتدائے حکومت ہندوستان میں گفتگو مذہب کی بہت کم تھی روز بروز زیادہ ہوتی گئی اور اس زمانے میں بدرجہ کمال پہنچ گئی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہماری گورنمنٹ کو ان امور میں کچھ مداخلت نہ تھی مگر ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ یہ سب معاملہ بموجب حکم اور بموجب اشارہ اور مرضی گورنمنٹ ہوتے ہیں۔ یہ سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرر کیا ہے۔ گورنمنٹ سے پادری صاحب تنخواہ پاتے ہیں۔ گورنمنٹ اور حکام انگریزی ولایت زاجو اس ملک میں نوکر ہیں وہ پادری صاحبوں کو بہت سا روپیہ واسطے خرچ کے اور کتابیں بانٹنے کو دیتے ہیں اور ہر طرح ان کے مددگار اور معاون ہیں۔ اکثر حکام متعہد اور افسران فوج نے اپنے تابعین سے مذہب کی گفتگو شروع کی تھی بعضے صاحب اپنے ملازمین کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی پر آکر پادری

صاحب کا وعظ شنو اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ غرض اس بات نے ایسی ترقی پکڑی تھی کہ کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ گورنمنٹ کی عملداری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب قائم رہے گا۔

پادری صاحبوں کا وعظ پادری صاحبوں کے وعظ نے نئی صورت نکالی تھی۔ علم اور مذہب کی کتابیں بطور سوال و جواب چھپنی اور تقسیم ہونی شروع ہوئیں۔ ان کتابوں میں دوسرے مذہب کے مقدس لوگوں کی نسبت الفاظ اور مضامین ونجبہ مندرج ہوئے۔ ہندوستان میں دستور وعظ اور کتھا کا یہ ہے کہ اپنے اپنے معبد یا مکان پر بیٹھکر کہتے ہیں جسکا دل چاہے اور جسکو رغبت ہو وہاں جاکر سُنے۔ پادری صاحبوں کا طریقہ اس کے برخلاف تھا۔ وہ خود غیر مذہب کے مجمع اور تیرتھ گاہ اور میلے میں جاکر وعظ کہتے تھے اور کوئی شخص صرف حکام کے ڈر سے مانع نہ ہوتا تھا۔ بعض ضلعوں میں یہ رواج نکلا کہ پادری صاحبوں کے ساتھ تھانہ کا ایک چپراسی جانے لگا۔ پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی اور ہماری گورنمنٹ سے ناراضی کا بیج لوگوں کے دلوں میں بویا جاتا تھا۔

مشنری اسکول مشنری اسکول بہت جاری ہوئے اور اس میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی۔ سب لوگ کہتے تھے کہ سرکار کی طرف سے ہیں۔ بعض اضلاع میں بہت بڑے بڑے عالی قدر حکام متعہد اُن سکولوں میں جاتے تھے۔ اور لوگوں کو اس میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ امتحان مذہبی کتابوں کا لیا جاتا تھا۔ اور طالب علموں سے جو لڑکے کم عمر ہوتے تھے۔ پوچھا جاتا تھا۔ تمہارا خدا کون ہے تمہارا نجات دینے والا کون اور وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے اس پر ان کو

انعام ملتا تھا۔ ان سب باتوں سے رعایا کا دل ہماری گورنمنٹ سے پھرتا جاتا تھا۔

یہاں ایک بڑا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر لوگ اس تعلیم سے ناراض تھے۔ تو اپنے لڑکوں کو کیوں داخل کرتے تھے۔ اس بات کو عدم پر عدم ناراضگی پر خیال نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ ایک بڑی دلیل ہے ہندوستان کے کمال خراب حال اور مفلس اور نہایت تنگ اور تباہ حال ہوجانے پر۔ یہ صرف ہندوستان کی محتاجی اور مفلسی کا باعث تھا کہ لوگ اس خیال سے کہ ان اسکولوں میں داخل ہوکر ہماری اولاد کو کچھ وجہ معیشت اور روزگار حاصل ہوگا۔ ایسی سخت بات کو جس سے بلاشبہ ان کو دلی رنج اور روحانی غم تھا۔ گوارہ کرتے تھے۔ نہ کہ رضامندی سے۔

بڑے کالجوں میں طریقہ تعلیم کی تبدیلی

بڑے بڑے کالج جو شہروں میں مقرر تھے۔ اول اول گو ان سے بھی کچھ کچھ دہشت لوگوں کو ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں شاہ عبدالعزیز جو تمام ہندوستان میں نامی مولوی تھے زندہ تھے۔ مسلمانوں نے ان سے فتویٰ پوچھا۔ انھوں نے صاف جواب دیا کہ کالج انگریزی میں جانا اور پڑھنا اور انگریزی زبان کا سیکھنا بموجب مذہب کے سب درست ہے۔ اس پر سیکڑوں مسلمان کالجوں میں داخل ہوئے۔ مگر اس زمانے میں کالجوں کا حال ایسا نہ تھا۔ بلکہ ان میں تعلیم کا سررشتہ بہت اچھا تھا۔ ہر قسم کے علوم فارسی اور عربی اور سنسکرت اور انگریزی پڑھائے جاتے تھے۔ فقہ اور حدیث اور علم ادب پڑھانے کی اجازت تھی۔ فقہ میں امتحان ہوتا تھا۔ سندیں ملتی تھیں۔ کسی طرح کی ترغیب مذہبی نہ تھی۔ مدرس بہت بڑی عزت اور معتبر اور مشہور اور ذی علم اور پرہیزگار مقرر ہوتے تھے۔ مگر آخر کار یہ بات نہ رہی۔ قدر عربی کی بہت کم ہوگئی۔ اور فقہ حدیث کی تعلیم یکسر جاتی رہی۔ فارسی بھی چنداں قابل لحاظ نہ رہی۔ تعلیم کی صورت اور کتابوں کے رواج نے بالکل تغیر پکڑا۔ اردو اور انگریزی کا رواج بہت زیادہ ہوا۔ جس کے سبب

وہی شبہ کہ گورنمنٹ کو ہندوستان کے مذہبی علوم کا معدوم کرنا منظور ہے۔ قائم ہوگیا مدرّس لوگ معتبر اور ذی علم نہ رہے۔ وہی مدرسے کے طالب علم کہ جنہوں نے ابھی تک لوگوں کی آنکھوں میں اعتبار پیدا نہ کیا تھا۔ مدرّس ہونے لگے۔ اس لئے ان مدرسوں کا بھی وہی حال ہوگیا۔

گورنمنٹ کا اشتہار درباب استحقاق نوکری

دفعتاً پیش گاہ گورنمنٹ سے اشتہار جاری ہوا کہ جو شخص مدرسہ کا تعلیم یافتہ ہوگا اور فلاں فلاں علوم اور زبان انگریزی میں امتحان دیکر سند یافتہ ہوگا وہ نوکری میں سب سے مقدم سمجھا جاوے گا۔ چھوٹی چھوٹی نوکریاں بھی انسپکٹر کے سارٹیفکٹ پر جس کو ابھی تک سب لوگ کالا پادری سمجھتے تھے منحصر ہوگئیں اور ان غلط خیالات کے سبب لوگوں کے دل پر ایک غم کا بوجھ پڑگیا اور سب کے دلوں میں ہماری گورنمنٹ سے ناراضی پیدا ہوگئی اور لوگ یہ سمجھے کہ ہندوستان کو ہر طرح بے معاش اور محتاج کیا جاتا ہے کہ مجبور ہوکر رفتہ رفتہ ان لوگوں کی مذہبی باتوں میں تغیر و تبدیلی ہو جائے گی۔

پادری صاحب اے ایڈمنڈ کی چٹھیات کا اجرا

یہ سب خرابیاں ہوگئیں کے دلوں میں ہو رہی تھیں کہ ۱۸۵۵ء میں پادری صاحبان اے ایڈمنڈ نے دارالامارۃ کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معززنوکروں کے پاس چٹھیات بھیجیں جن کا مطلب یہ تھا کہ اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی۔ تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی۔ ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگئی۔ مذہب بھی ایک چاہئے۔ اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہوجاؤ۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا۔ پاؤں کے تلے کی مٹی نکل گئی۔ سب

کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آگیا۔ اب جتنے سرکاری نوکر ہیں اول انکو کرشتان ہونا پڑیگا اور پھر تمام رعیت کو۔ سب لوگ بیشک سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیات گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں۔ آپس میں ہندوستانی لوگ اہلکاران سرکاری سے پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس بھی چٹھی آئی۔ اسکا مطلب یہ ہوتا کہ تم بھی بسبب لالچ نوکری کے کرشتان ہوگئے۔ اب چٹھیوں نے یہاں تک ہندوستانی اہلکاروں کو الزام لگایا کہ جنکے پاس چٹھیاں آئی تھیں وہ مارے شرمندگی اور ندامت کے چھپاتے اور انکار کرتے تھے ہمارے پاس تو نہیں آئی۔ لوگ جواب دیتے تھے کہ اب آجاویگی۔ کیا تم سرکار کے نوکر نہیں ہو۔ اگر سچ پوچھو تو یہ چٹھیاں تمام ہندوستانیوں کے غلط شبہات کو پکا اور مستحکم کرنے والی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے کر دیا اور اسکے مٹانے کو کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔

کچھ عجیب نہ تھا کہ اسی زمانہ میں کچھ برہمی اور تھوڑا بہت فساد بنگالہ میں شروع ہوجاتا چنانچہ اس وقت کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب معلی القاب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر بنگال نے بہت جلد خبر لی۔ اور ایک اشتہار جاری کیا جس سے فی الجملہ لوگوں کے دلوں میں تسلی ہوئی اور وہ اضطراب جو ہو گیا تھا دھیما ہوا۔ مگر جیسا کہ چاہیے ویسا قلع قمع اسکا نہ ہوا۔ لوگ سمجھے کہ یہ بات بالفعل موقوف ہوگئی۔ پھر کبھی قابو کے وقت پر جاری ہوگی پادری صاحبان اے ایڈمنڈ کی چٹھی اور نواب معلی القاب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر بنگال کا اشتہار آخر کتاب میں مندرج ہے وہاں دیکھو۔

مسلمانوں کو مداخلت امور مذہبی سے زیادہ تر رنج ہوا اور اسکا سبب | ان سب باتوں سے

مسلمان بہ نسبت ہنود کے بہت زیادہ ناراض تھے۔ اسکا سبب یہ ہے کہ ہندو اپنے مذہب کے احکام بطور رسم و رواج کے کرتے ہیں۔ نہ بطور احکام مذہب کے۔ ان کو اپنے مذہب کے احکام اور عقائد اور وہ دلی اعتقادی باتیں جن پر نجات عاقبت کی

موافق اُن کے مذہب کے منحصر ہے مطلق معلوم نہیں ہیں۔ اور نہ ان کے برتاؤ میں ہیں۔
اِس سبب سے وہ اپنے مذہب میں نہایت سُست اور بجز ان رسمی باتوں کے اور
کھانے پینے کی پرہیز کے اور کسی مذہبی عقیدے میں پختہ اور متعصب نہیں
ہیں۔ انکے سامنے انکے اُس عقیدے کے جس کا دل میں اعتقاد چاہیے۔ برخلاف
باتیں ہوا کریں۔ انکو کچھ غصہ یا رنج نہیں آتا۔ برخلاف مسلمانوں کے۔ وہ اپنے مذہب
کے عقائد کے بموجب جانتے ہیں کہ انکے مذہب میں نجات دینے والی اور عذاب میں ڈالنے
والی ہیں۔ بخوبی جانتے ہیں۔ اور ان احکام کو مذہبی احکام اور خدا کی طرف کے احکام
سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس سبب سے اپنے مذہب میں پختہ اور متعصب ہیں۔ ان وجوہات
سے مسلمان زیادہ تر ناراض تھے اور ہندوؤں کی بہ نسبت زیادہ تر فساد میں انکا شریک
ہونا قرین قیاس تھا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ بلا شبہ جیسی گورنمنٹ کی مداخلت مذہب
میں خلاف قواعد ملک داری ہے۔ ویسا ہی کسی مذہب کی تعلیم کو رعایا کا علی الخصوص
اس مذہب کی جسے وہ حق سمجھتی ہے۔ برخلاف اور بے جا ہے۔ مگر ہمارا مطلب
صرف اتنا ہے کہ باوجودیکہ ہماری گورنمنٹ ایسی ہی تھی مگر کام اس طرح پر ہوئے
کہ رعایا کا یہ غلط شبہ رفع نہ ہوا۔

ایکٹ ۲۱ سنہ ۱۸۵۰ء

بعض لیجسلیٹو کونسل سے بھی امور مذہبی میں مداخلت ہوئی
ایکٹ ۲۱ سنہ ۱۸۵۰ء صاف مذہبی قواعد پر خلل انداز تھا۔
پھر اس ایکٹ سے ایک یہ بدگمانی لوگوں کو تھی کہ یہ ایکٹ خاص واسطے ترغیب عیسائی
مذہب قبول کرنے کے جاری ہوا ہے۔ کیونکہ یہ بات ظاہر تھی کہ غیر مذہب کا کوئی آدمی
ہندوؤں میں شامل نہیں ہو سکتا۔ پس ہندو تو اس قانون کے مفاد سے محروم تھے۔ غیر
مذہب کا آدمی اگر مسلمان ہو جاوے تو اس کو اپنے مذہب کی رو سے جیسا کہ اس نے اختیار کیا ہے
اپنے مورثوں کا ترکہ جو غیر مذہب پر تھے لینا منع ہے۔ پس کوئی نو مسلم بھی اس ایکٹ

سے فائدہ نہیں اٹھاسکتا تھا۔ البتہ عیسائی مذہب جس نے قبول کیا ہے وہ فائدہ مند ہو سکتا تھا اس سبب سے لوگ خیال کرتے تھے کہ علاوہ مداخلت مذہبی کے اس ایکٹ سے صاف ترغیب ہے۔

ایکٹ ۱۵ ۱۸۵۶ء

ایکٹ ۱۵ ۱۸۵۶ء درباب بیوہ ہنود کے رسوم مذہبی میں خلل ڈالتا تھا گو اس میں بڑی بڑی بحثیں ہوئیں اور مشورے بھی لئے گئے مگر ہندو لوگ جو مذہب سے زیادہ پابند رسم و رواج کے ہیں اس ایکٹ کو نہایت ناپسند کرتے تھے بلکہ باعث اپنی ہتک عزت اور بربادی خاندان کا جانتے تھے اور یوں بدگمانی کرتے تھے کہ یہ ایکٹ اس مراد سے جاری ہوا ہے کہ ہنود کی بیوائیں خود مختار ہو جائیں اور جو چاہیں سو کرنے لگیں۔

بعض قوانین خلافِ مذہب

چند ایکٹ اور قانون ایسے ہیں کہ جن کی رُو سے باوصف متحدالمذہب ہونے متخاصمین کے برخلاف ان کے مذہب کے مقدمات دیوانی عدالت سے فیصل ہوتے تھے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہماری گورنمنٹ کسی مذہب کی طرفداری کرے۔ مختلف مذہب ہونے کی صورت میں بلاشبہ انصاف کا لحاظ چاہیئے بشرطیکہ وہ انصاف دونوں مذہبوں کے یا دونوں اہل مقدمہ کے معاہدے کے برخلاف نہ ہو۔ جب طرفین متحدالمذہب ہیں تو ضرور ہے کہ انہی کے مذہب یا انہی کے رسم و رواج کے مطابق مقدمات حقوق متعلقہ دیوانی کے فیصل ہوں۔

ضبطی اراضی لاخراج

قوانین ضبطی اراضیات لاخراج جس کا آخر قانون ۲ ۱۸۱۹ء ہے حکومت ہندوستان کو نہایت مضر تھا۔ ضبطی اراضیات نے جس قدر رعایائے ہندوستان کو ناراض اور بدخواہ ہماری گورنمنٹ کا کر دیا تھا اس سے زیادہ اور کسی چیز نے نہیں کیا تھا۔ سچ فرمایا تھا لارڈ منرو اور ڈیوک آف ولنگٹن صاحب بہادر

نے کر ضبط کرنا معافیات کا ہندوستانیوں سے دشمنی پیدا کرتی اور ان کو محتاج کر دیتا ہے میں بیان نہیں کر سکتا کہ ہندوستانیوں کو کس قدر ناراضی اور دلی رنج اور ہماری گورنمنٹ کی بدخواہی اور زیر کتنی مصیبت اور تنگی معاش اس سبب سے ان کو تھی۔ بہت سی معافیات صدہا سال سے چلی آتی تھیں وہ ادنیٰ ادنیٰ حیلے پر ضبط ہو گئیں۔ ہندوستانی صاف خیال کرتے تھے کہ سرکار نے خود تو ہماری پرورش نہیں کی بلکہ جو جاگیر ہم کو اور ہمارے بزرگوں کو اگلے بادشاہوں نے دی تھیں وہ بھی گورنمنٹ نے ہم سے چھین لیں۔ پھر تو ہم کو اور کیا توقع گورنمنٹ سے ہے۔ ضبطی اراضیات کے باب میں اگر ہماری گورنمنٹ کے طرف سے یہ عذر صحیح اور واقعی یہی سمجھا جاوے کہ اگر ضبطی اراضیات لاخراجی نہ ہوتی تو واسطے پورا کرنے اخراجات گورنمنٹ کے جس کو نہایت کفایت شعاری سے مان لینا چاہیے ہندوستانی آدمیوں سے اور کسی محصول کے لینے کی تدبیر کرنی پڑتی مگر رعایا کو اس سے کسی طرح پر تسلی اور جو مصیبت کہ ان پر پڑی اس کا دفعیہ نہیں ہو سکتا۔ دیکھو اس زمانے میں جہاں جہاں باغیوں نے اشتہارات واسطے بہکانے اور ورغلانے رعایا کے جاری کیے ہیں سب میں بجز دو باتوں کے یعنی مداخلت مذہبی اور ضبطی معافیات کے اور کسی چیز کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے بخوبی ثابت ہے کہ یہ دونوں باتیں اصلی منشا اور بہت بڑا سبب ناراضی اہل ہند کا تھا علی الخصوص مسلمانوں کا جن کا یہ نقصان بہت زیادہ بہ نسبت ہندوؤں کے پہنچا تھا۔

نیلام زمینداری

اگلی عملداریوں میں بلاشبہ حقیقت زمینداری کی خانگی بیع اور رہن اور ہبہ کا دستور تھا مگر یہ بہت کم ہوتا تھا اور جہاں تک ہوتا تھا برضامندی اور خوشی ہوتا تھا بعلت تمام باقی یا بعلت قرضہ جبراً اور تحکماً نیلام حقیقت کا کبھی نہیں ہوا۔ ہندوستان میں زمیندار اپنی موروثی زمینداری کو بہت عزیز سمجھتے ہیں اس کے زوال سے ان کو کمال رنج ہوتا ہے۔ اگر خیال کیا جاوے تو ہندوستان میں ہر

ایک محال زمینداری کا ایک چھوٹی سی سلطنت دکھائی دیتی ہے۔ قدیم سے سب کی رضامندی سے ایک شخص سردار ہوتا ہے وہ ایک بات تجویز کرتا تھا اور ہر ایک حقیقت دار لبقدر اپنے حصہ زمینداری کے بولنے کا اور دخل دینے کا اختیار ہوتا تھا۔ رعیت باشندہ وہ کے چودھری بھی حاضر ہوکر کچھ کچھ گفتگو کرتے تھے۔ اگر کسی مقدمے نے زیادہ طول پکڑا تو کسی بڑے گاؤں کے مقدم اور سردار کے حکم سے فیصلہ ہوگیا۔ ہندوستان کے ہر ایک گاؤں میں بہت خاصی صورت ایک چھوٹی سی سلطنت اور پارلیمنٹ کی موجود تھی۔ بے شک بادشاہ کو جس قدر اپنی سلطنت جانے کا رنج ہوتا تھا اتنا ہی زمیندار کو اپنی زمینداری جانے کا غم تھا ہماری گورنمنٹ نے اس کا مطلق خیال نہ کیا۔ ابتدائے عملداری سے آج تک شاید کوئی گاؤں باقی ہوگا جس میں تھوڑا بہت نہ انتقال ہوا ہو۔ ابتدا ابتدا میں ان نیلاموں نے ایسی بے ترتیبی سے کثرت پکڑی کہ تمام ملک الٹ پلٹ ہوگیا۔ پھر ہماری گورنمنٹ نے اس کے تدارک کو قانون اول ۱۸۲۱ء جاری کیا اور ایک کمیشن مقرر ہوا۔ اس سے اور صدہا قسم کی خرابیاں برپا ہوگئیں۔ یہاں تک کہ یہ کام حسب دلخواہ انجام نہ ہوسکا اور آخر کار یہ محکمہ بند ہوگیا۔

اس مقام پر ہم یہ گفتگو کرنی نہیں چاہتے کہ سرکار وصول مال گزاری کا یہ قاعدہ مقرر نہ کرتی تو پھر کیا کرتی، اور جب کہ زمین مال گزاری سرکار میں مستغرق اور اس کی ذمہ دار سمجھی جاتی ہے کیوں نہیں نیلام ہوتی کیونکہ ہم اس مقام پر صرف یہ بات بیان کرتے ہیں کہ سرکشی کے یہ اسباب ہوئے خواہ ان سببوں کا ہونا یہ مجبوری ہوا خواہ ناواقفی سے۔ اور اگر اس کی بحث دیکھنی ہوتی ہو تو ہماری دوسری رائے طریقہ انتظام ہندوستان میں ہے۔ اس کو دیکھو۔ مگر اتنی بات یہاں لکھ دیتے ہیں کہ زمین کا مال گزاری میں مستغرق سمجھنا بہت قابل مباحثہ ہے۔ درحقیقت دعویٰ سرکار کا پیداوار پر ہے نہ زمین پر۔

بموجب زرِ قرضہ نیلام حقیقت کے رواج نے بہت سے فساد برپا کیے۔ مہاجنوں

اور روپے والوں نے دم دے کر زمینداروں کو روپیہ دیئے اور قصداً ان کی زمینداری چھیننے کو بہت فریب برپا کئے اور دیوانی میں ہر قسم کے جھوٹے سچے مقدمات لگائے اور قدیم زمینداروں کو بے دخل کیا اور خود مالک بن گئے۔ ان آفات نے تمام ملک کے زمینداروں کو ہلا ڈالا۔

سختی بندوبست بندوبست مال گزاری جو ہماری گورنمنٹ نے کیا نہایت قابلِ تعریف ہے۔ مگر اگلے بندوبستوں کی نسبت سنگین ہے اگلی عملداریوں میں لبطور خام تحصیل مال گزاری لی جاتی تھی۔ شیر شاہ نے ایک تہائی پیداوار کا حصہ گورنمنٹ مقرر کیا تھا۔ کچھ شک نہیں کہ اس طریقے میں بہت مشکلیں تھیں اور گورنمنٹ کو نقصان بھی متصور تھا مگر کاشتکار سب آباد رہتے تھے کسی کو ٹوٹا دینا نہ پڑتا تھا۔ اکبر اول نے اسی بندوبست کو یعنی پیداوار کا تہائی حصہ لینا پسند کیا اور اسی کو جاری کیا مگر بندوبست پختہ کر دیا جس کا ذکر لارڈ الفنسٹن صاحب کی عمدہ تاریخ میں مندرج ہے۔ اور آئینِ اکبری میں بھی اس کا بیان ہے اکبر نے یہ اقسام زمین کے مقرر کیے:۔

اول۔ قسم کی زمین ہے جس کا نام پولج تھا اور ہر سال بوئی جاتی تھی برابر مالگزاری کا حصہ لیا جاتا تھا۔

دوم۔ قسم کی زمین جس کا نام پڑوتی تھا اور ہمیشہ کاشت نہ ہوتی تھی بلکہ چندے واسطے زور بڑھانے کے چھوڑ دیتے تھے۔ اس زمین سے انھیں سالوں کی بابت مالگزاری لی جاتی تھی جس میں وہ کاشت ہوتی تھی۔

سوم۔ قسم کی زمین جس کا نام چچر تھا اور تین چار برس سے بے ترود تھی اور اس کی درستی کے لیے خرچ بھی درکار ہوتا تھا۔ اول سال زراعت میں کچھ لیا جاتا تھا اور پھر بڑھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ پانچویں میں پورا ہوتا تھا۔

چہارم۔ قسم زمین جس کا نام بنجر تھا اور پانچ برس سے زیادہ بے ترود پڑی تھی۔

اور بھی ملائم شرطیں تھیں۔ اس خام بندوبست کا نقدی سے بدلنا اس طرح پر تھا کہ پیداوار اور بیگھ کی اور ہر قسم زمین کی اوسط کے حساب سے غلے کے وزن نکالی جاتی تھی۔ مثلاً بیگھہ پیچھے نو من غلے کی اوسط پیداوار نکالی اور تین من غلہ اس بیگھ کا کاشتکار سے لینا حصہ گورنمنٹ ٹھہر گیا۔ پھر اوسط نرخ ناموں سے قیمت غلہ قرار دی گئی اور وہ نقدی اس بیگھہ کی ٹھہر گئی۔ پھر اس میں بڑی رفاہ یہ تھی کہ اگر کاشتکار بعوض نقدی گرانی نرخ سمجھ کر تین من غلہ دے دے تو اس کو اختیار تھا۔ سرکاری بندوبست میں ان میں سے بہت باتوں کا خیال نہیں رہا۔ افتادہ زمین پر برابر محصول لگ گیا۔ جن زمینوں کا زور بڑھانے کو کچھ دنوں افتادہ رکھنا تھا اس کی منہائی نہیں ہوئی۔ ہر سال برابر جوتے جانے سے زور کم ہوتا گیا۔ پیداوار کم ہونے لگی۔ جو حساب کہ بندوبست کے وقت لگایا تھا وہ نہ رہا۔ اکثر اضلاع میں ہر ایک بندوبست سخت ہوگیا۔ زمینداروں کاشتکاروں کو نقصان عائد ہوئے۔ رفتہ رفتہ وہ بے سامان ہوگئے زراعت کا سامان بہت کم ہوگیا اور اس سبب سے جو زمین کاشت کرتے تھے وہ جیسا کہ چاہیے کمائی نہ گئی۔ اس سبب سے بھی کم پیداوار ہوئی۔ ادائے مال گزاری کے لئے وہ قرضدار ہوئے سود و قرضہ زیادہ ہونے لگا۔ بہت سے زمیندار و مال گزار جو بہت اچھا سامان اور معقول خرچ رکھتے تھے مفلس ہوگئے جن دیہات میں افتادہ زمین سوا تھی وہ اور زیادہ خراب ہوگئی ازیں ٹامسن صاحب بہادر اپنے ہدایت نامہ کی دفعہ ٦٤ میں لکھتے ہیں کہ آئین نہم ۱۸۳۳ء کے بندوبست میں علی العموم یہ بات نظر آتی ہے کہ اچھے دیہات کی جمع کچھ نرم تجویز ہوئی اور خراب دیہات کی جمع سنگین ہوگئی۔ زمینداروں کی ناجائز منفعتیں جاتی رہیں۔ اگرچہ یہ بات بہت اچھی تھی مگر بندوبست کے وقت اس کی رعایت چاہیے تھی جو نہ ہوئی۔ غرض ان اسباب سے زمینداروں اور کاشتکاروں کو مفلسی نے گھیر لیا تھا جس کے سبب باوجود اس امن اور آسائش کے جو زمینداروں کو تھی

ان کے دل سے پچھلی عملداریوں کی یاد بھولتی نہ تھی۔

تعلقہ داریوں کا شکست علی الخصوص اودھ میں

تعلقہ داری بندوبست کا شکست کر دینا اگرچہ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس میں کچھ ناانصافی ہوئی عمدہ سبب فساد کا ہوا خصوصاً ملک اودھ میں یہ تعلقہ دار راجہ بنے ہوئے تھے اپنی تعلقہ داری کے دیہات میں حکومتیں کرتے تھے نفع اٹھاتے تھے وہ بادشاہت اور منفعت ان کی دفعتاً جاتی رہی۔ اس باب میں بھی کہ اگر سرکار یہ نہ کرتی تو اصل زمینداروں کو ان ظالموں کے ہاتھ سے کبھو نکرز کالتی۔ اس مقام پر بحث نہیں کرنے کے بلکہ اس کی بحث ہماری دوسری رائے میں ہے۔ یہاں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ شکست تعلقہ داری بھی سرکشی ہے۔

دیوانی عدالت کا انتظام پنجاب سے اچھا ہے مگر اصلاح طلب ہے

دیوانی عدالت کا انتظام جو پریسیڈنسی بنگال اور آگرہ میں ہے وہ نہایت شائستہ ہے اس کو اس غدر میں کچھ مداخلت نہیں میں جانتا ہوں کہ اکثر حکام کی رائے اس کے برخلاف ہوگی اور پنجاب کے انتظام کو پسند کرتے ہونگے مگر یہ گفتگو نہایت قابلِ بحث ہے قانون پنجاب کا ایک مجمل مطلب ہے انہی قوانین کا جو اس ملک میں جاری ہیں ان کے بسط اور پھیلاؤ اور عمل درآمد کے واسطے قواعد متقرر نہیں ہیں۔ ہر حاکم اس میں خودمختار ہے۔ سب حاکموں کی رائے سلیم ہونی ضروری نہیں ہے پھر اس میں کس قدر خرابیاں انجام کو پڑنی متصور ہیں۔ دیوانی کا محکمہ سب محکموں سے زیادہ تر عمدہ ہے جس پر نہایت اہتمام چاہیئے۔ یہی محکمہ ہے جس پر آبادی ملک اور اجرائے تجارت اور افزونی بیخ بنیاد و استحکام حقوق منحصر ہیں۔ پنجاب میں یہ محکمہ نہایت کم قدر ہو رہا ہے حکام مطلق متوجہ نہیں بلکہ ہم کہتے ہیں کہ متوجہ ہونے کی فرصت نہیں جس قدر مقدمات

غور طلب بہ سبب انتقالات اور معاملات کثیر اور بہ سبب زیادہ مدت ہو جانے عملداری
سرکار کے اس ملک میں ان ملکوں کی عدالتوں میں درپیش ہوتے ہیں۔ وہ ابھی تک
پنجاب میں نہیں اور جب ہوں گے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ قوانین پنجاب اُن کی
درستی سے فیصلہ کرنے کو کافی نہیں۔ اس غدر میں دیوانی عدالت کا جس قدر اثر پایا جاتا
ہے وہ صرف اتنا ہے۔ اوّل انتقالات حقیقت۔ دوم مقروض ہونا یا مدیون ڈگری ہونا
لوگوں کا کہ یہ دونوں باتیں آپس کے فساد کے باعث ہوئیں نہ مقابلہ سرکار کی ان باتوں
سے آپس میں دلی رنج تھا اور یہ قاعدہ ہے کہ جب عملداری کو سستی ہوتی ہے آپس
کے تنازعہ سے فسادات برپا ہوتے ہیں۔ پھر ان دونوں باتوں میں جو لوگوں کو آپس
میں رنج تھا سب سے بڑا اس کا سبب یہ تھا کہ انتقالات ناواجبی اور قرضہ ناجائز لوگوں
کے سر پر ہو گیا تھا۔ وہ جھوٹی ڈگریوں سے ہو گئے تھے اور اسی سبب دیوانی عدالت پر
الزام لگایا جاتا ہے۔ خیال کرنا چاہیے کہ جس قدر کم توجہی اور ابتری اور سرسری تحقیقات
اور خود اختیاری حکام مجوزہ مقدمات دیوانی کی پنجاب میں ہے وہ بہت اس سے زیادہ
خرابیاں پیدا کرے گی۔ دیوانی عدالت کی تاثیر دس برس میں ظاہر نہیں۔ پچاس برس
بعد پنجاب کو ممالک مغربی شمالی کے انتظام اور تاثیر عدالت دیوانی سے مقابلہ کرنا چاہیے
نہ اب ہم اس بات کو منظور کرتے ہیں کہ پریسی ڈنسی بنگال اور آگرے کا قانون مطلق مقدمات
دیوانی قابلِ اصلاح ہے۔ انفصال مقدمات میں بہت تاثیر ہوتی ہے۔ اسٹامپ کے
بیش قیمت ہونے سے اپیل کے ہر مقدمے میں بہت سے درجات قائم ہونے سے لوگوں
کو زیرباری ہے۔ حکام دیوانی کو بعض قسم کا اختیار نہ دینے سے انفصال مقدمات میں
ہرج تھا۔ سو اس کو ایکٹ ۱۹ ۱۸۵۳ء نے کچھ کچھ رفع کیا۔ اور جس قدر باقی ہے وہ
قابلِ اصلاح ہے۔ اس میں اگر زیادہ گفتگو دیکھنی منظور ہو ہماری دوسری رائے کو جو
درباب انتظام ہندوستان ہے اس کو ملاحظہ کرو۔

معلوم ناواقفیت گورنمنٹ حال رعایا

اس میں کچھ شک نہیں کہ ہماری گورنمنٹ کو رعایا کے حالات اور اطوار اور رنج جو دکھ اُن کو تھے اُن کی اطلاع نہ تھی اور اطلاع نہ ہونے کا کیا سبب تھا؟ کیونکہ حالات اور اطوار کی اطلاع اختلاط اور ارتباط اور باہم آمد و رفت بے تکلفانہ سے ہوتی ہے اور یہ بات جب ہوتی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم میں مل جل کر اور محبت اور اخلاص پیدا کر کر بطور ہم وطنوں کے توطن اختیار کرے۔ جیسا کہ مسلمان غیر مذہب اور غیر ملک کے رہنے والوں نے ہندوستان میں توطن اختیار کر کے پیدا کیا اور غیر ملکیوں سے برادرانہ راہ و رسم پیدا کی۔ مگر درحقیقت ہماری گورنمنٹ کو یہ بات جو اصلی سبب رعایا کے حالات کی اطلاع کا ہے حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ اس طرح کی سکونت متکلفانہ ہماری کو ہونی متخیل ہے۔ اب رہی یہ بات کہ رعایا خود اپنے مصائب کی اطلاع کرتی تو اس کا قابو رعایا کو نہ تھا کیونکہ رعایا سے ہندوستان کو تجاویز گورنمنٹ میں ذرا بھی مداخلت نہ تھی۔ اور اگر کسی نے کچھ بے قاعدہ کوئی عرضی پرچہ بھیجا یا بحضور نواب گورنر جنرل بہادر پیش کیا وہ بطور استغاثہ تصور کیا گیا نہ بطور استحقاق مداخلت تجاویز گورنمنٹ میں اور اسی لئے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوا۔ اب ضرور ہوا کہ کوئی اور شخص حالات رعایا کی اطلاع گورنمنٹ میں کرے وہ اطلاع منحصر تھی حکام متعہد اضلاع کی رپورٹ پر وہ خود اس سے ناواقف تھے اور کوئی راہ نہ تھی ان کے اطلاع حاصل ہونے کو اور ان کی عدم توجہی اس باب میں اور ان کی نازک مزاجی ایک مشہور بات ہے اُن کے رعب سے ڈرتے تھے کسی کو سچی بات علی الخصوص وہ کہ جو مخالف طبع اور مزاج حاکموں کے ہوتی تھی کہنے کا مقدور نہ تھا۔ ہر شخص ملازم اور درباری رئیس سب ڈر کے مارے خوشامد کی بات کہتے تھے اور ہماری گورنمنٹ نے جو درحقیقت گورنمنٹ نوعیہ ہے ان باتوں سے گورنمنٹ شخصیہ کی صورت پیدا کی تھی۔ پھر یہ طریقہ اطلاع حالات رعایا کا بذریعے حکام اضلاع

ناکافی ہی نہ تھا بلکہ درحقیقت معلوم تھا۔ اس لیے حالات رعایا کے ہمیشہ ہماری گورنمنٹ سے مخفی رہے جو نیا قانون گورنمنٹ نے جاری ہوا اس سے جو مضرت رعایا کے حال اور رفاہ اور فلاح کو پہنچی اس کا رفع کرنے والا اور اس کی خبر دینے والا کوئی نہ تھا اس قسم کے امور میں کوئی غمخوار رعایا کا نہ تھا بجز ان کے لہو کے جو جل جل کر ان کے بدن میں رہتا تھا اور بجز ان کی بے کسی کے جس پر وہ آپ رو رو کر چپ رہتے تھے۔

مفلسی ہندوستان علی الخصوص مسلمانوں کی

مفلسی اور تنگی معاش ہندوستان کی رعایا کو ہماری گورنمنٹ کی حکومت میں کیوں نہ ہوتی۔ سب سے بڑی معاش رعایائے ہندوستان کی نوکری تھی اور یہ ایک پیشہ گنا جاتا تھا۔ اگرچہ ہر ایک قوم کے لوگ روزگار نہ ہونے کے شاکی تھے مگر یہ شکایت سب سے زیادہ مسلمانوں کو تھی۔ غور کرنا چاہیے کہ ہندو جو اصلی باشندہ اس ملک کے ہیں زمانہ سلف میں ان میں سے کوئی شخص روزگار پیشہ نہ تھا بلکہ سب لوگ ملکی کاروبار میں مصروف تھے۔ برہمن کو روزگار سے کچھ علاقہ نہ تھا بیں برن جو کہلاتے ہیں وہ ہمیشہ بیوپار اور مہاجنی میں مصروف تھے۔ چھتری جو اس ملک کے کسی زمانے میں حاکم تھے پرانی تاریخوں سے ثابت ہے کہ وہ بھی روزگار پیشہ نہ تھے بلکہ زمین سے اور ایک ایک ٹکڑہ زمین کی حکومت سے بطور بھیا چارہ علاقہ رکھتے تھے۔ سپاہ انکی ملازم نہ تھی بلکہ بطور بھائی بندی کے وقت پر جمع ہو کر لشکر آراستہ ہوتا تھا۔ جیسا کہ کچھ تھوڑا سا نمونہ روس کی مملکت میں پایا جاتا ہے۔ البتہ قوم کایت اس ملک میں قدیم سے روزگار پیشہ دکھلائی دیتے ہیں۔ مسلمان اس ملک کے رہنے والے نہیں ہیں اگلے بادشاہوں کے ساتھ بوسیلۂ روزگار کے ہندوستان میں آئے اور یہاں توطن اختیار کیا اس لیے سب کے سب روزگار پیشہ تھے اور کمی روزگار سے ان کو زیادہ تر شکایت بہ نسبت اصلی باشندوں اس ملک کے تھی۔ عزت دار سپاہ کا روزگار

جو یہاں کی جاہل رعایا کے مزاج سے زیادہ تر مناسبت رکھتا ہے ہماری گورنمنٹ میں بہت کم تھا۔ سرکاری فوج جو غالباً مرکب تھی تلنگوں سے اس میں اشراف لوگ نوکری کرنی معیوب سمجھتے تھے۔ سواروں میں البتہ اشرافوں کی نوکری باقی تھی مگر وہ تعداد میں اس قدر قلیل تھی کہ اگلی سپاہ سوار سے اس کو کچھ بھی نسبت نہ تھی۔ علاوہ سرکاری نوکری کے اگلے عہد کے صوبہ داروں اور سرداروں اور امیروں کے ہاں کے نوکر ہوتے تھے کہ ان کی تعداد بھی کچھ کم خیال کرنی نہیں چاہیئے۔ اب یہ بات ہماری گورنمنٹ میں نہیں ہے اس سبب سے رعایا کو حد سے زیادہ قلت روزگار تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب باغیوں نے لوگوں کو نوکر رکھنا چاہا ہزارہا آدمی نوکری کو جمع ہو گئے اور جیسے بھوکا آدمی محط کے دنوں اناج پر گرتا ہے اسی طرح یہ لوگ نوکریوں پر جا گرے ؎

ملحد گرسنہ در خانہ خالی بر خوان

عقل باور نہ کند کز رمضاں اندیشہ

بہت سے آدمی صرف آنہ ڈیڑھ آنہ روزمیہ پر نوکر ہوئے تھے اور بہت سے آدمی بالعوض یومیہ کے سیر ڈیڑھ سیر اناج پاتے تھے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کی رعایا جیسی نوکری کی خواہش مند تھی ویسی ہی مفلسی اور ناداری سے محتاج اور تنگ تھی۔

صرف مفلسی کے سبب سے رعایا کا تبدل عملداری چاہنا

لوگ معاش سے بھی تنگ تھے اور یہ ایک اصلی سبب ناراضی رعایا کا گورنمنٹ سے تھا۔ لوگوں کے دل جو تبدل عملداری کو چاہتے تھے اور نئی عملداری کے راغب اور دل سے اس سے خوش تھے۔ میں بہت سچ کہتا ہوں کہ اسی سبب سے تھے۔ ہم سچ کہتے ہیں اور پھر ہم کہتے ہیں کہ ہم بہت سچ کہتے ہیں جب افغانستان سرکار نے فتح کیا لوگوں کو بڑا غم ہوا۔ کیا سبب تھا صرف یہ تھا کہ اب مذہب پر علانیہ دست اندازی ہوگی جب گوالیار فتح ہوا، پنجاب فتح ہوا

اودھ لیا گیا لوگوں کو کمال رنج ہوا۔ کیوں ہوا اس لئے ہوا کہ ان کے پاس کوئی ہندستانی عملداریوں سے ہندوستانیوں کو بہت آسودگی تھی نوکریاں اکثر ہاتھ آتی تھیں ہر قسم کی ہندوستانی اشیا کی تجارت بہ کثرت تھی۔ ان عملداریوں کے خراب ہونے سے زیادہ افلاس اور محتاجی ہوتی جاتی تھی، ہماری گورنمنٹ کی عملداری میں خوبیاں اور بھلائیاں بھی حد سے زیادہ تھیں ہیں سب پر عیب نہیں لگاتا بقول شخصے ؎

عیب مے جملہ بہ گفتی ہنرش نیز بلو
نفی حکمت مکن از بہر دل عامے چند

امن اور آسائش اور آزادی۔ رستوں کا صاف ہونا۔ ڈاکوؤں، رہزنوں، ٹھگوں کا نیست و نابود ہونا، سڑکوں کا آراستہ ہونا، مسافروں کی آسائش، بیوپاریوں کا مال دور دور بھیجنا، غریب اعلیٰ اور ادنیٰ کے خطوط دور دست ملکوں میں برابر پہنچنا، خوں ریزی اور خانہ جنگی کا بند ہونا، زبردست کا زور ٹوٹنا اور اسی قسم کی بہت سی باتیں ایسی اچھی ہیں کہ کسی عملداری میں نہ ہوئی ہیں نہ ہوں گی۔ مگر غور کرو کہ ان باتوں سے وہ مصیبت جس کا ہم ذکر کرتے ہیں نہیں جاتی۔ ایک اور بات دیکھو کہ یہ نفع عملداری کا جو مذکور ہوا کن لوگوں کو زیادہ تر تھا اول عورتوں کو کہ سب طرح آسائش میں تھیں، خانہ جنگی میں اولاد کا مارا جانا۔ چور ٹھگوں کے ہاتھ لٹنا عاملوں کے ہاتھ سے خاوندوں اور بچوں کا محفوظ رہنا اور ہر طرح کے مصائب سے محفوظ تھیں۔ پھر دیکھو کس قدر خیر خواہ اور مداح سرکار کی عملداری کی تھیں۔ مہاجن اور تجارت پیشہ لوگ بہت آسائش سے تھے۔ پھر ان میں کوئی بھی بدخواہ نہ تھا۔ حاصل یہ کہ جن لوگوں کو عملداری سرکار سے نقصان نہیں پہنچا تھا ان میں سے کوئی بدخواہ نہ تھا۔

پچھلی عملداریوں میں جبتک ہندوستانیوں سے محبت نہ ہوئی آسائش نہیں ہوئی

ہندوستان کی پچھلی سلطنتوں کا حال دیکھو اول ہندستان پر مسلمانوں نے فتح پائی بزرگوں

اور پٹھانوں کی سلطنت میں ہندوستان کی رعایا سے محبت اور میل جول نہ ہوا جب تک آسائش اور آسودگی سلطنت نے صورت نہ پکڑی مغلیہ کی سلطنت میں اکبر اوّل کے عہد سے یہ ملاپ بخوبی شروع ہوا اور شاہجہاں کے وقت تک بدستور رہا۔ باوجودیکہ اس زمانے میں بھی رعایا کو بدنظمی اصولِ سلطنت کے سبب تکلیفیں پہنچتی تھیں مگر وہ زخم مندمل ہوجاتا تھا اس برادرانہ محبت سے جو آپس میں تھی لیکن عالمگیر کے عہد میں یہ محبت ٹوٹ گئی اور بہ سبب مقابلہ اور سرکشی قومِ ہنود کے مثل سیواجی مرہٹہ وغیرہ کے عالمگیر جملہ قومِ ہنود سے ناراض ہوا اور اپنے صوبہ داروں کے نام حکم بھیجے کہ جملہ قوم ہنود کے ساتھ بہ سختی گیری پیش آوے اور ہر ایک سے جزیہ لے۔ پھر جو مضرت اور ناراضی رعایا کو ہوئی وہ ظاہر ہے۔ غرضیکہ ہماری گورنمنٹ نے سو برس کی عملداری میں بھی رعایا سے محبت اور الفت پیدا نہ کی۔

ہندوستانیوں کی بے توقیری

اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ رعایا کو باعزت رکھنا اور ان کی تالیف کرنا یعنی ان کے دلوں کو ہاتھ میں رکھنا بہت بڑا سبب ہے پائداری گورنمنٹ کا تھوڑا ملے اور آدمی کی عزت ہو تو وہ بہت زیادہ خوش ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ بہت ملے اور تھوڑی عزت ہو۔ بے عزتی کرنی کسی کی ایسی بد چیز ہے کہ آدمی کے دل کو دکھاتی ہے۔ یہی چیز ہے کہ بغیر ظاہری نقصان پہنچائے عداوت پیدا کرتی ہے اور اس کا ایسا گہرا زخم ہوتا ہے کہ کبھی نہیں بھرتا ہے

جراحات اللسان لها التیام

ولا یلتام ما جر اللسان

تالیف کی خاصیت اس کے برخلاف ہے یہ وہ چیز ہے کہ اس سے دشمن دوست ہوجاتا ہے اور دوستوں کی محبت زیادہ ہوتی ہے۔ بے گانہ یگانہ ہوتا ہے۔ یہی چیز ہے کہ جس سے وحشی جنگل کے جانور چرند و پرند تابعدار ہوتے ہیں۔ پھر اگر رعایا کے ساتھ ہو تو وہ کس قدر مطیع اور فرمانبردار ہوں گے۔ ابتدا کے عملداری میں یہ چیز تھی کہ جس نے سب کے دلوں

کو ہماری گورنمنٹ کی طرف سے کھینچ لیا تھا ایک دلی اطاعت پیدا کردی تھی بیشک ہماری گورنمنٹ ان باتوں کو بھول گئی۔ بلاشبہ تمام رعایا ہندوستان کی اس بات کی شاہد ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ان کو نہایت بے قدر اور بے وقر کردیا ہے۔ ہندوستان کے اشراف آدمی کی ایک چھوٹے سے یورپین کے سامنے ایسی بھی قدر نہیں ہے جیسی کہ ایک چھوٹے یورپین کی ایک بہت بڑے ڈیوک کے سامنے یوں تصور کیا جاتا تھا کہ ہندوستان میں کوئی جنٹلمین نہیں ہے۔

حکام اضلاع کی سخت مزاجی اور بدزبانی

یہ سب باتیں یعنی محبت اور الفت اور عزت اور تالیف رعایا کی گورنمنٹ کی طرف سے ظاہر ہوتی ہے بہ وسیلہ ان حکام متعہد کے جو ہماری گورنمنٹ کی طرف سے ہندوستان میں کاربردازی اور رعایا سے معاملہ اور میل جول اور ملاقات رکھتے ہیں، گورنمنٹ کا ارادہ کیسا ہی نیک ہو وہ کبھی ظاہر نہ ہوگا جب تک یہ لوگ اس کے ظاہر کرنے پر کمر نہ باندھیں۔ اگلے حکام متعہد کے عادات اور روش اور اخلاق بہت برخلاف تھے۔ حال کے حکام متعہد سے وہ پہلے لوگ بہت عزت کرتے تھے ہندوستانیوں کی ہر طرح خاطر داری سے پیش آتے تھے ان کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے دوستانہ ان کے رنج و راحت کے شریک ہوتے تھے باوجودیکہ بہت بڑی سرداری اور حکومت ہندوستان میں رکھتے تھے اور تحشم اور رعب اور دبدبہ جو شایان حکومت ہے وہ بھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے پھر ایسی محبت اور عزت ہندوستانیوں کی کرتے تھے کہ ہر شخص مل کر ان کے اخلاق اور ان کی محبت کا فریفتہ ہوجاتا تھا اور تعجب سے کہتا تھا کہ یہ کیسے اچھے لوگ ہیں کہ باوصف اس حشمت و شوکت اور حکومت کے بے غرور ہیں اور کس طرح اخلاق سے ملتے ہیں۔ ہندوستان میں جو لوگ بزرگ گنے جاتے تھے ان سے اسی طرح پیش آتے تھے بیشک ان لوگوں نے بطرس مقدس کی پیروی کی تھی اور برادرانہ محبت اور اس برادرانہ

محبت پر الفت بڑھاتی تھی حال میں جو حکام متعہد ہیں ان میں سے اکثروں کی طبیعت اس کے برعکس ہیں۔ کیا ان کے غرور اور تکبر نے تمام ہندوستانیوں کو ان کی آنکھوں میں ناچیز نہیں کر دیا ہے کہ ان کی بدمزاجی اور بے پروائی نے ہندوستانیوں کے دل میں بے جا دہشت نہیں ڈالی ہے کیا ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم ہے کہ بڑے سے بڑا ذی عزت ہندوستانی حکام سے لرزاں اور بے عزتی کے خوف سے ترساں نہ تھا اور کیا یہ بات چھپی ہوئی کہ ایک اشراف اہلکار صاحب کے سامنے مثل پڑھ رہا ہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر بایا کرتا ہے اور صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں روتا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس روٹی اور کہیں نہیں ملتی اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے۔

مسلمانوں کو یہ باتیں زیادہ ناگوار تھیں اور اس کا سبب	اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ یہ باتیں ہر

ایک قوم کے لوگوں کو ناگوار تھیں مگر مسلمانوں کو بہت زیادہ گراں گزرتی تھیں۔ اس کا سبب بہت روشن ہے کہ صدہا سال سے مسلمان ہندوستان میں بھی باعزت چلے آتے ہیں ان کی طبیعت اور جبلت میں ایک غیرت ہے دل میں لالچ روپے کی بہت کم ہے کسی لالچ سے عزت کا جانا نہیں چاہتے بہت تجربہ ہوا ہوگا کہ اور قوم میں جو باتیں بغیر رنج کے اٹھا لیتے ہیں مسلمانوں کو اس سے بھی ادنی بات کا اٹھانا نہایت مشکل ہوتا تھا ہم نے مانا کہ مسلمانوں میں یہ خصلتیں بہت بری ہی سہی مگر مجبوری ہے۔ خدا نے جو طبیعت بنائی ہے وہ بدلی نہیں جاتی اس میں مسلمانوں کی بدبختی سہی مگر کچھ قصور نہیں۔ یہی رنج تھے جن کے باعث تبدیل عملداری کو دل چاہتا تھا سرکار کے برخلاف خبریں سن کر دل خوش ہوتا تھا مگر افسوس یہ ہے کہ ہماری گورنمنٹ کو مسلمانوں کی بھلائی سے اغماض نہ تھا ان کی لیاقت اور تعلیم ان کا ادب سب پیش نظر تھا مگر یہ لوگ اس سے بے خبر تھے اور ہماری

گورنمنٹ کا ارادہ اور دلی نیت حکام کے وسیلے سے ظاہر نہیں ہوتا تھا۔

ہندوستانیوں کی ترقی کا نہ ہونا

اہل ہند علی الخصوص مسلمانوں کی ناراضی کا بڑا سبب یہ تھا کہ اعلیٰ عہدہ جات پر ترقی بہت کم تھی بہت ہی کم زمانہ گزرا ہے کہ یہ لوگ تمام ہندوستان معزز تھی۔ بڑے بڑے عہدے پاتے تھے۔ ان کا عزم اور ان کا ارادہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ اسی طرح اپنی قدر و منزلت کی ترقی چاہتے تھے اور ظاہر میں کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ابتدائے عملداری سرکار میں جو لوگ خاندانی اور معزز تھے وہ منتخب ہو کر معزز عہدے پاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ بات نہ رہی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ان لوگوں میں چنداں لیاقت نہ تھی اس لئے امتحان کا قاعدہ ہماری رائے میں کسی طرح قابلِ الزام کے نہیں اور نہ درحقیقت کسی کو اس کا رنج ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ امتحان سے عمدہ اہلکار ہاتھ آئے، مگر ایسے ایسے لوگ ان معزز عہدوں پر مقرر ہو گئے جو ہندوستانیوں کی آنکھوں میں نہایت بے قدر تھے بسارٹیفکٹ ملنے میں خاندانی اور ذی عزت ہونے کا بہت کم لحاظ رہا جس قدر ہندوستانیوں کی ترقی لارڈ بنٹنگ صاحب بہادر نے کی اس سے زیادہ پھر نہیں ہوئی۔ کچھ شک نہیں ہے کہ وہ ترقی بہ سبب قلت عہدجات کے نہایت ناکافی تھی۔ بڑے بڑے اعلیٰ حاکم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ جیسی ترقی ہندوستانیوں کی چاہیے تھی ویسی ہی نہیں ہوئی۔

جس قدر سرکشی ہندوستان میں ہوئی اس سے زیادہ دکھائی دی

غصہ ایک ایسی چیز ہے کہ معاملات کی اصلیت کو آنکھ سے چھپا دیتا ہے طبیعت انتقام اور سیاست کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ سچ ہے کہ جو وارداتیں ہندوستان میں ۱۸۵۷ء میں پیش آئیں اسی لائق تھیں کہ ہمارے حکام کو جس قدر غصہ آوے اور جس قدر انتقام اور سیاست کریں

سبب بجا ہے۔ مگر ہندوستان کے حالات پر غور کرنا چاہیئے کہ درحقیقت کس قدر سرکشی ہندوستان اصلی تھی اور کیوں اس قدر بڑھ گئی اور کیوں اس قدر دکھائی دی اور بدنصیب مسلمان کیوں زیادہ مفلس بعض اضلاع میں دکھائی دیے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ صدہا سال سے عملداری ہندوستان میں تزلزل تھا۔ رعایائے ہندوستان کو یہ موروثی عادت تھی کہ جب کوئی امیر یا سردار یا بادشاہ زادہ قابو یافتہ ہوا اس کے ساتھ ہزاروں آدمی جمع ہوگئے۔ اس کی نوکری کو اس کی طرف سے عاملی کو اس کی طرف سے انتظام کو کسی طرح اپنا قصور نہیں سمجھتے تھے۔ ہندوستان میں یہ ایک مثل مشہور ہے کہ نوکری پیشہ کا کیا قصور جس نے نوکر رکھا تنخواہ دی اس کی نوکری کی۔ البتہ جب سردار اٹھایا جاوے اور اس کی جگہ دوسرا سردار قائم ہو اس کی اطاعت نہ کرنے کو قصور سمجھتے تھے۔ ہندوستان کے امیروں اور سرداروں کا علی الخصوص ان کا جو قبل عملداری سرکار ہندوستان پر متسلط تھے اور جس کے سبب ہندوستان طوائف الملوک تھا۔ یہی عادت تھی کہ ملازمین سیف اور قلم سے کسی طرح کی مزاحمت نہ کرتے تھے وہی عادت تمام ہندوستان کے لوگوں کو پڑی ہوئی تھی جب ہندوستان میں مفسدوں نے سر اٹھایا اور لوگوں کو نوکر رکھنا چاہا ہزارہا آدمی جو روٹی سے محتاج اور نوکریوں کے خواہش مند تھے جا کر نوکر ہوئے سب کہتے تھے کہ ہمارا کیا قصور ہے ہم تو نوکری پیشہ ہیں۔ عام رعایا میں سے بہت سے لوگ اس اپنی قدیمی عادت سے کہ اب جو سردار ہے اس کی اطاعت کریں ہم تو رعیت ہیں جو زبردست ہے اس کے تابع ہیں باغیوں کے تابع ہوگئے۔ بہت سے اہلکاران سرکاری یہ سمجھے کہ باغیوں سے ظاہرداری کر کے جان بچاویں اور جب سرکار کا تسلط ہو پھر سرکار کے تابع ہوں وہ بھی مجرم ہوگئے حالانکہ کچھ شک کا مقام نہیں ہے کہ وہ دل سے سرکار کے تابع تھے اکثر لوگوں اور اہلکاروں سے دفعتاً مجبوری خواہ نادانی خواہ بہ مقتضائے بشریت کوئی بات ہوگئی انھوں نے خیال کیا کہ اب ہمارے اس قصور اتفاقیہ یا مجبورانہ یا جاہلانہ

سے سرکار درگزر نہیں کرنے کی اور سزا دے گی۔ اس خوف اور ڈر سے لاچار باغیوں کے ساتھ جا شامل ہوئے۔ بہت سے آدمیوں نے درحقیقت کچھ نہیں کیا تھا مگر خوف اور بسبب اور خیالات چند در چند باغیوں میں مل گئے۔ بہت لوگوں نے اس زمانے میں وہ باتیں کیں جن باتوں کو وہ لوگ اپنے ذہن اور اپنی سمجھ میں جرم مخالف سرکار نہیں سمجھتے اگر تمام ہندوستان کے حالات بغاوت پر نظر یکجا دے گی تو ہم کو یقین ہے کہ دونوں قومیں جو ہندوستان میں بستی ہیں برابر بلکہ ایک سے زیادہ ایک اور ایک سے زیادہ ایک اس فساد میں مفسد نظر پڑیں گی اور اس کے اثبات پر تمام حالات ہندوستان کے گواہ موجود ہیں۔ مگر جن اضلاع میں مسلمان زیادہ تر مفسد دکھائی دیے اس کا سبب صرف یہی نہیں خیال کرنا چاہیے کہ دلی کی سلطنت پر مسلمان بادشاہ نے دعویٰ کیا تھا اور درحقیقت مسلمان اسی قدر مفسد ہوئے تھے جیسا کہ نظر پڑے نہیں حکام کا مزاج دفعتاً اُن باتوں سے جو ظاہر ہیں مسلمانوں سے بہت ناراض ہو گیا اُن کے مخالفوں کو بڑی گنجائش ہو گئی خود غرضانہ باتیں پیش کرنے کو تھوڑی بات کو بہت بڑھا کر کہا ادھر حکام کو زیادہ ناراضی ہوئی ادھر مسلمانوں کو زیادہ تر خوف اور مایوسی ہوئی اور اپنی تقدیر سے جتنے تھے اس سے مفسد دکھائی دیے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ پانچویں قسم کی بغاوت مسلمانوں میں بہت تھی اور وہ تبدل عملداری کے خیال سے بہت خوش ہوتے تھے جس کا سبب ہر ایک مقام ہم بیان کرتے آئے ہیں باایں ہمہ ہماری گورنمنٹ پر مخفی نہ ہوگا کہ اس حال پر بھی جان بازی کی خیر خواہیاں اس ہنگامے میں کس سے زیادہ ظہور میں آئی ہیں خدا کے آگے جس کو حقیقی بادشاہت ہے اور دنیا کے بادشاہوں کے آگے جن کو مجازی حقیقت خداوند نے عطا کی ہے سب گنہگار ہیں

بدانتظامی اور بے اہتمامی فوج

ہماری گورنمنٹ کا انتظام فوج ہمیشہ قابل اعتراض کے تھا۔ فوج انگلستان کی کمی ہمیشہ اعتراض کی جگہ تھی۔ جب کہ نادر شاہ نے خراسان کو فتح پایا اور ایران اور افغانستان دو

مختلف ملک اس کے قبضے میں آئے اس نے برابر کی دو فوجیں آراستہ کیں۔ ایک ایرانی قزلباشی دوسری افغانی جب ایرانی فوج کچھ عدول حکمی کا ارادہ کرتی تو افغانی فوج اُس کے دبانے کو موجود تھی اور جب افغانی فوج سرتابی کرتی تو قزلباشی اس کے تدارک کو موجود ہوتی ہماری گورنمنٹ نے یہ کام ہندوستان میں نہیں کیا ہم نے مانا کہ ہندوستانی فوج سرکار کی بڑی تابعدار اور خیرخواہ اور جاں نثار تھی مگر یہ کہاں سے عہد ہو گیا تھا کہ کبھی اس فوج کی خلاف مرضی حکم نہ ہوگا اور کسی حکم سے یہ فوج آزردہ خاطر نہ ہوگی پھر درصورت ناراض ہو جانے اس فوج کے جیسا کہ ہوا کیا راہ رکھتی تھی ہماری گورنمنٹ نے جس سے اُس کا رخ دفع فی الفور ہو سکتا۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کو مخلوط کر کے پلٹنوں میں نوکر رکھنا

یہ بات سچ ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ہندو مسلمان دونوں قوموں کو جو آپس میں مخالف ہیں نوکر رکھا تھا مگر بہ سبب مخلوط ہو جانے ان دونوں قوموں کے ہر ایک پلٹن میں یہ تفرقہ نہ رہا تھا ظاہر ہے کہ ایک پلٹن کے جتنے نوکر ہیں اُن سب میں بہ سبب ایک جا رہنے کے اور ایک لڑی میں مرتب ہونے کے آپس میں اتحاد اور ارتباط برادرانہ ہوتا تھا ایک پلٹن کے سپاہی اپنے آپ کو برادری سمجھتے تھے اور اسی سبب سے ہندو مسلمان کی تمیز نہ تھی دونوں قومیں آپس میں اپنے آپ کو بھائی سمجھتی تھیں اُس پلٹن کے آدمی جو کچھ کرتے تھے سب اس میں شریک ہو جاتے تھے ایک دوسرے کا حامی اور مددگار ہو جاتا تھا اگر انھیں دونوں قوموں کی پلٹن اس طرح پر آراستہ ہوتیں کہ ایک پلٹن نری ہندوؤں کی ہوتی جس میں کوئی مسلمان نہ ہوتا اور ایک پلٹن نری مسلمانوں کی ہوتی جس میں کوئی ہندو نہ ہوتا تو یہ آپس کا اتحاد اور برادری نہ ہونے پاتی اور وہی تفرقہ قائم رہتا اور میں خیال کرتا ہوں کہ مسلمان شاید پلٹنوں کو کارتوس جدید کاٹنے میں بھی کچھ عذر نہ ہوتا۔

اگر مسلمانوں کی جدا پلٹن ہوتی تو یہ تماشا مسلمانوں کو کارتوس کاٹنے میں عذر نہ ہوتا

فوج انگلشیہ کے کم ہونے سے
رعایا کو بھی جو کچھ خوف تھا وہ
صرف ہندوستانی ہی فوج کا
تھا علاوہ اس کے ہندوستانی فوج کو بھی بے انتہا غرور تھا وہ اپنے سوا کسی کو نہیں
دیکھتے تھے فوج انگلشیہ کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے تھے تمام ہندوستان کی فتوحات
صرف تلوار کے زور سے جانتے تھے ان کا یہ قول تھا کہ برہما سے لے کر کابل تک ہم
نے سرکار کو فتح کر دیا ہے علی الخصوص پنجاب کی فتح کے بعد ہندوستانی فوج کا غرور
بہت زیادہ ہو گیا تھا اب ان کے غرور نے یہاں تک نوبت پہنچائی تھی کہ ادنیٰ ادنیٰ
بات پر تکرار کرنے پر مستعد تھے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ فوج کے غرور اور تجبر کی
یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ کچھ عجب نہ تھا کہ وہ کوچ اور ہتمام پر بھی تکرار کرنے لگتی۔

فوج ہندوستانی کا نہایت مغرور ہو جانا اور اس کا سبب

ایسے وقت
میں کہ جب فوج کا یہ حال تھا اور ان کے سر غرور اور تجبر سے بھرے ہوئے تھے اور
دل میں یہ جانتے تھے کہ جس بات پر ہم اڑیں گے اور تکرار کریں گے خواہ مخواہ سرکار
کو ماننا پڑے گا ان کو نئے کارتوس دیے گئے جس میں وہ یقین سمجھتے تھے کہ چربی
کا میل ہے اور اس کے استعمال سے ہمارا دھرم جاتا رہے گا انھوں نے اس کے
کاٹنے سے انکار کیا۔ جب بارک پور کی پلٹن اس جرم میں موقوف ہو گئی اور حکم
سنایا گیا تو تمام فوج نہایت رنجیدہ ہوئی کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ بہ سبب تخلل
مذہب کے بارک پور کی پلٹن کا کچھ قصور نہ تھا وہ محض بے قصور اور صرف سرکار
کی نا انصافی سے موقوف ہوئی ہے تمام فوج نہایت رنجیدہ تھی کہ ہم نے سرکار کے
ساتھ رفاقتیں کیں اپنے سر کٹائے سرکار کو ملک در ملک فتح کر دیے سرکار ہمارے

مذہب لینے کے درپے ہوئی اور وہ ابھی بات پر موقوف کر دیا اس وقت کچھ فساد نہ ہوا کیونکہ فوج پر بجز موقوفی کے اور کچھ جبر نہ ہوا تھا مگر تمام فوج کے دل میں کچھ تو بہ سبب یقین ہونے چربی کارتوس میں اور کچھ بہ سبب رنج موقوفی پلٹن بارک پور کے اور سب سے زیادہ بسبب غرور اور خود بینی اور اس خیال سے کہ جو کچھ ہیں ہمیں ہیں۔ مصمم ارادہ ہو گیا کہ ہم میں سے کوئی بھی کارتوس نہیں کاٹے گا اس میں کچھ ہی ہو جائے بلاشبہ بعد واقعہ بارک پور آپس میں فوجوں کی خط وکتابت ہوئی پیغام آئے کہ کارتوس جدید کوئی نہ کاٹے ابتک تمام فوج کے دل میں ناراضی اور غصہ تو ہے مگر میری رائے میں ابھی تک کچھ فاسد ارادہ نہیں۔

میرٹھ میں سزا کے نامناسب کا ہونا | دفعتاً تقدیر سے کم بخت مئی سنہ ۱۸۵۷ء آگئی میرٹھ میں سپاہ کو بہت سخت سزا دی گئی جس کو ہر ایک عقلمند بہت بڑا اور ناپسند جانتا ہے اس سزا کا رنج جو کچھ فوج کے دل پر گذرا بیان سے باہر ہے وہ اپنی تمغوں کو یاد کرتے تھے اور بجائے اس کے بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کو پہنے ہوئے دیکھ کر روتے تھے وہ اپنی وفاداریوں کا خیال کرتے تھے اور پھر اس کے صلہ میں جو ان کو انعام ملا تھا دیکھتے تھے اور علاوہ اس کے ان کو بے انتہا غرور جو اُن کے سر میں تھا اور جس کے سبب وہ اپنے تئیں ایک بہت ہی بڑا سمجھتے تھے ان کو زیادہ رنج دیتا تھا۔ بہر سبب فوج مقیم میرٹھ کو یقین ہو گیا کہ یا ہم کو کارتوس کاٹنا پڑے گا یا یہی دن نصیب ہوگا اسی رنج اور غصے کی حالت میں دسویں مئی کو فوج سے وہ حرکت سرزد ہوئی کہ شاید اس کا نظیر بھی کسی تاریخ میں نہیں ملنے کا اس فوج کو کیا چارہ رہا تھا اس حرکت کے بعد بجز اس کے کہ جہاں تک ہو سکے مفسدے پورے کرے۔

بعد فساد میرٹھ کے فوج کو گورنمنٹ کا اعتبار نہ رہنا | جہاں جہاں فوج

میں یہ خبر پہنچی تمام فوج زیادہ تر رنجیدہ ہوئی میرٹھ کی فوج سے یہ حرکت ہوئی تھی اس سے تمام ہندوستانی فوج نے یقین جان لیا تھا کہ اب سرکار ہندوستانی فوج کا اعتبار نہ رہا ہر گاہ وقت پا کر سب کو سزا دے گی اور اس سبب سے تمام فوج کو اپنے افسروں کے فعل اور قول کا اعتبار اور اعتماد نہ تھا۔ سب آپس میں کہتے تھے کہ اس وقت تو ایسی باتیں ہیں جب وقت نکل جائیگا تو یہ سب آنکھیں بدل لیں گے ۔ میں بہت معتبر بات کہتا ہوں کہ دلی میں جو فوج باغی جمع تھی اس میں سے ہزاروں آدمیوں کو اس بے جا حرکت اور بے فائدہ بغاوت کا رنج تھا وہ روتے اور کہتے تھے کہ ہماری قسمت نے یہ کام ہم سے کروایا پھر بہت افسوس سے کہتے تھے کہ اگر ہم نہ کرتے تو کیا کرتے ایک نہ ایک دن سرکار ہمکو تباہ کر دیتی کیونکہ سرکار کو اب ہندوستانی فوج پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ وہ قابو کا وقت جب پاتے ہم کو تباہ کر دیتے ۔ ابتدائے غدر میں جب کہ ہنٹن پر فوج کشی کا ارادہ ہوا ہے ہنوز فوج روانہ نہ ہوئی تھی کہ بعضے آدمیوں کی صاف رائے تھی کہ جس وقت دلی پر فوج سے لڑائی شروع ہوئی بلاشبہ تمام ہندوستانی فوج بگڑ جاوے گی ۔ چنانچہ یہی ہوا سبب اس کا یہی تھا کہ فوج سے لڑائی شروع ہونے کے بعد ممکن نہ تھا کہ باقی فوج سرکار سے مطمئن رہتی ۔ وہ ضرور سمجھتے تھے کہ جب ہمارے بھائی بندوں کو مار لیں گے تب ہم پر متوجہ ہوں گے ۔ اس لیے سب نے فساد پر کمر باندھلی اور بگڑتے گئے جن کے دل میں فساد نہ تھا وہ بھی بہ سبب شامل ہونے فوج کے اس جتھے سے الگ نہ ہو سکے ہندوستانی رعایا جانتی تھی کہ سرکار کے پاس جو کچھ ہے وہ ہندوستانی فوج ہے جب تمام فوج کا بگڑنا مشہور ہو گیا ۔ سب نے سر اٹھایا عملداری کا ڈر دلوں سے جاتا رہا اور سب جگہ فساد برپا ہو گیا ۔

پنجاب میں سرکشی نہ ہونے کا سبب اب ہماری اس رائے کو پنجاب کے حالات پر تو لو ۔ پنجاب کے مسلمان

بہت ستم رسیدہ تھے سکھوں کے ہاتھ سے سرکاری عملداری سے اُن کا چنداں نقصان نہ ہوا تھا
سرکار نے پنجاب میں ابتدائے عملداری میں بہت تشدد کیا تھا اور اب دن بدن رفاہ کرتی جاتی
تھی۔ برخلاف ہندوستان کے کہ یہاں معاملہ بالعکس تھا۔ ابتدائے عملداری میں تمام
ملک کے ہتھیار لیے گئے کسی کو قابو فساد کا نہ رہا تھا اگرچہ وہ تمول سکھوں کو جو پہلے
نہ رہا تھا مگر ان کا کمایا ہوا روپیہ جو ان کے پاس جمع تھا ابھی خرچ نہ ہو چکا تھا اور وہ
مفلسی جو ہندوستان میں تھی وہاں ابھی نہیں آئی تھی اس کے سوا تین سبب اور
بہت قوی تھے جو پنجاب نہ بگڑا۔

اوّل یہ کہ فوج انگلشیہ وہاں موجود تھی۔

دوسرے یہ کہ وہاں کے حکام کی ہوشیاری سے دفعتاً بے خبری میں ہندوستانی
فوج کے ہتھیار لے لئے گئے بہ سبب طغیانی اور کثرت سے واقع ہوئے دریاؤں اور
بند ہو جانے گھاٹوں کے ہندوستانی فوج بے قابو ہو گئی فوج کا فساد برپا نہ ہو سکا۔

تیسرے یہ کہ تمام سکھ اور پنجابی اور پٹھان جن سے احتمال فساد تھا سرکار میں
نوکر ہو گئے اور لوٹ کا لالچ اس پر مزید تھا جو بات رعایائے ہندوستان اور روزگار پیشہ
کو باغیوں کے ہاں بہ مشکل اور بذلت حاصل ہوتی تھی وہ اہل پنجاب کو سرکار کے
ہاں بہ عزت و بلا دقت نصیب تھا پھر حالات پنجاب کے ہندوستان کے حالات سے
بالکل مخالف تھے ؎

ایک جائزہ

واجد علی شاہ

مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

واجد علی شاہ کی زندگی اور موت، عروج و زوال، داب شاہی اور فقر غیور، سخاوت اور مفلسی، دریا دلی، اور بے مائگی، یہ ایک ایسی کہانی ہے جس میں سوز و الم بھی ہے اور درد و حسرت بھی، اس میں درس عبرت بھی ہے اور پیام موعظت بھی، یہ ایک سبق بھی ہے اور پند بھی، ضروری ہے کہ مختصر طور پر واجد علی شاہ کی حکومت، معزولی، جلا وطنی، اور موت کا افسانہ بھی سنا دیا جائے، چشم عبرت دیکھے گی۔

جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

جہاں عیش و طرب، ناؤ نوش، چنگ و رباب، رقص و نغمہ اور سرود نشاط کی محفلیں جمتی ہیں، وہاں صف ماتم بھی بچھتی ہے، نوحہ و فغاں کا شور بھی بلند ہوتا ہے، نہ وہ دور رہا نہ وہ زینت آگیں باتیں رہیں، نہ یہ عہد ادبار و نکبت قائم رہا، ہاں مگر ان دونوں کی یاد باقی رہ گئی۔

تھی جہاں شمع وہاں خاک ہے پروانے کی

یہ خاک دیکھو، اس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال لو کہ یہی یاد اب موضوع بزم و انجمن ہے، یہ کبھی نہیں مٹ سکتی، یہ کبھی نہیں فراموش ہو سکتی!

بیدار مغز بادشاہ

واجد علی شاہ جب تخت حکومت پر بیٹھے۔ تو بالکل نوجوان تھے دل امنگوں سے معمور تھا، نہ دولت کی کمی تھی، نہ شاہد مطرب کی، ایک اشارہ چشم پر ہر چیز موجود ہو سکتی تھی، جس کا خیال دل میں پیدا ہو، بگاڑنے والے بہت تھے، بنانے والا کوئی نہ تھا جی حضوری اور ہاں میں ہاں ملانے والوں کی کمی نہ تھی، لیکن حق بات کہنے والا، راہ راست کیطرف ہدایت کرنیوالا کوئی نہ تھا، شریک لہو و لعب ہر کوئی تھا لیکن شریک پند و اصلاح کوئی نہ تھا۔

لیکن اس فضا میں بھی، واجد علی شاہ نے اپنے آپ کو سنبھالا، بیدار مغزی کا ثبوت دیا حالات کی اصلاح، نظام مملکت کی درستی، آئین و اصول کے نفاذ اور مالی و اقتصادی امور کی نگرانی فوجی اور عسکری طاقت کے استحکام و ثبات پر پوری توجہ صرف کی پابندی کے ساتھ امور مملکت میں وہ حصہ لیتے اور تمام حالات و کیفیات کا براہ راست مشاہدہ و معائنہ کرتے رہتے تھے، ایک ہمعصر مورخ لکھتا ہے۔

کاروبار سلطنت سے دلچسپی

کاروبار سلطنت پر سلطنت کے زمانہ میں کڑی نظر رکھتے تھے۔

"علی نقی خاں کے طالع کی یاوری سے بادشاہ کا مزاج ان کی صحبت رضامند ہو گیا، اور رسوخ ترقی پاتا گیا۔ اور بادشاہ نائب کی اعتماد پر مطمئن رہے، بعد چندے حسب اتفاق کچھ عرائض مستغیثاں مظلوم کی وزیر کے توسط کے بغیر بادشاہ کے ملاحظہ میں گزریں، طبع والا داد رسانی پر راغب ہوئی اور ایک سر رشتہ اخبار موسوم بہ "اخبار حضور" بہ اہتمام منشی ظفر علی اسیر جاری ہوا، ہر روز پرچے بادشاہ سنتے۔ اور اپنے ہاتھ سے احکام جاری کرتے، اہلکار سلطنت خبردار ہوئے، کاروبار سلطنت عمدہ طور پر چلنے لگا"۔[1]

۱۸۴۸ء میں شاہ لکھنؤ امجد علی شاہ بادشاہ کا انتقال ہوا تو واجد علی شاہ ان کے جانشین ہوئے انھوں نے فوج کو از سر نو مرتب کیا، احکام نافذ کیے گئے کہ لکھنؤ کی تمام پلٹنیں روزانہ صبح کے پانچ بجے پریڈ کیا کریں گی۔ بادشاہ خود پریڈ کے موقع پر کمان کرتے تھے اور جنرل کی وردی زیب تن فرماتے

۱؎ تاریخ اودھ جلد ۵ صفحہ ۱۷۰

تھے اور روزانہ ۴ سے ۵ گھنٹے تک فوج سے ڈرل کرایا کرتے تھے مزید برآں انھوں نے یہ حکم نافذ کر رکھا تھا کہ امور سلطنت کی ضروریات کے سوا اگر کبھی وہ خود غیر حاضر ہو جایا کریں گے تو ۲۰۰۰ روپے جرمانہ ادا کریں گے جسے فوج میں تقسیم کر دیا جائیگا۔ اتنا ہی جرمانہ اس پلٹن سے وصول کیا جاتا جو پریڈ میں دیر سے آتی۔ مزید سزا انھیں یہ ملتی تھی کہ پیدل فوج کی ۲ پلٹنیں اور رسالہ کی ایک پلٹن دن بھر مسلح رکھی جاتی۔

انگریزوں کا شبہ بادشاہ کی جدوجہد نے کمپنی کے دل میں ایک گونہ شبہ پیدا کر دیا۔ برطانوی ریزیڈنٹ نے بادشاہ سے دریافت کیا کہ حضور فوج کی تیاری میں اسقدر زحمت کیوں برداشت فرماتے ہیں؟ اور یہ تجویز پیش کی کہ اگر حضور کو اپنے ملک کی حفاظت کی خاطر افواج کی ضرورت ہو تو برطانوی افواج استعمال کیجا سکتی ہیں جن کے اخراجات محاصل اودھ سے ادا کر دیے جائیں گے امرائے دربار نے بھی عرض کی کہ ذاتی جدوجہد سے کسی قسم کا شبہ پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بادشاہ نے ان تمام فہمائشوں سے متاثر ہو کر یہ جواب دیا کہ چونکہ میری فوجی جدوجہد کو پسند نہیں کیا جاتا، لہٰذا میں دوسرے مشاغل میں اپنے تئیں مصروف رکھوں گا۔ اس کے بعد سے انھوں نے امور سلطنت سے غفلت برتنی شروع کر دی اور عیش و عشرت میں بسر اوقات کرنے لگے سابقہ وزیر اپنے عہدیدار برطرف کر دیے گئے، اور اُن کے بجائے علی نقی خاں جو ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے وزیر مقرر ہوئے، بادشاہ نے پہلے تو اپنے وزیر کی بھتیجی اور اس کے بعد اس کی لڑکی سے شادی کر لی، اور سلطنت کا سارا کاروبار علی نقی خاں کے ہاتھ سونپ دیا۔[1]

ریزیڈنٹ صاحب کے خلاف مزاج ایک دوسرا مورخ بھی اس واقعہ کی تائید کرتا ہے:۔

> بادشاہ نے پیادوں کی چند پلٹنیں اور سواروں کے رسالے بھرتی کر کے ان کو وردی اور ہتھیاروں سے آراستہ کیا تھا، ان کے نام بھی عجیب و غریب رکھے تھے، بانکا۔ ترچھا

---

[1] خدنگ غدر صفحہ ۳۴

گھنگھور - اختری اور نادری - اور ان کے قواعد کے لیے بنارسی زبان میں اصطلاحیں مقرر کی تھیں، اکثر بادشاہ بہ نفیس نفیس میدان پریڈ میں جاگران کے قواعد اور نیزہ بازی، اور شمشیر زنی، اور تفنگ اندازی کی مشق ملاحظہ فرماتے تھے، اور تین تین چار چار ساعت تک گھوڑے پر سوار ہوکر، دھوپ میں کھڑے رہتے تھے، اور کبھی کبھی خوش ہوکر انعامات اور خطابات سے سرفراز کرتے تھے، نادر العصر میں لکھا ہے کہ ایک دن نواب علی نقی خاں نے عرض کیا یہ امر ریزیڈنٹ کے مزاج کے خلاف ہے اس لیے بادشاہ نے بالکل اس طرف سے کنارہ کیا۔[۱]

اگر بادشاہ یہ نہ کرتے، تو شاید بہت پہلے معزول کر دیے گئے ہوتے، کیونکہ انگریز کسی بیدار مغز فرماں روا کو برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔

وضع قطع واجد علی شاہ جامہ زیب خوب رُو، اور خوش اندام شخص تھے، مولانا شرر فرماتے ہیں:۔

"بادشاہ کی وضع یہ تھی کہ بڑے بڑے بال تھے جن کا پیچھے کی طرف جوڑا باندھ لیتے، بڑی بڑی کھڑی مونچھیں اور منڈی ہوئی داڑھی، چندیا پر ایک چھوٹی سی نکے دار مسالے کی بھاری ٹوپی، گلے میں جامدانی یا ململ کا چست انگرکھا اس کے نیچے نہ کرتا ہوتا نہ شلوکہ بائیں جانب کی چھاتی کھلی رہتی، پاؤں میں پرانی وضع کا عرض کے ڈھیلے پائنچوں والا برکا پائجامہ، جاڑوں میں کوئی شالی رومال کندھوں پر ہوتا لیکن محلات اور باغات شاہی سے باہر نکلتے تو سر پر کوئی شالی پھٹیا سا لپیٹ لیتے اس کے ساتھ سچے کام کا کھیلا جوتا پہنتے تھے۔"[۲]

---

[۱] تاریخ اودھ جلد ۵ صفحہ ۱۲۵

[۲] جان عالم (عبد الحلیم شرر) صفحہ ۲۷

واجد علی شاہ کی زرپاشی اور دولت ایک مسلمہ حقیقت تھی :-
درگاہ حضرت عباس کی آستاں بوسی کے لیے، دو گھڑی دن چڑھے بادشاہ ہودج مرصع زرّیں میں بیٹھ کر بالائے فیل روانہ ہوئے، جب سواری دولت سرا سے چلی طشت جواہر نثار ہوئے، چوک کے وسط میں زرفشانی کے وقت، انگوٹھی جس پر الماس جڑا ہوا تھا، بادشاہ کی انگلی سے نکل کر گر پڑی، وہ ایک بوڑھی عورت نے پائی، جب بادشاہ کے پاس پہنچی، تو انگوٹھی لے کر دس ہزار روپے انعام میں دلائے گئے، جب محمود نگر کی سڑک پر پہنچے تو حسینی قوم کوزہ گر نے فریاد کی کہ قائم علی کشمیری، مقرب خاص نواب علی نقی خاں نے اس کا مکان زبردستی چھین کر گرادیا ہے، بادشاہ نے سواری ٹھہرائی، اور اسی وقت حکم دیا کہ قائم علی کا مکان گرادیا جائے اور جیب خاص سے پانچ ہزار روپے علی رضا بیگ کوتوال کو واسطے تیاری مکان مستغیث کے مرحمت ہوئے ——— [1]

شرعی سزا کا نفاذ

عہد واجد علی شاہ تک شرعی سزا کا نفاذ باقاعدہ ہوتا تھا۔
"ایک مجموعہ قلمی مجتہد العصر کے گھرانے کا نظر سے گزرا ہے جس میں مجتہدوں کے معروضے امجد علی شاہ کے عہد سے واجد علی شاہ کے عہد تک بادشاہوں کے نام اور عدالت مرافعہ کے فیصلے جو مجتہدوں نے صادر کیئے تھے، وزراء کے خطوط، بادشاہوں کے دستخطی احکام، بعض مقدمات متعلقہ مجتہد کے متعلق، ریزیڈنٹ کے پرچے پیام وغیرہ میں مندرج ہیں، یہ مجموعہ اوّل منشی مظفر علی خاں اسیر اور منشی امیر احمد مینائی نے نواب اقبال الدولہ کو دیا تھا، وہاں سے کتب خانہ رامپور میں آگیا، اس مجموعے سے معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کے عہد تک اودھ میں حدود شرعی جاری تھیں" [2]

---

[1] تاریخ اودھ جلد ۵ صفحہ ۱۳۴

[2] تاریخ اودھ جلد ۵ صفحہ ۱۶۲

بادشاہ کی شہ زوری | واجد علی شاہ، ورزشی بدن کے شہ زور شخص تھے، معاصر مورخ کا بیان ہے کہ:-

"علاوہ اور کمالات کے زور اور طاقت کا یہ عالم تھا کہ چٹکی سے سکّہ کے نقش مٹا دیتے تھے اور سکّہ کو دبا کر اس کی گولی بنا دیتے تھے"[1]

لباس کی تراش خراش | لباس کی تراش خراش اور نفاست کا نمونہ آج بھی لکھنؤ میں بہت کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے شاہی وقت کے اس فن کی ترقی کا ثبوت ملتا ہے۔ بڑے پائنچوں کا پائجامہ جو انگریزوں کے سائے کی نقل ہے، نصیر الدین حیدر کی عہد کی ایجاد ہے۔ بادشاہ نے اس کو پہنا، جس کی وجہ سے اکثر وضعداران شہر کی بھی یہی وضع ہو گئی بعد کو بہت لمبے لمبے پائنچوں کا پائجامہ مردوں سے چھوٹ گیا، مگر مستورات بیگمیں آج تک کلی گز کے پائنچوں کے پائجامے پہنتی ہیں۔ پنجگوشیہ ٹوپی بھی نصیر الدین حیدر کی ایجاد ہے۔

واجد علی شاہ نے قبۂ نور اور جامۂ حسن کے نام سے دو نئے قسم کے لباس ایجاد کیے، گردن سے قدم تک اس میں کلیاں ہوتی تھیں اور قبۂ نور ایسا لباس تھا کہ کاندھے سے پر بال نکلتے تھے[2]

اصلاحات کا پروگرام | اصلاحات کی فکر سے بھی بادشاہ سلامت غافل نہ تھے:-

"اوّل سال جب یہ بادشاہ تخت نشین ہوئے، یہ منظور ہوا کہ تمام علاقہ جات قلمرو سلطانی حضور تحصیل ہو جائیں، زمیندار اور تعلقہ دار اپنے وکلائی معرفت زر آمدنی داخل خزانہ سلطانی کیا کریں، ناظم اور چکلہ دار موقوف ہو جائیں کہ یہ علاقہ پر جا کر زیادہ ستانی اور زر طلبی کرتے ہیں، رعیت تباہ ہوتی ہے، اور نقصان سرکار بھی ہوتا ہے، لیکن اہلکاروں نے کہ ان کے حاصلات لاکھوں روپے کے جاتے تھے اس حکم کو جاری نہ ہونے دیا"[3]

---

[1] چمنستان مظفر

[2] ظفر نامہ صفحہ ۳۱

[3] تاریخ اودھ جلد ۵ صفحہ ۱۴

داد گستر بادشاہ | رعایا کی شکایات سننے اور اُن کا ازالہ کرنے پر واجد علی شاہ ہمہ تن متوجہ رہتے تھے۔

کسی دن ایک بادشاہ کی سواری میں دو ترک سوار آگے آگے دو نقرئی صندوقچے نیزوں پر لے کر چلتے تھے، راہ میں جو مستغیث عرضی دیتا تھا صندوقچے میں ڈال دیتے تھے، کنجی ان کی بادشاہ کے پاس رہتی تھی، اور بادشاہ اپنے ہاتھ سے کھول کر حکم لکھتے تھے، اور طبیعت بھی نہایت رسا اور تیز تھی۔ اور بادشاہ تاریخ نادر العصر اور محاربہ قدیمہ کی روایت کے مطابق مشغلۂ سلطانی رکھتا تھا، اہلکاروں کو اس سے خوف اور رعایا کو باعث ازدیاد تقویت تھا۔ له

واجد علی شاہ کی ایجادات | واجد علی شاہ نے اپنے دربار کے خطاب یافتہ معززین کے لئے ایک نئی اور عجیب قسم کی درباری ٹوپی ایجاد کی، اس کا نام عالم پسند (جھولا) تھا۔

بشپ ہیبر ۱۸۲۴ء میں بطور سیاح کے ہندوستان میں آیا، اس نے لباس و پوشاک دیکھ کر اور بادشاہ سے مل کر یہ رائے قائم کی کہ حضور لباس کے شائق اور اس فن کے بہترین نقادوں میں، یہی وجہ ہے کہ شاہانِ اودھ کے عہد میں رؤسا و امرا بھی اس بارے میں بڑے نقاد اور وسیع النظر تھے اور اسی قدردانی کی وجہ سے اس فن کو بہت ترقی ہوئی اور کپڑوں کی وضع میں تراش خراش پیدا ہوئی، واجد علی شاہ نے دوپلی نکے دار ٹوپی اور چوڑی گھیرے کا انگرکھا بھی ایجاد کیا۔ عه

تورہ | لکھنؤ کا شاہی عہد کھانے اور اس کی عجیب و غریب اور مختلف قسموں کے اعتبار سے بھی ممتاز ہے، تفصیل کا یہاں موقع نہیں، شاہی دعوتی کھانے کی ایک خاص قسم کا نمونہ یہ ہے:-

---

عه قدیم حکمرانانِ اودھ صفحہ ۱۵۸

له تاریخ اودھ جلد صفحہ ۱۲۳

"اصطلاحِ اودھ کے مطابق بارہ قسم کے کھانوں کے مجموعے کا نام تورا ہے، یہ لفظ ترکی ہے جو مغلوں کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوا۔

ایک تورے میں لازمی طور پر حسبِ ذیل غذائیں ہوا کرتی ہیں جو عموماً لکھنؤ والوں کو پسند ہیں لیکن یہ امتیازی تورا اپنی وسعت کے لحاظ سے کئی توروں کا قائم مقام اور چھ سات آدمیوں کے لیے کافی تھا۔

(۱) پلاؤ (۲) مزعفر
(۳) متنجن (۴) شیرمال
(۵) سفیدہ (میٹھے چاول جس میں زعفران کا رنگ نہ ہو)
(۶) بورانی کا پیالہ (ایجاد بوران بنتِ حسن وزیر مامون الرشید عباسی)
(۷) شیر برنج (۸) قورمہ
(۹) گوشت میں تلی ہوئی اروياں (۱۰) شامی کباب
(۱۱) مربے (۱۲) اچار یا چٹنیاں

اس تورے کے مختلف نمبروں میں متعدد ویلیٹ تھے مثلاً چار قسم کا پلاؤ اور کئی قسم کے میٹھے چاول، روٹیوں میں آبی چپاتی۔ پھلکا تنکی، شیرمال اور پراٹھا تھا۔ سادہ سالن اور کباب بھی کئی قسم کے تھے۔ مربّے اور چٹنی کی بہار دیکھنے کے لائق تھی۔ [1]

واجد علی شاہ کا سکہ

"انڈین میوزیم کے اندر رکھے ہوئے سکّوں کی فہرست کے تیسرے حصّے سے معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کے سکے پر ایک طرف یہ بیت تھی،

سکّہ زد بر سیم و زر از فضلِ تائید الٰہ
ظلِ حق واجد علی، سلطانِ عالم بادشاہ
۱۲۶۶ھ

---

[1] یادِ ایّام (عبدالرزاق) صفحہ ۵۸

دوسری طرف ایک تاج ہے اس پر ایک چھتری ہے جس کے دونوں طرف دو جھنڈیاں کھڑی ہیں انکو دو مرمیڈوں نے ایک ایک ہاتھ سے سہارا دیا ہے، ان کے دوسرے ہاتھوں میں ایک ایک چھوڑ ہے اور بازوؤں میں پڑے ہیں، مرمیڈ انگریزی میں ایک دریائی جانور کا نام ہے جس کے اوپر کا حصہ عورت یا مرد کے مشابہ ہوتا ہے، اور نیچے کا مچھلی کیطرح یہ نہایت نایاب جاندار چیز بڑے بڑے سمندروں میں رہتی ہے، مرمیڈ کا ترجمہ عربی میں بنت البحر ہے، اس تاج کے نیچے ایک قلعہ کی علامت ہے، اسکے نیچے دو تلواریں کھڑی ہیں، ان تمام چیزوں کے آس پاس کے دور میں سکے کے کنارے سے ملی ہوئی یہ عبارت مندرج ہے :-

"ضرب ملک اودھ، بیت السلطنت لکھنؤ، سنہ جلوس میمنت مانوس۔

اس فہرست میں اتنی تفصیل نہ تھی ہم نے خود سکہ دیکھ کر یہ حلیہ لکھا ہے [۱]

واجد علی شاہ کی جدت و ذہانت

مختلف چیزوں کے نام رکھنے میں واجد علی شاہ کی جدت ذہانت آپ اپنا جواب تھی، غازی الدین حیدر نے حقہ کا نام حسن محفل۔ جھرات کا نام دہی اور بالائی کا نام بالائی رکھا، اسی طرح واجد علی شاہ نے صدہا چیزوں کو ناموں کے خلعت دیے۔ شراب کو آب حرام، رضائی کو شب خوابی۔ جوتی کو آرام پائی۔ حقہ کو محبوب معشوق۔ تمباکو کو مے خوردنی۔ کو سر رکھنے کے تکیہ کو آرام سرا اور تکیئی کو آرام پہلو۔

واجد علی شاہ کی ادبیت

ہندوستان میں کسی بادشاہ کی تصنیف اتنی زیادہ اور کارآمد نہیں جس قدر واجد علی شاہ کی ہیں، واجد علی شاہ نے خطابات اور حکام وغیرہ میں شاعری اور ادب کے جوہر کوٹ کوٹ کر بھر دیے۔ عورتوں مردوں عمارتوں باغوں اور جانوروں کو ہزاروں خطاب دے ڈالے۔ ان خطابوں کی خوبی اس وقت معلوم ہوتی ہے، جب وہ چیز یا شخص سامنے ہو [۲]

---

[۱] تاریخ اودھ جلد ۵ صفحہ ۱۸۱

[۲] قدیم ہندوران اودھ، صفحہ ۳۷

موسیقی میں دستگاہ

فن موسیقی میں بادشاہ کا پہلا استاد باکمال مٹھو خاں کوٹھاری کا فرخ آبادی ہے۔ بادشاہ نے باسط خاں کے بعد فن موسیقی حاصل کر کے کمال کی حد تک پہنچا دیا۔ بادشاہ اس فن لطیف میں کامل بصیرت رکھتے تھے ان کا شمار بلحاظ فن اساتذہ میں تھا، ایک اہم جزو موسیقی جس کو عرف عام میں ٹائم یعنی وقت کہنا چاہیے، اس کا مادہ بادشاہ میں بہت تھا یوں تو لے کا مادہ کم و بیش ہر شخص میں ضرور موجود ہوتا ہے، شعراء نے جو اوزان مقرر کیے ہیں وہ بھی لے سے تعلق رکھتے ہیں، علم عروض دراصل مکمل لے ہوتا ہے یہ بدیہی امر ہے کہ جس شخص میں فطرتاً لے کا مادہ ہوگا، اس کے ہر عضو اور بن سے حرکت بے اختیاری ظاہر ہوگی پیدا ہو جائیگی لے پر بے اختیار اس کا ہر عضو پھڑکنے لگے گا۔ عوام کی نظر میں یہ حرکت ایک بے وقعت اور مہمل معلوم ہے، لیکن وہ شخص جس سے سرزد ہوتی ہے مجبور رہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

واجد علی شاہ کے اس فعل کو لوگ کہتے ہیں کہ وہ ناچتے تھے، حالانکہ وہ ناچتے نہ تھے بلکہ لے داری میں محو ہو کے ان کے اعضا سے ایسے حرکات سرزد ہونے لگتے تھے کہ بظاہر بادشاہ ناچتے تھے، دراصل واجد علی شاہ کبھی اور کسی زمانے میں نہیں ناچے، ان کا ناچنا بس یہی تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ لے داری میں کوئی اعلیٰ درجہ کا کامل فن گویا بھی بادشاہ کا مقابلہ نہ کر سکتا [illegible] جسے بھاؤ بتانا کہتے ہیں، یہ فن بھی علم موسیقی کا ایک جزو ہے اور انگریزی میں اسکو موشن [illegible] تمام اسپیکروں وغیرہ پر پایا جاتا ہے۔ جس طرح سے لے داری کا بھی اس کی ایک نوع ہے جس کا کمال واجد علی شاہ میں تھا، مگر لاعلمی کی وجہ سے یہ معلومات کا کمال ان کی بدنامی کا باعث آخر قرار دیا جاتا ہے۔

قیصر باغ کے میلے

قیصر باغ کے جشن عہد واجدی اور واجد علی شاہ کے کمال کے اظہار اور فن موسیقی کی سرپرستی کے زریں نمونے ہیں۔ واجد علی شاہ نے رہس کو جو متھرا کا ایک ناٹک تھا نئے طرز سے لکھنؤ میں رواج دیکر اس فن پر بڑا احسان کیا۔

فنون موسیقی کا بادشاہ

انھوں نے اپنے مذاق اور خیالی پلاٹ کا ایک نیا رہس ایجاد کیا۔ ستار بجانے میں بادشاہ کو کمال تھا۔ سلطان عالم ستار ایسا بجاتے تھے کہ روتے لوگ ہنس دیتے تھے اور ہنستے رو دیتے تھے۔ بادشاہ نے موسیقی کو محض فن کی حیثیت اور علم کو علم کی حیثیت سے حاصل کیا تھا اور جس قدر روایات ان کے ناچنے گانے کے متعلق مشہور ہیں یہ سب افترا ہے۔ یہ نہایت پارسا اور پابند شرع بادشاہ تھے۔[1]

شاعری اور ڈرامہ کی ترقی

شاعری اور ڈرامہ کے اعتبار سے بھی واجد علی شاہ کا عہد یگانہ اور ممتاز ہے:۔

"صرف واجد علی کے عہد میں اتنے شاعر لکھنؤ میں تھے، جتنے سارے ہندوستان میں تھے، شجاع الدولہ سے لے کر واجد علی شاہ تک خود بادشاہوں نے امراء، رؤساء، وزراء نے دامے، درمے، سخنے ہر طرح کی خدمت کی۔ زبان اور ادب اردو پر تا قیامت رہنے والا احسان کر گئے، واجد علی شاہ کے آخری دور میں فصاحتِ زبان اور شاعری نے لکھنؤ میں مضبوط جگہ پکڑ لی تھی۔ چند روز میں شعر کہنا لکھنؤ میں ایک وضع داری بن گیا تھا اور شعراء کی یہاں اس قدر کثرت ہو گئی کہ شاید کہیں کسی زبان میں نہ ہوئی ہو گی، شاہی بیگموں کا کیا ذکر ہے، شرفاء کی عورتوں میں شعر و سخن کا چرچا ہوا اور جہلا کے کلام میں بھی شاعرانہ خیال آفرینیوں، تشبیہوں اور استعاروں کی جھلک نظر آنے لگی، یہی وجہ ہے کہ آج تک یہاں کے سودے والے آواز لگاتے ہیں، تو بجائے یہ کہنے کے کہ گنڈیریاں کون لے گا؟ استعارتاً یوں کہتے ہیں کہ یہ قند کے ڈلے کون لے گا؟ ککڑیوں کے بیچنے والے

---

[1] قدیم نہر وانِ اودھ صفحہ ۶۳

چلاتے ہیں کہ" لیلی کی انگلیاں ہیں، مجنوں کی پسلیاں ہیں۔ کیا خوب لکڑیاں ہیں۔"
دبیر و انیس نے مرثیہ خوانی میں ایسے کمالاتِ شاعری دکھلائے کہ شعر و سخن کے آسمان پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔ اردو ادب میں وہ نئی نئی چیزیں پیدا کر دیں جن کو انگریزی تعلیم کے اثر سے طبیعتیں ڈھونڈنے لگی تھیں، اردو شاعری کی ایک قسم واسوخت ہے۔ نظمِ اردو کی ہر قسم لکھنؤ میں ہی شروع ہوئی۔ فنِ ہزل گوئی کو لکھنؤ کے آخری دور میں شیخ گوہر علی شیر ساکن نقی گنج نے کمال کے درجہ کو پہنچا دیا۔ عہد واجدی میں اردو ڈرامہ نے جنم لیا۔ سب سے پہلا ڈرامہ اندر سبھا ہے جس کو امانت لکھنوی نے ۱۸۵۳ء میں تحریر کیا۔ یہ موسیقی دار کامیڈی ہے۔" ؎

واجد علی شاہ کی ڈرامائی جدتیں

واجد علی شاہ بلا کی رسا اور ذہین طبیعت لیکر آئے تھے، وہ آرٹ کے دلدادہ تھے، اور آرٹ کے عروج و ارتقاء کے سلسلہ میں وہ بڑی دور کی کوڑی لایا کرتے تھے۔ ان کی جدتِ نئی ایجادیں تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش صفحہ بن گئی ہیں۔

"واجد علی شاہ خود فنِ موسیقی کے بڑے ماہر تھے اور فنِ موسیقی کے قدردان تھے، ان کے عہد میں لکھنؤ فن کا مرکز ہو گیا تھا اور کتنے باکمال فن حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے تھے، رہس خاص برج اور متھرا کا فن ہے، بادشاہ کی طبیعت اہلِ ہنود کے رہس کی طرف متوجہ ہوئی بادشاہ نے سری کرشن جی کا رہس دیکھا۔ اسی رہس سے خود اپنا ڈرامہ ایجاد کیا تھا۔ رہس کے سامان میں کئی لاکھ روپیہ صرف ہوا مثنوی ماہ پیکر اور عزالہ کی تصنیف سے جلسہ رہس کی بنیاد پڑی۔ اس کو دیکھتے

؎ قدیم ہنروران اودھ صفحہ ۲۲

ہی رعایا میں اس بات کا خاص شوق پیدا ہوا کہ عاشقانہ قصے جو اُن دنوں
پریوں کے حسن و عشق سے زیادہ وابستہ تھے عملی صورت میں دکھائے جائیں۔
پبلک کا رجحان دیکھ کر امانت لکھنوی نے ۱۸۵۳ء میں اندر سبھا تصنیف کی،
یہ اردو کا سب سے پہلا ڈرامہ ہے، جو موسیقی دار کامیڈی ہے جس میں ہندوؤں
کی دیو مالا میں مسلمانوں کے فارسی مذاق کی آمیزش کا پہلا نمونہ نظر آیا۔ اس
نے ڈرامہ اور تھیٹر کی بنیاد ڈال دی۔ یہ ڈرامہ واجد علی شاہ کے حکم سے
نہ تو تیار ہوا نہ کبھی اس میں کوئی حصہ واجد علی شاہ نے لیا اور نہ یہ تماشہ کبھی
قیصر باغ میں ہوا اور نہ بادشاہ کبھی اس میں شریک ہوئے، موسیقی کی ترقی
کے لحاظ سے یہ عہد زریں عہد تھا۔ باوجود اس کے اور فنون و کمالات
کو بھی ترقی تھی۔ جہاں اور فنون کی ترقی کا دور تھا وہاں موسیقی نے بھی ترقی
کی۔ یہ ضرور ہے کہ بادشاہ کے شوق اور کمال کی وجہ سے اس فن کو بہت عروج
ہوا اور باوجود اس کے کہ آج کل کے زمانہ میں موسیقی بحیثیت فن دنیا کی
بعض یونیورسٹیوں میں نصاب تعلیم کا ایک جزو ہے۔ اس کے اسکول اور
کالج اور درجے کھل گئے ہیں، مگر دورِ واجدی کی ترقی کو ابھی تک یہ فن نہیں پہنچ سکا،
واجد علی شاہ کو تاشا بجانے کا بڑا شوق تھا۔ محرم کی ساتویں تاریخ میں معمول تھا
کہ تقریباً ایک گھنٹہ تک خود بادشاہ گلے میں تاشا ڈال کر بجاتے تھے، تاشا بجانے
کی یہ صفت تھی کہ اتنی جلدی جلدی ضربیں پڑتیں کہ ایک قرعہ کا دوسرے
سے امتیاز نہ ہو سکتا تھا۔ واجد علی شاہ نے ٹھمری اور دادرے خوب خوب
کہتے اور وہی شاعر جو مثل بادشاہ کے موسیقی اور شاعری دونوں میں کمال رکھتا
ہو، ایسے دادرے اور ٹھمریاں کہہ سکتا ہے کہ موسیقی اور شاعری کو باہم دگر
جو مناسبت ہے وہ ایک جداگانہ بحث ہے۔ واجد علی شاہ نے نئی راگنیاں

ایجاد کیں، جیسے جوگیا، کنرا، جوہی، بادشاہ پسند وغیرہ نئی گتیں ایجاد کیں مثلاً انعامی گت، سلامی گت، لکھنؤا گھونگھٹ گت، ناز گت، بانکی گت، بندھی سلامی گت وغیرہ۔ موسیقی پر واجد علی شاہ نے کئی کتابیں لکھیں مثلاً تاجو، بنی، دلہن وغیرہ تاریخ ہند میں کئی بادشاہ موسیقی کے کامل استاد بتائے گئے ہیں، مگر جتنی معلومات واجد علی شاہ کو اس فن میں تھی، شاید کسی اور بادشاہ کو ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ فن موسیقی پر شاہانِ اودھ کا بہت بڑا احسان ہے اور آج یہ جو کچھ نمونہ اس فن کے کمال کا نظر آتا ہے یہ انہی کا پرتو ہے، شاہانِ اودھ ہنرمندوں کی حوصلہ افزائی میں ایسی دل چسپی کا اظہار کرتے تھے کہ ہنر معدوم نہ ہونے پائے اور عوام کو یہ دھوکا ہے کہ بادشاہ عیش پسندی کے جذبہ میں ایسا کرتے تھے۔ [1]

بادشاہ کی تعریف امیر کی زبان سے

منشی امیر مینائی، واجد علی شاہ کے متوسلین میں تھے۔ بڑے عابد، متقی، زاہد، قانع، متوکل، لیکن واجد علی شاہ کی عطا پاشیوں اور زر بخشیوں سے وہ اس درجہ متاثر تھے کہ جب بادشاہ کی تعریف پر آتے ہیں، تو ان کے منہ سے پھول جھڑنے لگتے ہیں، بیان کی اثر آفرینی بتاتی ہے کہ اس کلام میں آورد کا کہیں نام و نشان نہیں آمد ہی آمد ہے، اور اس آمد میں کس بلا کا جوش اور کس غضب کا خلوص ہے۔ خوش نما اور ترشے ترشائے الفاظ پرا باندھے کھڑے ہیں اور وہ ایک فن کار جوہری کی طرح انہیں شعر میں اس طرح جڑ دیتے ہیں کہ ع

وہ کہیں اند سنا کرے کوئی

قیصر باغ کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:۔

---

[1] قدیم ہنروران اودھ صفحہ ۵۶-۵۷

کس کے چمکے چاند سے رخسار قیصر باغ میں
چاندنی ہے سایۂ دیوار قیصر باغ میں

فی الحقیقت یہ بھی کم گلزار جنت سے نہیں
حوریں پھرتی ہیں سر بازار قیصر باغ میں

موجۂ مے کی نسیم صبح میں تاثیر ہے
بے صبوحی مست ہیں ہشیار قیصر باغ میں

پاؤں کا یاں ذکر کیا صاف ہے ایسی زمین
دل پھسلتے ہیں دم رفتار قیصر باغ میں

تشنگانِ شوق ہیں شیریں لبوں کے میہمان
بٹ رہا ہے شربت دیدار قیصر باغ میں

اے دلِ مایوس بے برگی سے افسردہ نہ ہو
لائیگا نخلِ تمنا بار قیصر باغ میں

دور ہوں گی کلفتیں مٹ جائیگی سب کاہشیں
لالہ ہے بے داغ گل بے خار قیصر باغ میں

سایۂ بالِ ہما کیا ڈھونڈتا ہے اے امیر
بیٹھ جا بس سایۂ دیوار قیصر باغ میں

ایک موقع پر واجد علی شاہ کی تعریف و توصیف میں زبان کھولتے ہیں اور کیسے اچھے آفرین انداز میں کہتے ہیں :-

ہم ہوں یا موسیٰ ہو کوئی دیکھ سکتا ہے اسے
پردے حیرت کے پڑے ہیں جلوہ گاہِ طور میں

حوصلہ عالی اگر ہو ہر جگہ معراج ہے
دار بھی ہے شاخ سدرا دیدۂ منصور میں

منزلِ مقصود کی مستوں کو دکھلاتی ہے راہ
خضر بن بیٹھی ہے سبزی دانۂ انگور میں

ہو اگر گردوں مخالف غم نہیں مجھ کو امیر
ہوں میں ظلِ دامنِ شاہِ ابوالمنصورؔ میں

بانکے کنہیا سلطانِ عالم

فتح الدولہ برق، واجد علی شاہ کے سچے اور بے انتہا مخلص جاں نثاروں میں تھے، مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے برق اور اختر میں وہی ربط تھا، جو عرفی اور جہانگیر میں تھا، زندگی کی آخری سانس تک برق واجد علی شاہ اختر کے دامنِ دولت سے وابستہ رہے، بادشاہت کے دور میں بھی اور جلا وطنی کے عالم میں بھی۔ انہوں نے اکثیر کی طرح بے وفائی نہیں کی، بلکہ مصیبت کے دنوں میں اور زیادہ وفاداری کیساتھ

ؔ ابوالمنصور، واجد علی شاہ کی کنیت تھی!

ساتھ دیا، بادشاہ ان کی وفاداری اور جاں نثاری کے ہمیشہ معترف رہے، برق نے بھی زبان شعر سے اختر کی تعریف کی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

عجب بانکے کنہیا نوجواں سلطان عالم ہیں ‏ ‏ حسینِ جانِ جہاں، جانِ جہاں سلطانِ عالم ہیں
زباں موج سے بادِ بہاری کہتی پھرتی ہے ‏ ‏ کہ قیصر باغ کے سروِ رواں سلطان عالم ہیں
نہ ہو کیوں قاف سے تا قاف شہرہ سارے عالم میں ‏ ‏ پری پیکر سلیمانِ جہاں سلطان عالم ہیں
جبیں ہے چودھویں کا چاند حسن روز افزوں ہے ‏ ‏ رخِ انور سے مہرِ آسماں سلطانِ عالم ہیں
بنا ہے لکھنؤ کنعان و رشکِ مصر ہیں کوچے ‏ ‏ عزیز و یوسفِ ہندوستاں سلطانِ عالم ہیں
لبِ جاں بخش سے جیتے ہیں مردے باتوں باتوں میں ‏ ‏ مسیحائے جہاں، معجز بیاں، سلطانِ عالم ہیں
تخلص برق اختر ہے کہ مکھڑا ماہ کامل ہے ‏ ‏ فلک منزل، ملائک پاسباں، سلطانِ عالم ہیں

اب دوسری زمین اور دوسرے ردیف و قافیہ میں برق کا جلوہ دیکھئے:۔

گہر افشاں ہے نیسانِ کرم سلطانِ عالم کا ‏ ‏ بہار آئی جوانانِ چمن کی لکھنؤ چمکا
نہ ایسا کوئی آگے تھا نہ ایسا اب کوئی ہوگا ‏ ‏ مؤخر ہے زمانہ باغِ ہستی میں مقدم کا
عجب برسات کا عالم ہے بیلا روز بٹتا ہے ‏ ‏ ہمیشہ مینہ برستا ہے یہاں دینار و درہم کا
درِ دریائے بخشش سے زمانہ کیوں نہ شاداب ہو ‏ ‏ گلِ تر کو نہاتا ہے چمن میں قطرہ شبنم کا
برائے حفظِ جاں ہر دم وظیفہ برق رکھتے ہیں ‏ ‏ کہ نامِ پاکِ حضرت میں اثر ہے اسمِ اعظم کا

معزولی کا فیصلہ

انگریزوں کو یہ پسند نہ تھا کہ واجد علی شاہ امور مملکت میں حصہ اور دلچسپی لیں جب انہوں نے، امور مملکت میں حصہ لینا چھوڑ دیا اور سارا نظام مملکت ریزیڈنٹ اور گورنر جنرل کے اشارۂ چشم کو سونپ دیا، تو انگریز اس پر بگڑ گئے کہ بادشاہ نالائق ہے امور سلطنت سے دلچسپی نہیں لیتا۔ لہٰذا اسے راستہ کے کانٹے کی طرح ہٹا دینا چاہیئے،

مولوی نجم الغنی یہ کہانی یوں سناتے ہیں:۔

"روز دوشنبہ ۱۸ فروری کو صاحب ریزیڈنٹ اور کپتان ہیر اور جنرل ویلا

صاحب کمان افسر فوج بادشاہ کے پاس آئے اور گورنر جنرل کی تحریر جو بادشاہ کے نام پر تھی دی، اس میں کئی مدیں بہت توضیح سے لکھی ہوئی تھیں اور پچھلے معاملات کی تفصیل مسند نشینی نواب سعادت علی خاں کے عہد سے اس وقت تک تھی اور ہر امر جزئی کلی میں سلطنت کی بے اتفاقی اور بعض الفاظ بادشاہ کی غفلت اور بے پروائی کے بیان میں درج تھے، بادشاہ نے جب اس کو پڑھا تو دل پر درد سے بے اختیار ایک آہ کھینچ کر جناب باری کی طرف متوجہ ہو کر کہا خداوندا تو شاہد حال ہے، مجھ پر یہ جفا اور جبر صریح ہے اور حیلۂ انتظام سے میرا گھر مجھ سے چھینا جاتا ہے، میں کبھی گوارا نہ کروں گا کہ یہ آبروریزی خاندانِ سلطنت کی میری وجہ سے ہو، تھوڑی دیر کے بعد جو کچھ افاقہ ہوا تو ریزیڈنٹ نے دلجوئی کی راہ سے بادشاہ کی تسکین خاطر کے لیے کہا کہ بخدا ہمارا قلب بھی متحمل نہیں ہو سکتا کہ آپ کو ایسے صدمۂ روحانی میں دیکھیں، جب نواب گورنر جنرل نے یہ احکام ارشاد فرمائے تھے تو میرے قلب کا بھی عجیب حال ہوا تھا ——— !"

زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

"صاحب ریزیڈنٹ" کے بارے میں مولوی نجم الغنی نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی حیثیت مگرمچھ کے آنسو سے زیادہ نہیں، یہ "صاحب ریزیڈنٹ" معلوم ہوتا ہے، بہت اچھے ایکٹر بھی تھے، ایک طرف بادشاہ کی جانب پرواد سوز دلی بڑھایا دوسری طرف زبانِ حقیقت ترجمان سے تسکین و تسلی، ہمدردی و دل سوزی کے کلمات ارشاد فرمائے، ساتھ ہی ساتھ نہایت تہذیب سے لیکن آمرانہ نخوت، اور فرماں روایانہ پندار کے لہجہ میں گویا ہوئے :-

"بہرحال یہ راضی نامہ فارسی و انگریزی مضمونِ واحد کا حاضر ہے برضا و رغبت اس پہ مہر فرمائیے کہ میں نے ملک محروسہ سرکار کمپنی کے تفویض کیا اور مشاہرہ مجوزہ بہ طیبِ خاطر بلا اکراہ قبول کیا، بادشاہ نے جواب دیا کہ اگر حکم صدر بدعملی و بے

انتظامی و عدم تحصیل زر کی نسبت ہے تو تفویض ملک میں مضائقہ نہیں ورنہ جبر و تعدی سے نہیں ہو سکتا، اس کے بعد ریزیڈنٹ نے کہا کہ سات مکان وسیع مثل شاہ منزل، مبارک منزل، خورشید منزل، سکندر باغ، بادشاہ باغ، رمنہ ان کو بھی دکشا سیر و تفریح کے لیے آپ کے قبضۂ اختیار میں رہیں گے، باقی تمام مکانات شاہی ہمارے قبضے میں آئیں گے، جن میں عدالتیں نشست کریں گی، حکام کا قیام ہوگا اور املاک شاہی میں جو خون ہوں گے تو انکا تصفیہ بھی ہماری تجویز سے ہوگا۔ آج سے تین دن تک آپ کو اختیار ہے بعد اس کے ہمارے احکام جاری ہوں گے، بعد اس کے ریزیڈنٹ نے راضی نامہ جو وزیر کے ذریعہ سے حاصل ہوا تھا، بادشاہ کے ملاحظہ میں گزرانا، بادشاہ نے کہا کہ میری اس پر مہر ہے، یہ درست ہے لیکن جب میں نے برضامندی مہر کی ہو تو پھر میرے انکار کا کیا سبب ہے، اور جب آپ خود ہر امر جزئی کو بالمشافہ کہتے ہیں پس ایسے امر عظیم کے واسطے مجھ سے کیوں نہ پوچھا اور یہ مہلت تین دن کی کیا ضرور ہے، آپ کو ہر وقت اختیار ہے، پھر ریزیڈنٹ نے کہا کہ اگر ہماری رضامندی کے موجب کیجئے گا تو وہ امر کریں گے، جو باعث مسرت ہوگا اور اگر ہماری ناراضی منظور ہے تو قیام لکھنؤ بھی دشوار ہو جائیگا، والدۂ بادشاہ نے جواب دیا جو خرابی اس گھر کی تمہاری بدولت ہونا تھی ہو چکی۔ اس سے بدتر اور کیا ہوگا؟ اب قیام اس شہر کا اور دوسرے کا اور جو چاہو دونوں برابر ہیں، اس سے زیادہ ہماری آبروریزی کیا ہوگی اور جبر صریح اس سے زیادہ کیا ہوگا؟"

بادشاہ کی امن پسندی

صاحب ریزیڈنٹ بعد اس کے رخصت ہوئے جب درِ دولت پر پہنچے تو گارد نے دستی سلامی دی۔ ورجا بجا پہرہ دوں کو بے ہتھیار

دیکھ کر متعجب ہوئے۔ منصلح الدولہ سے پوچھا، جواب دیا کہ بادشاہ نے فوج سرکاری کی آمد کی وجہ سے جہانیان انگریز کے رفع تردد ات کی غرض سے ملازمان سلطنت اور رعایا ئے شہر کو ہتھیار باندھنے کی ممانعت کر دی ہے اور توپیں بھی اسی واسطے چرخ سے گرادی ہیں۔

اب بعض نامی اشخاص اصلاح کے درپے ہوئے چنانچہ نواب محسن الدولہ اور نواب منور الدولہ اور شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں وغیرہ کی رائے اس بات پر قرار پائی کہ بادشاہ نے جو مہر اور راضی نامے سے انکار کیا ہے اس پر مستقل و قائم رہیں اور انگریزوں کا شک و شبہ رفع کرنے کی غرض سے ملازمین شاہی کو حکم قطعی پہنچے کہ کوئی شخص ہتھیار نہ باندھے اور توپیں جہاں جہاں ہیں چرخ سے گرادی جائیں۔ اور درِ دولت کے سپاہی گارد اور پہرے کے اپنے اپنے ہتھیار میگزین میں داخل کر دیں۔ فقط لاٹھیوں سے پہرہ دیں، انگریزوں کے تردد کا یہ پہلا مرحلہ بہ آسانی طے ہو گیا!

انگریزوں کی دہشت اہلکاروں کی نمک حرامی۔

تاہم انگریزوں نے احتیاطاً دو کمپو شہر میں بلا لیے، اس عرصہ میں اور بھی انگریزی فوج یعنی گوروں اور ہندوستانیوں کی پلٹنیں اور ترک سواروں اور گوروں کے رسالے اور گھوڑ چڑھے توپ خانہ کی بارہ توپیں اور بیل باتری کی بارہ توپیں شہر کے پاس آگئیں اور فوج کربلائے تال کٹورہ کے قریب عالم باغ کے سامنے میدان میں ٹھہری، فوج کہتی تھی کہ انگریز قیصر باغ کو قیصر گڑھ تصور کر رہے تھے۔

ورنہ اس قدر فوج لانا عبث تھا اور کیونکر ایسا شبہ نہ ہوتا جہاں فوج شاہی کے سوا رعایا سے جنگ کی جو کثرت پچاس ہزار سے کم نہ تھی۔ اس کے سوا زمینداران اور تعلقہ داران اور راجے اور ملک محروسہ کی تمام رعایا مسلح تھی مگر افسوس ہے

کہ یہاں سب نے نامردی کی اور اہلکاروں نے بڑی نمک حرامی کی۔ ۰ ؎

الٰہی جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے؟

بادشاہ پر جو ظلم وستم روا رکھا گیا، ان کی جس طرح توہین وتذلیل کی گئی، خاندانِ شاہی کی جس طرح بے حرمتی کی گئی، اس کی توجیہہ تو یہ کیجا سکتی ہے کہ بادشاہ لاکھ بے خطا سہی لیکن ان کی یہ خطا کیا کم تھی کہ وہ ایک زرخیز ملک کے بادشاہ تھے۔ اور اس ملک اور اس کے وسائل و ذرائع کی انگریزوں کو ضرورت تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ رعایا نے، حکام نے، عمال نے، تعلقہ داروں جاگیرداروں اور زمینداروں نے تو فوراً سر اطاعت خم کر دیا تھا، ان کے لئے سفاکانہ احکام کیوں جاری ہوتے؟ "صاحب" آثار محشر ؒ نے گورنر جنرل کے ظالمانہ احکام کی تفصیل یہ دی ہے۔

اوٹرم صاحب کو گورنر جنرل نے اتنی باتوں کے لئے حکم دیا تھا۔

(۱) بادشاہ، انکے اقارب واعزہ کے لئے پندرہ لاکھ روپیہ مقرر کئے ہیں۔

(۲) سرکار کمپنی کو ملک رضائے خاطر سے دینے کے کاغذ پر بادشاہ سے دستخط کرا لیں

(۳) اگر بادشاہ مہر نہ کریں، تو اس کی کیفیت تحریر کریں۔

(۴) بادشاہی توپ خانہ ضبط کر لیں۔

(۵) بادشاہ دلّی یا آگرہ میں رہیں دگوالیار چونکہ قریب ہے۔ اس بارہ میں کمیٹی کرنے کے بعد حکم دیا جائے گا۔

(۶) جہاں کلکٹری یا مجسٹریٹی ہو وہاں بادشاہ کا قیام ہونا چاہیئے۔

(۷) بادشاہ کے عزیز و اقارب شہر سے علیحدہ کر دیئے جائیں، یا بادشاہ کے ساتھ چلے جائیں۔

(۸) اودھ میں دو برس تک جرنیلی کا عملدرآمد رہے۔

؎ تاریخ اودھ جلد ۵ (نجم الغنی) صفحہ ۲۱۰

(۹) بادشاہ کے رشتہ داروں کے ہاتھ میں جس قدر نوٹ ہیں دو سال تک۔
اس کی آمدنی ان لوگوں کو نہ ملے۔
(۱۰) جملہ ساکنانِ اودھ سرکار انگریزی میں روزگار کریں۔
(۱۱) تمام بادشاہی عہدہ دار قید ہوں۔
(۱۲) اہلکارانِ شاہی نے جو کچھ زر محاسبہ وصول کیا ہو وہ سپاہ کی تنخواہ میں
دے دیا جائے۔
(۱۳) تنخواہ عملہ بادشاہی کی سرکار کمپنی سے تعلق رکھے
(۱۴) جو اہلکار محاسبہ سے پاک ہوں، ان سے تعرض نہ کیا جائے۔
(۱۵) بادشاہ جہاں رہنا چاہیں دو ماہ میں وہاں اپنا اسباب اٹھالے جائیں
(۱۶) بادشاہ کے ہر ایک عزیز و اقارب کی تانکار ضبط کرلی جائے۔
(۱۷) زمیندار لوگ دو برس تک اپنی اپنی زمینداری سے بے دخل رہیں اور تحصیلدار انکے
علاقے کا زرتحصیل رعایا سے وصول کر کے انگریزی خزانہ میں داخل کریں۔
(۱۸) تحصیلداروں اور چکلہ داروں سے ایک سال کی ضمانت لے لی جائے۔[1]

گورنر جنرل کے ان ظالمانہ احکام پر پوری طرح عمل اس لئے نہ ہوسکا کہ تھوڑے ہی
عرصہ بعد غدر شروع ہوگیا، لیکن انگریزوں کی نیت بہرحال ظاہر ہوگئی،
انگریز لکھنؤ پر قابض ہوگئے، بادشاہ کلکتہ چلے گئے، پندرہ[2] لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ
مقرر ہوا۔ اور اس طرح اودھ کی حکومت، جو مشرقی تمدن کا آخری نمونہ تھی، چراغ صبح کی
طرح جھلملا کر ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔ کسی نے تاریخ کہی

لکھنؤ شد خراب واویلا
۱۲۷۲ھ

---

[1] آثار محشر [2] تاریخ اودھ جلد ۵ صفحہ ۲۰۳

خون کے آنسو

واجد علی شاہ کی معزولی پر بہت سی آنکھیں اشکبار ہوئیں، بہت سے دل تڑپے، اہل قلم نے نثر میں، شاعروں نے شعر میں اپنے دل کا بخار نکالا۔ ذیل میں ہم رائے بدھن چند عاجز (خیر آبادی) کی تاریخ درج کرتے ہیں، اور اس لئے درج کرتے ہیں کہ لوگ دیکھ لیں، مسلمان بادشاہ کے زوال پر ہندو رعایا کا ایک فرد کس طرح خون کے آنسو بہاتا ہے۔؟ ایک ہندو شاعر فارسی زبان میں کیسے کیسے گل کھلاتا ہے؟ یہ جذبات صرف شاعر کے نہیں ہیں۔ اس کی ہندو قوم کے عوام بھی اس میں شامل ہیں، ملاحظہ ہو۔

یک دور چرخ فیروزہ رخست — نہ قصر شہی ماند و نے تاج و تخت
نمودار شد صورتِ انقلاب — برافتاد از آسماں آفتاب
زسر دور شد ظلِ لطفِ آلہ — سریر شہی منتزع شد ز شاہ
نہ چترِ مرصع نہ تاجِ بلند — مقعد بجا و بلا در فگند
بہارِ محمد امین[١] گرد شد — گلستانِ منصور[٢] خاں زرد شد
بہ گلزار بختِ شجاع[٣] سعید — ز دشت بلا بادِ صرصر رسید
گلِ گلشنِ آصف[٤] سینہ چاک — در افتاد از شاخِ دولت بخاک
چنیں شور در خاص و عام اوفتاد — ہمائے سعادت بدام اوفتاد
خیابانِ غازی[٥] نہالِ نصیر[٦] — ز دستِ خزاں گشت در دارو گیر

شاعر نے بڑی خوبی سے واجد علی شاہ کا شجرہ نسب بھی بیان کر دیا ہے جسکی تفصیل یہ ہے، (مجیبی)

١ اودھ کے خاندانِ شاہی کے مورثِ اعلیٰ۔

٢ پہلے وزیر اودھ

٣ شجاع الدولہ

٤ آصف الدولہ ٥ غازی الدین حیدر

٦ نصیر الدین حیدر

سموم غم و رنج و درد و الم   بباغ محمد[۱] علی زد قدم

چو کافور رنگینیٔ سرمدی   پرید از رخ لالۂ امجدی[۲]

عزا خانہ شد منزل لکھنؤ   الم حلقہ زن بود در چار سو

ندانم چہ غوغہ چہ اسرار بود   کہ شور قیامت نمودار بود

برآشفت روح امین درجناں   بفردوس زد گریہ منصور خاں

بلرزید گور شجاع شجاع   لب روح آصف بخواند الوداع

سعادت[۳] ذبس گریہ دردناک   بغلطید سیماب ساں زیر خاک

بخاک نجف روح غازی طپید   طپاں بود جان نصیر سعید

بروح محمد علی تاب بود   زغم چشم حیرت پر از آب بود

بنالید امجد علی زار زار   سر خویشتن زد بسنگ مزار

نفیر از جہانے دریغا چہ شد   صدا بود ہر سوگ آیا چہ شد

کسے سوختہ می کوفت از دست غم   کسے سر ہمی زد بسنگ الم

کسے بود از جان شیریں بتنگ   کسے را شد از زندگی عار و ننگ

دل عاجز از شورش ناگہاں   ز فرط الم بود غوغا کناں

چو از دست شہ رفت تخت و کلاہ   بگفتم شدہ منتزع ملک شاہ[۴]
۱۲۷۲ھ

تاریخ دیگر

شہ عالی گہر واجد علی شاہ   ز سر افگندہ چوں تاج خلافت

۱؎ بادشاہِ اودھ،

۲؎ شاہِ اودھ،

۳؎ نواب سعادت علی خاں،

۴؎ بادشاہِ اودھ،

بہارستانِ قیصر باغ شد زرد — سوادِ لکھنؤ شد بے لطافت
خزاں آمد بباغستان شاہی — رواں شد بُلبُلِ باغ ظرافت
نہ تاج زر نہ تخت خسروی ماند — بسر شد سایۂ چتر ندامت
رقم بنمود عاجز عیسوی سال — سعادت رفتہ از نجم سعادت
۱۸۵۶ء

تصوّر سے کلیجہ منہ کو آتا ہے!

واجد علی شاہ کی لکھنؤ سے روانگی، ایک بہت بڑا سانحہ تھا، لیکن اس دنیا میں ہر روز سانحے ہوتے رہتے ہیں۔ اور انہیں چار و ناچار برداشت کرنا پڑتا ہے، یہ سانحہ بھی برداشت کر لیا گیا۔ لیکن اس کا ایک منظر دیکھ لیجیے۔ "خم خانۂ جاوید" میں لکھا ہے:-

"۵ رجب ۱۲۷۲ھ ہجری مطابق ۱۳ مارچ ۱۸۵۶ء بروز شنبہ پہر رات گئے اپنے پھوپھا نواب حسام الدولہ بہادر کو لکھنؤ میں اپنا مختار مقرر فرما کر راہی کانپور ہوئے، اس وقت جو حالت اقربا و متوسلین شاہی کی ہوئی اس کے تصوّر سے کلیجہ منہ کو آتا ہے، جناب عالیہ ملکۂ کشور۔ نواب خاص محل صاحبہ معشوق محل، جنرل مرزا سکندر حشمت برادر حقیقی، مرزا ولی عہد، جنرل فریدون قدر اور نواب منور الدولہ وزیر خاں شاہ کے ہمرکاب رہے، ان کے علاوہ کم و بیش تین سَو متوسلانِ بارگاہ نے بھی رفاقت کر کے حق نمک ادا کیا۔ لیکن ریذیڈنٹ کی ممانعت کی وجہ سے منشی خانے اور بیت الانشاء کا کوئی آدمی بادشاہ کے ساتھ نہ گیا!"

مہاراجہ بنارس کی وفاداری

اس وقت جب بادشاہ کے متوسلین ان سے منہ موڑ رہے تھے، ایک سابق باج گزار ہندو، راجہ ایسا بھی تھا جو اب بھی وفاداری کا دم بھر رہا تھا۔

سامان درست کرنے کے بعد بادشاہ ۷ اپریل کو کانپور سے روانہ ہو کر

۱۶ر اپریل کو بنارس پہنچے، لکھنؤ سے بنارس تک دو گھوڑوں کی گاڑی پر سفر کیا۔ کیونکہ اب تک ریل نہیں بنی تھی۔ ان ایام میں گرمی کی بڑی شدت تھی۔ چنانچہ سفر میں ازحد تکلیف شاقہ اٹھائیں۔ خاص کر اس مقام پر جہاں دریائے گنگا و گھاگھرا کا اتصال ہے، بہت تکلیف پہنچی۔ بادشاہ نے کانپور میں ایک ماہ تک قیام کرکے سہل لیا۔ اور بعض کو خشکی کی راہ سڑک سڑک کلکتہ بھیجا اور اکثر کو کشتیوں میں بٹھا کر ساتھ لیا۔ بنارس کے راجہ نے اخلاص مندی کا اظہار کیا۔ اس لئے بادشاہ ان کے دارالحکومت تک بجرے میں بیٹھ کر گئے۔ یہاں ہر طرح کا آرام ملا۔ مہاراجہ ایشوری پرشاد نرائن سنگھ نے مراسم مہمانی اس شان و شوکت و فراخ دلی سے ادا کئے کہ خود بادشاہ باوجود آلام روحانی کے ان کے حسن خدمات سے خوش و سپاس گزار ہوئے دس روز وہاں قیام کرکے دخانی جہاز پر سوار ہو کر راہی کلکتہ ہوئے ۱۳ر مئی ۱۸۵۶ء کو مٹیا برج مہاراجہ بردوان کی کوٹھی میں جو مولوی مسیح الدین خاں سفیر شاہی نے پہلے سے بہ اکراہ یہ تجویز کر رکھی تھی، رونق افروز ہوئے، جب کلکتہ میں بادشاہ کے ورود کا حال معلوم ہوا، تو قلعہ فورٹ ولیم سے ۲۱ توپوں کی سلامی سر ہوئی۔ [1]

خاص محل کا خط کلکتہ سے

خاص محل واجد علی شاہ کی وفا سرشت بیگم تھیں، شوہر کے ساتھ عیش کے دن کاٹتے تھے، اب یہ گوارا نہ ہوا کہ مصیبت اور دکھ کے دنوں میں اس کا ساتھ چھوڑ دیں۔ چنانچہ یہ بھی لکھنؤ سے کلکتہ سدھاریں، کلکتہ پہنچ کر انہوں نے، ایک خط شیدا بیگم کو لکھا، ظاہر ہے کہ بیچاری خاص محل کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی، کہ یہ نجی خط کبھی چھپے گا۔ اس خط میں انہوں نے دل کھول کر رکھ دیا ہے، یہ خط نہیں ہے دل کے ٹکڑے ہیں، اگر معلوم ہوتا یہ کبھی چھپے گا تو وہ ضرور کہتیں،

---

[1] تاریخ اودھ جلد ۵ صفحہ ۲۷۲

من متاعِ خورشیدِ دلِ صد پارۂ خویشم!

بہر حال وہ خط جسے پڑھ کر واقعی آنسو نکل آتے ہیں (کم از کم میری تو یہی کیفیت ہوئی)، یہ ہے :-

"بہن شیدا بیگم میران جی کی ۱۷ ہر تاریخ ۱۲۷۲ھ پنجشنبہ کا دن عمر بھر نہ بھولے گا جبکہ سلطانِ عالم کو جنرل اوٹرم صاحب نے باپ دادا کی حکومت چھوڑ دینے اور دست بردار ہونے کا حکم دیا اور لکھنؤ سے ہم لوگ جدا ہوئے، جیسے بلبل گلزار سے چھوٹی، یوسف مصر سے نکلے، بوئے گل چمن سے جدا ہوئی پیا جانِ عالم کا سکوت اور تمام عملہ کا حسرت سے دیکھ کر بے بسی کے آنسو بہانا۔ کمال ادب سے رومال میں غم کے موتیوں کو سمونا۔ اعزا کو ہچکیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہم آخوش محلات میں ماتم بپا چھوڑ کر سلطانِ عالم کے ہمراہ رخصت ہوئے۔ اس وقت جانِ عالم کا یہ کہنا "تم پر دس برس تک میں نے حکومت کی۔ اس عرصہ میں جو کچھ صدمہ تم کو میری ذات سے پہنچا ہو اس کو خوشی معاف کر دو۔ اس وقت میں معزول ہوں اور تم سے چھٹتا ہوں، خدا جانے زندگی بھر پھر ملوں یا نہ ملوں۔" بہن اس جملہ نے تم کو یاد ہے محل کو مجلسِ ماتم بنا دیا تھا۔ حضرت منور الدولہ احمد علی خاں نے کہا: "سرکار۔ ایسے وقت میں غلام کو قدم سے جدا نہ کرو۔ سلطانِ عالم خاموش ہو گئے۔ حضور ملکہ کشور آرا بیگم صاحبہ اور بھیا سکندر حشمت سلمہ اور مختِ جگر نورِ نظر ولی عہد بہادر سلمہ میں اور چار اور سرکار کی خواص ہمراہ تھیں۔"

آگے چل کر سفر کی روداد لکھی ہے۔

"رجب کی پانچویں کو لکھنؤ سے چلے تھے کانپور پہنچے۔ میرا روتے روتے برا حال ہوا۔ پرون صاحب کے بنگلے پر ہم لوگ مقیم ہوئے۔ رجب بھر وہیں رہے۔ شعبان کی پہلی کو الہ آباد کے لئے روانہ ہوئے۔ آٹھ دن وہاں ٹھہرے۔ پھر بنارس آئے۔ راجہ پرانا نمک خوار تھا۔ انہی سی اس نے اچھی خدمت کی۔

رہیاں حضور ملکہ کی بڑی تواضع کرتیں۔ ہر وقت ہاتھ باندھے چاکری میں کھڑی رہتیں مجھ مغموم کی پوچھ بھی بہت تھی میں ہر وقت سلطانِ عالم کی دل جوئی میں لگی رہتی ان کا باتوں میں دل بہلاتی۔ مگر وہ غم میں گھلے جاتے تھے میں واری جاؤں! یہ حال دیکھ کر دل کڑھتا ہے۔ بنارس سے دخانی جہاز پر سوار ہو کے رمضان کی ۲۷ کو کلکتہ ہمارا قافلہ پہنچا۔ سب پر تکان کا اثر ہے۔ اس وقت تم کو راستہ کی مختلف کیفیت لکھ رہی ہوں۔ تم بھی حال لکھنا۔ بہار سے پیچھے کیا بیتی۔

راقمہ نواب خاص محل کلکتہ ۲۹ رمضان ۱۲۷۳ھ

ارمانوں کا سوگ

اس غم آگیں مکتوب پر اردو کے ایک فاضل نقاد نے جو تبصرہ کیا ہے وہ بھی قابلِ دید ہے:۔

"خط لکھنے کے لئے کاغذ اور قلم ہی کی نہیں بلکہ خونِ جگر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جانِ عالم اور ان کی بیگمات کے خطوں میں حسرتوں کی شرح ہے جذبات کی شکست ہے ارمانوں کا سوگ ہے۔ ان میں دلی کیفیات کا اظہار ہے لیکن ایسا ہے لگ جیسے تیر کمان سے نکل جائے یہ خطوط صرف تاریخ کے ہی طالب علم کے لئے اہم نہیں، مکتوباتی ادب میں بھی درجہ رکھتے ہیں"۔ [1]

بیگمات کے خطوط پر شرر کا تبصرہ

لکھنؤ کی بیگماتی زبان اپنی شیرینی اور دل آویزی کے اعتبار سے مشہور ہے۔ ظاہر ہے یہ زبان جیسی نکھری ہوئی اور ستھری ہوئی قصر شاہی میں نظر آسکتی اور کہاں نظر آسکتی تھی واجد علی شاہ کی بیگمات کے خطوط اس اُردوئے معلیٰ کا بہترین نمونہ ہیں۔ مولانا شرر ان ہی نامجات یعنی خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

---

[1] کلاسیکی ادب صفحہ ۱۲۴

"میرے خیال میں اس سے اچھا ادبی ذخیرہ اُردو زبان کو پھر نہ نصیب ہو سکے گا، اتفاق سے ایسے تودہ نامجات گزشتہ سے میری نظر سے گذرتے رہے اور میں انھیں نہایت ہی شوق سے پڑھا کرتا اور اصل حقیقت یہ ہے کہ مجھ میں جو کچھ ادبی ذوق پیدا ہوا انھیں تودہ ناموں کے پڑھنے کی برکت ہے۔"[1]

جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا

کلکتہ پہنچنے کے بعد، واجد علی شاہ پر کیا کچھ گذری ان کے اور گورنر جنرل کے مابین کیا نامہ و پیام ہوا یہ داستان دردبھی سننی ہی پڑے گی، "آثار مختصر" میں لکھا ہے:-

"چونکہ بادشاہ کا ورود کلکتہ میں استغاثے کی غرض سے ہوا تھا۔ اس لئے گورنر جنرل نے نہ ان کا استقبال کیا نہ سلامی کی توپیں سر کرائیں نہ مہمانداری کے لوازم ادا کئے، اس زمانہ میں مہاراجہ گوالیار بھی وہاں گئے ہوئے تھے ان کا استقبال اعلیٰ پیمانے پر ہوا اور گورنمنٹ ہاؤس کے قریب ایک پرتکلف کوٹھی میں مہمان کو لے گئے۔ چند ہفتہ کے انتظار کے بعد منور الدولہ کے مشورے سے ایک خط بادشاہ کی طرف سے دوستانہ شکایت میں گورنر جنرل کو بھیجا گیا۔ چند روز تک قاصد اور خط کی گورنر جنرل کے حضور تک رسائی نہ ہو سکی۔ آخر منور الدولہ کا رفیق منشی باقر علی اس کام میں کوشش کرنے لگا، اور گورنر جنرل کے عملے کو کچھ دے کر وہ خط گورنر جنرل کو پہنچا پایا۔ ایک ہفتہ کے بعد گورنر جنرل نے یہ جواب بھیجا کہ حضرت کے تشریف لانے کی خبر ہم کو نہ ہوئی ورنہ رسم استقبال و سلامی کی توپیں عمل میں آتیں اور حضرت کیا استغاثہ کی دستی یہاں سے مشکل ہے اس لئے کہ ہم کو ولایت سے یہ حکم ہے کہ جو

---

[1] جانِ عالم (مشور) صفحہ ۸۲

کچھ لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل سابق، ملک اودھ کی نسبت تجویز کیے گئے ہیں، اسی کے مطابق عمل کریں اُس کام میں کمی بیشی نہ ہو، اس صورت میں حضرت کو اختیار ہے کہ اپنے معاملے میں رجوع لندن میں اصالۃً یا وکالتاً ملکۂ معظمہ کے حضور میں کریں۔

انگریزوں نے بادشاہ کی ہر چیز نیلام کر دی

لکھنؤ میں غرض مندوں نے جس قدر شاہی محلات میں سامان پایا، اس کو تصرف دوستانہ میں لانے میں کمی نہیں کی، یہاں تک کہ تمام سامان شاہی یوں ہی برباد گیا، جو کچھ تھوڑا سا سامان تھا، اس میں سے کچھ تو سفر انگلستان کے مصارف میں خرچ ہوا اور کچھ کلکتے کی اقامت کے لئے اسباب ضروری تیار کرنے میں خرچ ہو گیا اور کچھ خائن مصاحبوں نے اڑایا۔ ادھر چیف کمشنر نے جائزہ جملہ کارخانہ جات سلطانی کا اور ملازمین شاہی کا لیا، فوج پیادہ و رسالہ ملاکر مجموعہ ستاسی ہزار ملازم ہر فرقہ و پیشہ بموجب فرد دفتر شاہی برآمد ہوئے۔ سب کو حکم برطرفی سنا دیا۔ سات ہزار چوپائے، ۲۰۰ ہاتھی ۲ ہزار گھوڑے، ۱۰۰ شیر، دو لاکھ کبوتر اور بے شمار اسباب سرکار شاہی میں موجود پایا۔ جن کا کوٹھی دلآرام میں دو ماہ تک نیلام ہوتا رہا۔ اس طرح اور اسباب کمیاب کوڑیوں پہ نیلام ہوا کروڑوں روپیہ کا سامان جو دو سو برس کے قریب زمانہ وزارت و شاہی میں مہیا ہوا تھا چشم زدن میں برباد ہو گیا، دیکھتے دیکھتے سب کارخانہ شاہی درہم برہم ہو گیا۔

یہ قیدی پہلے بادشاہ تھا!

واجد علی شاہ سے لکھنؤ چھٹا، کلکتہ پہنچے، لیکن یہ جلاوطنی بھی انھیں راس نہ آئی۔ چرخ کج رفتار یہاں بھی آمادہ ستم رہا، غدر شروع ہوا تو بادشاہ کی طرف سے اندیشہ ہائے دور و دراز صاحبان انگریز کے دلوں میں پیدا ہوئے، چنانچہ انھیں فورٹ ولیم میں نظر بند کر دیا گیا۔

بادشاہ کی گرفتاری اور قید کا جو منظر ذکاء اللہ نے، انگریز دوست ہونے کے باوجود دکھایا ہے وہ اس تفصیل سے کسی اور تاریخ میں نہیں ملتا۔

بارک پور کی سپاہ کے ارادوں کے سبب سے جو ہول اٹھتے تھے وہ ان کے ہتھیاروں کے لینے سے دور ہوئے، مگر ہنوز شاہ اودھ کے آدمیوں کی طرف دغدغہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ شاید وہ دنگا وفساد کریں گے گورنمنٹ کے پاس ایسے ثبوت موجود تھے کہ بادشاہ کے بعض ملازمین نے قلعہ کے ہندوستانی سنتریوں کے اغوا کرنے میں کوشش کی کہ وہ سرکار کی نمک حرامی کریں، یہ کہنا ناممکن ہے کہ ان کی سازشیں زیادہ نہ پھیلی ہوں۔ اس لیے لارڈ کیننگ نے مسٹر گرینٹ کی صلاح سے ایڈمنسٹن صاحب سیکریٹری کو بھیجا کہ وہ شاہ اودھ اور اس کے مشیروں کو فورٹ ولیم میں پہنچا دے۔

وہ صبح کو سویرے سے محل شاہی پر پہنچے اور اس کے سب طرف دیواروں کے پاس گوروں کے پہرے جما دیئے کہ بادشاہ محل سے نکل کر کہیں بھاگ نہ جائے بادشاہ کے وزیر علی نقی خاں اور دوسرے بڑے بڑے مشیروں کو اپنے قابو میں کر لیا اور پھر بادشاہ کے پاس جانے کی درخواست کی، کچھ دیر بعد ان کو شاہی کمروں میں جانے کی اجازت ملی، نہایت مؤدبانہ انہوں نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ گورنر جنرل نے یہ سنا ہے کہ سازشیں حضور کے نام سے ہو رہی ہیں۔ اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ احتیاطاً حضور کو گورنمنٹ ہاؤس میں رکھا جائے (قلعہ میں جو مکان گورنر جنرل کے رہنے کا مقام) بادشاہ نے نہایت عمدہ تقریر متانت و سنجیدگی سے یہ کہا کہ میں نے اپنے کسی قول اور فعل سے باغیوں کی مدد نہ کی، میں خوش ہوں گورنر جنرل جہاں چاہیں مجھے رہنے دیں پھر وہ ایڈمنسٹن صاحب کے ساتھ قلعہ کو روانہ ہوا۔ کچھ دیر تک وہ اپنے تئیں ضبط

گزرنا پڑا، راہ میں رو کر کہنے لگا کہ میرے باپ اور دادا کیا شان وشکوہ رکھتے تھے، یا میں یہ بدنصیب ہوں۔ سلہ

کلکتہ کی سفارت کا انجام واجد علی شاہ کو اپنی بے گناہی کا یقین تھا، اس سے زیادہ انگریزوں کی شرافت اور ملکہ وکٹوریہ کی عدالت کا یقین تھا، چنانچہ کلکتے میں پہنچنے کے بعد خیال ہوا کہ شاید شدائد سفر اور غم وہم اور رنج ذکر سے پھر نہ کہیں مرض خفقان وفراق عود کر آئے اس لئے اطبا کی یہ رائے ہوئی کہ خود بادشاہ سفر انگلستان اختیار نہ کریں۔ اس وجہ سے بادشاہ نے کلکتے سے آگے سفر ملتوی کیا۔ والدۂ بادشاہ، مرزا محمد علی بہادر ولی عہد اور سکندر حشمت بادشاہ کے بھائی کو ہمراہ لے کر اس سفر کے لئے آمادہ ہوئیں اور بادشاہ کی طرف سے انھوں نے وکالت کا قصد کیا اور مولوی مسیح الدین خاں ان کے ساتھ ہوئے وہ ۱۸ جون ۱۸۵۶ء کو بوقت شب سوار ہو کر راہی منزل مقصود ہوئے۔ اس قافلہ شاہی غریب الدیار میں ۱۱۰ زن ومرد تھے۔ بادشاہ نے تحائف گراں بہا و نایاب برائے نذر جناب ملکہ کوئین وکٹوریہ اور دو برس کا زاد راہ دے کر رخصت کیا

بہادر شاہ کا انتقال۔ کسی طرح کا نامہ وپیام بادشاہ تک نہ پہنچنے پاتا تھا۔ لندن سے جو خطوط آتے تھے وہ محصلان متعینہ براہ راست پہنچا دیا کرتے تھے۔ ادھر بادشاہ کی والدہ حج اور زیارت کے ارادے سے لندن سے روانہ ہو کر ۱۸۵۸ء میں فرانس کے دار الحکومت میں پہنچ کر راہی ملک عدم ہوئیں اور بعد ایک ماہ کے مرزا سکندر حشمت نے اور ان کی بیٹی رفعت آرا بیگم نے بھی انتقال کیا۔ وفات کی تاریخ یہ ہے۔

جناب عالیہ رشک مریم و بلقیس بہم سکندر حشمت بہادر ذی جاہ

سلہ تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۷۳۹

چو ارتحال نمودند در سواد فرنگ — دو چند گشت بعالم ظہور حسرت و آہ
دوبارہ مصرعۂ تاریخ سال باید خواند — دو پال قلب ہمہ از دو صدمۂ جانکاہ

دیگر

ملکۂ کشور آں جناب عالیہ فلک جناب — مادرِ خسرو اودھ مہر کلاہ و مہ رکاب
کرد سفر ازیں جہاں آہ ملول و خستہ جاں — از ہمہ خلقِ ناگہاں، در بہ نہفت در حجاب
بود بشوق کعبہ خوش در رہِ صبر جبر کش — داد خدائے منعمش اجر و جزائے بے حساب
خامۂ سبتہ چاک من با غم و حسرت و محن — سالِ وصال او نوشت ملکۂ مغفرت مآب

اس سانحہ جاں گزا اور واقعہ ہوش ربا سے طبع مقدس ملول ہوئی، ملک فرانس جناب عالیہ اور جنرل صاحب کا مدفن ہوا۔ دیکھیے قدرت قادر کہاں لکھنؤ کی ولادت اور کہاں فرانس کی موت یہ سامان ظاہر صرف اس واسطے پیش آیا تھا کہ خاک اجسام مذکورین خاکِ فرانس میں مل جائے جہاں یہ خبر جاں گداز پہنچی تھی کہ یہ مژدہ راحت افزا بھی گوش گزار ہوا کہ بطن نواب اختر محل منکوحۂ دوم سے بعمر ۲۳ سال نور دیدۂ اقبال روشنی بخش کاشانہ ہوا اور نام مرزا حسین اور عرف چھوٹے مرزا مقرر ہوا۔

واجد علی کی بیگمات در در سرگرداں۔ بعد چندے ایک عرضداشت میر واجد علی داروغہ مقام لکھنؤ کی طرف سے پہنچی کہ باغی مغلوب ہوئے انتظام سرکار کما حقہ ہو گیا۔ میں نے جو کوشش و اہتمام حفاظت متعلقان سرکار انگریزی میں کی، خدا جانتا ہے صاحب کمشنر نے میم صاحبات اور بچوں کو میری حراست سے اپنے پاس بلا لیا اور آٹھ محل مبارک اس حفاظت میں میرے شریک حال رہے سلطان جہاں محل، شہنشاہ محل، امیر محل، فخر محل مع شہزادہ نو قدر، اختر محل، امراؤ محل، بیدہ محل وغیرہ صاحب کمشنر نے محلات مذکورہ بالا

کی آبادی کا حکم دے دیا جائے۔ باقی محلات تباہ و پریشان در بدر سرگرداں اور حیران ہیں، نہ پوشاک ہے نہ سامانِ خوراک اور یہ سب بے قصور ہیں اگر کوئی تحریر حضرت اقدس کی صاحب کمشنر کی پاس پہنچے تو محلات کی صورت آبادی ظہور میں آئے اور تا اجرائے تنخواہ پچاس پچاس روپیہ ماہوار بطور گذر اوقات مقرر فرمایا جائے اسباب جہاں تک باقی تھا کوتوالی میں اٹھ گیا۔ مگر میری مُہر لگی ہوئی ہے اور سرکار نے وعدۂ واپسی فرمایا ہے۔

بادشاہ کا حکم :- اور بادشاہ نے واجد علی داروغہ کو حکم دیا کہ ایک جگہ تمام محلات کو آباد کیا جائے۔ ۲۹ ستمبر ۱۸۵۹ء کو مرزا ولی عہد بھی سفر ولایت سے بے نیل و مرام واپس آگئے۔ کم و بیش دو کروڑ روپے کی زیر باری اس سفر میں ہوئی اور نتیجہ جو نکلا ظاہر ہے۔[1]

...کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے!

واجد علی شاہ اپنی اولاد پر جان دیتے تھے، لیکن جب قسمت نے ساتھ چھوڑا، ملک چھنا، حکومت گئی، غربت و فلاکت کا دور شروع ہوا۔ تباہی اور مصیبت نے ڈیرا ڈالا، تو وہ اولاد، جو نورِ نظر اور لختِ جگر تھی، آبرو کی گاہک اور جان کی دشمن ہو گئی بیٹے نے باپ پر دعویٰ کیا اور رقم رکھالی۔

"مرزا ہزبر علی فریدوں قدر نے بوجوہ چند در چند بادشاہ پر نالش کر کے ...۵ ماہواری اپنا مع اپنی والدہ معشوق محل کے جدا کرا لیا۔[2]

بے کس گورنر جنرل

واجد علی شاہ نے بغاوت نہیں کی تھی، سرتابی نہیں کی تھی، سرکشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا، انگریزوں نے انھیں بے وجہ معزول کیا وہ معزول ہو گئے

[1] تاریخ اودھ جلد ۵ (نجم الغنی) یہ تفصیلات اسی سے ماخوذ ہیں

[2] تاریخ اودھ جلد ۵ (نجم الغنی) صفحہ ۲۸۱

انگریزوں نے انھیں وورٹ ولیم میں قید کردیا۔ وہ قید ہو گئے، انگریزوں نے انھیں ذلتیں دیں، انہوں یہ ذلتیں سہ لیں سہ دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالتے گئے۔

لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ لکھنؤ میں ان کی کوٹھیاں کھدر رہی ہیں، محل مسمار کیے جا رہے ہیں، اور خاندانِ شاہی کی خواتین ذلیل اور بے حرمت کی جا رہی ہیں، خاندانِ شاہی کے افراد کے ساتھ ظلم و جور کا برتاؤ کیا جا رہا ہے، املاکِ شاہی لوٹی جا رہی ہے، بادشاہ کا مال و اسباب ضبط اور ضائع کیا جا رہا ہے، تو اس ذلت کو وہ ہنسی میں نہ ٹال سکا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے انہی آنسوؤں سے اس نے روشنائی کا کام لیا اور گورنر جنرل لارڈ کیننگ سے فریاد کی۔ لارڈ کیننگ کو جو کچھ چاہیے تھا (الملک ادرعہ) وہ مل گیا تھا، اب وہ ذاتی طور پر بادشاہ کی تذلیل و تحقیر پسند نہیں کرتے تھے۔ تحقیقِ احوال کے لیے، انہوں نے لکھنؤ کے چیف کمشنر اور متعلقہ حکام سے جواب طلب کیا لیکن وہ لوگ یا تو خاموش رہے، یا آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔ چیف کمشنر اور انگریز حکام کو تعجب تھا کہ ان سے معزول بادشاہ پر مظالم کے سلسلہ میں جواب طلب کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں وہ خط جو لارڈ کیننگ نے چیف کمشنر کو لکھا، جہاں اُن کی شرافتِ ذاتی کا مظہر ہے، وہاں ان کی بے بسی کی بھی منھ بولتی تصویر ہے۔

مولوی ذکاء اللہ اپنی تاریخ میں فرماتے ہیں کہ لارڈ کیننگ جواب طلب کرتے ہوئے لکھتے ہیں

”تم کو جاننا چاہیے کہ گورنمنٹ کے پاس (بادشاہ سابق کو) جواب دینے کے لیے مصالحہ موجود نہیں ہے۔ تمہارے سارے جوابوں کو بادشاہ کے خطوں کے پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھتا ہوں، تو میں ہرگز اپنے تئیں اس قابل نہیں پاتا کہ یہ کہہ سکوں کہ عمارات جن کا بیان کیا گیا ہے وہ مسمار نہیں ہوئیں، اگرچہ بادشاہ کو ایک خاص جلو خانہ کی بابت اطلاع دی گئی ہے کہ وہ ڈھ رہا ہے بادشاہ نے ۱۴ ستمبر ۱۸۵۶ء کے خط میں لکھا ہے کہ چھتر منزل میں گھوڑے اور کتے باندھے گئے ہیں۔ بادشاہ کی اولاد کو دھمکیاں دی

گئیں ہیں کہ ان کا وظیفہ بند ہو جائے گا، تم مجھ سے کہتے ہو کہ جوابوں میں تاخیر اس وجہ سے ہوئی کہ ان کی تکمیل زیادہ ہو جائے۔ اس لئے مشکل سے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ معاملات تمہاری نظر سے نہ گزرے ہوں مگر کوئی اور سبب بھی میں نہیں جانتا کہ تم نے ان کو کیوں فروگذاشت کیا؟ خواہ کچھ ہی ہوا ہو۔ تم نے جو کارروائی کا طریقہ اختیار کیا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بادشاہ سے ایسا برتاؤ برتنا پڑا جس کو ذلت تو نہیں کہہ سکتے مگر مکروہ ناسزا ضرور تھا۔ بادشاہ جو شکایتیں کرتا تھا خواہ وہ سچی ہوں یا جھوٹی وہ صاف صاف گورنمنٹ کے افسروں کے خلاف تھیں۔ گورنر جنرل بادشاہ کو یقین دلاتا تھا کہ جلد یہ معاملات چیف کمشنر کی طرف رجوع کئے جائیں گے تو خاطر خواہ بادشاہ کو اس کی توجیہہ بتلادی جائے گی۔ میں یہ اجتہاد کرتا تھا جس کے کرنے کا مجھے حق حاصل ہے کہ چیف کمشنر میری ہدایتوں کی اطاعت کرے گا اور اپنا فرض ادا کرے گا۔ مگر اس میں میں نے بڑی غلطی کھائی، اور بہت سی باتوں میں شکست پائی جن کا ابھی بیان بھی نہیں اب کا لکہ گورنمنٹ اس کو نظرانداز نہیں کر سکتی یہ کوئی بات نہیں ہے کہ یہ الزامات بادشاہ کے بدنام طبیبوں نے برانگیختہ کئے ہیں، خواہ وہ سیاہ ہوں یا سفید ہوں ان کا جواب دینا چاہئے ہے۔ حیرت ہے کہ تم نے اس ضرورت کی قدر نہیں کی

چیف کمشنر صاحب اور گبنس صاحب وغیرہ خاندان شاہی کی شکایتوں اور التماسوں پر متوجہ نہ ہوئے۔ آخر لارڈ کیننگ کو یہ معلوم ہو گیا کہ جس چیف کمشنر کو میں نے انتخاب کیا تھا وہ غلط تھا۔[1]

اور ظاہر ہے بیچارے گورنر جنرل صاحب اس سے زیادہ کیا کر سکتے تھے؟

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ٢٧٤

آہ جاتی ہے فلک پر ۔۔۔۔!

لارڈ میو، گورنر جنرل نسبتاً شریف آدمی تھے، لیکن حکمران قوم کے فرد تھے، ایک مرتبہ انہوں نے جوش پندار میں بادشاہ کو ذلیل کیا، اُن کی توہین کے مرتکب ہوئے، بادشاہ بھلا کیا کر سکتے تھے، خون کا گھونٹ پی کر اور آہ کر کے خاموش ہو گئے، لیکن یہ آہ ناکام نہیں رہی، فلک پر پہنچی اور کامیاب لوٹی۔ بادشاہ کی توہین کا واقعہ یہ ہے :-

۱۸۶۹ء کا واقعہ ہے کہ گورنر جنرل لارڈ میو ہوئے۔ پہلے وہ خود ہی بادشاہ سے ملنے کو آئے اور بادشاہ اُن سے مل کر خوش ہوئے، دوسرے دن بادشاہ ان کی بازدید کی ملاقات کو گورنمنٹ ہاؤس تشریف لے گئے جہاں تخت گاہ کے کمرے میں لارڈ میو نے پہلے بادشاہ کے برابر کرسی پر بیٹھ کر ان سے باتیں کیں اور تھوڑی دیر بعد خدا جانے کیا دل میں آیا کہ کرسی سے اُٹھ کر شہ نشین کی اونچی صدر کی کرسی پر جا بیٹھے اور بادشاہ کو وہیں نیچے رہنے دیا۔ بادشاہ کو اس میں ایسی سُبکی نظر آئی کہ بے ساختہ اُٹھ کر بغیر رخصت ہوئے واپس چلے آئے اور اس کے بعد سے پھر کبھی کسی انگریز سے نہ ملے، گھر پہنچے تو کسی مزاج داں مصاحب نے عرض کیا: "جہاں پناہ ظلِ سبحانی بغیر لارڈ صاحب سے رخصت ہوئے کیوں چلے آئے؟" فرمایا میں کس سے رخصت ہوتا؟ میں نے دیکھا کہ اس اونچی صدر کی کرسی پر بجائے زندہ آدمی کے ایک لاش رکھی ہے[1]

۔۔۔ چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

اور واقعی کچھ ہی دن بعد، یہ زندہ آدمی لاش میں تبدیل ہو گیا، لیکن کس طرح؟ یہ عبرت انگیز واقعہ اس طرح پیش آیا؟ کالے پانی کا ایک قیدی اپنا چشم دید واقعہ یوں بیان کرتا ہے

---

[1] جانِ عالم (عبد الحلیم شرر) صفحہ ۲۹

"لارڈ میو صاحب بہادر ۸ فروری ۱۸۷۲ء کو سات بجے کے بعد مع چار اگن بوٹوں کے انڈیمان میں جلوہ افروز ہوئے۔ صدہا صاحب لوگ اور میم واسطے سیر جزیرہ کے لارڈ میو صاحب کے ہمراہ تھے۔ آٹھ بجے کے بعد گورنر صاحب مع چند ہمراہیان خود جہاز سے اتر کر جزیرہ روس میں جو صدر مقام پورٹ بلیر کا ہے مشرف افروز ہوئے اترنے کے وقت لارڈ صاحب کے واسطے ۲۱ ضرب توپ کی سلامی ہوئی۔ اس وقت ہزاروں عورت مرد قیدی اور آزاد اس نظارے کو دیکھنے کے لئے جمع تھے۔ لارڈ صاحب بہادر ٹاپو میں اترنے کے ساتھ ہی بازار کی طرف متوجہ ہوئے اور راسکوں بازار، ہسپتال، بارک تبدیاں، بارک جنگی پلٹن کا ملاحظہ کر کے چیف کمشنر صاحب انڈیمان کے بنگلہ پر تشریف لے گئے اور وہاں ٹفن تناول کر کے تھوڑا آرام کر کے گورہ بارک کا ملاحظہ کیا اور پھر اپنے اگن بوٹ کو دیکھتے ہوئے وہیپر آئی لینڈ کو جہاں بدمعاش قیدی رہتے ہیں، مشرف افروز ہوئے اور بعد ملاحظہ وہیپر کے ڈنٹ پیریٹ کے قریب ایک پہاڑی واقع ہے چاتم، یہاں ایک لکڑی کے لال تختے کو لارڈ صاحب نے بہت پسند کیا۔ پھرتے پھرتے یک بیک لارڈ صاحب کے دل میں آیا کہ اسی وقت ماؤنٹ ہیریٹ کو بھی ملاحظہ کیا جائے پرائیویٹ سیکریٹری اور چیف کمشنر نے بوجہ غیر وقت ہو جانے کے اس دن مونٹ ہیریٹ کو جانے سے بہت اصرار سے منع کیا۔ لیکن لارڈ صاحب نہ مانا۔ یوں کہو کہ موت نشان کو نہ جانے دیا اور چاتم سے سوار ہو کر ہوپ ٹاؤن میں جو زیر پا مذکور آباد ہے پہنچے اس ٹاپو میں شیر علی نام ایک آفریدی قیدی مدت دراز سے ایک چھری واسطے قتل کرنے کسی افسر اعلیٰ کے تیار کر کے منتظر بیٹھا تھا جب لارڈ صاحب کی کشتی ہوپ ٹاؤن میں پہنچی تو شیر علی مذکور اپنی چھری ہمراہ لے کر

ہوپ ٹاؤن سے لارڈ صاحب کے ہمراہ تھا، مگر اثنا میں اس کا داؤ نہ چلا۔
اور لارڈ صاحب بخیریت تمام پہاڑ پر پہنچ گئے۔ اب وقت غروبِ آفتاب کا
آگیا تھا، لارڈ صاحب نے وہاں بیٹھ کر سمندر میں غروبِ آفتاب کا تماشا دیکھا
جب اندھیرا ہوگیا تو مشعلوں کی روشنی میں نیچے اترنے لگے، اس وقت مسلح پولیس
چاروں طرف تھی، چیف کمشنر صاحب اور سیکریٹری صاحب، لارڈ صاحب کے
دائیں بائیں جسم سے جسم ملا کر چلتے تھے اور دوسرے بیسیوں افسر پیچھے پیچھے
اترائی میں بھی لارڈ صاحب بخیریت ہوپ ٹاؤن تک پہنچ گئے، مگر جب گھاٹ
پر گاڑی کے نزدیک جو وہاں کھڑی تھی پہنچے، چیف کمشنر صاحب، لارڈ
صاحب کی اجازت لے کر کسی ضرورت سے پیچھے آئے اور لارڈ صاحب مع
سیکریٹری آہستہ آہستہ چلے جاتے تھے۔ اس وقت اس گاڑی کی آڑ میں سے
ایک آدمی نے مثل شیر کے کود کر دو زخم کاری لارڈ صاحب کو چھری سے ایسے لگائے
کہ لڑکھڑا کر لارڈ صاحب سمندر میں جا پڑے اس گڑبڑ میں مشعلیں بھی سب
گل ہوگئیں۔ مگر ایک دوسرے قیدی نے جرأت کر کے قاتل کو پکڑ لیا۔ ورنہ وہ
اور دو چار کو مارتا۔ لارڈ صاحب کو سمندر سے نکالا، وہ تو ایک دو بات کر کے
راہیِ ملکِ بقا ہوئے، جب قاتل سے پوچھا کہ یہ تم نے کس واسطے کیا؟ تو اس
نے کہا کہ میں نے خدا کے حکم سے کیا ہے۔ پھر پوچھا کہ کیا تمہارا کوئی شریک ہے؟ تو
جواب دیا خدا میرا شریک ہے بعد تحقیقات ضابطہ منظوری ہائیکورٹ بنگال
کے قاتل کو پھانسی کی سزا کا حکم ہوا۔ یہ قاتل شیر علی نام ضلع پشاور کا ایک
افغان تھا، اس نے کہا سنہ ۱۸۶۹ء میں میرا ارادہ تھا کہ کسی بڑے انگریز افسر
کو ماروں گا اس واسطے چند سال سے یہ چھرا تیار کر رکھا تھا۔ جب آٹھ فروری
۱۸۷۲ء کو لارڈ صاحب آئے اور ان کی سلامی ہوئی تو میں نے چھرے کو دوبارہ

تیز کیا۔ میں تمام دن اس تاک میں رہا کہ کسی طرح اس ٹاپو میں پہنچوں، جہاں لارڈ صاحب ٹھیرے ہوئے تھے ملیں، مگر مجھ کو وہاں جانے کی رخصت نہ ملی، شام کے وقت میں مایوس ہوگیا تھا۔ لارڈ صاحب کو موت میرے گھر لے آئی۔ میں پہاڑ پر بھی لارڈ صاحب کے ساتھ گیا تھا اور ساتھ ہی واپس آیا تھا، مگر آتے جاتے اور پہاڑ پر اس کا موقعہ نہ ملا۔ تب میں اس گاڑی میں آکر چھپ رہا یہاں سے میری مراد پوری ہوگئی۔ یہ شخص گو ضعیف الجثہ اور پست قد بستہ آدمی تھا مگر بڑا نہ زور اور دلیر آدمی تھا۔ پھانسی پڑنے کے وقت تک وہ کچھ ہراساں نہ تھا۔ پھانسی پر چڑھ کر اس نے بآواز بلند قیدیوں سے کہا کہ بھائیو، میں نے تمہارے دشمن کو مار ڈالا اور تم گواہ رہو کہ میں مسلمان ہوں اور پھر کلمہ پڑھنے لگا اور کلمہ پڑھتے ہی پڑھتے اس کی جان جسم سے پرواز کرگئی۔[۱]

مٹیا برج کے ٹھاٹھ

مذکرۂ خم خانۂ جاوید میں لکھا ہے کہ اگرچہ شاہ اودھ کی ظاہری حالت اور انتزاع سلطنت کو دیکھ کر عبرت پسندوں کا خیال تھا کہ اب وہ طمطراق شاہانہ عیش و نشاط اس مٹیا برج میں کہاں مگر نہیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے اور حقیقت حال سے آگاہ اشخاص بخوبی جانتے ہیں کہ اس فلاکت اور گئی گذری حالت میں بھی اس باوضع بادشاہ نے تا دمِ مرگ، اپنی کسی عادت اور کسی شاہانہ عیش پرستی و شغل میں کوئی فرق نہ آنے دیا اور اس شعر کا مصداق بنا رہا۔

تند باد قہر نے گشتی تو توڑا پھر بھی ہاں　　زمزمہ لب پر وہی ہے ہر چہ بادا باد کا

اس غریب الوطنی میں بھی بیس ہزار قدیم متوسلین حضرت کے ہمرکاب رہے اور سب کے ساتھ حتی الوسع وہی سلوک، وہی برتاؤ قائم رہا جو زمانہ سلطنت میں برتا جاتا تھا جس نے مٹیا برج کی اس زمانہ میں سیر کی ہے وہ کہہ سکتا ہے کہ اس مٹی ہوئی حالت میں بھی لبے باغ ارم نہا کر راجا اندر کا

---

[۱] تاریخ عجیب (مولانا جعفر تھانیسری) صفحہ ۱۱۷

اکھاڑہ کر رکھا تھا اس پر محلات و ایوان دل کشا کی وہی شان، سامان و اسباب آرائش کی وہی افراط جو ہر شخص کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکے۔ غرض وہ کون سی شان و شوکت تھی جو وہاں نمایاں نہ تھی۔ ہر قسم کے جانوروں کا دلی شوق تھا۔ چنانچہ آپ کا چڑیا خانہ ایسا نادر اور بے مثل تھا کہ اکثر یورپ کے سیاح اسے دیکھنے آتے تھے اور آپ کے مذاق اور تلاش کو سراہتے تھے۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

آخر آدھی زندگی عیش و عشرت میں اور آدھی عمر حسرت و اندوہ میں بسر کرنے کے بعد سلطان عالم واجد علی شاہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے:۔

مدخفیف علالت کے بعد ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء ۲۶ محرم ۱۳۰۵ھ کو نو گھڑی رات گئے انتقال کیا اور سرفراز علی خاں نامی ایک شخص کے خط سے جو دہیں موجود تھا ان کا انتقال کرنا ۲ محرم کو ثابت ہوتا ہے۔ انتقال سے تیسرے دن اپنے تیار کردہ امام باڑہ سبطین آباد میں پیوند زمین ہوئے، جو مٹیا برج میں واقع ہے۔

مولانا شرر کے اشک خونیں

مولانا عبد الحلیم شرر، واجد علی شاہ کے نمک خوار تھے، ان کی طفلی اور عہد شباب کا زمانہ بادشاہ کے دامن کرم میں بسر ہوا تھا وہ کئی سال تک مٹیا برج میں جلا وطن بادشاہ کے ساتھ رہے تھے۔ انھوں نے دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں بہت قریب سے بادشاہ کو دیکھا تھا اور اس کے کردار و سیرت سے بہت متاثر بھی تھے۔ بادشاہ کی وفات پر انھوں نے نثر میں جو مرثیہ لکھا وہ ان کے جذبہ ادرمند کا آئینہ ہے۔

مولانا کا یہ رقت انگیز مقالہ خاصا طویل تھا۔ ہم نے اسے کافی مختصر کر دیا ہے، مولانا فرماتے ہیں:۔

۲۱ ستمبر کو بادشاہ راہی ملکِ جاوداں ہوئے ان کے انتقال کے بعد انگریزی

جانِ عالم (شرر)

گورنمنٹ کے انصاف نے یہ صورت اختیار کی کہ شاہی کوٹھیوں اور اُن کے جملہ مال اور اسباب پر اپنا بہو مقرر کردیا اور کہا گیا کہ کل ترکہ ورثاء میں تقسیم کردیا جائے گا، اگر کوٹھیوں اور مکانوں کو اسی حالت میں تقسیم کردیا جاتا تو بھی وہ شاید ہی کم رہ جاتیں مگر انگریزوں کو اس میں زیادہ انصاف نظر آیا کہ کل کوٹھیاں اور سامان فروخت کردیا جائے اور نقد روپیہ ورثاء میں تقسیم ہو۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب کوٹھیاں کھود ڈالی گئیں باغ اور رمنے ویران ہوگئے، جانور بھی سب فروخت ہوگئے۔ غرض واجد علی شاہ کے زمانے کے مٹیابرج کا اب نام و نشان بھی باقی نہیں رہا، اب نہ کوٹھیوں کا سراغ ہے اور نہ ان کے مکینوں کا۔ البتہ اس زمانہ کے دیکھنے والے چند بوڑھے رہ گئے ہیں جو ٹھنڈی سانسوں کے طویل سلسلے کے بعد کچھ افسانے بیان کردیتے ہیں۔[1]

---

[1] جانِ عالم (عبدالحلیم شرر) صفحہ ۱۹۲

لکھنؤ کا مرثیہ

الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیّاد

لکھنؤ مٹ گیا، لیکن اس کی یاد نہ مٹ سکی، اودھ کی سلطنت بے چراغ ہوگئی، لیکن اس کا نقش محو نہ ہو سکا، واجد علی شاہ معزول ہوئے، جلاوطن ہوئے، فورٹ ولیم میں قید رہے، اور ایک روز اس جہانِ گذراں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے، لیکن چشمِ گریہ ساماں پر کوئی قدغن نہ لگ سکا۔

انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی، ان کے دبدبہ و طنطنہ کے سامنے سب کے سر جھک گئے ان کی سفاکی اور درندگی بہیمیت اور شقاوت، ظلم و جور اور قتل و غارت نے سکوتِ مرگ طاری کر دیا ساری خلقت پر، لیکن شاعر کا نالۂ موزوں زمین سے اُٹھا اور عرش پر پہنچ گیا اُسے کوئی نہ روک سکا، اس پر کوئی قدغن نہ لگا سکا، اس نے اشارہ میں، استعارہ میں، کنایہ میں، تمثیل میں، تشبیہ میں، وہ سب کچھ کہہ دیا جو کہنا چاہتا تھا۔

اودھ کی تباہی، لکھنؤ کی بربادی، واجد علی شاہ کی نامرادی اور باشندگانِ لکھنؤ کی زبوں حالی کا مرقع کئی شاعروں نے کھینچا ہے، میں تلخیص و اختصار کے ساتھ بطور نمونہ ان کے تھوڑا سا کلام پیش کرتا ہوں۔!

سیّد اکبر حسین اکبر

غمِ ملّت

وہ ہوا نہ رہی وہ چمن نہ رہا
نہ گلی نہ رہی وہ حسیں نہ رہے

وہ فلک نہ رہا وہ سماں نہ رہا
وہ مکاں نہ رہا وہ مکیں نہ رہے

نہ گلوں میں گلوں کی سی بو وہ رہی
نہ عزیزوں میں لطف کی خو وہ رہی

نہ حسینوں میں رنگ وفا وہ رہا
کہیں اور کی کیا وہ ہمیں نہ رہے

نہ وہ آن رہی نہ اُمنگ رہی
نہ وہ رندی و زہد کی جنگ رہی

سوئے قبلہ نگاہوں کے رُخ نہ رہے
درِ دیر پہ نقشِ جبیں نہ رہے

نہ وہ جام رہے نہ وہ مست رہے
نہ فدائے عہد الست رہے

وہ طریقۂ کار جہاں نہ رہا
وہ مشاغل رونق دیں نہ رہے

ہمیں لاکھ زمانہ بھلائے تو کیا
نئے رنگ جو چرخ نے دکھائے تو کیا

یہ محال ہے اہل وفا کے لئے
غمِ ملّت و الفت دیں نہ رہے

میر ببر علی انیس

فریاد

کیوں کر دلِ غمزدہ نہ فریاد کرے
جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ اب خداوند کریم
اُجڑی ہوئی سلطنت کو آباد کرے

سیّد ظہیر الدین ظہیر

داستانِ انقلاب

جو ہاتھ عقدہ کشا تھے وہ بستہ کار ہوئے
جو قد کہ رشکِ صنوبر تھے وہ نزار ہوئے
جو پاؤں غیرتِ گل تھے وہ خار خار ہوئے
حنائی تلوے دلوں کی طرح فگار ہوئے
جو سینے گلشنِ خوبی تھے داغ داغ ہوئے
جو دل کہ خانۂ عشرت تھے بے چراغ ہوئے

نگاہ صورتِ تصویر رہ گئی حیراں
ہر ایک جسم بنا شکلِ قالبِ بے جاں
چھٹے یگانوں کے ہمراہ ہوش و تاب و تواں
بہ رنگِ طائرِ ترسیدہ اُڑ گئے اوساں
مثالِ آئینہ ہر ایک چشم حیراں تھی
دلوں کی طرح سے جو زلف تھی پریشاں تھی

ہر ایک رونقِ بزمِ جہاں قتل ہوا
ہر ایک قبلۂ ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک طوطیٔ شیریں زبان قتل ہوا
ہر ایک بلبلِ نوشیں بیان قتل ہوا
گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ پشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

نکلنا شہر سے عفت کا بے سر و ساماں
وہ چاک چاک گریباں لگا کے تا داماں
وہ جانا پردہ نشینوں کا با سرِ عریاں
وہ دار و گیر سپاہِ شریر و بے ایماں
درازدستیٔ ظلم ستم شعاروں کا
فلک کو یاس سے تکنا خدا کے ماروں کا

نکلتے شہر سے ہیں پر نکل نہیں سکتے — ہزار چال سے چلتے ہیں چل نہیں سکتے
گردش شکل کو بدلیں بدل نہیں سکتے — قدم قدم پہ ہے لغزش سنبھل نہیں سکتے
کمندِ موت نے کیا بند بند جکڑے ہیں — زمین شہر نے ایک ایک کے پاؤں پکڑے ہیں

وہ دھوپ اور وہ ریگِ تپاں وہ گرم ہوا — وہ فوج فوج ہر ایک سو سے زغۂ اعدا
وہ کینہ ورزیٔ غارت گران بے پروا — اور اس پہ ظلم کنواروں کا وہ کہ واویلا
جو ہم سے سنتے ہیں اس انقلاب کی باتیں — وہ لوگ کہتے ہیں کرتے ہو خواب کی باتیں

وہ گل سے چہرے حرارت سے تمتمائے ہوئے — وہ گورے گورے بدن خاک میں ملائے ہوئے
لبوں پہ آہ، جگر میں الم سمائے ہوئے — جفا کی تیغ سے سیف زخم دل پہ کھائے ہوئے
وہ داغِ مرگِ عزیزاں وہ دشت پیمائی — وہ ریگ و خار مغیلاں و آبلہ پائی

گلوں سی چشموں پہ اک مردنی سی چھائی تھی — وہ مہ سے چہروں پہ گویا چھپی ہوائی تھی
غضب، وہ پردہ نشینوں کی بے ردائی تھی — غرض کہ آنے سے پہلے قیامت آئی تھی
بیان کیجئے نصیبوں کی کیا برائی کا — وہ دشت اور وہ پھرنا برہنہ پائی کا

جہاں کی تشنۂ خوں تیغ آبدار ہوئی — سنان نیزہ ہر اک سینہ سے دوچار ہوئی
رسن ہر ایک بشر کے گلے کا ہار ہوئی — ہر ایک سمت سے فریاد گیر و دار ہوئی
ہر ایک دشت خفا میں کشاں کشاں پہنچا — جہاں کی خاک تھی جس جس کی وہ وہاں پہنچی

نہالِ گلشنِ اقبال پائمال ہوئے — گلِ ریاضِ خلافت لہو میں لال ہوئے
یہ کیا زوال ہوئے اور کیا کمال ہوئے — کمال کو بھی نہ پہنچے تھے جو زوال ہوئے
جو عطر گل کا نہ ملتے، ملے وہ مٹی میں — جو فرشِ گل پہ نہ چلتے، ملے وہ مٹی میں

منیر شکوہ آبادی

داغِ غم

دل تو پژمردہ ہے داغ غم گلستاں ہوں تو کیا
آنکھیں روتی ہیں دہانِ زخم خنداں ہوں تو کیا

ہو گئے برباد شاہانِ سلیماں منزلت
اب بلائیں ہوں تو کیا دنیا میں پریاں ہوں تو کیا

موت کے پنجرے میں شیرانِ دلاور پھنس گئے
شیر افگن ایک دو شیرِ نیستاں ہوں تو کیا

بیگمیں، شہزادیاں پھرنے لگیں خانہ خراب
اب چڑیلیں صاحبانِ قصر و ایواں ہوں تو کیا

مسجدیں ٹوٹی پڑی ہیں صومعے ویران ہیں
یادِ حق میں ایک دو دل ہائے سوزاں ہوں تو کیا

مٹ گئے قصرِ معلیٰ، کھد گئے زریں محل
رنج سے معمور گر دل ہائے ویراں ہوں تو کیا

بجھ گئیں شمعیں، جلے پروانے تو کیا فائدہ
اُڑ گئے پروانے شمعیں نور افشاں ہوں تو کیا

دیکھنے والے نہیں پھر آئینے کس کام کے
بے زلیخا شہر سارے یوسفستاں ہوں تو کیا

کربلا میں یا نجف میں چل کے مر جائیں منیر
ہند میں ہم پہلوئے گورِ غریباں ہوں تو کیا

میر امان علی سحر

شہر بے چراغ

عجیب مجمع اہل کمال تھا افسوس
ہزار حیف وہ صحبت فلک نہ دیکھ سکا

نہ پانچوں وقت کی نوبت نہ وردیاں نہ گجر
نہ توپ چلتی ہے اب، ہے غضب کا سناٹا

جہاں میں صاحب جوہر کی ہے یہ بے قدری
ٹکے ٹکے پہ بکیں اصفہانیاں کیا کیا

کسی کا کھد گیا پشتہ کہیں گری دیوار
چبوترہ کہیں غائب کسی کا دروازا

جو کچھ خرید کو بازار تک گیا کوئی
وہاں سے پھر کے جو آیا تو گھر نہ پہچانا

یہ حکم ہے کہ نہ ہوں چار ایک جا باہم
وہ دن گئے کہ شب و روز رہتا تھا جلسہ

میر یار علی رند

شکوۂ صیاد

کھلی ہے کنجِ قفس میں مری زباں صیاد — میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد
جہاں گیا میں گیا دام لے کے واں صیاد — پھر آ تلاش میں میری کہاں کہاں صیاد
اُجاڑا موسمِ گل ہی میں آشیاں میرا — الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد
میں جھانکتا نہیں چاکِ قفس سے بھی گل کو — کہ تا نہ ہو مری جانب سے بدگماں صیاد
الٰہی دیکھیے صحبت برآر ہو کیوں کر — زباں دراز ہوں میں اور بد زباں صیاد
نکالیو نہ قدم آشیاں سے او بلبل — لگائے بیٹھے ہیں پھندے جہاں تہاں صیاد
چمن میں رکھا نہ بلبل کا نام تک باقی — خدا کرے یونہی ہو جائے بے نشاں صیاد
مرے بیان کو سُن سُن کے کانپ کانپ اٹھا — غضب یہ ہے کہ سمجھتا نہیں زباں صیاد
پروں کو کھول دے ظالم جو بند کرتا ہے — قفس کو لے کے میں اڑ جاؤں گا کہاں صیاد
دکھایا کنجِ قفس مجھ کو آب و دانہ نے — دگرنہ دام کہاں میں کہاں، کہاں صیاد
فریبِ دانہ نہ کھاتا میں زینہار اے رند — نہ کرتا دام اگر خاک میں نہاں صیاد

عجیب قصہ ہے دلچسپ اک حکایت ہے
سناؤں گا گل و بلبل کی داستاں صیاد

آفتاب الدولہ قلق

سفر آشوب

(لکھنؤ واجد علی شاہ کے بعد)

تین حصے سے سوا شہر کھدا پایا تمام
جس طرف دیکھو نظر آتا ہے اک ہو کا مقام
مہر وش سیکڑوں رہتے تھے جہاں گرم خرام
ٹھوکریں کھا کے بشر چلتے ہیں اس جا ہر گام
اجنبی ہو گئے ایسے یہ بھٹک جاتے ہیں
ساکنِ شہر تلک راہ نہیں پاتے ہیں

جس جگہ کل تک ان آنکھوں سے یہ ساماں دیکھا
جا پڑی آنکھ جدھر ایک پریشاں دیکھا
جس کو دیکھا صفتِ گل اُسے خنداں دیکھا
آج اُجڑا ہوا ہم نے وہ گلستاں دیکھا
سبق دفترِ آرام نہ زنہار پڑھو
آیۂ فاعتبروا یا اولی الابصار، پڑھو

کثرتِ لالہ و گل سے جو ہو مملو گلزار
عندلیبوں کو قدم رکھنا ہو جن شاخوں پہ بار
زرِ گل روز لٹاتی ہو جہاں بادِ بہار
ہر چمن میں ہوں وہیں برگِ خزاں کے انبار
جائے گل خار ہوں باغ عوض گلخن ہوں
بدلے سرخی کے لہو سے روشیں رنگیں ہوں

یہی سرکار وہ پارس تھی جو چھو جاتا تھا
چار ہی دن میں اسے مال یہ ہاتھ آتا تھا
خوبیِ بخت سے توقیر بھی یہ پاتا تھا
کم سے ایک کو خاطر میں نہ وہ لاتا تھا
روز ساماں نئے سب کو نظر آتے تھے
دم میں بنتے تھے کئی، کتنے بگڑ جاتے تھے

جس گھڑی ہوتا ہے اس تازہ خرابے پہ گزر — یہ گماں کرتا ہے ہر ایک ستم دیدہ بشر
نہیں اڑتا ہے یہ سڑکوں پہ غبار آٹھ پہر — فرقتِ شہ میں زمیں شہر کی ہے خاک بسر
دل پہ صدمے جو گزرتے ہیں وہ سب سہتے ہیں — باغِ شاہی میں سڑک دیکھ کے یہ کہتے ہیں
دلخراش ایسی الٰہی کوئی روداد نہ ہو — اس طرح گھر کسی دشمن کا بھی برباد نہ ہو
مدّعی ایسا بھی ہر ستم ایجاد نہ ہو — کسی بے جرم پہ دنیا میں یہ بیداد نہ ہو
ایسی سرکار کسی کی نہ لٹے دنیا میں — یوں وطن سے کوئی اپنے نہ چھٹے دنیا میں
ٹھیر اے دیدۂ گریاں کہ شگونِ بد ہے — دیکھ چپ رہ دلِ ناداں کہ شگونِ بد ہے
کیا کریں چاک گریباں کہ شگونِ بد ہے — بال کیونکر ہوں پریشاں کہ شگونِ بد ہے
وہ دم اللہ زمانے میں سلامت رکھے — قائم اس نام کو تا روزِ قیامت رکھے

حرفِ آخر

الحمدللہ کہ یہ کتاب اتمام کو پہنچی میں نے کوشش کی ہے کہ اپنے موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کروں اور زیادہ سے زیادہ مستند مواد پیش کر دوں کم از کم میں تو اپنی جگہ مطمئن ہوں کہ میں نے اپنا فرض پوری دیانت سے انجام دیا ہے۔ رہے پاکستان کے "عظیم" نقاد اور "سعادت یار خاں رنگین" کے ہم ردیف و ہم قافیہ نکتہ چیں، سودہ دہائی دیتے ہوئے ایک ایک آستانہ پر بہر حال میں پہنچتے رہیں گے، فریاد اور دہائی کے لئے بھی یہ ہر دروازہ استعمال کرتے ہیں ان سے کون کہے

بازار مصر میں جو چلی، یوسف کا سامنا کر
کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائے کا چلن میں

لیکن مجھے اس کا افسوس ضرور ہے کہ وہ سارا مواد جو بڑی محنت سے میں نے جمع کیا تھا کتاب کے ضخیم ہو جانے کے باعث استعمال میں نہ آسکا بعض تحریر کردہ عنوانات تک مجھے روک لینے پڑے، بہر حال یہ مواد بے کار نہیں جائے گا، انشاءاللہ اپنے وقت پر کام آئے گا۔

مجھے افسوس ہے کہ ساقی (کراچی) کا پرچہ سعی بسیار کے باوجود دستیاب نہ ہو سکا جس میں ممتاز حسن صاحب (سیکریٹری فنانس حکومت پاکستان) کا ایڈیٹوریل تبصرہ "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" پر شائع ہوا تھا اتفاق سے نگار اور صدق کے پرچے مل گئے، مولانا نیاز فتح پوری نے جو تبصرہ کیا تھا۔ اس کا ایک حصہ درج کرتا ہوں

"جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے، یہ بہادر شاہ ظفر اور ان کے عہد کی تاریخ ہے جس میں اس عہد کے تمام سیاسی، علمی، ادبی و معاشرتی پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے اور اس حد تک ریسرچ و استقصاء سے کام لیا گیا ہے کہ اگر ہم اس کو اس زمانہ کی "دائرۃ المعارف" کہیں تو غلط نہ ہو گا۔

شاہ ظفر کا عہد تاریخ ہند کا بڑا انقلاب آفریں عہد تھا جس نے عہد مغلیہ کے آخری نام لیوا کو ختم کر کے انگریزی حکومت کی بنیاد استوار کی، ہر چند شاہ ظفر کی حکومت حدودِ قلعہ کے اندر ہی محدود تھی لیکن اس کا نفسیاتی و اخلاقی اثر اتنا ضرور تھا کہ اگر ۵۷ء کی جنگِ انقلاب کامیاب ہو جاتی تو اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوتا کہ اگر مغلیہ حکومت کا اقتدار از سر نو قائم نہ ہو سکتا، تو انگریزوں کے پاؤں بھی

یہاں نہ جم سکتے۔

۱۸۵۷ء کی تاریخ پر انگریزی اور اُردو میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن ان میں سے اکثر وہ ہیں جن میں اکثر انگریزی حکومت کے خوف سے صحیح نہیں لکھی گئیں، اس لئے ضرورت تھی کہ کوئی ایسی کتاب اس موضوع پر لکھی جائے جو نہ صرف صحت واقعات بلکہ استقصاء جزئیات کے لحاظ سے بھی قابلِ استناد ہو اس کے فاضل مصنّف نے تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کا مطالعہ کر کے اس تاریخ کا مواد فراہم کرنے میں جتنی محنت سے کام لیا ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ ہر چند اس کا اندازِ بیان اور اس کا اسلوب ترتیب ایسا نہیں جس سے ہم اس عہد کے حالات ترتیب کے ساتھ معلوم کر سکیں لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کو سامنے رکھ کر ہم ایک بڑی اچھی تاریخ کی کتاب مرتب کر سکتے ہیں۔

اس کتاب میں اس عہد کے سیاسی حالات اور واقعاتِ انقلاب تفصیل کے ساتھ ساتھ تمام اکابر و اعاظم، تمام شعراء و حکماء تمام مشاغل و مراسم اور علمی و ادبی تصانیف کا بھی مفصل ذکر کیا گیا ہے جس نے اس کتاب کو ایک نہایت دلچسپ کشکول کی حیثیت دے دی ہے مولانا فضلِ حق خیرآبادی کی عربی کتاب "ثورۃ الہند" اور ان کے عربی قصائد کا ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ انقلاب کی تاریخ بھی ہے اور مرثیہ بھی۔"

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے 'صدق' میں ایک طویل تبصرہ شائع فرمایا تھا جس کا ایک حصّہ یہ ہے۔

"مصنّف صاحب کوئی تارک الدنیا گوشہ نشین قسم کے آدمی نہیں کہ سب طرف سے یکسوئی حاصل کئے ہوئے اسی ایک کتاب کے لکھنے لکھانے میں لگے رہے ہوں، وہ جرنلسٹ (اخبار نویس) ہیں، ناولسٹ ہیں اور ایسے کہ ان کے ناول کھٹا کھٹ ایک کے بعد ایک نکلتے چلے آتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ایک دارالاشاعت کے منیجر بھی! اس کم فرصتی پر یہ عالم کہ ایک دفتر کا دفتر تیار کر دیا فرصت ہوتی تو خدا جانے کیا غضب ڈھاتے۔

کتاب کا نام ہے "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" لیکن کتاب بہادر شاہ پر تو کم ہے اور ان کے عہد پر زیادہ۔ چنانچہ بہادر شاہ کا تذکرہ تو صفحہ ۲۵۶ پر ختم ہو جاتا ہے اور پھر آگے چل کر کچھ صفحے

بہادر شاہ کے مقدمہ کو بھی ملا لیجئے۔ باقی صفحہ ۷۰۵ سے عہد بہادر شاہی کے صوفیہ و مشائخ علماء شعراء، اطباء، ہنرور اور فن کار، شہدائے غدر، اخبارات، عمارات اور دوسرے عنوانات متعلق وغیر متعلق کا سلسلہ جو چھڑتا ہے، وہ کتاب کے خاتمہ ہی پر ختم ہوتا ہے بقول شخصے ع

قصہ زلف مختصر نہ ہوا

اور کتاب کو مجموعی حیثیت بجائے ایک سوانح عمری یا تاریخ کے ایک تاریخی، سوانحی، ادبی اخبار کشکول کی دے جاتا ہے۔ جامعیت اور کاملیت اور ہمہ گیری اس بلا کی کہ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کی فہرست مطبوعات اور حالی کے مرثیہ حکیم محمود خاں دہلوی اور اکبر الہ آبادی کے جلوہ دربار قیصری کی پر بہار نظموں تک کا عکس اسی آئینے میں ملاحظہ فرمائیے! کیا کہیے کہ آج حیات نہ ہوئے مولانا شوکت علی مرحوم ورنہ عجب نہیں کہ یہ ضخیم و فخیم اور رنگا رنگ کتاب اپنے سارے پھیلاؤ اور بھراؤ کے ساتھ انھیں کے نام نامی سے معنون ہوتی! بڑا ہی بلیغ اور ہر معنی لحاظ سے پر معنی انتساب (ڈیڈی کیشن) ہوتا اور معنویت کی ایک نئی روح اس سے اس قالب کاغذی میں پڑ جاتی۔"

(صدق ۲۵ جنوری ۱۹۵۷ء)

کراچی کے مشہور اور معیاری رسالہ "نیا دور" کا تبصرہ یہ ہے:۔

"غدر کی داستان تاریخ ہند کا ایک ایسا المیہ ہے جس کی نظیر کسی دوسرے ملک کی تاریخ میں بہت مشکل ہی سے ملے گی، پاک و ہند کے اہلِ قلم اور مورخین کو شاید اس کی اہمیت سے انکار نہ ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ کسی نے آج تک اس طرف توجہ نہ دی اور ہماری تاریخ کا یہ اہم اور سبق آموز خزینہ یاد دل سے فراموش ہوتا چلا گیا۔ مورخین کی بے توجہی کی وجہ ہو سکتی ہے کہ ۱۹ ویں صدی کے اواخر بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں انگریزی قہرمانیت کے پیشِ نظر کسی مورخ کو اس موضوع پر قلم اٹھانے کی جرات ہو ہی نہیں سکتی تھی اور اس کے بعد اہلِ ہند کے نئے عزائم اور نئی قومی تحریکات نے وہ زور پکڑا کہ کسی کو اس طرف متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ مرحوم خواجہ حسن نظامی نے اس موضوع پر اپنے دل کش انداز میں بہت کچھ لکھا مگر بعض تراجم کو چھوڑ کر اس کی حیثیت افسانوی ہے تاریخی نہیں۔

ہم رئیس احمد صاحب جعفری کے ممنون ہیں کہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد لکھ کر تاریخ ہند میں ایک اہم باب کا اضافہ کیا ہے اور اپنی کتاب میں بہت سی ایسی باتیں پیش کیں جو پہلی بار منظر عام پر آئیں "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" ۱۳۶۰ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم مگر پُر از معلومات کتاب ہے فاضل مؤلف نے کتاب کو ۵۵ ابواب پر تقسیم کیا ہے اور ہر باب کے تحت مضمون کی وضاحت کے لئے متعدد مفید عنوانات درج کئے ہیں۔ کتاب کے اکثر حصے بے حد دلچسپ اور بیش بہا معلومات کا خزانہ ہیں۔

فاضل مصنف نے ابتدائیہ باب ۲ میں ان واقعات وحالات کو اجمالی طور پر تحریر کیا ہے جو عالمگیر کی وفات کے بعد بہت تیزی سے ہندوستان میں رونما ہوا ہے۔ جیسے مرہٹوں کے حملے، سکھوں کی بربریت اور ہیبت دہلی اور آگرہ کے درمیان جاٹوں کی شورشیں وغیرہ۔ اسی باب میں آگے بڑھ کر ہندوستانی تمدنی، سماجی اور اقتصادی حالت پر روشنی ڈالی ہے۔ افتتاحیہ کلیہ باب بیحد دلچسپ ہے اور اس کے مطالعہ ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہندوستان اپنی تمام صلاحیتیں کھو چکا ہے اور اب ذلت، نکبت، محکومی اور غلامی کے سوائے اس کی قسمت میں اور کچھ نہیں

بہادر شاہ ظفر کے ذاتی حالات ہمہ روز کے مشاغل معمولات داد و دہش کا نقشہ پہلی بار قرطاس پر نظر آیا۔

عہد بہادر شاہ کے علماء، فضلاء، اطباء اور فن کاروں پر بہت اچھی روشنی ڈالی ہے جس سے کتاب کی ادبیت میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ اس باب میں بہت سے ایسے لوگوں کا تذکرہ آگیا ہے، جو اس دور میں کافی ممتاز اور مشہور تھے مگر زمانے نے اپنی عادت کے موافق ان کی یادوں کو فراموش کر دیا تھا۔

کتاب کا اہم ترین حصہ جزو غدر کا بیان ہے فاضل مؤلف نے غدر کا باب اور محرکات پر دلنشیں انداز میں بحث کی ہے اور غدر کے حالات و واقعات شرح و بسط سے بیان کئے ہیں مگر مفصل ہونے کے باوجود غدر کا حال مکمل طور پر بیان نہ کر سکا اس کی وجہ یہ بظاہر معلوم

ہوتی ہے کہ فاضل مؤلف نے انگریزی ماخذوں کو یک قلم نظر انداز کر دیا ہے۔ انگریز مصنف نے اس موضوع پر متعدد بیش بہا کتابیں لکھی ہیں جن میں جزئیات تک نہیں چھوڑیں گو ان کا نظریہ مخالفانہ ہے مگر ان میں صدہا کام کی باتیں ہیں جن پر نظر ڈالے بغیر غدر کا بیان مکمل نہیں ہو سکتا۔ غدر کے متعلق ایک اہم سوال یہ ہے جس کا فیصلہ کن جواب ابھی تاریخ نے نہیں دیا۔ اور وہ یہ کہ کیا غدر ایک بیرونی جابر اور مستبد حکومت کا تختہ الٹ دینے کے لئے اہلِ ہند کی متفقہ اور منظم کوشش تھی یا صرف فوجیوں کی شورش جس میں چند خود غرض عناصر موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے شامل ہو گئے تھے۔ اہلِ ہند غدر کو ایک عرصہ تک فوجی شورش سمجھتے رہے سر سید نے بھی یہی ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی کہ غدر فوجی بغاوت کے سوا کچھ نہ تھا جب ہندوستان میں نئی نئی تحریکیں نمودار ہونے لگیں تو اہلِ ہند کا زاویہ نگاہ بدلنے لگا اور انھوں نے بہت سی پرانی چیزوں کو نئے ناموں سے یاد کرنا شروع کیا مثلاً ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے غالب کو دید کے ہم پلہ قرار دیا اور ڈاکٹر سید محمود نے غالب کو محبِ وطن ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی، بالکل اسی طرح غدر کا نیا نام جنگِ آزادی ہوا لیکن نام بدل دینے سے چیز کی ماہیت اور حقیقت نہیں بدل سکتی۔ فاضل مؤلف نے بھی غدر کو آزادی کی منظم اور متفقہ کوشش تسلیم کی ہے مگر تاریخ تو قدم قدم پر ثبوت مانگتی ہے، حرف حرف اور لفظ لفظ پر جرح و تعدیل کرتی ہے۔ اس کے نزدیک خالی بیان بیکار ہے۔ ہمارے نزدیک اسی اہم سوال کا جواب فاضل مؤلف کے ذمہ ابھی باقی ہے جو اُن کو اسی کتاب کے اگلے ایڈیشن میں لکھنا چاہیے۔

یہ بات تو پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ غدر کی ابتدا ہندوؤں سے ہوئی تھی اور اسی کے عواقب یک سر مسلمانوں کو برداشت کرنے پڑے کاش فاضل مؤلف اس موضوع پر بھی کچھ روشنی ڈالتے تاکہ ہندوؤں کا کردار زیادہ وضاحت سے منصۂ شہود پر آجاتا اور ہمیں معلوم ہو جاتا کہ ہماری ساری جہربانیوں، شفقتوں، محبتوں کا ہندوؤں نے کیا جواب دیا۔ میر دوں کے متعلق فاضل مؤلف کا بیان عبرت انگیز ہے۔ اسی زمانہ کے ہر دور میں میر جعفر، میر صادق اور احسن اللہ جیسے میر دں کی کمی نہ تھی اور اس جنگِ آزادی کو ناکام بنانے میں ایسے میروں کا کہاں تک ہاتھ تھا اس کی

بھی وضاحت اس باب میں ہو جاتی۔

بہادر شاہ بیچارا تو برائے نام غدر کا ہیرو تھا۔ بالکل اسی طرح مرزا مغل اور دوسرے شہزادے بھی نمائشی تھے۔ غدر کا اصلی ہیرو دہلی میں بخت خاں تھا اس کے حالات زندگی ابھی تک گمنامی کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں ہم سب کو فاضل مؤلف کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ ان کی کاوش کوشش سے ایک عظیم المرتبت ہستی سے پہلی بار تعارف نصیب ہوا۔

غدریہ قصائد مولانا فضل حق خیرآبادی کا قصیدہ بھی خوب ہے فاضل مؤلف نے اس کو درج کتاب کر کے غدر اور بعد غدر کے مصائب پر روشنی ڈالی ہے، پڑھتے وقت تو مجھے اس میں اسپین کی تباہی کے مرثیہ کی روح محسوس ہوئی، وہی حسرت، وہی تلخی، وہی تلخ کلامی۔"

(نیا دور۔ کراچی)

اب پھر یہ کتاب عظیم، اور غیر عظیم نقادوں کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں شعر میں کہتا ہوں ہے تم کرد

یکم نومبر ۱۹۵۷ء

رئیس احمد جعفری
۹۸۔ ڈیگور پارک، لاہور
